وطن کے لئے میرے عزائم

اعلیحضرت ہمایوں محمدّ رضا شاہ پہلوی آریامہر

شاھنشاہ ایران

وطن کے لئے میرے عزائم

مترجم

ڈاکٹر یونس جعفری

دہلی کالج۔ دھلی

پبلشرز

رنگ محل

دہلی۔ ہند

پبلشرز: رنگ محل
۲۴۴۹، پھاٹک حبش خاں، تلک بازار، دہلی (ہند)

پہلی انگریزی اشاعت :	۱۹۶۱ء	(امریکہ)
دوسری انگریزی اشاعت :	۱۹۶۸ء	(انگلستان)
پہلی فارسی اشاعت :	۱۹۶۲ء	(ایران)
پہلی ہندی اشاعت :	۱۹۷۱ء	(ہند)
پہلی اُردو اشاعت :	۱۹۷۱ء	(ہند)
تعداد اشاعت اُردو :	۵,۰۰۰	

فوٹو آفسیٹ پروسسنگ	:	رنگ محل، دہلی
بلاک میکنگ	:	رنگ محل بلاک ورکس، دہلی
کتابت	:	حفیظ الدین، عبدالمنان، مقصود علی
طباعت آفسیٹ	:	گرافک انڈیا، دہلی
طباعت بلاک	:	کیکسٹن پریس، ایکسٹینشن، نئی دہلی
بائنڈنگ	:	فائن بک بائنڈنگ ہاؤس، دہلی

زیر اہتمام : عبدالمالک صدیقی

فہرست مضامین

صفحہ

فہرست تصاویر

صفحہ

عرضِ مترجم

جس گھر میں مَیں نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا وہاں کے ماحول میں فارسی زبان و ادب کا گہرا اثر تھا۔ اردو شعراء کے کلام کا موازنہ فارسی شاعری سے کیا جاتا اور مباحثہ ہفتوں تک چلتا رہتا جس میں ہر بار پلّہ فارسی کا ہی بھاری رہتا اور ہر شخص فارسی ادب کی عظمت و وسعت کا اعتراف کر کے اٹھتا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے جب میں نے دہلی کالج میں داخلہ لیا تو اس وقت فارسی میرا اختیاری مضمون تھا۔ لیکن بعد میں مَیں نے ذاتی ذوق و شوق کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ اس کا مطالعہ ایک امتیازی مضمون کی حیثیت سے کیا جائے چنانچہ میں نے اس زبان میں پہلے آنرز اور بعد میں ایم۔ اے بھی کیا۔

زمانہ طالب علمی میں فارسی تاریخ و ادب سے متعلقہ اردو فارسی کتابوں کے علاوہ انگریزی کتابیں یا ان کے ترجمے پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ جن میں سیاحت نامہ ابراہیم بیگ، ژان ژاک امریکائی کا سفرنامۂ ایران، جیمس موریر کی کتاب حاجی بابا اصفہانی، پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران اور سر پرسی سائیکس کی کتاب قابلِ ذکر ہیں۔ انؔ کتابوں کو کیونکہ بار بار پڑھنا پڑا تھا اس لئے یہ بات ذہن میں اچھی طرح جم گئی کہ اگرچہ ایران نے فارسی زبان و ادب کو تو بہت کچھ دیا ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہ ابھی صدیوں پیچھے ہے۔

نومبر ۱۹۶۲ء کے آخر میں مجھے ایران کے سفر کا اتفاق ہوا تہران کے ہوائی اڈہ مہرآباد پر جیسے ہی میں نے قدم رکھا میرے ذہن میں عجیب اور متضاد خیالات کا تصادم ہونے لگا ذہن میں یہ بات رچ بس چکی تھی کہ ایران بالکل ہی پس ماندہ ملک ہے لیکن سامنے جو حقائق تھے وہ صاف صاف کہہ رہے تھے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے ایران میں ہر وہ چیز ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں ہو سکتی ہے میں نے وہاں ہر چیز کو غور سے دیکھا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس میں فرسودگی اور کہنگی کا پہلو نکالنے کی کوشش کی مگر ہر بار اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔

میرا قیام ڈھائی سال رہا اس عرصہ میں بہت سے مستشرقین سے بھی ملاقات ہوئی جن میں سے ہر شخص سے میں نے

فرداً فرداً یہ سوال کیا کیا تم کو ایران کی عام زندگی میں پرانے پن اور کہنگی کے آثار نظر آتے ہیں اور اس ملک میں کسی طرح کی کمی محسوس ہوتی ہے سب نے یہی کہا بالکل نہیں۔ کبھی تو یہ لگتا ہے کہ ہم تہران میں نہیں یورپ کے کسی گوشہ میں بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے ذہنی تضاد کا ذکر چھیڑا اور سب نے ہی مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ ان کتابوں کو پڑھ کر اور ایران آکر انہیں بھی واقعی سخت حیرانی ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود ہی ایک کتاب لکھوں اور یہ بتاؤں کہ اب تک جو ایران کے متعلق سفرنامے لکھے گئے ہیں ان کی حیثیت اب علی بابا چالیس چور اور چراغِ الہ دین کے افسانوں کی سی ہے اور موجودہ ایران اس سے قطعی مختلف ہے۔

میں اپنی کتاب کے لئے مواد اکٹھا کر ہی رہا تھا کہ شاہنشاہ ایران اعلیٰحضرت محمد رضا شاہ پہلوی آریا مہر کی کتاب[1] 'مشن فار مائی کنٹری' میرے ہاتھ لگی۔ اس کتاب کو میں نے غور سے پڑھا اور پڑھ کر اس نتیجہ پہ پہنچا کہ میں ایرانی زندگی کے کسی ایک یا دو پہلوؤں پر تو روشنی ڈال سکتا ہوں مگر ایسی مستند کتاب لکھنا میرے لئے شاید ناممکن ہوگا۔ شاہنشاہ آریا مہر کی کتاب کو میں نے ہر اعتبار سے مکمل پایا چنانچہ خود کتاب لکھنے کی بجائے اس کے ترجمہ کا فیصلہ کیا۔ ترجمہ کرنے کا فیصلہ میں نے کسی وقتی جوش کے تحت نہیں کیا کیونکہ ایک طرف مجھے شاہنشاہ کی عظمت و بزرگی کا پاس تھا تو دوسری طرف اپنی کم مائیگی کا بھی احساس۔ اس فیصلہ کے بعد میں خود بھی مسلسل مضامین لکھتا رہا اور فارسی و انگریزی سے ہندی اور اردو میں ترجمہ کا کام بھی کرتا رہا۔ جب میری اپنی تخلیقات اور تراجم ملک میں اور ملک کے باہر اعلیٰ اور معیاری رسائل میں چھپ گئیں اور میرا اپنا ایک اسلوب بن گیا تو میں نے اس کام کو شروع کیا۔

اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی ہے اور اس کا فارسی ترجمہ ایک سال بعد ۱۹۶۲ء میں ماموریت برائے وطنم کے نام سے شائع ہوا۔ انگریزی متن کی زبان نہایت شستہ اور ادبی ہے لیکن ترجمہ کا بیشتر حصہ لفظی ہے اور مترجم نے عوامی زبان کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ترجمہ میں کچھ ایسے جملوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جو انگریزی متن میں نہیں آئے اس کے علاوہ مترجم نے فارسی زبان کے مزاج اور خمیر کو دیکھتے ہوئے جملوں کی نشست میں بڑی خوش اسلوبی سے کئی جگہ تبدیلی بھی کی ہے اگرچہ اردو ترجمہ انگریزی متن کی بنیاد پر ہے لیکن فارسی ترجمے کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے اور کہیں کہیں اردو ترجمے میں فارسی ترجمے کی پیروی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یورپی زبانوں کے بعض الفاظ جو زیادہ معروف نہیں ہیں نیچے حواشی میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ راقم الحروف نے اردو ترجمے کے ساتھ ہی اس کتاب کا ترجمہ ہندی میں 'ڈیش کے نام میرا سندیش' کے عنوان سے کیا ہے۔

ایران اور ہندوستان کے تعلقات ہر اعتبار سے ناقابلِ شکست ہیں۔ ایرانیوں نے وقت کے بدلنے کے ساتھ اور حالات کے مطابق تبدیلیاں پیدا کرنے کی وجہ سے اپنی بہت سی قدیم روایات کو جن میں لباس، زبان کے بہت سے الفاظ اور رسم و رواج شامل ہیں ترک کر دیا ہے۔ لیکن ان چیزوں کا ہمارے ملک میں ابھی تک رواج ہے۔

ہمارے ملک کے محقق ایرانی تہذیب و تمدن میں اپنی قدیم عظمت کو تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے تہذیبی اور نسلی

1. MISSION FOR MY COUNTRY

تعلقات کے علاوہ ایران سے ہمارا دینی رشتہ بھی ہے جس کی وجہ سے ہمارے تعلقات کبھی فرسودہ نہیں ہو پاتے بلکہ ہر دم تازہ اور استوار رہتے ہیں۔ بہت سے محققوں نے ایران اور ہندوستان کی تہذیب میں یگانگت اور قربت کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور دونوں ملکوں کو نزدیک لاتے ہوئے ان کی تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن شاہنشاہ ایران اعلیحضرت محمد رضا شاہ پہلوی آریا مہر کی کتاب کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان دونوں ملکوں میں اور بھی زیادہ قربت پیدا کر دے گی کیونکہ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں ایرانی تہذیب و تمدن کی زیادہ نمایاں تصویر نظر آتی ہے اور دونوں ملکوں کی تہذیب و تمدن کا مقابلہ کرنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ کرنے میں مجھے فخر کا احساس ہوتا ہے کیونکہ اس کتاب میں جس قدیم تہذیب و تمدن کا اعلیحضرت نے ذکر کیا ہے وہ ہم کو بالکل اپنا معلوم ہوتا ہے۔

آخر میں میں اپنے کرم فرماؤں کا بھی ذکر کروں گا۔ میں ایران کے سفیر کبیر محمد رضا امیر تیمور کا بیحد شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری اس درخواست کو قبول کیا اور ترجمہ کا موقع دیا۔ میں ایرانی سفارت خانے کے پریس اٹیچی احمد مشتوق زادہ اور محمد امین کاردان کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میری ہر طرح مدد کی اور ہر مشکل میں میرے ساتھ پورا تعاون کیا۔ ان کی ہر دم حوصلہ افزائی میری راہنما ثابت ہوئی اور یہ کتاب ان کے شوق دلانے پر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ارادت مند

یونس جعفری

دہلی کالج، دہلی

۲۱ مارچ ۱۹۷۱ء

دیباچہ

اس کتاب کی چونکہ عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی اس لئے زیرِ تحریر میں لائی گئی ہے جہاں تک مجھے علم ہے ایرانی شہنشاہیت کی بنیاد اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے رکھی گئی تھی۔ اور میں پہلا ایرانی بادشاہ ہوں جس نے اپنی سوانح حیات اس قدر مرتب و مسلسل سپرد قلم کی ہے۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی میں یعنی ایرانی شہنشاہیت کے شروع ہونے کے دو ہزار سال بعد شاہ طہاسپ اوّل نے جو اس ملک کا حکمراں رہ چکا ہے اپنی زندگی کے متعلق ایک مختصر تاریخچہ لکھا تھا۔ اس واقعہ کے دو سو سال گذر جانے کے بعد شاہ طہاسپ دوم کے عہد میں ایک فرانسیسی پادری نے بادشاہ کی سوانح عمری اجمالی طور پر لکھی تھی۔ جس میں اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ بادشاہ (شاہ طہاسپ دوم) کسی فرانسیسی کی اولاد ہے۔

انیسویں صدی میں ناصر الدین شاہ نے یہ جاننے اور دیکھنے کے لئے کہ یورپ کی ترقی کے کیا راز ہیں دو مرتبہ وہاں کا سفر کیا۔ ان دونوں سفروں کا حال اس نے اپنے سفرنامے میں بڑی خوبی سے درج کیا ہے لیکن ان بادشاہوں میں سے کسی نے بھی اپنی زندگی کے واقعات باقاعدہ اور منظم طریقے سے قلمبند نہیں کئے اور آخر کار تختِ سلطنت پر برسرِ اقتدار آنے کے سولہ سال بعد میں نے ہی یہ کام اپنے ذمّے لینے کا فیصلہ کیا۔

اس کتاب کے لکھنے کا صرف یہی مقصد نہیں کہ اپنی زندگی کے حالات لکھ کر اپنے ملک کے دوسرے تمام شاہنشاہوں سے سوانح نگاری کے میدان میں سبقت لے جاؤں بلکہ میں نے یہ محسوس کیا کہ ایسی کتاب کی واقعی ضرورت ہے جو ایران کا حال اور مستقبل جاننے والوں کے لئے رہنما ثابت ہو۔ پچھلی چند صدیوں میں ہم نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے مقام و منزلت کو نہیں پہچانا اور اسی وجہ سے ہم نے اپنے ملک کی ترقی کے لئے صحیح منصوبے تیار کرنے میں غفلت سے کام لیا۔ ہم بڑے صبر آزما حالات سے گذرے ہیں ہم نے اپنے ملک میں جو تھوڑے بہت ترقی کے کام کئے تھے اس کے متعلق ہماری

معلومات بہت مبہم اور غیر واضح تھیں اس کے علاوہ مزید ترقی اور آگے بڑھنے کے جتنے ذرائع تھے ان کی راہ میں جو انتظامی خرابیاں اور رکاوٹیں آسکتی تھیں ان کو سمجھنے میں ہم بری طرح ناکام رہے۔ اور اپنے مستقبل کے واسطے اپنے اندانے اور مقاصد متعین کرنے میں ہم نے سہل انگاری اور تن آسانی سے کام لیا۔ ان وجوہات کی بنا پر ایران کا حکمراں ہونے کی حیثیت سے میں نے فیصلہ کیا کہ پچھلی تمام بنیادی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لئے میں خود پیش قدمی کروں۔

اس سے قطع نظر میں اپنے ذہن میں ان خیالات کی بھی پرورش کر رہا تھا کہ ایرانی حکمرانوں میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت بادشاہ یعنی اپنے والد رضا شاہ پہلوی کے متعلق مزید اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ان کے زمام اختیار سنبھالنے سے دو صدی پہلے حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ گویا ہم گرتے گرتے اس جگہ پہنچ گئے تھے جس کو اہل یورپ عہد جہالت[1] و گمنامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انفرادیت پسندی ہماری قوم کا خاصہ ہے اور اس وجہ سے ہم اپنی ہی غفلت کے باعث اجتماعی اور سیاسی طوائف الملوکی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ جس دلدل میں ہم پھنس چکے تھے اس سے باہر نکالنے کیلئے رضا شاہ پہلوی جیسے قوی حوصلہ اور آہنی ارادے کے مالک انسان کی ضرورت تھی تاکہ وہ ہم کو ذلت اور گمنامی کے گڑھے سے نکال کر قومی تعمیر و ترقی کی راہ پر لگا سکے۔ اور انہوں نے واقعی اپنی قوم کو بیدار کر کے ہی دم لیا اور یہ احساس دلایا کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا ہیں۔ انہوں نے اپنی قوت ارادی اور لگن سے اس ملک کی کایا ہی پلٹ دی اور ترقی کی راہ پر اس کو متمدن اقوام کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا۔ میں اس سے قبل بھی ایک کتابچہ لکھ چکا ہوں۔ جس میں ان کے مختصر حالات بیان کئے گئے تھے اور ملکی خدمات کو سراہا گیا تھا لیکن اتنا ہی کہہ دینا کافی نہ تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ ان کی زندگی، اور کامیابی کے رازوں کو تفصیل سے قلمبند کیا جائے۔

اس کتاب کا آغاز میں نے ۱۹۵۸ء میں کیا تھا اور ۱۹۶۰ء کے آخری دنوں میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس عرصے میں دوسرے کاموں کے لئے وقت دینا بھی میرے لئے ایک طبعی بات تھی۔ لیکن سوائے اُن چند دنوں کے جب کبھی مجھے

1. DARK AGES

کسی سفر پر جانا پڑتا تھا میں ہر ہفتے کئی کئی گھنٹے اس کتاب پر صرف کرتا۔ بلکہ سفر کے دوران بھی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

یہ کتاب ایک طرح عام سوانح عمریوں اور اہم یادداشتوں کے موضوع سے الگ ہے۔ کیونکہ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ ایک ملک کے سربراہ کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کی بجائے خود اس ملک کی تاریخ اور اہم واقعات کا ذکر کیا جائے۔

کتاب کا آغاز ایران کی حیرت انگیز قدیم تاریخی روایات اور عہدِ ماضی کے درخشاں واقعات سے کیا گیا ہے۔ اگلی فصل میں میں نے اپنے والد کی برجستہ شخصیت کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ ترقی و تعمیر میں ان کا کیا نمایاں کردار رہا ہے یہیں پر میں نے اپنے بچپن کے واقعات، یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کا حال اور اس تربیت کا ذکر کیا ہے جو میرے والد نے موجودہ ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے مجھے دی اور اس میں انہوں نے بذاتِ خود دلچسپی لی اس کے بعد میں نے بیان کیا ہے کہ کس طرح دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے ایران میں سیاسی اور اقتصادی بحران آیا۔ اتحادیوں نے ملک پر قبضہ کیا اور اکیس سال کی عمر میں والد کی جگہ حکومت کی ذمہ داریوں کو مجھے اپنے کندھوں پر لینا پڑا۔

اس کتاب میں میں نے ان تاثرات کا بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح مصدق نامی ایک کوتاہ اندیش سیاستدان اپنی ذاتی اغراض کے لئے ملک کو تباہی کی طرف لے جارہا تھا جس کی وجہ سے تیل کی صنعت بالکل بند ہو گئی، ملک اقتصادی بحران میں گھر گیا اور قریب تھا کہ ہماری شمعِ آزادی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے۔ اس کتاب میں میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ ہمارا ملک کس طرح ایک عرصے تک سرد جنگ کا اکھاڑہ بنا رہا اور ہم نے کن حالات سے گذر کر اپنی آزادی کو دوبارہ مستحکم بنایا اور کس طرح میرے ذہن میں مثبت قوم پرستی کی تحریک کو ملک میں پھیلانے کا خیال آیا۔

ایران کی تہذیب و معاشرت پر جو مغربی تاثرات آئے ہیں ان کا بھی مختصر سا حال اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ اور امید ہے کہ ان اثرات کی وجہ سے مغرب اور مشرق میں ایک نئے قسم کا رابطہ قائم ہوگا یہیں پر ملک کی اقتصادی ترقی اور مستقبل کے امید افزا حالات کا بھی ذکر ہے۔ اور جمہوریت کے بارے میں اپنے سہ گونہ نظریات کا بھی میں نے اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ ملک میں جمہوریت کے اصولوں کو زندہ رکھنے کے لئے ہم نے کیا اقدامات کئے ہیں۔ اسی کتاب میں اصلاحاتِ ارضی کا حال بھی درج ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ پچاس ہزار گاؤں میں بسنے والے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اب تک کیا مفید کام کئے جا چکے ہیں۔ ملک میں خواتین جو فرائض و خدمات انجام دے رہی ہیں اس کا بھی مختصر حال درج ہے۔ تعلیم و تربیت سے متعلقہ میرے خیالات و نظریات بھی یہاں بیان کئے گئے ہیں۔ ایرانی تیل کے سیاسی، اقتصادی اور تکنیکی پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں ایران کی فوجی حیثیت کیا ہے اور دنیا کے اس حصّہ میں اور دوسرے مناطق میں امن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی میں نے اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ سب سے آخر میں مَیں نے اپنی روزانہ کی مصروفیات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح عملی طور پر اس قدیم شہنشاہیت کے تحفظ کے لئے کام کر رہا ہوں۔

پوری کتاب میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ وہ مشکلات اور رکاوٹیں جو میری راہ میں آئی ہیں انکو وضاحت سے لکھنے کے بجائے مختصر طور پر بیان کرتا ہوا گذر جاؤں۔ مثال کے طور پر شخصی ایمانداری اور دیانت داری کا مسئلہ خواہ سرکاری دفاتر میں ہو خواہ صنعت و تجارت میں یا زندگی کے دوسرے شعبوں میں ابھی تک ہمارے لئے دشواری کا باعث بنا ہوا ہے اگرچہ گذشتہ چند سالوں میں ہمارے اداری نظام میں کچھ حد تک اصلاح ہوئی ہے لیکن ابھی تک بعض معاملات میں نظام کہنہ و فرسودہ ہے۔

افلاس، جہالت، بیماری ابھی تک پورے طور پر ہمارے ملک سے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ

بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ترقی یافتہ ممالک نے جو چیزیں صدیوں اور کئی نسلوں کے گذرنے کے بعد حاصل کی ہیں ہم ان تک چند سالوں میں پہنچ گئے ہیں۔

ایران کی طویل تاریخ میں کئی بار ایسے اتفاقات آئے ہیں کہ بڑی بڑی طاقتیں اس کو تاخت وتاراج کرنے کے لئے اٹھیں لیکن کچھ عرصے بعد وہ یہاں کے لوگوں میں گھل مِل کر رہ گئیں۔ باوجود اس کے ہم پر کئی بار نہایت ہی تباہ کن حملے کئے گئے لیکن ہم نے اپنے مشخصّات کو برقرار رکھا اور آج بھی سائنس کے دور میں بدلتے ہوئے حالات اور وقت کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے بھی ہم نے اپنی عادات واطوار اور قدیم تہذیبی روایات کو نہیں چھوڑا ہے۔ جیسے ہی ہم ترقی کرتے چلے جائیں گے اندھی تقلید کا خیال بھی ختم ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسروں سے جو کچھ بھی ہم لیتے ہیں اس کو اپنی ضروریات کے مطابق اپنے تمدّن، بزرگوں کی میراث اور اس خطّے کی آب وہوا کے رنگ میں ہی رنگ لیتے ہیں۔

آج مشرقِ وسطیٰ پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کے متعلق متضاد نظریات اور خیالات ہیں۔ ایک طرف تو اس خطّے نے دنیا کو تہذیب وتمدّن سے مالا مال کیا ہے تو دوسری طرف یہ قوموں کے لئے کشیدگی اور تناؤ کا سبب بھی بنا رہا ہے۔ میری رائے میں اب مشرقِ وسطیٰ میں تجدیدِ حیات کے لئے حالات پورے طور پر مساعد ہیں اور مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایران نے ماضی میں تو باوجود تمام انقلابات کے اپنی بقا کا تحفظ کیا ہو اور اب اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

سوویت روس
سوویت روس
جلفا
تبریز
رضائیہ
بندرگاہ پہلوی
رشت
قزوین
کرج
تہران
مشہد
ہمدان
کرمانشاہ
قم
دشت کویر
خراسان
عراق
افغانستان
کاشان
گلپائیگان
اصفہان
یزد
شوش
اہواز
آغاجاری
آبادان
خرمشہر
دشت لوت
تخت جمشید
شیراز
کرمان
زاہدان
بلوچستان
جزیرہ خارگ
فارس
بوشہر
ایرانشہر
بندرگاہ عباس
سعودی عرب
ایران

۱۔ سرزمینِ ایران عہدِ قدیم و جدید میں

اوائلِ جوانی اور دورانِ ولیعہدی میں جبکہ میں سوئٹزرلینڈ میں پڑھا کرتا تھا اس وقت کا ایک واقعہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ ہمارا دودھ بیچنے والا جو ہر روز صبح سویرے ہمارے مدرسہ میں دودھ کے برتنوں سے بھری گاڑی لے کر آتا تھا۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا میں کس ملک سے آیا ہوں۔ میں نے جواب دیا پرشیا (ایران) سے تب اس نے کہا ہاں پرشیا کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ امریکہ میں ہے۔

اس بات کو کئی سال گذر گئے۔ حال ہی میں دربارِ شہنشاہی کے ایک نوعمر ملازم نے امریکہ کا سفر کیا۔ واپسی پر اُس نے ایک بڑا ہی عجیب واقعہ بیان کیا جو اس کے ساتھ وہاں پیش آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ امریکہ جانے سے پہلے میری یہ آرزو تھی کہ کسی اصلی ریڈ انڈین کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور جب میں اریزونا پہنچا تو میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے امریکی میزبان سے کیا۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا بر آنا تو بہت سہل بات ہے کیونکہ ہم کسی بھی نزدیکی ریڈ انڈین بستی میں آسانی سے جا سکتے ہیں۔ وہاں کسی نہ کسی ریڈ انڈین سے ملاقات ہو ہی جائے گی جس وقت ہم ریڈ انڈینوں کے علاقے میں پہنچے تو یہ دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ ریڈ انڈین نسل کے لوگ جو وہاں پر تھے۔ ان کے سروں پر وہ پروں والے سربند نہ تھے جن کی نمائش امریکہ اپنی فلموں کے ذریعہ ساری دنیا میں کرتا ہے۔ بالآخر میرے میزبان نے میرا تعارف ایک ایسے ریڈ انڈین سے کرایا جو اپنے قبیلہ کا مخصوص لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر پروں دار سربند بھی تھا اور چہرے کو مختلف رنگوں سے منقش بھی کر رکھا تھا۔ اس شخص نے نہایت شستہ انگریزی میں مجھ سے سوال کیا تم کس ملک کے باشندے ہو—

یہ سُن کر میں نے جواب دیا میں اس دور دراز ملک کا رہنے والا ہوں جس کو پرشیا یا ایران کہتے ہیں۔

ایران کا نام سنتے ہی اس ریڈ انڈین کا چہرہ خوشی سے کِھل اُٹھا اور نہایت فصیح فارسی میں اس نے کہا سلام علیکم، حال شما چطور است (آپ کے مزاج کیسے ہیں)۔

میں اس گفتگو سے سخت حیران ہوا لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ شخص دوسری عالمگیر جنگ کے دوران امریکی فوجی افسر کی حیثیت سے خلیج فارس میں رہ چکا تھا۔ اس کے دستے نے تقریباً پانچ ملین ٹن جنگی اسلحہ اور ذخائر (میگزین) ایران کے راستے سے روس پہنچائے تھے جو اتحادیوں کو سرعت کے ساتھ ہٹلر پر فتح دلانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ اس ریڈ انڈین نے نہ صرف فارسی زبان سیکھی بلکہ اپنے قبیلہ کے بعض افراد کو بھی سکھائی تھی۔ اس کو ہماری قدیم تہذیب و تمدن کے بارے میں بھی کافی معلومات تھیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس ریڈ انڈین کی طرح مغربی ممالک کے لوگ بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں میرے ملک کے بارے میں واقفیت پیدا کرتے، کاش کہ وہ جانتے کہ ایران نے بنی نوع انسان کی تہذیبی ترقی کے لئے کیا خدمات انجام دی ہیں اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنے علم و ہنر اور تہذیب و تمدّن کے ذریعے ساری دنیا کی خدمت کر سکتا ہے جب کبھی میں سوچتا ہوں کہ مغرب میں ایران کو بہت زیادہ شہرت حاصل نہیں ہے تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کیونکہ مغربی دنیا کو ایران نے علم و ہنر ادب و فلسفہ کی دولت سے بالکل اسی طرح مالا مال کیا ہے جس طرح آج امریکہ نکتہ چہار کے تحت ساری دنیا کو مالی اور تکنیکی مدد دے رہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ پچھلے چند سالوں میں جب سے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک نے دنیا کے سیاسی میدان میں آگے بڑھنا شروع کیا ہے۔ اُس وقت سے دنیا کے گوشے گوشے میں ہماری قدیم سرزمین یعنی ایران سے لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

دنیا یا مشرقِ وسطیٰ کے جغرافیائی نقشوں پر ایران یا پرشیا کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ملک ریاست الاسکا سے بڑا ہے اور اس کا رقبہ ریاست ٹکساس سے دوگنا ہے مجموعی طور پر اس کا رقبہ فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، اسپین، پرتگال، بلجیم، لکسمبرگ اور ہالینڈ سے کہیں زیادہ ہے، ہماری جغرافیائی کیفیت ہزاروں سال سے ایسی ہی چلی آ رہی ہے گویا ہم دنیا کے چوراہے پر ہوں یا اس جگہ جہاں ساری دنیا کی راہیں ملتی ہیں، جس وقت لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے اس وقت بھی اور آج ہوائی جہاز اور جیٹ کے دور میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔

ایران کی آبادی فی مربع میل کے حساب سے کم ہے لیکن ملک کی آبادی جو دو کروڑ چالیس لاکھ ہے براعظم آسٹریلیا کی آبادی سے دوگنی ہے میرا پایۂ تخت ان شہروں میں سے ایک ہے جو بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں چنانچہ دوسری جنگِ عظیم سے اب تک اس کی آبادی تین گنا سے زیادہ ہو چکی ہے۔ دوسری جنگ کے دوران اس کی آبادی پچاس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ تہران کی آبادی بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے جیسا کہ دنیا کے اور بہت سے شہروں میں بھی ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے وطن ترک کر کے اس شہر میں سکونت اختیار کر لی ہے، بہر حال سبب کچھ بھی ہو، مجموعی اعتبار سے ہمارے پایۂ تخت کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

ملک کا بڑا حصّہ خشک اور بے آب ہے لیکن دوسرے حصّے سالانہ بارش کی کثرت کی وجہ سے گھنے جنگلات اور دھان کے کھیتوں سے ڈھکے رہتے ہیں جو علاقے نسبتاً خشک ہیں ان کو پانی زیادہ تر اُن پہاڑوں کی برف پگھلنے سے حاصل

ہوتا ہے جو ایک دائرے کی شکل میں ایران کے مرکزی پلیٹو کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور یہ کوہستانی سلسلہ ایک دوسرے کو کئی جگہ سے کاٹتا بھی ہے، سوائے صحرائی علاقے کے پورے ایران میں کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جو پہاڑوں سے بہت زیادہ فاصلے پر ہو، وہ پانی جو پہاڑوں سے آتا ہے اس کو نہروں کے ذریعے کھیتوں میں پہنچا دیا جاتا ہے اور حال ہی میں ہم نے گہرے کنوئیں کھودنے کے بھی انتظامات کئے ہیں۔ نیز ماہرین کا خیال ہے کہ موجودہ آبادی سے دو تین گنا زیادہ آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایران میں کافی مقدار میں پانی موجود ہے، ایران کی آب و ہوا میں تفاوت بہت زیادہ ہے مختلف جگہوں پر پورے سال کے دوران موسم میں فرق ہوتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں آب و ہوا کے اس فرق نے لوگوں کو محنتی اور طاقتور بنانے میں بڑی مدد کی ہے۔ ہمارے ملک کے لوگوں کی جسمانی طاقت غیر معمولی ہے اور شاید کسی کو اس بات سے اختلاف نہ ہوگا کہ ایران کے لوگ مختلف ورزشوں جیسے وزن برداری (ویٹ لفٹنگ) اور کشتی میں نہایت طاقتور ثابت ہوئے ہیں اور عالمی مقابلوں میں ہمارے پہلوان اِن کھیلوں میں ملکی آبادی کے تناسب سے زیادہ انعامات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ذہانت و فراست کے اعتبار سے بھی ایران کے لوگ کسی طرح کم نہیں۔ میرے خیال میں سارے ملک میں عوام کے اندر اجباری تعلیم کی توسیع سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی اہلِ ایران، علم و ہنر، کاشتکاری، صنعت و تجارت کے میدان میں نہایت موثر اور قابلِ قدر کام انجام دیں گے۔

معدنیات کے لحاظ سے بھی ایران کے ذخائر نہایت ذی قیمت ہیں، لیکن تیل کی وجہ سے ہماری صنعت دنیا کی بڑی بڑی صنعتوں میں شمار کی جاتی ہے اور اسی لحاظ سے ہم نے شہرت بھی پائی ہے مشرقِ وسطیٰ میں تیل کی صنعت ایران سے شروع ہوئی اور تازہ ترین اطلاعات اور تکنیکی تحقیقات کے مطابق ہمارا ملک اس بڑی کشتی کی طرح ہے جو تیل کے سمندر پر ٹھہری ہوئی ہے نسبتاً کم لوگوں کو علم ہے کہ ہمارے پاس پتھر کا کوئلہ، لوہا، تانبہ، کرومائیٹ، مینگنیز، جواہرات اور کیمیاوی نمک جیسے بوریٹ، سلفیٹ، جیسی اشیاء بھی ہیں جو اتنی کثیر مقدار میں ہیں کہ ان کو برآمد بھی کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا استخراج ابھی تک ابتدائی مراحل میں ہے۔

ایران کی مٹی تقریباً سب ہی جگہ سوائے صحرائے نمک زار کے جو آسٹریلیا کی طرح ایران کے مرکزی پلیٹو کے ایک بہت بڑے حصے کو گھیرے ہوئے ہے زرخیز ہے جہاں کہیں پانی قابلِ زراعت زمین میں پہنچتا ہے وہاں مختلف قسم کی فصلیں مثلاً گیہوں، جوار، مکئی، چاول، روئی، آلو، ماش، چقندر، گنا، تمباکو، چائے اور سبزیاں جیسے گوبھی، شلجم، پیاز، بیگن، کھیرا، وغیرہ کی کاشت کی جاتی ہے۔

جو لوگ ایران آئے ہیں انہوں نے یہاں کے رسیلے اور خوشبودار میوؤں اور خاص طور پر سیب، آڑو، خوبانی، انگور، چیری، آلو بخارا، ناشپاتی، انار، کھجور، زیتون اور ترشیات میں لیمو، نارنگی وغیرہ سے حظ اٹھایا ہوگا، انواع و اقسام کا خربوزہ، پستہ، فندق اور بادام ہمارے ملک میں کثرت سے ملتے ہیں۔ مویشیوں کی دیکھ بھال پر ایران میں خاص توجہ دی

جاتی ہے، اہلِ دیہات اور قبائل کے افراد جو اپنے قبیلہ کا مخصوص لباس پہنتے ہیں ملک کے کوہ و دشت میں جانوروں کے گلے اور چوپائے پالتے ہیں پچھلے چند سالوں میں زراعت کے لئے مکینکی طریقوں کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔ دیہاتیوں اور کاشتکاروں کے درمیان تقسیم اراضی کا جو پروگرام مرتب کیا گیا ہے اور جس پر عمل درآمد بھی کیا جانے لگا ہے اس کا تفصیل سے ذکر آئندہ فصلوں میں آئے گا۔

خوراک کے سامان کی ہم نسبتاً کم درآمد کرتے ہیں لیکن برآمد کثیر مقدار میں ہوتی ہے اور خاص طور پر میوے، پستے اور بادام بہت زیادہ باہر بھیجے جاتے ہیں خاویار کی بہت بڑی مقدار جو دنیا کے بازاروں میں روسی خاویار کے نام سے بیچی جاتی ہے۔ ایران سے ہی روس، امریکہ اور دیگر تمام ممالک کو برآمد کی جاتی ہے۔ (کسی مسخرے نے کیا خوب کہا ہے کہ محض اختلافِ نظر کی بنا پر خاویار ماہی بحرِ خزر کے شمالی علاقے سے جنوبی سواحل کی طرف کوچ کر گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انقلاب روس سے سالوں پہلے اس مچھلی نے بحرِ خزر کے جنوبی کنارے جن کا پانی گرم ہے یعنی ایران کے ساحلوں کو اپنے رہنے، انڈے دینے اور پلنے بڑھنے کے لئے انتخاب کر لیا تھا) ہمارے ماہی گیری کے ذرائع بھی بہت وسیع ہیں۔ اور ان پر ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہماری مصنوعات جن کی پیداوار ہم اپنے ہموطنوں اور ساری دنیا کے لئے کرتے ہیں کس قدر مفید اور ذی قیمت ہیں لیکن یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسانی اور قدرتی ذرائع کا استعمال ہم نے حال ہی میں شروع کیا ہے۔ انگلستان کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں ایران ہی وہ تنہا ملک ہے جس کی توسیع و ترقی کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔

ایران ہزاروں سال سے مغرب اور مشرق کا مقامِ اتصال رہا ہے (اگرچہ بہت سے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا ملک جغرافیائی اعتبار سے براعظم ایشیا کا ہی ایک حصہ ہے)۔ جن قافلوں کی تجارت کی غرض سے چین اور یورپ کے درمیان ریشم کی راہ[1] پر آمد و رفت رہتی تھی وہ ایران سے ہی ہو کر گزرتے تھے۔ اور انہوں نے اس ملک کو بطورِ مستقل اپنی تجارت کا مرکز بنا لیا تھا۔ یہ قافلے جو مشرقی ممالک سے ریشم جواہرات اور دوسرا سامان خرید کر لاتے تھے وہ یا تو اس دولتمند ملک میں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ یا یہاں سے دوسرے ممالک خاص طور پر یورپ بھیج دیا کرتے تھے۔ سامان کی خرید و فروخت سے زیادہ افکار و خیالات کا تبادلہ ہوتا تھا چنانچہ ہمارے ملک کے بادشاہوں کی سرپرستی میں ہمارا ملک مشرقی علوم و تہذیب کا مرکز بن گیا تھا۔

نئی دنیا کی دریافت سے صدیوں پہلے جب کہ یورپ کے بیشتر لوگ اپنی خوراک زمین پر بیٹھ کر ہاتھوں سے کھایا کرتے تھے اُس وقت ایرانی کھانے کے لئے خوبصورت نقشیں روغنی ظروف اور چھری چمچے کا استعمال کیا کرتے تھے چینی تہذیب سے قطع نظر ہمارے ملک کے لوگوں کا تمدن آج دنیا میں قدیم ترین زندہ تمدن شمار کیا جاتا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ ہمارا

1. SILK ROUTE

تمدن بعض چیزوں میں چینی تمدن سے اعلیٰ وافضل ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

ہمارا تمدن کتنا بھی قدیم رہا ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری تہذیب چینی اور ہمسایہ عرب تہذیب کی بہ نسبت مغربی تہذیب سے زیادہ نزدیک ہے۔ ایران آریائی نسل کے اُن لوگوں کی قدیم ترین سرزمینوں میں سے ایک ہے جن کی نسل سے امریکہ کے بہت بڑے حصے کی آبادی اور یورپی قوموں کی تشکیل ہوئی ہے۔ نسلی اعتبار سے ہم عربوں سے جو سامی النسل ہیں بالکل جدا ہیں اور یہی بات فارسی زبان پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ ہماری زبان انڈو یورپی زبانوں میں سے ہے جو انگریزی فرانسیسی، جرمنی اور دیگر زبانوں کا سرچشمہ ہے۔

اگرچہ ایرانیوں نے ہر دور میں دوسری اقوام کے افراد کے ساتھ ازدواجی روابط بھی قائم کئے ہیں اور عربوں کی ایران پر فتح کے بعد عربی الفاظ کثیر تعداد میں ہماری زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ لیکن ہماری زبان اپنی نسلی خصوصیات اور مشخصات کے ساتھ اب تک قائم ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مجھے جب یہ علم ہوا کہ گل لالہ اور بادبانی چکیاں ایران سے ہی ہالینڈ لے جائی گئی ہیں تو میں متعجب میں رہ گیا، یہ بات مجھے نیدرلینڈ کے کلچرل آتاشی سے معلوم ہوئی تھی جو بڑا دانشمند شخص تھا۔ میرے خیال میں اگر ہالینڈ کا باشندہ اس امر کو تسلیم کر لیتا ہے تو تردید کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ دانشمند موصوف نے بڑے دقیق مطالعے اور تحقیقات کے بعد اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ ہالینڈ کا اصلی لالہ ایک قسم کا خودرو لالہ ہے جو ہمارے ملک میں اُگتا ہے اور بادبانی چکی بھی ان چکیوں سے ہی بنائی گئی ہے جو جنوبی ایران میں کبھی چلا کرتی تھیں۔ ہالینڈ کے تاجروں کا پہلا دستہ جب ایران آیا تو اس نے یہ نمونہ اپنے لئے حاصل کر لیا تھا۔ نرد کا کھیل ایرانیوں نے ایجاد کیا ہے اور اس طرح یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ چوگان بازی بھی سب سے پہلے ایران میں شروع ہوئی تھی۔ نیز ہمارے بادشاہوں کو اس سے خاص دلچسپی رہی ہے اسی طرح یہ بات بھی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ پستہ بھی ایران ہی کی پیداوار ہے، چارے کی کاشت بھی سب سے پہلے ایران ہی میں یہاں کے اصیل گھوڑوں کی پرورش کے لئے کی گئی تھی۔ آڑو بھی ان میووں میں سے ہے جس کو ایرانیوں نے بہت قدیم زمانے میں چین کے قدرتی جنگلوں سے حاصل کیا تھا اور اس کی نشوونما پر پوری توجہ دی تھی اور پھر بتدریج یہ میوہ بحرِ روم کے ساحل کے ساتھ یورپ پہنچ گیا۔ سرخ گلاب ہزاروں سال سے نہ صرف ایرانی باغوں کو زینت بخش رہا ہے بلکہ سب سے پہلی بار ہمارے ملک میں ہی لگایا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گلِ یاس، نرگس، یاسمین کو نہ صرف ایران سے باہر دوسری جگہوں پر لے جایا گیا بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے ایرانی نام اب تک محفوظ ہیں۔ شربت جو ایران میں بصورت مایع اور امریکہ اور دوسری جگہوں پر قلفی کی شکل میں جا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ صدیوں سے ایرانیوں کا خوشگوار مشروب رہا ہے۔ شیری نام کی شراب لفظ شیراز سے مشتق ہے۔ عربوں نے اس کو قرونِ وسطیٰ میں اسپین میں رائج کیا اور اس کے بنانے کا طریقہ سکھایا۔

علمی اور فنی امور میں بھی ایرانیوں کی تخلیقی قوت نمایاں رہی ہے۔ دھوپ گھڑی کی ایجاد ایرانیوں نے کی اور

پہلا رصدخانہ اسی ملک میں قائم کیا گیا۔ گھڑی کا ڈائل جس کو آج عالمگیر شہرت حاصل ہے ایران ہی میں اس کی اختراع ہوئی۔ اگرچہ بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابنِ سینا جس کا شمار ایران کے مشہور و معروف حکماء اور اطباء میں ہوتا ہے اور اب سے ہزار سال پہلے اس ملک میں گذرا ہے پنسلین کے خواص سے پوری طرح واقف تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے مشہور و معروف رسائل قرونِ وسطیٰ میں اور بعد میں بھی یورپ اور دوسری جگہوں پر طب کی معتبر ترین کتابوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس نے پھپھوندی کو جو روٹی کے اوپر آجاتی ہے مہلک زخموں کے علاج کے واسطے تجویز کیا ہے اور اطبا کو ہدایت کی ہے کہ وہ پھپھوندی اس روٹی پر سے حاصل کریں جس میں نمی باقی ہو۔ اور اس کو بڑی ہوشیاری سے زخم پر لگائیں۔ کئی صدیاں گذر جانے کے بعد ایک انگریز عالم سر الیگزانڈر فلیمنگ[1] نے اس پھپھوندی کا نام پنی سیلیوم[2] رکھا۔ اور اس کی طبی خصوصیات کو دوبارہ موردِ مطالعہ و آزمائش قرار دے کر ایک دوائی تیار کی جو اب دنیا بھر کے بازاروں میں پنسلین کے نام سے کثیر تعداد میں ملتی ہے اور جس نے ہزارہا لوگوں کو موت کے منہ سے چھڑایا ہے۔

مغربی دنیا کے رہنے والے بہت کم یہ بات جانتے ہیں کہ ایران کی زیادہ تر شہرت اس امر پر مبنی ہے کہ اس نے امورِ سلطنت اور ملک کے انتظامی اصولوں میں دنیا کی رہنمائی کی ہے اور اسی نے سارے ملک کو صوبوں میں تقسیم کرنے کا دستور بنایا تاکہ ہر صوبے کے انتظامی امور ایک صوبیدار کے ہاتھ میں رہیں یہ بات بھی واضح ہے کہ کسی وسیع ملک کا نظم و نسق ایسے انتظامی ڈھانچے کے بغیر ممکن نہ تھا۔

سارے ملک کے طول و عرض میں ڈاک کے لئے سڑکیں بنانے کے منصوبے کو سب سے پہلی بار ایران ہی میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ رومی سلطنت کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ہمارے ملک میں ڈاک کے ایسے منظّم طریقے موجود تھے جن کے ذریعے ملک کے دو حصّوں کے درمیان رابطہ قائم رکھا جاسکتا تھا اور ہر جگہ مقررہ فاصلوں پر ڈاک چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ حکومت کے قاصد جو ہر چوکی پر تازہ دم گھوڑوں کو بدل لیا کرتے تھے۔ ایران کی وسیع و عریض سلطنت کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پندرہ روز میں خطوط پہنچا دیا کرتے تھے۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر برج بنا کر اور ان میں آگ روشن کر کے کوسوں کی مسافت پر جلد از جلد خبر پہنچانے کے انتظامات کے علاوہ پیغام رسانی کے دوسرے طریقے بھی تھے۔

جن ممالک نے ٹھپے سے سکّہ بنانے کا طریقہ رائج کیا ان میں ایران کا نام سب سے پہلے آتا ہے دریک نامی سونے کا سکّہ جس کو داریوش اعظم نے گھڑوایا تھا پرانے زمانہ میں عام طور پر روپیہ کی اکائی (یونٹ) کی حیثیت سے رائج تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہ پرانے زمانہ کا سکّہ وزن کے اعتبار سے انگلستان کے سونے کے سکّے یعنی پونڈ کے برابر تھا۔ اور داریوش کا چاندی کا سکّہ بھی انگلستان کے شلنگ کے ہم وزن تھا نہ صرف ایران کی وسیع و عریض سرزمین پر بلکہ باہر بھی تجارت میں سہولت کی غرض سے ناپ تول میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے بھی ہم پیشرو رہے ہیں۔ اور اس طرح ہم نے حساب داری کا ایک منظّم اور متحد الشکل طریقہ جاری کیا جس کو بعد میں سب ہی ملکوں نے آہستہ آہستہ اپنا لیا۔

1. SIR ALEXANDER FLEMING 2. PENICILLIUM

سب سے پہلا ملک جس نے کسی وسیع سلطنت کے نظم و نسق کے امور کو مضبوط کیا وہ ایران ہی تھا۔ اس کتاب کے پڑھنے والوں میں بہت سے ایسے ہوں گے جنہوں نے سلطنتِ روم کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن سلطنتِ روم کے آغاز سے سینکڑوں سال پہلے ایران جیسے وسیع و عریض ملک کی شہنشاہیت اپنی عظمت کے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لگان وصول کرنے کے طریقے، عوام کی بہبود کے اقدامات، فوجی تنظیمات اور دوسرے وہ تمام ادارے جو آج بھی بڑے بڑے ملکوں کے انتظامی امور کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اُس وقت نہایت عمدگی اور خوبی سے استعمال کئے جاتے تھے۔

میرا ملک ایک بہت بڑے مذہب یعنی دین زرتشت کا گہوارہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب وادیان کی ترویج و تبلیغ کا بھی مرکز رہا ہے۔ ان ادیان میں فرقہ شیعہ بھی شامل ہے جس کا شمار اسلام کے بڑے فرقوں میں ہوتا ہے اور میں خود بھی اس فرقہ کے راسخ العقیدہ پیروان میں سے ہوں اور اس موضوع پر دوبارہ گفتگو اس کتاب میں آئے گی۔ زرتشت مذہب کی بنیاد چھٹی صدی قبل مسیح میں زرتشت کے ہاتھوں ہی رکھی گئی بقول ولیم جیکسن[1] (جس کا شمار ادیان کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں مستند اساتذہ میں ہوتا ہے) یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کے علاوہ ناممکن ہے کہ دنیائے قدیم میں بجز دینِ زرتشت کے کوئی اور مذہب ہو جو اس قدر سچّا اور اتنا عمدہ و اعلیٰ ہو اور جس نے اس حد تک جسم کی فنا، روح کی بقا، ہادی بشر کا آنا، نیکیوں کی جزا، برائیوں کی سزا، روح کی بقا جیسے مسائل جن کا ذکر کتابِ مقدّس اوستا میں آیا ہے شاید ہی کسی اور کتاب میں فکرِ انسانی کے لئے اس قدر تسلی بخش ہوں۔ دیگر عقائد جن کا ایران میں رواج ہوا وہ مانی کا مذہب ہے اس نے اپنے مذہب کی اشاعت تیسری صدی عیسوی میں شروع کی۔ وہ چاہتا تھا کہ تمام مذاہب جو اس سے پہلے موجود تھے ان کے اصولوں کو یکجا کر کے ایک نیا دین جاری کرے جس کی اساس دین زرتشت، بدھ مت اور عیسائیت پر قائم ہو اور غالباً یہ پہلا شخص ہے جس نے مختلف مذاہب کے عقائد کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔

ایران کے عرفا نے نہ صرف اشاعتِ دین میں حصّہ لیا بلکہ وہ روحانی ادب میں بھی ممتاز رہے ہیں اور خصوصاً وہ ادب جس کو تصوّف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو اسلام کے بعد کے دور میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ متصوّفہ کے کلام نے مستشرقین کی توجہ کو اپنی طرف جلب کیا ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے جو روحِ صفا و اخوت و محبت اِن عرفا کے کلام میں جلوہ گر ہے اور جس کو انہوں نے دلچسپ حکایات اور مثالوں کی شکل میں نہایت شستہ اور زیبا ادبی زبان میں بیان کیا ہے اس کی ان مستشرقین نے بڑی تعریف کی ہے۔ دراصل ہم شعر و ادب میں اور خصوصاً فردوسی، حافظ، سعدی، مولوی، خیّام جیسے بزرگ شعرا، اور دیگر اساتذہ کے کلام کی بنا پر ہی دنیا میں شہرت حاصل کئے ہوئے ہیں کیمبرج یونیورسٹی کے دانشمندوں میں سے ایک کا قول ہے کہ حجم کے اعتبار سے جو فارسی میں ادبی سرمایہ موجود ہے وہ اور کسی زبان میں نہیں ہے اور مغربی ممالک کے تمام طلبا، جنہوں نے فارسی ادب کا مطالعہ فارسی زبان میں کیا ہے وہ اس دانشمند کے نظریئے کی تصدیق کرتے ہیں۔

شاید بیجا نہ ہوگا کہ میں اپنے ملک کی طویل تاریخ کو مختصراً یہاں بیان کروں۔ پتھر کے زمانے میں لوگ بحرِ خزر کے

1. A. V. W. JACKSON

جنوبی کنارے پر اُس حصے میں آباد تھے جس کو موجودہ دور میں ایران کہا جاتا ہے، تہران جو میرا پایۂ تخت ہے اس کے نزدیک ہی ایک گاؤں کے کھنڈرات ملے ہیں۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کے خیال میں یہ کھنڈرات ...۲۰ سال قبل مسیح کے ہیں۔ کاشان کے نواح میں جو مرکزی ایران کا ایک شہر ہے سیلک[1] نامی دیہات کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں جس کو ماہرین آثارِ قدیمہ عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ ہزار سال قبل کا بتاتے ہیں ان کھنڈرات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانہ میں ایران کے لوگ بدوی اور خانہ بدوشی کی زندگی اور شکار حاصل کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومنے پھرنے کو ترک کرکے دیہاتوں میں بس چکے تھے اور کھیتی باڑی اور مویشیوں کے پالنے کے کام کو اپنا لیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں امریکی اور ایرانی ماہرین آثارِ قدیمہ نے آذربائیجان میں جو ایران کا شمال مغربی صوبہ ہے حسنلو[2] گاؤں کے قریب ایک بہت خوبصورت سونے کا نقشیں پیالہ دریافت کیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آثارِ قدیمہ کے نقطۂ نظر سے جتنی بھی اب تک دریافت ہوئی ہیں ان میں یہ سب سے بڑی دریافت ہے یہ پیالہ اور قدیم زمانہ کا قلعہ جس میں یہ پیالہ دریافت ہوا ہے ایک ایسی قوم پر سے رازوں کے پردے اٹھاتا ہے جس کے متعلق ابھی تک کسی کو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ یہ قوم نویں صدی قبل مسیح میں قرب وجوار کی قوموں کے حملے کی وجہ سے شکست کھا کر ختم ہو گئی۔ میری نظر میں یہ واقعہ ہم پر واضح کر دیتا ہے کہ ہمارا علم ایرانی تمدن کے ابتدائی دور کے متعلق بہت ناقص ہے۔

غالباً حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار پانچ سو سال قبل ایک نئی قوم جس کو آریا قوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ہمارے آباؤ اجداد (جو سطح مرتفع ایران میں آباد تھے) کے ساتھ گھل مل گئی۔ اگرچہ یہ بات ابھی تک بطور کلی ثابت نہیں ہوئی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ مرکزی روس کے جنوبی علاقے سے ہجرت کر کے ایران آئے ہوں۔ بہرحال اسی قوم نے اپنے نام پر میرے ملک کا نام رکھا اور سرزمین ایران کا نام آریا آباد پڑ گیا۔ جو آریا ایران آئے وہ دو بڑے گروہ یعنی ماد اور پارس میں تقسیم ہو گئے۔ جن کا ذکر انجیل میں بھی آیا ہے۔

اہلِ ماد کے افراد کی ایک بڑی تعداد نے موجودہ ایران کے شمال مغربی حصے میں سکونت اختیار کر لی۔ اہلِ پارس نے جنوبی علاقوں سے ذرا نیچے اتر کر اپنا مستقر بنا لیا۔ اگرچہ دونوں ہی گروہ آریا نژاد تھے۔ لیکن ابتدا میں اہلِ ماد اپنے تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اہلِ پارس کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ نہ صرف مویشی، بھیڑ بکریوں کے گلے، سٹیلے، فوجی گاڑیاں اور پاسبانی کے لئے کتے رکھتے تھے بلکہ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے ساتویں صدی قبل مسیح میں یعنی شہر روم کے آباد ہونے سے ڈیڑھ سو سال پہلے اہلِ ماد نے ایک نہایت وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا دارالخلافہ ہکمتانہ شمال مغربی ایران میں موجودہ شہر ہمدان کے قریب تھا۔

اہلِ پارس ہرچند اہلِ ماد کے مطیع و باجگزار شمار کئے جاتے تھے۔ لیکن ان کی اپنی حکومت تھی اور ان کا ہی بادشاہ حکمرانی کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام سیروس اول یا کوروش تھا جس نے ہخامنشی خاندان کی بنیاد اپنے قبیلہ کے نام پر رکھی

1.SIYALK 2.HASANLU

کوروش اعظم نے ۵۵۹ سے ۵۲۹ (قبل مسیح) تک حکومت کی۔ اس کا شمار دنیا کی تاریخ میں نہایت مدبر اور آزمودہ بادشاہوں میں کیا جاتا ہے اس نے اہلِ ماد کے دارالسلطنت کو فتح کر کے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور موجودہ ایران کے تمام نواحی علاقوں کو فتح کر کے ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھی۔ جو دنیا کی حکومتوں میں ایک (اور بعض کے نزدیک دنیا کی سب سے پہلی) آزاد خود مختار حکومت شمار کی جاتی تھی۔ ایران پر پورے طور پر تسلط پانے کے بعد اس نے ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا عزم کیا چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس کے اور اس کے لڑکے کمبوجیہ کے عہد میں ایرانی سلطنت کا شمار دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہیت میں ہونے لگا اور اس سے پہلے دنیا والوں نے اتنی وسیع سلطنت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ علم الانسان کا امریکی ماہر ڈاکٹر کن[1] اپنی کتاب کاروان میں لکھتا ہے ہخامنشی سلطنت حقیقی معنوں میں دنیا کی قدیم ترین سلطنت تھی کیونکہ اس سلطنت کی تشکیل مختلف ممالک کی حکومتوں کے تعاون سے کی گئی تھی اور ان تمام حکومتوں کی زمامِ اقتدار شخصِ واحد کے اختیار میں تھی اگرچہ کانسے کے عہد میں مصر، سومر، بابل اور چین میں بھی سلطنتیں قائم تھیں لیکن اُن فنی تشکیلات سے محروم تھیں جن کو ایرانیوں نے امورِ مواصلات اور باہمی ارتباط میں تیز رفتاری پیدا کرنے کے پیشِ نظر ایجاد کیا تھا کیونکہ کسی وسیع ملک کے انتظامی امور کے لئے ایسے منظم ادارے کا وجود لازمی تھا اور اس قسم کا تنظیمی ادارہ چین میں ہخامنشی حکومت کے آغاز کے تین سو سال بعد معرضِ وجود میں آیا۔

ایرانی شہنشاہیت کی بنیاد کوروش اعظم کے ہاتھوں رکھی گئی تھی لیکن اس کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری نہ تھا بلکہ یہ بین الاقوامی مساوات و برادری کی اساس پر قائم تھی مفتوحہ اقوام کے حقوق کی حفاظت کی جاتی تھی اور ان کے آداب و رسوم کا پورا احترام کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ہماری سب سے پہلی شہنشاہیت مجلس اقوامِ متحدہ کی طرح تھی جو ۲۵۰۰ سال بعد دوبارہ دنیا کے سامنے عالمِ وجود میں آئی ہے۔

کمبوجیہ کے جانشینوں میں جن بڑے بادشاہوں نے حکومت کی ان میں داریوش اوّل اور خشیارشا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کیونکہ ان بادشاہوں نے اپنی ذہانت۔ فراست اور روشن فکری سے ایران جیسے وسیع و عریض ملک میں نظم و نسق کو اس طرح برقرار رکھا کہ آج کی متمدن دنیا اس بات کی معترف ہے کہ یہ اہلِ ایران کا ہی حصہ تھا۔ ۵۰۰ سال قبل مسیح میں جبکہ ایرانی شہنشاہیت اپنے پورے اوج پر تھی۔ مشرقِ وسطیٰ کا بہت بڑا علاقہ (بجز جزیرہ نمائے عرب کے) اور اطراف و نواح کے کتنے ہی وسیع حصّے ایرانی حدود میں شامل تھے۔ اس کی مشرقی سرحد دریائے سندھ تک اور شمالی سرحد جنوبی روس تک پھیلی ہوئی تھی مغربی جانب سے اس کی حدود بحرِ روم تک پہنچی تھیں اور موجودہ یونان کا بہت بڑا حصّہ پورا ترکی اور قبرص اور مصر قلمرو ایران میں شامل تھے۔

ایرانی شہنشاہیت کی حدود سلطنتِ روما کی طرح (جو ۱۱۵ قبل مسیح میں اپنی اوج پر پہنچ چکی تھی) مختلف ادوار میں بدلتی رہیں۔ لیکن دو صدی تک اس عہد کی متمدن دنیا سلطنتِ ایران میں شامل تھی۔ داریوش اوّل تاریخ کی ایک ممتاز

1. DR. COON

ہستی ہے اس نے ۵۲۱ سے ۴۸۵ (قبل مسیح) تک ایران پر حکومت کی حقیقی شہنشاہی کا مفہوم و مطلب صحیح طور پر اس عبارت سے واضح ہو سکتا ہے جو داریوش اوّل کے سنگِ قبر پر کندہ ہے:

"میں داریوش اعظم ایران کا بادشاہ اور مختلف اقوام کا شاہنشاہ ہوں۔ اور مدتوں سے اس دنیا پر جو بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، سلطنت کر رہا ہوں۔"

۳۳۱ قبل مسیح میں اسکندر یونانی نے ملک ایران کی تسخیر کی لیکن اس کی موت کے آٹھ سال بعد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ یونانی اپنی نو بنیاد حکومت کے شیرازے کو بکھرنے سے نہیں روک سکتے۔ سکندر کے سرداروں میں ایک شخص سلوکس[1] نامی بھی تھا۔ وہ ایرانی شہنشاہیت کے ایک حصے پر جس میں ملک ایران بھی شامل تھا اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ حکومت ایک صدی تک قائم رہی بظاہر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یونانیوں نے اپنی طاقت کے زور پر پورے ایران پر اپنا قبضہ کر لیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ کیونکہ جو حملہ آور اس ملک میں آئے انہوں نے ایرانی آداب و رسوم کو اپنایا، ایرانی عورتوں سے شادیاں کیں اور اپنے ملک کے انتظامی امور میں ایرانیوں سے مدد کے خواہاں ہوئے اور اس طرح ایرانی تہذیب و تمدن نے ان کو اپنے میں ضم کر لیا۔

تقریباً ۲۴۴ قبل مسیح میں اہلِ پارت نے جن کا شمار شمال مشرقی ایران کے نسبتاً کم متمدن آریا نژاد قبائل میں ہوتا تھا سلوکس کے جانشینوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے چار سو سال سے زیادہ حکومت کی۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے ایران کے اعلیٰ تمدن کا پورا اثر قبول کیا۔ اور ایرانی آداب و رسوم کو پوری طرح اپنا لیا وہ ایرانی دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے اور ہخامنشی دور کے رسم و رواج ان کی زندگی کا معمول بن گئے، اہلِ پارت کا عہد ایران میں قوم پرستی کی روح کے احیاء کا دور تھا۔

اس عہد میں ایران اور روم کے درمیان تقریباً تین صدی تک جنگیں ہوتی رہیں۔ رومیوں کی یہ کوشش تھی کہ اپنی سلطنت کو مشرق کی طرف توسیع دیں لیکن اہلِ پارت ان کے اس ارادے کو پسپا کر دیتے تھے۔ مدتوں تک ایرانی گھوڑ سوار جن کو بھاری اسلحہ پہن کر لڑنے کی تربیت دی جاتی تھی اور جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں سرفروشوں اور جانبازوں کے لئے ایک مثال ثابت ہوئے۔ اپنی فنی برتری کی بنیاد پر رومی سپاہ پر غالب رہے۔ بالآخر رومیوں کو مجبوراً اہلِ پارت کی اختراعات کو قبول کرنا پڑا (البتہ یہ پہلی بار نہ تھا کہ رومیوں نے فوجی قوانین میں ایرانیوں کی پیروی کی۔ اس سے پہلے بھی خشایارشا نے جب رومیوں کے ساتھ جنگ کی تھی۔ تو اس نے کشتیوں کا پل بنایا تھا۔ اور اس کے چار سو سال بعد قیصر[2] اور ہانیبال[3] نے اس قسم کے پل استعمال کئے تھے) مجموعی طور پر دریائے فرات جو آج بھی مملکت سوریہ اور عراق میں سے گذرتا ہے، ایران اور سلطنت روما کے درمیان سرحد کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہ ایرانی ہی قوم تھی جو غیر معین مدت تک رومی طاقت کا مقابلہ کرتی رہی اور پے در پے حملوں کے باوجود رومیوں کو ایران

1. SELEUCUS 2. CAESAR 3. HANNIBAL

پر فتح نصیب نہ ہوئی۔

تقریباً ۲۲۲ء میں ایران کے جنوبی صوبوں (مملکتِ فارس) کے بادشاہ اردشیر نے اہلِ پارت کے خلاف جن کا وہ تابع تھا بغاوت کر دی۔ اس نے اہلِ پارت کے ساتھ تین بڑی جنگیں کیں تیسری جنگ میں جو ۲۲۶ عیسوی کے آخر میں لڑی گئی تھی اہلِ پارت کا بادشاہ اردوان مقابلہ کرتے ہوئے اردشیر کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس بادشاہ نے ساسانی خاندان کی بنیاد رکھی جس نے چار سو سال تک یعنی امریکہ کی تاریخ سے (عیسائیوں کے نئی دنیا پر قدم رکھنے سے آج تک یا انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کے عہدِ حکومت سے اب تک) دوگنی مدت تک حکومت کی۔

ساسانی دور نے ہخامنشی عہد کا احیا کر دیا۔ اور ایک بار پھر ایرانی فن اور تہذیب اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ جن ایجادات اور ترقیات کی بنا پر ہمیں شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ چنانچہ زرتشت کے مذہب کو جو ہخامنشی دور کا زندہ مذہب تھا دوبارہ رونق و سرفرازی حاصل ہوئی اور وہ ایران کا سرکاری مذہب بن گیا۔

ساسانی بادشاہ بڑی مضبوط عمارتیں بنایا کرتے تھے چنانچہ آج بھی ایران میں جگہ جگہ ان کے شاندار محل، عبادت گاہیں اور قلعے دیکھے جا سکتے ہیں، نوشیروان عادل (۵۳۱ تا ۵۷۹) ساسانی خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے ملک کے اندر اور باہر، سڑکیں، پل اور پکی سرائیں بنوائیں جن میں رات کے وقت قافلے ٹھہرا کرتے تھے۔ اس نے دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھ کر زمین دوز نہروں میں (جس کو فارسی میں قنات کہتے ہیں) پانی کو محفوظ رکھ کر اور پہاڑوں سے زراعتی زمینوں میں پانی پہنچا کر کاشتکاری کو بہت ترقی دی۔

ساسانیوں نے رومی فوجوں کو کئی بار شکست دی اور شاپور اوّل نے تو شاہ روم والریان[1] کو گرفتار کر کے قید میں بھی ڈلوا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایران اور روم کی سرحدیں اُس جگہ سے تجاوز نہ کر سکیں جو اہلِ پارت کے عہد میں تھیں۔ البتہ نوشیرواں نے شمال کی طرف روس کے اندرونی علاقے فتح کر کے اور مشرق کی جانب موجودہ افغانستان کے بہت سے حصّوں پر قبضہ کر کے اپنی مملکت کو توسیع دی اور اس نے ملکِ عرب پر بھی حملہ کیا اور عرب فوجوں کو شکست دیتا ہوا یمن تک جو جزیرہ نماعرب کے انتہائی سرے پر ہے پہنچ گیا۔

چوتھی صدی عیسوی میں جب رومیوں نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ نے مذہبی صورت اختیار کر لی اور ارمنستان کا علاقہ دونوں حکومتوں کے درمیان تنازع کا سبب بن گیا۔ اس دوران ترک قبائل جو روز بروز اپنی طاقت بڑھا رہے تھے۔ کبھی ایران کے ساتھ ہو جاتے اور کبھی رومیوں سے ساز باز کر لیتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی طاقت زوال پذیر ہونے لگی اور بالآخر بے کار ہو کر رہ گئی۔ اسی کے ساتھ ایرانی نظم و نسق اور زرتشتیوں کے روحانی عقائد میں بھی فتور آ گیا۔ چنانچہ عربوں نے جو دین اسلام قبول کر چکے تھے ایران پر حملہ کر دیا اور اس طرح ۶۴۱ء میں ایرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔

1. VALERIAN

عربوں کو دوسرے حملہ آوروں کی نسبت جلدی احساس ہوگیا کہ ایرانی روح متزلزل ہونے والی ہی نہیں، بلکہ ناقابلِ شکست ہے، باوجود اس کے زرتشتی مذہب ختم ہوگیا اور اس کے ماننے والے بہت تھوڑی تعداد میں رہ گئے۔ لیکن ایرانی تہذیب باقی رہی چنانچہ ابنِ خلدون اور مسعودی جیسے عرب دانشمندوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایرانی تہذیب کو عرب تہذیب پر برتری حاصل ہے لہٰذا یہ بات باعثِ تعجب نہیں ہے کہ ایرانی نژاد ملکی عہدیداروں، دانشمندوں اور صنعت گروں کو امورِ مملکت داری میں اہم مراتب حاصل ہوں۔

دینی عقائد میں بھی ایرانیوں نے خود کو پورے طور پر عربوں کے سامنے تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ قومی جذبہ کے تحت انہوں نے حملہ آوروں کے برعکس جو سنّی المذہب تھے آہستہ آہستہ تشیّع کو قبول کرلیا۔ شیعہ حضرات اہلِ سنّت کے اس عقیدے کو کہ پہلے تین خلیفہ حضرت محمد صلعم کے روحانی جانشین تھے تسلیم نہیں کرتے ان کا یہ اعتقاد رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ان کے جانشین پیغمبرِ اسلام کے داماد حضرت علی ابن ابی طالب ہیں آپ کے فرزند دلبند نے جو شیعوں کے تیسرے امام ہیں ایران کے بادشاہ کی لڑکی سے جس کو عربوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تھی اور جنگ میں مارا گیا تھا شادی کی۔

مجموعی طور پر میرے ملک کی اکثریت شیعہ مذہب ہے لیکن ہماری یہ کوشش ہے کہ اسلام کے فرقوں کے اختلاف کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ بلکہ خود کو اس اسلامی اجتماع کا جز سمجھیں جس کے ماننے والوں کی تعداد ۵۰ کروڑ سے زیادہ ہے اور جو مسیحیت کے بعد دنیا کی سب سے بڑی دینی برادری شمار کی جاتی ہے۔

اگرچہ ۶۵۱ سے ۱۲۵۸ عیسوی تک عربوں کی ایران پر حکومت رہی لیکن وہ محض نام کے حکمراں تھے۔ کیونکہ ایرانی ہمیشہ ان کے خلاف بغاوت کرتے رہے اور ایران کے مختلف حصّوں میں ایسی بہت سی ریاستیں قائم ہوگئیں جن کے فرمانروا بظاہر تو خلفائے عرب کے تابع تھے لیکن وہ روز بروز مزید مراعات و حقوقِ آزادی حاصل کرتے جارہے تھے۔ درحقیقت ایران پر عربوں کی حکومت دو سو سال سے زیادہ تجاوز نہ کرسکی۔ اس عرصے میں ایسے بھی حکمراں خاندان ہوئے ہیں جن میں سے بعض کو ان کی فتوحات کی بنا پر شہرت حاصل ہوئی چنانچہ غزنوی خاندان کی قلمرو میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصّہ شامل تھا۔ اسی چھ سو سال کی مدت میں بعض بادشاہ ایسے بھی ہوئے جنہوں نے اپنے عہدِ سلطنت میں فارسی ادب کی حمایت اور سرپرستی کی اور انہی کی تشویش و ترغیب کا نتیجہ تھا کہ فارسی زبان و ادب کا احیا رہوا۔ اسی عہد کا درخشاں ستارہ ایران کا مشہور شاعر فردوسی ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ایران پر سلجوقی خاندان کی حکومت تھی (یہ لوگ وسطِ ایشیا کے باشندے تھے) ان کے عہدِ حکومت میں ایران ایک بار پھر متحد ہوگیا۔ انہوں نے مصر اور شام کو بھی فتح کرلیا اور ایرانی شہنشاہیت کو تقریباً اسی اوج و عظمت پر پہنچا دیا جو کبھی عہدِ قدیم میں تھی۔ سلجوقی خاندان کے بادشاہوں نے علم و ہنر کی بھی سرپرستی کی چنانچہ ان کے عہدِ حکومت میں علوم فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ نامور شاعر منجم اور ریاضی داں حکیم عمر خیام اس عہد کے بے شمار دانشمندوں

میں سے ایک ہے جس کو سلجوقی بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ اسی خاندان کے عہدِ حکومت کے آخری دور میں منگولوں کا ایران پر حملہ ہوا۔ یہ تاریخ کا المناک ترین سانحہ تھا جو میرے ملک پر اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ہمسایہ ملکوں پر بلا بن کر نازل ہوا۔

کبھی کبھی تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ آخر لوگ کیوں اس بات پر مصر ہیں کہ منگولوں کے سردار چنگیز خاں کو (جس نے تقریباً ۱۲۲۰عیسوی میں ایران کو تسخیر کیا تھا) افسانوی کردار کی شکل میں پیش کیا جائے۔ درحالیکہ ہم اس شخص اور اس کے سپاہیوں کے مظالم، غارت گری اور بے رحمانہ قتلِ عام کو فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ اس نے ہمارے ترقی یافتہ شہروں کو برباد کر دیا اور اس کی فوجوں نے ہزاروں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی بیدردی سے قتل کر ڈالا اور اس کو اپنے اس فعل پر ذرا بھی پشیمانی نہیں ہوئی۔

منگولوں نے ایران پر ایک صدی تک حکومت کی اس کے بعد تیمور لنگ کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ وسط ایشیا کے ترک قبائل میں سے تھا اور نسل کے اعتبار سے منگول۔ اگرچہ اس کا شمار تاریخ کی افسانوی شخصیتوں میں ہوتا ہے لیکن تباہی و بربادی میں چنگیز خاں سے کسی طرح سے کم نہ تھا۔ ایران پر تیمور اور اس کے جانشینوں کی حکومت کا عہد وہی ہے جب کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔

ان قبائل کی بے رحمانہ قتل و غارت گری کی وجہ سے ہمارے ملک کی آبادی لاکھوں کی تعداد میں کم ہو کر رہ گئی لیکن ہمارا تمدّن کسی معجزے کی طرح باقی رہا اور علم و ہنر نے ترقی کی چنانچہ ایران میں بہت سی جگہ رصد گاہیں قائم ہوئیں اور علمِ ریاضی کو فروغ حاصل ہوا۔

سعدی اور حافظ جیسے بڑے شعرا کی ادبی تخلیقات وجود میں آئیں۔ اور ایک بار پھر ہمارا تمدّن حملہ آوروں کی طاقت پر غالب آیا اور اس نے ان کو متمدّن بنایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے سابقہ افعال و اعمال پر پشیمان ہو کر دانشمندوں کی حمایت و سرپرستی قبول کی اور بہت سی عالیشان عمارتیں بنوائیں جو آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہماری زبان و ادب نے ہندوستان پر بھی اپنا اثر ڈالا اور پانچ سو سال تک اس ملک کی ادبی زبان فارسی رہی اور لوگ ہمارے ادبی شاہکاروں کو ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے فارسی کو سرکاری اور درباری زبان کا مرتبہ دیا اور انگریزوں کے اقتدار تک یہ اسی حیثیت کی حامل رہی۔ اردو زبان جو آج برصغیر ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کی زبان ہے فارسی سے بہت نزدیک ہے اس نے فارسی سے بہت کچھ سرمایہ حاصل کیا ہے۔

ایرانی وطن دوستوں نے بیرونی حملہ آوروں کا قلع قمع کر دیا اور ۱۵۰۱ء میں ایک نئے سلسلے یعنی صفوی خاندان کی بنیاد رکھی گئی۔ بعض دانشمندوں کی رائے میں صفوی حضرت محمد صلعم کی نسل سے ہیں۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہو لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ اس خاندان نے اپنی سلطنت کی ابتدا سے ہی شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا اور اس کی ترویج و ترقی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی۔

شاہ عباس اعظم نے ۱۵۸۷ء سے ۱۶۲۹ء تک حکومت کی وہ صفوی خاندان کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ گذرا ہے

اس بادشاہ نے رفاہ عامہ اور بہبودی کے وہ کام انجام دیئے جس کی مثال کئی صدیوں تک نہیں ملتی۔ اس کے باجلال اور پرشکوہ پایۂ تخت شہر اصفہان کی تمام متمدن دنیا میں شہرت تھی۔ اور آج بھی اس شہر کی وہ شان و عظمت دیکھی جا سکتی ہے۔ اس نے ملک کے اندر اور باہر سے ماہرِ فن صنعت کاروں کو جمع کیا۔ قالین بافی کی صنعت کو توسیع دی۔ ریشمی قالین اور زربفتی مخمل۔ دھات اور مٹی کے برتن۔ کاشی کاری کی صنعت کے علاوہ صفوی دور کی طرز معماری خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ شاہ عباس نے بہت سی سڑکیں بنوائیں اس سے پہلے کوروس اعظم نے اور اس کے بعد میرے والد نے پورے ملک سے راہزنی اور قتل و غارتگری کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ اس نے شرلی[1] برادر (انگریزوں) کی مدد سے ایران میں سب سے پہلی فوج تیار کی۔ جو نئے ڈھنگ کے ہتھیاروں سے لیس تھی جس کے نتیجے میں پورے ملک سے طوائف الملوکی بالکل ختم ہو گئی۔

شاہ عباس اگرچہ بڑا مقتدر بادشاہ تھا۔ لیکن اپنے خاندان کے افراد سے اسے بے انتہا حسد تھا۔ اور وہ ان کے ساتھ نہایت بے رحمی اور سنگدلی کا سلوک کیا کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اولاد میں سے کسی فرد کی تربیت اس غرض سے نہیں ہو سکی کہ آگے چل کر وہ عنانِ ملک کو سنبھال سکے اور تاج و تخت کی حفاظت کر سکے چنانچہ ۱۷۲۲ء میں افغانی حملہ آوروں نے ایران پر حملہ کر دیا اگرچہ ان کو جلد ہی ملک سے نکال دیا گیا تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کو خواہ تھوڑے عرصہ کے لئے ہی سہی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا ۱۷۳۶ء میں ایک معمولی خاندان کے ایرانی سردار نے صفوی خاندان کی زوال پذیر حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے نادر شاہ کے نام سے افشار خاندان کی بنیاد رکھی۔ نادر شاہ ایران کے نپولین کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے افغانوں، ترکوں اور روسیوں کو جنہوں نے ایران کے بہت سے علاقے اپنے قبضہ میں کر لئے تھے نکال باہر کیا اور نہایت محکم مرکزی حکومت قائم کر کے ملک میں ایک بار پھر وحدت و یکجہتی کو زندہ کر دیا اس نے ہندوستان پر بھی حملہ کیا اور یلغار کرتا ہوا دلی تک پہنچ گیا اور وہاں سے مال و متاع جمع کر کے فاتح کی حیثیت سے ایران واپس آیا۔

نادر شاہ کے بعد زند خاندان کا زمانہ آیا۔ اس خاندان کے دورِ حکومت میں ایران میں ہر طرف امن و امان رہا لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور ۱۷۹۶ء میں بحر خزر کے مشرقی ساحل کے ترک خاندان کے ایرانی سردار نے قاجاری خاندان کی بنیاد رکھی۔

قاجاری خاندان جو ۱۹۲۵ء میں میرے والد کے ہاتھوں معزول ہوا کافی عرصے تک ایران پر حکومت کرتا رہا لیکن اس کا شمار ضعیف ترین حکمراں خاندانوں میں ہوتا ہے۔ قاجاری بادشاہ ایران کے اندرونی معاملات میں غیر ملکیوں کی دست اندازی کو روکنے میں بڑے کمزور ثابت ہوئے اور داخلی معاملات میں ان کی اس کمزوری سے غیر ملکیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ ان بادشاہوں نے دینی علماء کو بھی ملکی معاملات میں مداخلت کی ضرورت سے زیادہ آزادی دے رکھی تھی لیکن وہ راہزنوں اور قبائلیوں کی سرکوبی میں خود کو بے بس پاتے تھے اور آخری چند بادشاہوں نے تو غضب ہی کیا ان کا مقصد ملک کی اصلاح نہ تھا بلکہ مختلف ممالک کی سیر و سیاحت سے زیادہ دلچسپی تھی جس پر بے اندازہ روپیہ صرف ہوتا تھا۔ اور ان کے

1. SHERLEY BROTRERS

اس صرفِ بیجا کی وجہ سے ملک بالکل کنگال ہو گیا تھا۔ اپنی فضول خرچیوں کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اطراف و جوانب سے روپیہ قرض لینا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غیروں کے وظیفہ خوار ہو کر رہ گئے۔

میرا یہ ہرگز مقصد نہیں ہے کہ قاجاریوں کے بارے میں جو اپنی رائے کا اظہار کروں اس میں تندی اور شدت سے کام لوں جس سے یہ ظاہر ہو کہ میرے والد نے ان سے جو سلوک کیا اس کی میں طرفداری کر رہا ہوں۔ میری رائے میں بعض قاجاری بادشاہوں میں عمدہ صلاحیتیں بھی تھیں۔ مثال کے طور پر اس خاندان کے مؤسس آغا محمد خاں کو ہی لے لیجئے ہر چند وہ اپنی خونریزی اور سفاکی کی وجہ سے بدنام ہے لیکن وہ دلیر سپاہی بھی تھا اور ایران کی وحدت و سالمیت کو اس نے برقرار رکھا۔ ناصر الدین پہلا ایرانی بادشاہ ہے جس نے یورپ کا سفر کیا۔ اور اپنے تاثرات کو سفرنامہ کی شکل میں ترتیب دیا اس سفرنامہ میں بہت سی دلچسپ باتیں ہیں۔ مثال کے طور پر جب اس نے پہلی بار ریل کے انجن کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ انجن کے خول میں گھوڑا چھپا ہوا ہے جو اس کو کھینچ رہا ہے لیکن جیسے ہی اس کو فنی رموز کا پتہ چلا تو اس کو اس قدر اشتیاق ہوا کہ اس نے فوراً ہی بلجیم کے انجینیروں کو تہران اور ری کے درمیان پانچ میل لمبی ریل کی پٹری بچھانے کی دعوت دیدی۔ درباری عورتوں کو حکم دیا کہ وہ بھی وہی لباس پہنیں جو بیلے[1] کی رقاصائیں پہنتی ہیں۔ لیکن یہ لباس زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔

میرے اس خیال سے مغرب اور مشرق کے مورخ بھی متفق ہیں کہ ایران کی تاریخ میں قاجاری خاندان کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں رہی۔ لیکن یہاں اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ قاجاری خاندان ہی پہلا خاندان تھا جس نے روس اور برطانیہ کی نوآبادیاتی باہمی سیاسی رسہ کشی کی طرف توجہ دی اور اس کا سامنا کیا۔ اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رضا شاہ نے نہایت ہوشمندی اور چابکدستی سے سامراجی خطرات کا مقابلہ کیا۔ قاجاریوں کی پستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے طویل دورِ حکومت میں ہی یورپ اور امریکہ تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہے تھے۔ اور ایران اس قدر پیچھے رہ گیا تھا کہ گویا تہذیب کے ابتدائی دور کی طرف لوٹ رہا ہو جس وقت اس بات کی ضرورت تھی کہ ایران متمدن دنیا کے ساتھ آگے بڑھے اور علمی و صنعتی ترقیات سے فائدہ اٹھائے اس وقت قاجاری خوابِ غفلت میں محو تھے۔

میرے والد نے پہلوی خاندان یعنی ایران کے موجودہ حکمران خاندان کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں رکھی (پہلوی: پارت خاندان کا بھی نام تھا اور قدیم فارسی زبان کا بھی) تخت نشینی کے بعد وہ عہدِ حاضر کی ضروریات کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے تھوڑے عرصے میں ہی ایران کی اقتصادی اور اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ۱۹۴۱ء میں میں ان کا جانشین ہوا۔ چنانچہ ضروری ردوبدل کے بعد (جس کا ذکر آگے آئے گا) میں نے بھی انہی کی روش پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔

آج میرا وطن مغربی اور مشرقی تمدن کے امتزاج کا مظہر ہے۔ ۳۳۰ قبل مسیح میں جس دن سکندرِ اعظم نے ہمارے باشکوہ دارالسلطنت تختِ جمشید کو آگ لگائی تھی اور اس کے سپاہی ایران کو تباہ و برباد کر رہے تھے اس وقت ایران میں سب سے پہلے حکمران خاندان کو قائم ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ تختِ جمشید کے کھنڈرات روم سے زیادہ قدیم ہیں۔ جن لوگوں نے ان

1. BALLET

دونوں شہروں (روم اور تختِ جمشید) کے کھنڈرات دیکھے ہیں انہوں نے تختِ جمشید کی عظمت وجلال کا اعتراف کیا ہے۔ آج ان ہی کھنڈرات کے پہلو میں عصرِ حاضر کے ایران کی ترقیات کی زندہ مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ایران کے جنوب مرکزی شہر شیراز میں جو تختِ جمشید کے نواح میں آباد ہے آج بھی گلاب اور نارنگیوں کے شگوفوں کی معطر فضا میں چمن زاروں کے کنارے بیٹھ سکتے ہیں اور حافظ کے اشعار سے جو کہ اس نے ۶۰۰ سال قبل کہے تھے لیکن جو آج بھی تروتازہ اور شاداب ہیں مشام جان کو شمیم بیز کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے نیلگوں آسمان کے نیچے، بلبل کے دلنشین چہچہوں سے جس کو ہمارے شعراء نے بیحد پسند کیا ہے اور اپنے اشعار میں بطور کنایہ استعمال کیا ہے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ انہیں مناظرِ قدرت کے ساتھ جو روح کے لئے غذا کی حیثیت رکھتے ہیں شیراز میں مشرقِ وسطیٰ کا بہترین ہسپتال بھی ہے اور پانی صاف کرنے کا کارخانہ بھی ہم نے یہاں قائم کیا ہے (اس کام کے لئے ہم ایک ایرانی خیر اندیش کے شکرگذار ہیں جس نے نیویارک میں روپیہ جمع کر کے اپنے ملک میں عوام کی فلاح کے لئے خرچ کیا) یہاں ایک جدید طرز کی یونیورسٹی قائم کرنے کا بھی ارادہ ہے جس کی عمارت ہمارے عہدِ باستان کی فنِ معماری کا نمونہ ہوگی اور نصابِ تعلیم امریکی یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق ہوگا۔

شاہ عباس کے عالیشان پایۂ تخت شہر اصفہان میں آج بھی غلّہ چوپایوں کی مدد سے پیسا جاتا ہے (قدیم رواج کے مطابق چوپایوں کی آنکھیں کام کے وقت باندھ دی جاتی ہیں تاکہ چکّی چلاتے وقت بھڑکیں نہیں) اس شہر میں چاندی کے ظروف پر پرانے زمانے کے کاریگروں کی صنعت کے نمونے بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور یہیں فنِ تعمیر کا مکمل نمونہ وہ احاطہ بھی ہے جو میدان شاہ کے نام سے مشہور ہے اور جسے شاہ عبّاس اعظم نے چوگان دیکھنے کے لئے بنوایا تھا اور جس کے منظر سے دیکھنے والوں پر حیرت طاری ہوجاتی ہے آج اسی شہر میں جدید طرز کے بہت سے کپڑا بننے کے کارخانے انجینیروں اور غیر ملکی ماہرین کی نگرانی میں چل رہے ہیں اس کے علاوہ شہر میں جو آبادکاری کے اقدامات کئے گئے ہیں وہ بھی قابلِ دید ہیں۔

تہران شہر کے باہر آج بھی اونٹوں کے قافلے نظر آتے ہیں جن پر دور دور سے ہر قسم کا سامان لاد کر شہر میں لایا جاتا ہے حسین چاندنی راتوں میں ان اونٹوں کے بندھی گھنٹیوں کے نغمے سے نہایت فرحت بخش اور شاعرانہ سماں بندھ جاتا ہے۔ پھلوں اور پھولوں سے لدے سرسبز باغوں میں جو تہران کے چاروں طرف ہیں آج بھی بیٹھ کر لطف حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آبِ رواں کے کنارے آج بھی پرندوں کے نغمے اور آبشار کے ترنم سنے جاسکتے ہیں کوہِ البرز کی برف سے ڈھکی چوٹیاں جو چنار کے درختوں کے پیچھے سے نظر آتی ہیں نگاہوں کے سامنے حسین منظر پیش کرتی ہیں۔ اسی شہر میں تہران یونیورسٹی بھی ہے جس کو میرے والد نے قائم کیا تھا اور جہاں سردست ۰۰۰ ۱۱ طالب علم و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ ان طلبائیں سے کچھ کے ساتھ آپ بھی بیٹھ کر ٹیلی ویژن اسکرین پر یونیورسٹی اسپتال میں عمل جراحی (آپریشن) ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی دوست یا رشتے دار کی پذیرائی کے لئے تہران کے عظیم اور شاندار ہوائی اڈے پر جائیں جو آج کی ضروریات کے مطابق جیٹ ہوائی جہازوں

کی بین الاقوامی سروس کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے تو آپ ان چوڑی چوڑی سڑکوں پر سے گذریں گے جن کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور جدید طرز کی دوکانیں اور اسٹور بنے ہوئے ہیں اور جہاں آپ کو بعض عورتیں پیرس کے جدید ترین طرز کے لباس میں ملبوس نظر آئیں گی وہیں ان میں سے بعض برقعہ پوش بھی ہوں گی۔ میری آرزو ہے کہ ایران جس کی تہذیب ماضی میں اس قدر پرشکوہ و باعظمت رہی ہے، عہدِ حاضر کی ترقیات سے بھی پورے طور پر ہمکنار رہے۔ وطن کے لئے میرے دل میں کیا امیدیں اور تمنائیں ہیں ان کا ذکر میں آئندہ فصلوں میں کروں گا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے ہمارے تہذیب و تمدن کی تاریخ سب سے زیادہ قدیم ہے زبان و نژاد کے اعتبار سے ہماری قوم کا مغربی دنیا سے گہرا تعلق ہے اور بغیر مبالغہ کے کہا جا سکتا ہے کہ مغربی ممالک کے موجودہ تمدن کے چند اصول ایسے ہیں جن کا آغاز ایران سے ہوا۔ بہت غور و فکر کے بعد جو نتائج اخذ ہوئے ہیں ان کے پیش نظر ہم نے مغربی تمدن کو اپنایا ہے اور اپنے ملک کے گراں بہا خزانے میں اس سے اضافہ کر رہے ہیں اور یہ محض خام خیالی نہیں کہ مغرب و مشرق کے امتزاج سے جو تمدن وجود میں آئے گا۔ وہ ہمارے لئے سازگار ہوگا۔ کیونکہ ایران نہ صرف اپنی جغرافیائی حیثیت سے دنیا کے چہار راہے پر واقع ہے بلکہ اور بھی دیگر اسباب ہیں جن کی بنا پر ہمارے ملک کے لئے یہ حالات رونما ہوئے۔

۲۔ ایران کی ترقی میں میرے والد کی خدمات

جب بھی میں اپنے ملک کی قدیم و بیش قیمت تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو چند چیزیں میری توجہ کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایرانی شخصی آزادی کی وجہ سے ہمیشہ مشہور رہے ہیں۔ جو لوگ تہران کے اصول و ضوابط سے بے نیاز ٹیکسی چلانے والوں کو شخصی آزادی کا مظہر سمجھتے ہیں میں ان کی یہاں مخالفت نہ کروں گا (جس دن ٹیکسی ڈرائیوں نے ہڑتال کی تو ایسا لگتا تھا گویا پورا تہران شہر سکوت و خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا ہے) لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کی ہزاروں سالہ پرانی تاریخ میں شخصی آزادی کا احساس بہت سے موقعوں پر گہرے اثرات لے کر نمایاں ہوا ہے ــــ اہم تاریخی حملے، دشمنوں کی وقتی فتوحات اور اس قسم کے بہت سے حادثات اس ملک میں رونما ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی واقعہ ایسا نہ تھا جو ایک معمولی ایرانی فرد کے انداز فکر کو بدل سکے۔ اپنی اس عادت کے اعتبار سے ہم فرانسیسیوں سے مشابہ ہیں (فرانسیسی ٹیکسی ڈرائیور بھی شخصی آزادی کے اظہار میں ہمارے ٹیکسی چلانے والوں سے کم نہیں ہیں)۔ اس حیثیت سے ایران کو ایشیا کا فرانس کہا جائے تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اسی عادت و خصلت کے لحاظ سے ہم امریکی قوم سے بھی مشابہت رکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایرانی اور امریکی مِل جُل کر رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر سال سینکڑوں ایرانی طالب علم امریکہ پڑھنے کی غرض سے جاتے ہیں اور ایک بھی طالب علم ایسا نہیں جو وہاں کی پڑھائی اور بود و باش سے خوش و خرّم نہ ہو اور اسی طرح جو امریکی میرے ملک میں کام کرتے ہیں پوری طرح آزادانہ طور پر میرے ملک کے لوگوں کے ساتھ اجتماعی زندگی میں شریک رہتے ہیں۔

ایرانیوں کو مہمان نوازی کی بنا پر ہمیشہ شہرت حاصل رہی ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے اس قومی فطری جذبے کا دقیق مطالعہ کرنا چاہے تو وہ دنیا کی ان بڑی بڑی لائبریریوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے جن میں ایران کے متعلق کتابیں موجود ہیں، (جیسے برٹش میوزیم لائبریری و لائبریری آف کانگریس آف امریکہ) کیونکہ جن سیاحوں نے ماضی میں ایران کا سفر کیا ہے انہوں نے اپنے سفرناموں میں ایرانیوں کے اس قابل قدر جذبہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور آج ہم کو یہ کہتے ہوئے بے انتہا

مسرت محسوس ہوتی ہے کہ ایرانیوں کی یہ قدیم روایت زمانے کے بدلنے کے ساتھ ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کو پہلے سے زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے اور آج بھی قصبوں اور دیہاتوں میں یہ رواج عام ہے۔

ایرانیوں اور امریکیوں میں شباہت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایران صدیوں پہلے ان طبقاتی اور نسلی اختلافات سے آزاد ہو چکا ہے جو اب بھی بعض ممالک میں رائج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں بعض اشخاص کو خاص مراعات حاصل ہیں اور دوسرے ان خصوصیات سے محروم ہیں اور دونوں کے درمیان فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے لیکن جس طرح امریکہ میں اکثر ہوتا ہے ایران میں بھی اس بات کا امکان ہے کہ نچلے طبقوں سے اہل لوگ ترقی پا کر اعلیٰ مدارج تک پہنچیں۔ اس ضمن میں میرے والد صاحب کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایران کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے بادشاہ، سردارانِ قبائل، وزراء، علماء، شعراء، اور بڑے بڑے نثر نگار نچلے طبقوں سے ابھر کر شہرت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے ہیں۔

ہم نے کبھی رنگ و نسل کے امتیاز یا مذہبی تعصب کی حمایت نہیں کی بلکہ اس کے برعکس ہم ہمیشہ دوسری اقوام اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور رواداری سے پیش آئے ہیں اور ہمارا ملک دوسری اقوام کے مصیبت زدہ لوگوں کے لئے پناہ گاہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ جب بخت النصر، ۵۹۷ قبل مسیح میں بابل کی فتح کے بعد یروشلم سے جن یہودیوں کو قیدی بنا کر لایا ان کو کوروش اعظم نے انہی روایات کی پیروی کرتے ہوئے آزاد کر دیا اور حکم دیا کہ اپنا مقدس اثاثہ ساتھ لے کر واپس فلسطین چلے جائیں اور دوبارہ اپنی عبادت گاہ کی تعمیر کریں۔ ان قیدیوں نے کوروش اعظم کے خزانے سے گراں بہا تحائف حاصل کئے اور اپنی عبادت گاہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اس واقعے کا ذکر انجیل میں بھی آیا ہے۔

ایران کے شاہنشاہ یزدگرد اوّل نے ۴۰۹ عیسوی میں ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے عیسائیوں کو عام اجازت تھی کہ پورے ملک میں جہاں بھی چاہیں اپنے مذہبی فرائض انجام دیں۔ اس کے بعد بھی جب اہلِ روم ارمنستان میں داخل ہوئے تو ہمارے ملک نے ارمنی مہاجروں کو پناہ دی۔ اور یہ تو حال ہی کی بات ہے کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت اور بعد میں بھی ہزاروں کی تعداد میں روسی عیسائی دہشت پسندوں اور بالشویک حکومت کی زیادتیوں سے تنگ آ کر اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور ایران میں آ کر بس گئے۔ اس موقعے پر بھی ایرانیوں نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔

اگرچہ ماضی میں کچھ غیر ذمہ دار اشخاص کے تعصب کی وجہ سے کبھی کبھی بعض اقلیتی فرقوں پر زیادتیاں بھی ہوئی ہیں، لیکن بطور کلی میرا خیال ہے اور جس سے مغربی ممالک کے مورخین بھی اتفاق کریں گے کہ جس حسنِ سلوک اور رواداری کو ہم نے مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے ساتھ روا رکھا ہے اس کی اتنی نمایاں مثال مغربی ممالک میں بھی نہ ملے گی۔ اور میری رائے میں دیگر اقوام و مذاہب کے ساتھ جو حسنِ سلوک اور خوش خلقی کا برتاؤ ہم نے روا رکھا ہے اس نے ہماری تہذیب و تمدن کو بھی بہت قوت بخشی ہے۔

پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ایران اگرچہ اپنی جنگجوئی اور بہادری کی وجہ سے صدیوں تک مشہور رہا ہے لیکن تہذیب و تمدن کے میدان میں اس کی شہرت جنگجوئی سے زیادہ رہی ہے اور اپنے تہذیب و تمدن سے ہی ہم نے فاتح قوموں کو مغلوب کیا ہے یعنی جن کا کوئی تمدن نہیں تھا ان کو اس نے متمدن بنایا اور جن کا کوئی تمدن تھا تو اس پر اپنے تمدن کا گہرا اثر چھوڑا۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہماری فوجی طاقت کو شکست ہوئی بھی تو تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ہم ہمیشہ فاتح رہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کئی صدیوں تک زندگی کے مختلف شعبوں میں جیسے ملکی نظم و نسق، فوجی تربیت، تجارت، اقتصاد، علوم، ادبیات، فنونِ لطیفہ اور معماری میں دوسروں کے لئے ہم رہنما ثابت ہوئے ہیں اور ہمارے بعض بادشاہ تو ایسے بھی گذرے ہیں کہ جنہوں نے ایک طرف نہایت وسیع سلطنت پر حکومت کی ہے تو دوسری طرف علم و ہنر اور صنعت و حرفت کی بھی سرپرستی اور پشت پناہی کی ہے۔

لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کر دینا چاہئے کہ ہماری رہنمائی کی بنیاد مذہبی، اخلاقی اور معنوی اقدار پر استوار تھی۔ پہلے باب میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام سے بہت قبل ایران میں حضرت زرتشت بہت بڑے پیغمبر ہوئے ہیں۔ انہوں نے روح کے جاودانی ہونے اور نیکی و بدی کے درمیان مسلسل کشمکش کے ذکر کے ساتھ بعض عیسائی مذہب کے اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے اور اپنے ماننے والوں کو تین نیک باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ تین باتیں ہیں:۔ اچھا سوچو، اچھا بولو اور اچھے کام کرو۔ داریوش اعظم نے سچائی کی اہمیت اور جھوٹ کی مذمت کی ہمیشہ تاکید کی ہے۔ ۵۲۱ قبل مسیح میں اس کی زبان سے یہ لافانی جملے نکلے تھے: "مجھے انصاف سے محبت ہے اور گناہ سے نفرت۔ اوپر کے طبقے کے مظالم جو نیچے کے طبقے کے لوگوں پر ہوتے ہیں میں ان سے سخت ناراض ہوں"۔

اردشیر اول جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ساسانی خاندان کا بانی تھا اس کا قول ہے کہ طاقت فوج کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ فوج بغیر پیسے کے نہیں رہ سکتی، بغیر کاشتکاری کے پیسہ جمع نہیں ہوتا اور بغیر انصاف کے کھیتی نہیں پھلتی پھولتی۔

خسرو انوشیروان بھی ساسانی خاندان کا نامور بادشاہ ہوا ہے اگرچہ کبھی کبھی وہ حد سے زیادہ سختی کیا کرتا تھا لیکن اس کا عدل و انصاف ایسا تھا کہ آج تک تاریخ اس کو عادل کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

نوشیروان کے متعلق ہم سب نے یہ کہانی سن رکھی ہے کہ کس طرح اس نے مظلوموں سے ملنے اور ان کے ساتھ انصاف کرنے کی غرض سے محل کے باہر گھنٹی لٹکوا دی تھی اور ایک چوپایہ اپنے مالک کے مظالم سے تنگ آکر دادرسی کے لئے اس گھنٹی تک پہنچ گیا تھا۔ یہ بادشاہ عیسائیوں سے بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اس نے ان بڑے بڑے اشراقی فلسفیوں کا اپنے دربار میں استقبال کیا اور کئی سال تک اپنا مہمان رکھا جن پر قیصرِ روم نے ظلم و زیادتی کو روا رکھا تھا اور اس کے بعد اس نے قیصرِ روم سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ ان پر کسی قسم کی سختی نہ کرے گا واپس ان کے وطن بھیج دیا۔ عیسائیوں کے ساتھ بھی

نوشیرواں بہت اچھا سلوک کیا کرتا تھا۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جس حسنِ سلوک اور خوش خلقی کی دنیا کو ضرورت ہے وہ ہماری ہی ذات سے وجود میں آئی ہے۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میرے والد کی حکومت سے پہلے جو دور گذرا ہے اس میں میرے وطن نے بڑی سختی اور پریشانیوں کا سامنا کیا ہے۔ طرزِ حکمرانی، امورِ مملکت، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کی وجہ سے جو ہم کو دنیا میں رہبری کا مقام حاصل تھا وہ ہم کھو چکے تھے۔ اونچے طبقے کے لوگوں کا جور و ستم جو نچلے طبقے پر ہوتا تھا اس کا احساس بھی ہمارے ذہنوں سے مٹ چکا تھا۔ جذبۂ وطن پرستی، شجاعت اور زہد و تقویٰ سے ہم بالکل دور ہو چکے تھے۔ راست گوئی سے ہم پھر چکے تھے۔ جھوٹ بولتے ہوئے جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔

میرے والد کے سامنے بہت سے مسائل تھے جن کو انہوں نے بہت خوبی کے ساتھ حل بھی کر لیا لیکن ان سب حالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے پہلے کے دورِ حکومت پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ یہ وہ دور تھا جس میں غیر ملکیوں کا اثر و رسوخ ملک میں تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ہمارے رہنما زوال پذیر سیاسی حالات اور بدعنوانیوں کے درمیان سانس لے رہے تھے۔

۱۸۰۷ عیسوی میں فتح علی شاہ قاچار نے فرانسیسی حکومت سے ایک معاہدہ کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ نپولین فرانس پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس کو امید تھی کہ اس معاہدے کے بعد وہ ایران کے راستے ہندوستان کو فتح کر سکتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے یہ بات طے پائی تھی کہ فرانسیسی حکومت ہم کو جنگی ہتھیار مہیا کرے گی اور ہمارے سپاہیوں کو نئے ڈھنگ سے فوجی تربیت دے گی تاکہ ہم زارِ روس کی فوجی طاقت کا مقابلہ کر سکیں جس نے چھ سال قبل ہم سے گرجستان کا صوبہ چھین لیا تھا۔ پیٹر اعظم (۱۷۲۵ ــــ ۱۶۸۲ عیسوی) کے عہد سے روسی حکومت برابر اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ اپنے مقبوضہ علاقوں کو جنوب کی طرف بڑھائے تاکہ خلیج فارس تک پہنچ کر اس کی بندرگاہوں کو اپنے قبضے میں لے آئے۔ اِدھر نپولین نے روس سے صلح و صفائی کر لی اور ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ان حالات کے پیشِ نظر ہم نے روس کے چنگل سے گرجستان کو آزاد کرانے کی غرض سے فوجی چڑھائی کر دی جس کے نتائج بے حد خراب نکلے اور ۱۸۱۳ء کے گلستان عہدنامے کے مطابق ہم کو نہ صرف گرجستان بلکہ اسٹھ اور صوبوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ بحرِ خزر کے ان ساحلوں پر جو ہماری قلمرو میں شامل تھے جنگی جہاز رکھنے کا حق ہم سے چھین لیا گیا۔

روسیوں کی حریص نگاہیں ہندوستان پر بھی لگی ہوئی تھیں۔ اور اسی وجہ سے انگریزوں کو ایران کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ روسی فوجیں اسی ملک سے گذر کر ہندوستان پہنچ سکتی تھیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر ۱۸۱۴ء عیسوی میں ہمارے اور انگریزوں کے درمیان بھی معاہدہ وجود میں آیا جس کا مقصد روس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو متحدہ دفاعی فوج

کے ذریعے روکنا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے یہ طے پایا کہ اگر روسی فوجیں ایران کی سرحد میں زبردستی داخل ہوں تو حکومتِ برطانیہ ایران کو فوجی یا مالی امداد دے گی۔

۱۸۲۶ء میں ایران اور روس کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں حکومتِ برطانیہ نے ایران کی ضروری سامان سے تو مدد نہیں کی البتہ دونوں ملکوں کے درمیان ثالث بن گئی۔ چونکہ اس دفعہ بھی ایران کے پاس جنگی سامان کافی مقدار میں موجود نہ تھا اس لئے اس جنگ کا خاتمہ ترکمان چائے کے منحوس معاہدے پر ہوا۔ اس معاہدے پر دستخط ۱۸۲۸ء میں ہوئے تھے جس کی رو سے ایران کا مزید علاقہ روس میں چلا گیا۔ اور تاوان کی صورت میں بہت بھاری رقم بھی ادا کرنی پڑی اس کے علاوہ تجارتی وغیر تجارتی حقوق بھی روس کو حاصل ہو گئے۔

تھوڑا عرصہ گذرنے کے بعد یعنی انیسویں صدی میں روس نے ہمارے ساتھ بظاہر صلح آمیز رویہ اختیار کر لیا۔ وہ اپنے اس رویئے سے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ مشرقی اضلاع جو افغانستان کی سرحد کے قریب تھے وہاں وہ ایرانی طاقت کو دوبارہ بحال کرنے میں ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہم کو افغانستان سے جنگ کرنے کے لئے بھی اکسایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اور انگریزوں کے درمیان ۱۸۵۷ء میں تھوڑے عرصے کے لئے دشمنی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ انگریزی حکومت اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ہندوستان کے دفاع کے لئے افغانستان کی حیثیت بالکل ڈھال کی سی ہے اس کے علاوہ روسیوں نے ترکمان چائے معاہدے کے تحت نہ صرف ایران کے شمالی علاقوں میں بلکہ مشرق کی طرف بھی اپنی طاقت اور اثر ورسوخ کو بڑھانا شروع کر دیا۔

روسیوں اور انگریزوں کی سیاسی اور تجارتی کشمکش میں ہم بری طرح تباہ ہوئے اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہی تھے کیونکہ قاجاری بادشاہوں نے اپنے دربار کے بیجا اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بہت سے تجارتی حقوق غیر ملکیوں کو سونپ دیئے تھے۔ ان حقوق میں سب سے عجیب حق، اختیار کل تھا جو ۱۸۷۲ء میں بادشاہِ وقت نے بارون جولیس ڈریوٹر کو دیا جس نے برطانوی قومیت حاصل کر لی تھی۔ اس مختار نامے کے مطابق بارون ڈریوٹر نے ستر سال کی مدت تک ایران میں ریل اور ٹرام چلانے کے حقوق حاصل کر لئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے راہ سازی، آب پاشی، معدنیات، کارخانجات، ٹیلی گراف اور ٹیکس وغیرہ کے ذریعے روپیہ جمع کرنے کے لئے بھی خاص مراعات حاصل کر لی تھیں لیکن ایک طرف تو عوام کی سخت مخالفت اور دوسری طرف روس کے دباؤ کی وجہ سے بادشاہ کو یہ مختار نامہ منسوخ کرنا پڑا۔ شاہ نے محض ڈریوٹر کی دلجوئی کی خاطر اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ انگریزی سرمایہ سے ایران میں بنک قائم کرے اور اس بینک کو طویل عرصے کے لئے ایران میں نوٹ چھاپنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایران میں معدنیات جن میں تیل بھی شامل تھا دریافت کرنے کا ٹھیکہ اسی کو دیا گیا لیکن اس کو آخری سودے سے مالی فائدہ نہ ہوا۔

انگریزوں نے ایران میں ٹیلیگراف کا محکمہ قائم کیا جس کا انتظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ایران میں دریائے کارون

بھی ایسا دریا ہے جس میں جہاز چل سکتے ہیں۔ اس دریا میں جہاز چلانے کا حق بھی انہی کو حاصل تھا۔ تمباکو کی کاشت کا ٹھیکہ بھی ایسے شخص کو دیا گیا تھا جو شہریت کے اعتبار سے برطانوی تھا لیکن عوام اور خاص طور پر علمائے دین کی شدید مخالفت کی وجہ سے یہ عہدنامہ منسوخ کر دیا گیا۔

ان حالات کے پیش نظر روسی بھی ایران میں اپنے قدم جما رہے تھے۔ ناصرالدین شاہ نے اجازت دے دی تھی کہ ایرانی قزاقوں کی ایک بریگیڈ روس کے فوجی افسران کے تحت تیار کی جائے۔ یہ بریگیڈ جس کی تنظیم و تربیت غیر ملکی حکومت کے تحت ہو رہی تھی تھوڑے ہی عرصے میں ایران کی بڑی قومی جنگی طاقت ثابت ہوئی ۱۸۸۸ء میں ایک روسی شہری نے بحر خزر کے پورے اس ساحل پر جو ایران میں شامل تھا ماہی گیری کے حقوق حاصل کر لئے۔ ۱۸۹۱ء میں روسی بنک کا افتتاح تہران میں ہوا۔ اور برٹش بنک کی طرح جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے کرنسی نوٹ چھاپنے کے حقوق اب اس بنک کو حاصل ہو گئے روسیوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ شاہ وقت کو مزید قرضے دے کر اپنے اقتدار کو پہلے سے بھی زیادہ محکم کر لیا۔ اور قرضے کی دستاویزات کی بنیاد پر انہوں نے مزید تجارتی اختیارات حاصل کر لئے۔ اس عرصے میں روسیوں نے اور اس کے فوراً بعد تمام دوسری حکومتوں نے غیر ملکی مراعات (کاپی چولیشن) کا قانون ایران میں نافذ کر دیا۔ اس قانون کی رو سے حکومتِ ایران اُن غیر ملکیوں پر مقدمے چلانے سے محروم ہو گئی جو ایران میں مختلف قسم کے جرائم کے مرتکب ہوا کرتے تھے۔

قاجاری بادشاہوں کی بدمعاملگی اور بے اصولیوں نے عوام کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کوئی مؤثر قدم اٹھائیں، چنانچہ جمہوریت پسندوں کی جماعت وجود میں آئی اور اگست ۱۹۰۶ء میں دس ہزار تاجر اور جمہوریت پسند انگریزی سفارتخانہ (تہران) کے باغ میں پناہ کے لئے گھس گئے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ عوام نے قاجاری سلطنت اور حکومت کے کارپردازوں میں جو بدعنوانیاں چلی آ رہی تھیں اس کے خلاف یہ احتجاج کیا ہے۔ اسی کے ساتھ تہران کے روشن فکر علماء شہر سے باہر نکل کر قم میں پناہ گزین ہو گئے تب شاہ نے مجبور ہو کر اصلاحات کا وعدہ کیا اور دو ماہ بعد جمہوریت کا فرمان جاری کر دیا۔

جمہوریت پسندوں نے داخلی اصلاحات کے علاوہ روسیوں کے اقتدار اور ان کی تحریکوں کو روکنے کا بھی مطالبہ دربار سے کیا۔ بعض اشخاص کی رائے میں انگریز محض اس وجہ سے جمہوریت پسندوں کی مدد کر رہے تھے کہ وہ روسیوں کے خلاف تھے لیکن میرے خیال میں انگریز خلوص کے ساتھ اس بات میں دلچسپی لے رہے تھے کہ ایران میں جمہوری حکومت قائم ہو جائے۔ اس بات کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ۱۹۰۷ء میں روسیوں اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے ایران، افغانستان اور تبت میں دونوں حکومتوں نے اپنی نقل و حرکت کے لئے حدود مقرر کر دیں۔ اس معاہدے نے جمہوریت پسندوں کے حوصلے بری طرح پست کر دیئے۔

لیکن درحقیقت بیرونی طاقتیں ان حصوں کو جو پہلے ہی ان کے زیر اثر تھے آپس میں تقسیم کرنا چاہتی تھیں۔ انگریزوں نے عہد کیا کہ ملک کے شمالی حصے میں جہاں روس کا دخل پورے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے تجارتی حقوق سے دستبردار ہو جائیں گے اور دوسری حکومتوں کو بھی یہ حقوق حاصل کرنے سے روکیں گے اس کے جواب میں روسیوں نے بھی ایران کے جنوب مشرقی حصے کے متعلق جو نسبتاً رقبے میں چھوٹا تھا لیکن انگریزوں کے زیر اثر تھا یہی عہد و پیمان کیا۔

وہ علاقہ جو ان دو حصوں کے درمیان تھا اور حد بندی کے معاہدوں سے بچ رہا تھا اس پر دونوں حکومتوں کے تجارتی حقوق پہلے کی طرح باقی تھے (ان اہم جملہ حقوق میں تیل نکالنے کا حق بھی شامل تھا جو ۱۹۰۱ء میں ڈارسی نامی شخص کو دیا گیا تھا یہ نسلاً انگریز تھا لیکن اس نے آسٹریلیا کی شہریت حاصل کر لی تھی) لیکن اس علاقے میں جس کو غیر متعلقہ کہا جاتا تھا روسیوں سے زیادہ انگریز اپنی سرگرمیاں دکھا رہے تھے۔

روس اور برطانیہ نے پہلی جنگ عظیم کے موقعہ پر آپس میں صلح کر لی کیونکہ انہیں ایک نئی طاقت یعنی جرمنی حکومت کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور انہیں امید تھی کہ ۱۹۰۷ء کا معاہدہ اس سخت کشمکش کو کم کر دے گا جو اُن دونوں کے درمیان چلی آرہی تھی اور مشترکہ دشمن کے مقابلے کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوگا لیکن ایرانیوں کی رائے میں یہ معاہدہ ان کے وطن کو نگل جانے کی غرض سے کیا گیا تھا بہرحال روس و برطانیہ مذکورہ معاہدہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور ہمارے ملک میں ان دونوں حکومتوں کی کشمکش برابر جاری رہی۔ اسی اثنا میں ایرانی قوم پرستوں کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور وہ اس مجلس (ایرانی پارلیمنٹ) کی حفاظت نہ کر سکے جس کی تشکیل ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔

مظفر الدین شاہ کو تو کچھ حد تک ایران میں جمہوری نظام سے دلچسپی تھی لیکن اس کا لڑکا اس کا سخت مخالف تھا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ روسی حکومت کی مدد سے دوبارہ مطلق العنان حکومت قائم کرے چنانچہ اس نے تین مرتبہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس کو شکست کا منہ اس لئے دیکھنا پڑا کہ جمہوریت پسندوں نے ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس کا مقابلہ کیا تھا۔ دوسری مرتبہ اس نے یہ چال چلی کہ جون ۱۹۰۸ء میں ایرانی قزاقوں کی بریگیڈ کے روسی کمانڈر کی مدد سے ایرانی پارلیمنٹ کی عمارت کو بم سے اُڑوا دیا اور پارلیمنٹ کا خاتمہ کر دیا شاہ اور اس کے روسی عملے کو ایرانی قوم کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن دوسرے ہی سال جمہوریت پسندوں نے قزاقی بریگیڈ کو شکست دی۔ محمد علی میرزا نے فرار ہو کر روس میں پناہ لی اور اس کا گیارہ سالہ لڑکا احمد شاہ اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔

۱۹۱۱ء میں اس نے آخری کوشش کی اور اس کے ساتھیوں نے روس اور بحر خزر کے راستے سے ایران کو فتح کرنے کی غرض سے حملہ کیا لیکن اس دفعہ بھی انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اگرچہ جمہوریت پسند وقتی طور پر کامیاب ہو گئے لیکن روسیوں نے وہی برتاؤ کیا جو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے

پر کیا تھا یعنی اپنی فوجی طاقت کو ہمارے ملک کی شمالی سرحد پر جمع کئے رہے۔

۱۹۱۱ء میں ایران کی زبوں مالی حالت کو درست کرنے کے خیال سے ایرانی حکومت نے ایک امریکی شخص کو جس کا نام مورگان[1] شوستر تھا امین کل کی حیثیت سے ملازم رکھا۔ اس نے جلد ہی لوگوں کا اعتماد حاصل کرلیا اور جو مالی اصلاحات وہ کرنا چاہتا تھا اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا لیکن اسی سال کے آخر دنوں میں روسیوں نے ایران کو الٹی میٹم پیش کر دیا۔ ان کے جو مطالبات تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شوستر کو مالیات سے الگ کیا جائے۔ یہ بات اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ روسی نہیں چاہتے تھے کہ ایران ملکی امور میں اتنا منظم ہوجائے کہ وہ کسی طرح ان کا محتاج نہ رہے۔ روسی فوجوں نے ایران کے کئی شمالی شہروں پر حملے کئے جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ اگرچہ مجلس شورائے ملی نے روس کے الٹی میٹم کو مسترد کردیا تھا لیکن وزراء کی کابینہ نے اس کو تسلیم کرلیا۔ یہ تمام واقعات تفصیل سے شوستر کی کتاب اختناق ایران (ایران کی گھٹن) میں پڑھے جاسکتے ہیں۔

اگرچہ پہلی جنگ عظیم میں باوجود اس کے کہ ایران نے جنگ میں شریک نہ ہونے کا اعلان کردیا تھا لیکن جرمن، برطانوی، روسی اور ترک پورے ملک میں سرگرم عمل تھے۔ ترکوں نے نازیوں کی مدد کی خاطر تہران کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن روسیوں سے شکست کھائی۔ جرمن کارپردازوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہمارے ملک کے قبائلی سرداروں کو اپنے مقصد کی خاطر بھڑکانا چاہا بلکہ یہاں تک کوشش کی کہ ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں مسلح افواج تیار کیں لیکن ان کو اس مقصد میں بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ میجر[2] پرسی سائیکس نے جو بعد میں سر پرسی سائیکس کے لقب سے مشہور ہوا (اس نے ایران کے متعلق دو جلدوں میں ایک کتاب بھی لکھی ہے) جنوبی ایران کی پولیس کے نام سے ایک فوجی دستہ تیار کیا اور ایران کے جنوبی حصے پر قابض ہوگیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ملک کی اندرونی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خستہ و زبوں ہو چکی تھی۔ ادھر ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آچکا تھا اور بہت سی روسی فوجیں ایران کے شمالی صوبوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ انگریزی فوج کے کچھ دستوں نے جن کو روانگی کا حکم مل گیا تھا چلتے چلتے روسی فوجوں پر حملہ کر دیا لیکن اس میں ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے ہم سے ایک معاہدے کی پیش کش کی جس کے اہم نکات ایران کو قرض دینا، انتظامی اور مالی امور کی اصلاح کے لئے انگریز مشیر مقرر کرنا، سامان جنگ مہیا کرنا، سڑکیں بنانا اور ریل کی پٹری بچھانا تھے۔ اس معاہدے کی تہہ میں چونکہ یہ بات پنہاں تھی کہ غیروں کا غلبہ ایران پر پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے اس لئے عوام نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔ اگرچہ حکومت نے تو اس معاہدے کو تسلیم بھی کرلیا تھا لیکن مجلس شورائے ملی نے اس کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

ملک کی کمزوری اور زبوں حالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ میرے والد اور دوسرے وطن پرست اس ملک کی بدبختی

1. MORGAN SHUSTER 2. MAJOR PERCYSYKES

پر سخت افسردہ ونالاں تھے۔

صوبہ مازندران بحر خزر کے نزدیک واقع ہے۔ میرے والد صاحب کی پیدائش اس صوبے میں ۱۸۷۸ عیسوی میں ہوئی۔ قاجاری بادشاہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے نسل کے اعتبار سے ترک تھے لیکن اس کے برعکس میرے والد کا تعلق خالص ایرانی خاندان سے تھا۔ ان کے والد اور دادا نے ایرانی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ایران اور افغانستان کی ایک جنگ میں ان کے دادا نے قابلِ ستائش بہادری اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ ان کے والد صوبہ مازندران میں حفاظتی دستے کے اعلیٰ افسر تھے۔ میرے والد صاحب جن کا نام اس وقت رضا خان تھا ابھی چالیس ہی دن کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی والدہ اس نوزائیدہ بچے کو لے کر تہران چلی آئیں۔ راستے میں غضب کی سردی تھی جس کی وجہ سے اس ننھے سے بچے کی زندگی سخت خطرے میں پڑگئی تھی۔

ابھی ان کی عمر چودہ سال سے تجاوز نہ کر پائی تھی کہ قزاق بریگیڈ میں بھرتی ہوگئے۔ یہ بریگیڈ ان کی ولادت کے پہلے سال میں قائم کی گئی تھی۔ اس وقت ان کو بالکل لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا کیونکہ اس زمانے میں تعلیم صرف دولت مند، صاحبِ اقتدار اور علماء کے بچوں تک ہی محدود تھی اور چونکہ علم و دانش کو وہ محض اپنا حق سمجھتے تھے اس لئے عوام میں اس کو پھیلنے سے روکتے تھے تاکہ وہ عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ملک میں مطلق العنان بنے رہیں اور جو جی میں آئے کرتے رہیں۔

جس وقت میرے والد صاحب کی تاجپوشی ہوئی تو ایران کی قدیم رسم و روایات کے مطابق شہنشاہ "ظل اللہ" "مؤید بتائیداتِ الٰہی" اور "قبلۂ عالم" جیسے القاب ان کے لئے مخصوص کر دیئے گئے لیکن حکمران ہونے کے باوجود خواہ وہ غیر ملکی اہم شخصیتوں کو شرف ملاقات بخشتے خواہ مجھ سے ہمکلام ہوتے ان کو اس بات سے مسرّت ہوتی تھی کہ خود کو ایک معمولی سپاہی ظاہر کریں۔

میرے والد صاحب نے اچھی عادات و اطوار اور شخصی خوبیوں کی بنا پر نہایت تیزی سے ترقی کی۔ ان کے زمانے میں ایرانی فوج میں افسروں کے بتدریج عہدے نہ تھے یعنی ایسا کوئی دستور نہ تھا کہ معمولی سپاہی درجہ بدرجہ ترقی کریں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سپاہی اعلیٰ افسر بننے کے لئے ہاتھ پیر مارتے اور اچھل کود کر دفعتاً مقامِ افسری تک پہنچ جاتے۔

اگرچہ اس طرح کی ترقی کی مثالیں ایرانی فوج میں بہت کم ہیں لیکن میرے والد کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ اس کو نظر انداز کیا جا سکے۔ وہ کشادہ سینہ اور دراز قد آدمی تھے اور چہرے سے مردانہ جاہ و جلال جھلکتا تھا۔ ان کے پروقار چہرے پر جو چیز سب کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرتی تھی ان کی پرکشش آنکھیں تھیں جو ان سے ملاقات کرنے والوں کے دل میں اترتی چلی جاتی تھیں، اور بڑے بڑے دلاور کانپنے لگتے تھے میں نے سنا ہے کہ ایرانی قزاقوں کی فوج کے روسی افسر ان سے ملتے ہوئے کتراتے تھے کیونکہ وہ ان سے ڈرتے تھے۔

میرے والد صاحب کی ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ مفید و مددگار ثابت ہوئی وہ ان کی مطالعے کی عادت تھی۔

پڑھنے لکھنے کا شوق انہیں شروع سے ہی تھا اور اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ کسی سے پوچھنے میں انہیں عار نہ تھی۔ فوجی مشق و تربیت کے بعد ہر روز انہیں جتنا بھی وقت ملتا وہ اس کو اپنے کسی نہ کسی دوست کی مدد سے لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے فوجی بارکوں کی مدہم روشنی میں بھی انکا مطالعہ جاری رہتا اور جب پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو وہ اپنے چھوٹے سے کمرے سے باہر نکل آتے اور روشنیوں میں چمکتے ہوئے شہر تہران کا دور سے نظارہ کرتے۔

اُس زمانے میں کسی کو فوجی زندگی سے دلچسپی نہ تھی اور چونکہ حکومت کے پاس طاقت نہیں تھی اسی لئے معمولی سے معمولی ٹیکس بھی وصول نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے حکومت کے ملازمین کو تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ سپاہی کبھی مرغی کے انڈے بیچ کر اور کبھی ایندھن فروخت کر کے یا اسی قسم کے دوسرے کاموں سے اپنا اور بیوی بچّوں کا پیٹ پالتے تھے۔ اور کبھی اتفاق سے حکومت تنخواہ کے نام سے کچھ دینا چاہتی تو بجائے نقد روپے کے اینٹیں یا دوسرا عمارتی سامان دے دیتی کیونکہ خزانے میں نقد روپیہ موجود نہ ہوتا تھا۔ میرے والد اکثر سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ وزارتِ خارجہ نے کسی بڑے آدمی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا چونکہ وزارت خانے کے پاس سامان خریدنے کو پیسہ نہ تھا اس لئے بازار سے سامان قرض خرید کر دعوت کا انتظام کیا گیا۔

فوج کی حالت بُری طرح خستہ و زبوں تھی۔ ساز و سامان اور ہتھیار سب پرانے اور بُری حالت میں تھے (پوری فوج میں چند توپوں کے سوا کچھ نہ تھا) لوگوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور میرے والد کی نظر میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ وہ فوج جس میں وہ ملازم تھے غیر ملکی افسروں کے ماتحت تھی۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرے والد صاحب کی اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہوگی اور دل پر کیا گذرتی ہوگی جب وہ یہ دیکھتے ہوں گے کہ فوج کے لئے احکام بجائے ایران کے دارالسلطنت کے روس کے پایۂ تخت سے صادر ہو رہے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے دل میں جذبۂ وطن پرستی اس وقت شدّت سے ابھرا ہوگا جب انہوں نے حقیقی طور پر غیر ملکی تسلّط کے اثرات کو سمجھ لیا ہوگا۔

میرے والد صاحب نے پہلے سپاہی کی حیثیت سے اور بعد میں افسر ہو کر بہت سی جنگوں میں شرکت کی اور بہت سے سرکش اور باغی قبائلی سرداروں کو جنہوں نے شہروں اور قصبات میں لوٹ مار مچا رکھی تھی سرکوب کیا تھا۔ ایران کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی ہے تو قبائلی لوگ قتل و غارت گری شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر حکومت طاقتور ہو اور ان کو مطیع کرلے تو یہی لوگ ملک کی تعمیر میں بہت اہم کام انجام دیتے ہیں۔ میرے والد کو نہ صرف قبائلی لوگوں اور اُن لٹیروں کی سرکوبی کے لئے متعدد بار افسر مقرر کیا گیا جنہوں نے فوجی دستوں کی طرح خود کو منظّم کر رکھا تھا بلکہ انقلابِ روس کے بعد جب بالشویکوں نے ایران پر حملہ کیا تو وہ کئی جنگوں میں خود شریک تھے۔

میرے والد صاحب نے ایک دفعہ لٹیروں کی جماعت کا مقابلہ کیا۔ لڑائی کے وقت جو احساسات ان کے دل میں پیدا ہوئے وہ انہوں نے مجھے سنائے جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مقابلے کے وقت

ایران کی بدامنی اور بدحالی سے اتنی نفرت ہوئی کہ میں نے جان بوجھ کر خود کو لٹیروں کی گولیوں کے سامنے کر دیا۔ اُس وقت میں سفید گھوڑے پر سوار تھا اور آسانی سے مجھے گولی کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں صاف بچ گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے احساسات میرے والد کے دل میں کس وجہ سے پیدا ہوئے۔ آج میں تصوّر کی آنکھ سے ان کو سفید گھوڑے پر سوار دیکھ سکتا ہوں، ملک کی افسوسناک حالت نے ان کے مردانہ اور پروقار چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں کر دیئے ہیں۔ اگر سچ پوچھا جائے تو یہ ملک اُن دنوں میں ملک کہنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ اس کی مرکزی حکومت اس قدر ناکارہ ہو چکی تھی کہ اس کو حکومت کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ملک کا بڑا حصہ مقامی سرداروں اور نوابوں کے قبضے میں تھا جو بظاہر تو شاہ سے اس کی عزت و آبرو کی حفاظت اور وفاداری کا اظہار کرتے لیکن عملی طور پر مطلق العنان تھے اور اپنی ریاست میں لوگوں پر جس قدر بھی ظلم ہو سکتا تھا روا رکھتے۔ فوج کے پاس جدید قسم کے ہتھیار نہ تھے اور جو کچھ مسلح فوج تھی وہ ملک کی وفادار نہ تھی۔ امن و امان ہر طرف سے اٹھ چکا تھا۔ عدالتوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ لوگوں کے فیصلے مفتیانِ دین اور قبیلوں کے سردار کیا کرتے تھے۔ ملک کا بڑا حصہ ایسا تھا جہاں کا قانون ہی یہ بن چکا تھا کہ زبردست زیردستوں پر زور آزمائی کرتے رہیں جن کے پاس زور تھا وہ کبھی ظلم سے باز نہ آتے اور جو مظلوم تھے وہ ہمیشہ ظلم و ستم سہتے رہتے۔

بدامنی کا یہ عالم تھا کہ شہر تہران میں جو پورے ملک کا پایۂ تخت ہے لوگ سورج چھپنے کے بعد اگر بہت ہی ضروری کام ہو جیسے ڈاکٹر کو بلانا (جس کا ملنا بھی ایک امرِ محال تھا) یا اسی قسم کا کوئی دوسرا کام ہو تو گھر سے باہر نکلتے تھے ورنہ گھر بند کئے بیٹھے رہتے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اگر گھر سے باہر نکلے تو عین ممکن ہے کہ محلے کے غنڈے اور بدمعاش ان کو لوٹ لیں۔ وسائلِ آمد و رفت تو داریوش کے عہد سے بھی زیادہ بدتر اور ناقابلِ اطمینان تھے۔ جو مسافر تہران سے مشہد جانا چاہتے تھے وہ چوروں اور لٹیروں کے ڈر کی وجہ سے روس کی سرحدوں میں سے گزر کر سفر کیا کرتے تھے۔ جنوبی ایران کا ایک صوبہ خوزستان ہے وہاں پہنچنے کے لئے لوگ ترکی اور عراق کا سفر کیا کرتے تھے۔

پہلے بھی اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ جو غیر ملکی (ان میں وہ بالشویک بھی شامل تھے جو بڑی تعداد میں ایران میں آگئے تھے) ایران میں مختلف جرائم کے مرتکب ہوتے تھے ان پر خاص شرائط کی وجہ سے ایرانی عدالتوں میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ دراصل اُس زمانے میں کوئی ایسا باصلاحیت اور پروقار حاکم بھی نہ تھا جو اس کام کو انجام دیتا خاص معاہدہ کے نفاذ کا سبب ہی یہ تھا کہ ملک میں قابل اور اہل حکام کا فقدان تھا۔ اقتصادی معاملات میں بھی ہم پوری طرح آزاد نہ تھے۔ کیونکہ قاجاری بادشاہوں نے مختلف تجارتی حقوق غیر ملکیوں کو سونپ رکھے تھے۔ ایک طرف بیرونی طاقتیں اور دوسری طرف غنڈے اور لٹیرے پورے ملک میں من مانی کر رہے تھے۔ بیچارے عوام جہل، بیماری، افلاس اور فلاکت میں پس رہے تھے اور سب کے دلوں پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی جس وقت پوری قوم تباہیوں اور بربادیوں میں

گھری ہوئی تھی تو شاہِ وقت کے سر میں یورپ کی سیر کی دھن سوار تھی اور اگر کوئی فکر تھی تو یہ تھی کہ کس طرح عیش و عشرت پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جائے۔ ان حالات میں ایک وطن پرست سوائے شرمندگی کے احساس کے کر بھی کیا سکتا تھا۔

وقت کی مجبوری زمانے کے حالات اور قوم کے رجحانات کا جب تقاضا ہوتا ہے تو ایسا مردِ آہن پیدا ہوتا ہے جو لوگوں کو مصائب سے نجات دلا سکے۔ ایسا آدمی ملک کی تقدیر بدل دیتا ہے اور تاریخ کے دھارے موڑ دیا کرتا ہے۔ ان دنوں ایسے ہی بہت سے شواہد سامنے آرہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ میرے والد ایسے ہی انسان ثابت ہوں گے۔

۱۹۲۰ء کے اوائل تک ایرانی قزاقوں کی بریگیڈ کی نگرانی روسی افسروں کے ذمے تھی۔ کہنے کو تو یہ افسر سفید روسی کہلاتے تھے لیکن ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے خود کو بالشویکیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا جب سرخ روسیوں نے ایران کے شمالی صوبے پر قبضہ کر لیا تھا اور اس بریگیڈ کو سرخ روسیوں کے خلاف لڑنے کے لئے مقرر کیا گیا تو بالشویک افسروں نے کھلم کھلا ایران کے ساتھ غداری کی۔ میرے والد کو قوم پرستی کے جذبے نے اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ روسی افسروں کے فتنے سے سرزمینِ ایران کو پاک کر دیں۔

اگست ۱۹۲۰ء میں میرے والد نے اپنے ضمیر کی آواز کو مان لیا اور قزاق بریگیڈ کے روسی افسروں کو باہر نکال دینے کی راہ نکال لی۔ انہوں نے کمانڈر کا عہدہ خود سنبھال لیا۔ حکومتِ ایران نے ان کے اس عمل پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور فوراً اس عہدے پر تقرری کی منظوری دے دی۔ انہوں نے جو عزم و ارادہ کیا تھا اس کو پورا کیا اور غیر ملکی اقتدار کو پست کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد میرے والد نے اقتدار کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کیں یہاں تک کہ ایک دن پورے طور پر زمامِ اختیار ان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس مقصد کی برآری کے لئے انہوں نے سید ضیاء الدین طباطبائی نامی صحافی کی خدمات حاصل کیں۔ یہ شخص علمائے دین کے خاندان سے تھا اور بڑی بے باکی سے حکومت کی بداعمالیوں اور ملک کے ناسازگار حالات پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ اپنے خیالات کے اعتبار سے وہ انقلاب پسند انسان تھا جس وقت میرے والد نے فوج کی مدد سے ملک کے پایۂ تخت کو حاصل کرنے کے لئے ناکہ بندی کی تو اسی شخص نے تمام حکومت کے افسروں پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔

میرے والد نے قزوین سے جو شمال مغربی ایران کا ایک شہر ہے اپنے لشکر کو تہران کی طرف روانہ کیا اور فروری ۱۹۲۱ء میں بغیر کشت و خون کے فوجی انقلاب کے ذریعے قاجاریوں کی کمزور اور بے جان حکومت کو برطرف کر دیا۔ سید ضیاء الدین کو وزراء کی کابینہ کا صدر چنا گیا اور میرے والد وزیرِ جنگ اور تمام فوجوں کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

سید ضیاء الدین کا شمار بڑے سرگرم اصلاحی کام کرنے والوں میں ہوتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد اس نے ملک کے متمول طبقے اور حکومت کے اعلیٰ افسروں سے سازباز شروع کر دی۔ میرے خیال میں میرے والد کو اس کے سیاسی و اقتصادی نظریات سے نہیں بلکہ اس کے طرزِ عمل اور سوجھ بوجھ کے طریقے سے اختلاف تھا چنانچہ فوجی انقلاب کے تین ماہ بعد احمد شاہ

نے کسی دوسرے شخص کو وزراء کا صدر مقرر کر دیا۔ میرے والد نے اس تقرر پر کوئی اظہار اختلاف نہیں کیا۔
میرے والد کو ہر کابینہ میں وزیرِ جنگ مقرر کیا گیا۔ پوری کابینہ میں وہی ایسے شخص تھے جن کو بہت با اثر سمجھا جاتا تھا چنانچہ ۱۹۲۳ء میں وہ وزیراعظم چنے گئے۔ اس کے فوراً بعد احمد شاہ جو نہایت کمزور بادشاہ تھا نامعلوم مدت کے لئے یورپ چلا گیا۔
میرے والد کے وزارتِ عظمیٰ پر پہنچنے سے ایک سال قبل ترک خلافت کی بوسیدہ بساط کو لپیٹ چکے تھے بتھوڑے عرصے بعد انہوں نے کمال اتاترک کی قیادت میں جمہوری حکومت قائم کی۔ ایران کے بعض حلقوں میں جو ترکی کے واقعات سے متاثر تھے یہ خیالات گردش کرنے لگے کہ یہاں بھی جمہوری نظام قائم ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے والد بھی ایک مدت تک جمہوری نظام کے حق میں تھے لیکن چونکہ ہزاروں سال سے ایران میں یہ روایت چلی آرہی تھی کہ حکومت کا سربراہ ایک بادشاہ ہی ہونا چاہئے اس لئے عوامی رائے اس نظریئے کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ ایران کے بہت سے صوبوں میں ایسے جمہوریت پسند لوگ موجود تھے جو ایسے جمہوری نظام کے حامی تھے جس کا سرپرست بادشاہ ہی ہو۔
۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ایرانی پارلیمنٹ نے احمد شاہ کو جو یورپ کی سیر وسیاحت کے لئے گیا ہوا تھا اور کچھ عرصے کے بعد اس کا وہیں انتقال ہوا تختِ سلطنت سے معزول کر دیا اور میرے والد کی شہنشاہیت کا اعلان کیا۔ ۲۵ اپریل ۱۹۲۶ء کو ان کی تاجپوشی ہوئی اور اسی موقع پر میرے ولیعہد ہونے کا اعلان کیا گیا۔
۱۹۳۴ء میں میرے والد نے ترکی کا سفر اس ملک کی حیرت انگیز ترقی کے مشاہدے اور سیاسی و ثقافتی روابط کے استحکام کی غرض سے کیا تھا۔ میری رائے میں اس دور کے ایران اور ترکی کا مقابلہ یہاں بہت مناسب ہوگا۔ نظامِ خلافت کو ختم کر کے جب ترک مغربی ممالک کے زیادہ نزدیک آئے اور ان کے تہذیب و تمدن کو اپنایا تو وہ ترقی کی راہ میں ہم سے کہیں آگے بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی فوج کی تنظیم جرمن قواعد کے مطابق کی تھی۔ ان کے ملک میں فوجی یونیورسٹیاں ہتھیار بنانے کے کارخانے اور اچھے تربیت یافتہ افسر سب ہی کچھ موجود تھا۔ وہ پہلی عالمگیر جنگ میں بڑی بہادری سے لڑے اور اتحادیوں کی بہترین فوجوں سے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ میرے والد کے عنانِ اختیار سنبھالنے سے پہلے ایران میں ہر طرف طوائف الملوکی تھی لیکن اس وقت ترکوں نے بڑی مضبوط حکومت قائم کر رکھی تھی۔ جو پورے ملک میں نظم و نسق قائم کئے ہوئے تھی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ریلیں، بندرگاہیں، کارخانے اور دوسری وہ تمام چیزیں موجود تھیں جن سے ان کے متمدن ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ ان کے مقابلے میں ہمارے پاس اس طرح کا کچھ بھی ساز و سامان موجود نہ تھا۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ترقی کی راہ ہمیں ترکوں سے زیادہ طویل طے کرنی تھی۔
میرے والد اپنے فیصلوں میں کسی طرح کی نرمی کے قائل نہ تھے۔ وہ جس کام کو پورا کرنے کا ارادہ کر لیتے تو اس پر تیزی سے عمل کے ساتھ ہی بڑے سکون و اطمینان سے اس کے ہر پہلو پر غور و فکر کرتے اور اپنے فیصلوں میں کسی کا دباؤ

میرے والد رضا شاہ پہلوی، میری بہنیں (بائیں سے دائیں) شہزادی شمس، شہزادی اشرف اور میں خود

گلستان محل میں اعلیٰحضرت رضا شاہ پہلوی کی تاجپوشی

گلستان محل کا وہ حصّہ جہاں تختِ طاؤس رکھا ہے۔ یہ تاجپوشی کے موقعوں کے لئے مخصوص ہے

یا اثر قبول نہیں کرتے تھے چنانچہ فوجی انقلاب کے پانچ روز بعد روس اور ایران کے درمیان دوستی کے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلا معاہدہ تھا اور بڑے عرصے سے التوا میں پڑا ہوا تھا جس طرح وہ فوج کشی میں عجلت سے کام لیا کرتے تھے بالکل اسی طرح اس معاہدے کی تکمیل میں بھی انہوں نے سرعت دکھائی۔

اس معاہدے کی رو سے روس کو ان تمام مطالبات اور حقوق سے جو اس کو ایران میں حاصل تھے دست بردار ہونا پڑا اور تمام ادارے اور کارخانے جیسے قرضہ دینے والے بینک، روس کے سرحدی شہر جلفا سے تبریز تک بچھی ہوئی چھوٹی ریلوے لائن، بحرِ خزر کی بندرگاہ انزلی (آج یہ بندرگاہ بندر پہلوی کے نام سے مشہور ہے) کا کل ساز و سامان، پکی سڑکیں ٹیلیگراف کی لائنیں سب واگذار کرنی پڑیں۔ ترکمانچائے معاہدے کی رو سے ایران کو بحرِ خزر میں تجارتی جہاز استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں تھا لیکن نئے معاہدے کے مطابق اس کو برابر کے حقوق مل گئے تھے قانون خاص مراعات جو ایرانیوں کے لئے نفرت کا سبب تھا منسوخ کر دیا گیا۔ اس معاہدے کے بعد ایرانیوں نے یہ بات واضح طور پر محسوس کی کہ زار روس اور بعد میں آنے والی سوویت روس کی حکومت کی سیاسی حکمتِ عملی میں کافی تبدیلی آ گئی ہے۔

۱۹۱۹ء میں جو معاہدہ ایران اور انگلستان کے درمیان ہوا تھا میرے والد اور ان کی حکومت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ اوپر بھی ذکر آ چکا ہے کہ اس معاہدے پر اگرچہ دستخط ہو چکے تھے لیکن ایران کی قومی پارلیمنٹ نے اس کو منظور نہیں کیا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے نہ صرف انگلستان کے فوجی مشیر بلکہ دوسرے مشیر بھی ایران آئے اور ریلوے لائن بچھانے کی غرض سے کچھ انگریز انجینیئروں کو نقشے تیار کرنے کے لئے روانہ کیا لیکن ایران کے وطن پرستوں نے اس معاہدے کی شدید مخالفت کی جس کے نتیجے میں اس معاہدہ کو بھی باطل قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انگریزی فوج کا آخری دستہ بھی ایران سے چلا گیا۔ لیکن روس کی کچھ فوج ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر پڑی رہی جس کی وجہ سے روس کی فوجی مداخلت پورے طور پر ہمارے ملک سے ختم نہ ہو سکی۔ اس اہم واقع کی تفصیل میں اگلے باب میں بیان کروں گا۔

مندرجہ بالا مسائل کے ساتھ ہی ساتھ میرے والد ملک کی اندرونی اصلاحات کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوئے۔ یہ ان کی دیرینہ آرزو تھی اور جس کی طرف انہوں نے سب سے پہلا قدم اٹھایا کہ پورا ملک جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا اس کو ایک بار پھر متحد کر دیں۔ اس کام کو کرنے کے لئے بڑی طاقتور فوج کی ضرورت تھی جس دن سے انہیں وزیرِ جنگ اور ایرانی فوجوں کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا انہوں نے اس امر کی کوشش شروع کر دی تھی کہ ایرانی قزاقوں کی بریگیڈ، جنوبی پولیس، جاندارمری[1] اور دیگر تمام دستوں کو اکٹھا کر کے ایک مضبوط متحدہ فوج کی تشکیل کریں۔ سپاہیوں کی غذا، ان کی باقاعدہ تنخواہ کا انتظام اور جدید فوجی تعلیم ایسے مسائل تھے جو ان کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ وطن کی خدمت کے لئے حوصلہ بڑھانا اور ایرانی ہونے پر فخر کرنا ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

۱۹۲۴ء تک ایرانی فوج پانچ لشکروں، ایک آزاد پلٹن پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ ایک حفاظتی دستہ بھی تھا جو

1. GENDARMERIE

راستوں کی دیکھ بھال، امن وامان اور مسلح لٹیروں اور ڈاکوؤں سے مسافروں کو بچانے کے لئے متعین کیا گیا تھا (میرے والد نے خطرناک راستوں پر چوکیاں بنوائی تھیں جن میں مستقل طور پر سپاہی رہا کرتے تھے۔ مسافروں اور راستوں کی حفاظت اور دیکھ بھال اُن کے ذمے تھی) تھوڑے عرصے بعد اس فوج میں مختصر سے بحری اور ہوائی دستے کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں لازمی فوجی تربیت کا قانون نافذ کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک اور بھی اس میں اصلاحی کام کئے گئے۔ دو فوجی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ کچھ نوجوانوں کو تربیت کے لئے فرانس بھیجا گیا اور کچھ فرانسیسی مشیروں کو ایرانی فوج میں ملازم بھی رکھا گیا۔

میرے والد کے ایک بڑے قریبی دوست نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی فوج کے تہران میں داخل ہونے کے تھوڑے عرصے بعد کی بات ہے کہ وہ اپنے منہ میں کچھ گنگنا رہے تھے اور پھر ایک دم اونچی آواز سے خود سے باتیں کرنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے، "کاش میرے پاس ایک ہی طرح کی ہزار بندوقیں ہوتیں"۔ اس جملے سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے دل میں یہی خیال تھا کہ ملک میں امن وسلامتی کس طرح قائم ہو۔ صورتحال جو بھی ہو لیکن ان کی یہ آرزو اور مونہہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس بات کو پورے طور پر واضح کر دیتے ہیں کہ اس وقت ساز و سامان کے اعتبار سے ایرانی فوج کی حالت کس قدر زبوں تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بہت جلد ایک کارخانہ بندوق سازی کا، دوسرا مشین گن بنانے کا اور تیسرا چھوٹے ہتھیاروں کے لئے کارتوس تیار کرنے کا قائم کیا۔ یہ کارخانے جو ان کی ہمت اور کوشش کا نتیجہ ہیں دوسرے کارخانوں کی طرح جو جنگی سامان تیار کرتے ہیں چل رہے ہیں۔

ان اہم کاموں کے ساتھ ہی ساتھ پورے ملک میں امن وسلامتی قائم رکھنے کی غرض سے میرے والد نے کئی بار فوج کشی بھی کی۔ انہوں نے میرزا کوچک خان کی سرکوبی کے لئے بھی فوج روانہ کی۔ یہ شخص کیمونسٹوں کا زبردست حامی تھا اور بحرِ خزر کے صوبوں پر زور و زبردستی سے قابض ہو گیا تھا اور ۱۹۲۱ء کے معاہدے پر دستخط ہونے سے قبل تک روسی اعلانیہ اُس کی مدد کر رہے تھے۔ اس جنگ میں میرزا کوچک خان کو شکست ہوئی اور اس کے ساتھی فرار ہو گئے۔ صوبہ فارس، خوزستان اور بلوچستان کے قبائلی سردار انگریزوں کی شہ پر زور پکڑ گئے تھے اور اعلانیہ حکومتِ وقت سے بغاوت پر آمادہ تھے۔ ان کا انجام بھی وہی ہوا جو میرزا کوچک خان کا ہوا تھا۔

جس زمانے میں میرے والد قزاق بریگیڈ کے افسر تھے ایک دفعہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ تہران سے ہمدان گئے۔ پوری رجمنٹ میں صرف ایک ہی گھوڑا تھا جو مریضوں کو لے جانے کے لئے مخصوص تھا۔ راستوں کا طے کرنا اس قدر دشوار تھا کہ پیادہ بھی مشکل ہی سے گذر سکتا تھا۔ میرے والد اگرچہ ایک بڑے تجربہ کار افسر تھے انہوں نے زندگی میں اس قدر سختیاں اٹھائی تھیں کہ کڑی سے کڑی مشکل کو برداشت کر لیتے تھے لیکن وہ بھی جس وقت منزل پر پہنچے تو زخموں کی شدت اور پیروں کے شل ہو جانے کی وجہ سے بیمار پڑ گئے۔ اس لئے یہ تعجب کی بات نہیں کہ جس وقت وہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوئے تو ملک میں امن وامان کے بعد جو مسئلہ سب سے زیادہ ان کی نظر میں اہم تھا وہ سڑکوں اور وسائل آمد و رفت

تو درست کرنا تھا۔ یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو گئی تھی کہ اچھے راستوں کے بغیر ملک میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

انجینئر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایران کی پوری ریلوے لائن جو میرے والد کے ہاتھوں ۱۹۲۷ء میں شروع ہو کر ۱۹۳۹ء میں مکمل ہوئی اس لحاظ سے سب سے زیادہ دلچسپ ہے کہ اتنی طویل ہونے کے باوجود اس قدر کم وقت میں تیار ہوئی۔ فنی اعتبار سے بھی یہ ریلوے لائن سوئٹزرلینڈ کی ریلوے لائن سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ لائن ۴۱۰۰ پلوں اور ۲۲۴ سرنگوں میں سے گذرتی ہے جن کی مجموعی لمبائی ۵۴ میل ہے۔ ان میں سے ایک سرنگ تو دو میل لمبی ہے۔ اس کے علاوہ کتنی ہی ایسی سرنگیں ہیں جو پہاڑوں میں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی گذرتی ہیں اور یہ پیچ و خم ایک دوسرے کے اوپر سخت چٹانوں میں بنتے چلے گئے ہیں۔

نو سو میل لمبی لائن (بعد میں اور بھی اضافہ ہوا ہے اور یہ لائن ملک کے بہت سے حصوں میں بچھ گئی ہے) کے اخراجات قند اور چائے کے ٹیکس کی رقم سے پورے کئے گئے۔ یہ ٹیکس زیادہ تر ان کسانوں اور کاشتکاروں نے ادا کئے جو اپنی نقد آمدنی کا ایک معقول حصہ چائے اور شکر پر خرچ کرتے ہیں۔ میرے والد غیر ملکی قرضوں کے سخت خلاف تھے کیونکہ غیر ملکی قرضوں کی وجہ سے جوان کے بزرگوں نے نقصان اٹھائے تھے وہ اس کو بھلا نہیں سکتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے غیر ملکی قرضوں سے پرہیز کیا لیکن ریلوے لائن کو جلدی مکمل کرنے کی غرض سے انہوں نے بغیر کسی نسلی اور قومی امتیاز کے مختلف قوموں اور ملکوں کے انجینئر ملازم رکھے۔ میرے والد نے کئی اہم مقامات پر پکی سڑکیں اور بحر خزر کے ساحل پر اور خلیجِ فارس میں بندرگاہیں تعمیر کرائیں۔ بین الاقوامی اور داخلی سطح پر ہوائی سروس انہوں نے ہی قائم کی۔ ایران میں ٹیلیگراف کا انتظام انڈو یورپین نامی انگریزی کمپنی کے اختیار میں تھا ۱۹۳۱ء میں میرے والد نے اس کمپنی کے یہ اختیارات ختم کر دیئے۔

ایران کی اقتصادی اور مالی آزادی برقرار رکھنے کے لئے کرنسی چھاپنے کا حق قومی کر دیا گیا۔ میرے والد نے ایرانی قومی بینک (بانک ملی ایران) بھی قائم کیا جس کا انتظام ایران کے اہل اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس بینک میں کام کرنے والوں کے لئے کلب، ریسٹورانٹ، نہانے کے لئے حوض، ورزش و تفریح کا سامان، ہسپتال اور پورے ساز و سامان سے آراستہ چھاپے خانے تیار کریں۔ اس بینک نے بہت جلدی ہی بہت سی شاخیں ملک کے مختلف شہروں میں قائم کر دیں۔ آمد و خرچ کا سب سے پہلا باقاعدہ بجٹ بھی تیار کر دیا۔ ڈاکٹر آرتھر سی میلسپو[1] امریکی باشندہ تھا۔ وہ اقتصادی معاملات کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میرے والد نے ایرانی مالیات کی اصلاح کے لئے اس کا تقرر کیا۔ وہ پانچ سال تک ایران میں رہا۔ کچھ عرصے بعد اس کو دوبارہ بلا لیا گیا۔ اس نے ایران کے دو سفر کئے اور ان دونوں سفروں کے مشاہدات اور تجربات دو کتابوں میں شائع کئے۔

جس دن میرے والد نے عنانِ اقتدار کو سنبھالا تو بجلی بنانے، دیا سلائی تیار کرنے اور تیل صاف کرنے کے کارخانوں کے علاوہ کوئی اور صنعت ایران میں نہ تھی اور اس پر بھی غیر ملکیوں کی اجارہ داری تھی۔ میرے والد کی کوشش تھی کہ ایران

1. DR. ARTHUR C. MILLSPAUGH

اپنی ضروریات کی چیزیں دوسروں کی مدد کے بغیر خود ہی تیار کرے چنانچہ ان کے دورِ حکومت میں روئی، اون اور ریشم بُننے کے کارخانے، چمڑے، جوتے، بٹن، کاغذ، سیمنٹ، اینٹ، شیشہ اور دوائیاں بنانے کی فیکٹریاں قائم ہوئیں ہتھیار اور سامانِ جنگ بنانے کے کارخانے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ان کے علاوہ تھے۔ ان میں سے بعض کارخانے حکومت کے سرمائے سے، بعض حکومت اور ایرانی سرمایہ داروں کے اشتراک سے اور بعض صرف ایرانی سرمایہ داروں کے سرمائے سے قائم کئے گئے تھے۔ یہ اقدامات اس نظریئے کے تحت کئے گئے تھے کہ کہیں سوویت یونین حکومت اپنے کارخانوں کو مالی امداد دے کر جو مال ایران میں تیار ہوتا ہے ویسا ہی کم قیمت پر ایران میں بھیج کر ایرانی مارکیٹ پر قبضہ نہ کرلے۔ میرے والد نے غیر ملکی تجارت کے سلسلے میں حکومت کی اجارہ داری کے اصول کے تحت بہت سے اقدامات کئے۔ انہوں نے پورے ملک میں ناپ تول اور مقدار کے یکساں پیمانوں کے استعمال کو فروغ دیا اور وہ تمام اوزان ایک دم ختم کردیئے جن کا حساب کرنے میں حساب داں بھی چکرا جاتے تھے۔

میرے والد نے یہ بھی حکم دیا کہ غیر ممالک کی جو حکومتیں اپنی تحریروں میں لفظ "پرشیا" استعمال کرتی ہیں اُن کے ساتھ خط و کتابت میں اِس کی بجائے "ایران" استعمال کیا جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ونسٹن چرچل نے جو اس وقت پریشان نظر آرہا تھا شوخی سے آنکھ مار کر کہا تھا کہ کوئی شخص مجھے اس بات کے لئے مجبور نہیں کرسکتا کہ میں پرشیا کے لئے بجز پرشیا کے کوئی اور لفظ استعمال کروں۔ حال ہی میں مَیں نے ایرانی دانشوروں اور برجستہ شخصیتوں کی درخواست پر اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ پرشیا اور ایران دونوں ہی لفظ مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے مترادف استعمال کرسکتے ہیں۔

شاید آپ خیال کریں گے کہ جس ماحول میں میرے والد نے اپنے جوانی کے دن گذارے تھے اس کے پیشِ نظر وہ اجتماعی اور ثقافتی اصلاحات میں دلچسپی نہ لیتے ہوں گے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ انہوں نے عدلیہ کا جدید نظام قائم کیا جس کی بنیاد یورپین اقوام کے عدالتی قوانین اور خاص طور پر فرانسیسی نظام کے مطابق تھی۔ انہوں نے عدالتوں میں بہت سے نئے شعبے کھولے اور محکمۂ عدلیہ کے فیصلے کرنے کا فرسودہ نظام جو دینی علماء کے ہاتھ میں تھا نئی عدالتوں کو سونپ دیا۔ ایک سال بعد انہوں نے کاپیچولیشن قانون کو سرکاری طور پر ختم کردیا۔ باوجود اس کے ملک میں اسکول ٹیچر بہت کم تھے لیکن انہوں نے یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کی طرح پورے ملک میں عام مفت تعلیم کو لازمی قرار دیا۔

۱۹۳۴ء میں میرے والد نے تہران یونیورسٹی قائم کی۔ یونیورسٹی کی تمام عمارتیں جدید طرز کی ہیں اور ایک بہت وسیع میدان میں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے عہدِ حکومت سے قبل چند ہی ایرانی طالب علم پڑھنے کی غرض سے باہر جاتے تھے لیکن ان کے عہد میں طالب علموں کو حکومت کے خرچ پر یورپ بھیجنے کا پروگرام مرتب کیا گیا اور اب ہر سال سینکڑوں ایرانی

نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کا سفر کرتے ہیں۔

یہ تھا مختصر ذکر ان بنیادی اور وسیع اصلاحی اور ترقیاتی منصوبوں کا جن کو میرے والد نے پورے ملک میں عملی جامہ پہنایا۔ ان کے بعد جو کارہائے نمایاں میں نے انجام دیئے ہیں دراصل ان کی مضبوط بنیاد انہوں نے ہی رکھی تھی۔ میرا یہ کہنے کا مقصد نہیں ہے کہ میرے والد سے پورے دورِ سلطنت میں کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی کیونکہ انسان خواہ کوئی بھی ہو غلطی سے بچ نہیں سکتا۔ کوئی بھی بڑا فرمانروا جو میرے والد کی طرح عملی انسان ہوگا غلطیاں کئے بغیر نہ رہ سکے گا مثلاً بعض لوگ جو میرے والد کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ میرے والد نے ملک کی صنعت کو ترقی و توسیع دینے کے لئے جتنی توجہ دی اتنی کاشتکاری پر نہیں دے سکے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میرے والد نے اپنی تاجپوشی کے بعد ایرانی پارلیمنٹ پر اپنا پورا غلبہ رکھا اور کبھی اس کو ختم کرنے کے اقدامات نہیں کئے۔

باوجود ان سب باتوں کے میرے والد صاحب کی خدمات کو سمجھنے کے لئے یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ اس وقت کے ایران میں اور موجودہ ایران میں بہت فرق ہے، اگر میرے والد نے کاشتکاری سے زیادہ صنعت کی طرف توجہ دی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ایران میں صنعت تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے مقابلے میں ہمارے کاشت کار ہزاروں سال سے اپنے زراعتی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور اگر میرے والد نے ڈیموکریسی اور آئینی اصولوں کی پابندی نہیں کی تو اس کا سبب یہ تھا کہ حقیقی ڈیموکریسی کے لئے لازمی ہے کہ رائے دینے والے پڑھے لکھے ہوں تاکہ قانون ساز اسمبلی مفید و موثر قوانین بنا سکے۔ اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ دراصل میرے والد نے تعلیم کے شعبے کو توسیع دے کر عوام میں تعلیم پھیلانے کی طرف توجہ دی تاکہ حقیقی ڈیموکریسی کے لئے راستہ ہموار ہو سکے۔

اسی طرح یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ میرے والد کی شخصیت مجھ سے بہت مختلف تھی۔ انہوں نے جن کاموں کو پورا کرنے کا عزم کیا تھا اس کے لئے ان میں ذاتی اور فطری صلاحیتیں بھی تھیں لیکن وہی فطرت اور صلاحیت آج کے حالات میں مناسب نہ تھی اور مجھے پورا الیقین ہے کہ اگر ان حالات میں اپنے والد کی جگہ ہوتا تو جس طرح سے انہوں نے کام کئے ہیں میں اس حسن و خوبی سے انجام نہ دے پاتا۔ موجودہ صورتِ حال میں شخصیت کے اعتبار سے شاید میں اپنے والد صاحب سے زیادہ مناسب ہوں۔

بہرحال ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ زمانے کے حالات اور وقت کے تقاضے ہر دور میں افراد کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کا وجود زمانے کے بدلتے حالات کا نتیجہ ہے۔ اس کی زندگی میں اور بھی بہت سے اسباب ہیں جو اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس بات کا ذکر میں اگلے باب میں کروں گا کہ جس ماحول میں میری پرورش ہوئی ہے وہ میرے والد صاحب کا پیدا کیا ہوا تھا اور اس کی تیاری میں ان کی شخصیت کارفرما تھی۔ باوجود اس کے کہ ان کی شخصیت کا مجھ پر اتنا گہرا اثر پڑا لیکن ہماری طبیعتیں ایک دوسرے سے جدا تھیں جس روز میرے والد کی ولادت

ہوئی تھی۔ اگر میں نے بھی اِس دنیا پر اُسی دن قدم رکھا ہوتا (یعنی میں ان کا جڑواں بھائی ہوتا) اور اسی ماحول میں میری پرورش ہوئی ہوتی پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہماری شخصیت ایک دوسرے سے الگ ہوتی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تاریخ کے اس عجیب اتفاق کا ہم دو انسانوں کی زندگی میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔ اپنی ذات اور شخصی صلاحیتوں کے اعتبار سے اُس دور میں ملک کی خدمت کے لئے وہ مجھ سے بہتر ثابت ہوئے اور ان کے ادب اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ میری طبیعت موجودہ ایران کے لئے زیادہ مناسب ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ حیات ہوتے تو اس بات کی تصدیق کرتے۔

ایران جس وقت گوشۂ گمنامی میں تھا تو میرے والد نے ہمیں فرار کی بجائے مغربی دنیا اور اس کے تمدن کی طرف توجہ دلائی۔ یہ انہی کی ذات تھی جس نے پوری قوم کو نئی زندگی کی راہ دکھائی اور ان کے لائے ہوئے انقلاب نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کو نئی قدروں سے روشناس کرایا۔

۳ــــ میرا بچپن

ساری دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ بیٹے کی اخلاقی اور ذہنی ترقی میں باپ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ میرا معاملہ بھی اِس اصول سے الگ نہیں ہے اور میری اخلاقی ترقی میں سب سے زیادہ اثر میرے والد کی شخصیت کا ہی رہا ہے۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہوں گا کہ میں اپنے والد کے اخلاق و کردار کی مکمّل تصویر نہیں ہوں البتہ ان کا مثبت اور منفی اثر میری شخصیت پر کئی پہلوؤں سے پڑا ہے اس لئے ضروری ہے کہ میں اس فصل کو ان کی اخلاقی اور ذاتی خصوصیات کے ذکر سے شروع کروں۔

سب ہی لوگ یہاں تک کہ اُن کے دشمن بھی بغیر کسی اختلاف کے اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے وہ بڑے عجیب اور غیر معمولی انسان تھے۔ اگر ایک طرف ان کا نام دُنیا کے خوش خُلق ترین انسانوں میں بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا تھا تو دوسری طرف ان کا شمار دُنیا کے سب سے زیادہ رعب دار لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی نگاہ میں وہ اثر تھا کہ بڑی ہمّت اور حوصلے والے لوگ بھی ان کے سامنے کانپنے لگتے تھے۔ لوگوں کی طبیعتوں کو پرکھنے کی ان میں عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں کسی بھی شخص کی کمزوریاں اور خوبیاں، اچھائیاں اور برائیاں اس طرح معلوم کر لیتے تھے کہ گویا ان کی نظریں اس کے دل میں اُترتی چلی جا رہی ہوں اور یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے صاحبِ اقتدار لوگ ان سے نظریں نہیں ملا سکتے تھے۔ لوگوں کی عام رائے سے بالکل برعکس وہ بڑے مہربان اور نرم دل انسان تھے اور اپنے بال بچوں سے بہت زیادہ محبّت کرتے تھے جس وقت وہ گھر میں ہوتے تو ان کی سختی اور رعب پیار محبت کی شکل اختیار کر لیتا اور مجھ سے تو چونکہ میں ان کا ولی عہد تھا نہایت نرمی اور مہربانی سے پیش آتے اور کبھی کبھی تو وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہوتے کہ میرے ساتھ کھیل میں حصّہ لیتے اور دھیرے سروں میں گیت سناتے لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ بھی اسی طرح کا برتاؤ کرتے تھے یا نہیں۔

سادگی ان کی سب سے بڑی خوبی تھی اور ظاہرہ شان و شوکت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں

جو اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے کسی اعلیٰ مرتبے پر پہنچنے کے بعد لوگوں پر اپنے مال و دولت کا رعب ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی ممالک کے حکمراں کبھی سادگی پسند نہیں رہے لیکن میرے والد اس بات میں فخر محسوس کرتے تھے کہ وہ قاجاری بادشاہوں کی طرح ظاہرہ شان و نمود پر فضول خرچی نہیں کرتے۔ اپنے پورے دورِ حکومت میں انہوں نے زیادہ تر فوجی وردی ہی استعمال کی۔ وہ معمولی قسم کی دیسی جرابیں پہنتے تھے، جوتے اکثر گھسے ہوئے ہوتے تھے اور اپنی جیب میں ایک معمولی رومال اور چاندی کا سگریٹ کیس جس میں ایران کے ہی بنے ہوئے سگریٹ ہوتے تھے رکھتے تھے۔ صفائی ستھرائی کا انہیں خاص خیال رہتا تھا۔

چونکہ معدہ کمزور تھا اس لئے سادہ غذا پسند کرتے تھے۔ ناشتے میں صرف چائے پیتے تھے۔ ایرانی زیادہ تر ڈبل روٹی پنیر، انڈے اور میوے وغیرہ سے ناشتہ کرتے ہیں لیکن میرے والد کو ان سب چیزوں سے پرہیز تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں چاول اور اُبلے ہوئے چوزے کے علاوہ کچھ نہیں کھاتے تھے۔ جب کام میں مشغول ہوتے تو مقررہ وقت پر کئی بار ایک معمولی سی پیالی میں چائے پیتے۔ ان کے دفتر کا کل سامان یہ تھا: ایک بہت خوبصورت جڑاؤ میز جو اب میرے کام آتی ہے۔ ایک کرسی۔ ایک صوفہ۔ ایک قالین اور ایک ایران کا پورا نقشہ۔ گھر پر وہ زیادہ تر توشک پر آرام کرتے جو زمین پر بچھی رہتی تھی اور تخت پر کبھی نہیں سوتے تھے چنانچہ اسی طرح میرا بھی زمین پر دراز ہونے کو دل چاہتا ہے۔ انکا روزانہ کام کا معمول بھی بہت سادہ تھا۔ وہ صبح پانچ بجے بیدار ہو جاتے۔ جلدی جلدی نہانے اور خط بنانے کے بعد ناشتے کے لئے میز پر پہنچ جاتے (اگر اس کو ناشتہ کہا جا سکتا ہے) روزانہ کی خبریں اور رپورٹیں جو اس وقت تک اُن کے پاس پہنچ جاتی تھیں وہیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور ٹھیک ساڑھے سات بجے اپنے دفتر میں جا بیٹھتے تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنے چیف سکریٹری کو بلاتے۔ پھر ان لوگوں سے ملتے جن کو پہلے سے وقت دے دیا گیا ہوتا۔ اس کے بعد وزیروں اور اعلیٰ افسروں کے ساتھ کانفرنس ہوتی جو ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہتی۔ اس کے فوراً بعد وہ کھانا کھاتے اور دو بجے پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ شام کا وقت معمولاً فوجی دستوں، آبادکاری کے منصوبوں اور دفتروں کے معائنے میں گذرتا۔ کابینہ کی نشستیں اکثر دوپہر بعد ان کی موجودگی میں ہوتی تھیں۔ چھ سے آٹھ بجے تک سارے دن کی کارروائی جو ان تک پہنچی تھی اس کو پڑھا کرتے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے کھانا کھاتے اور رات کے دس بجے سو جاتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سوتے میں بھی مختلف منصوبے اور کام ان کے ذہن میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت خالی الذہن نہیں رہتے تھے۔

اوپر جن باتوں کا ذکر آچکا ہے اُن پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ میرے والد کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے ہر کام میں باقاعدگی اور نظم و ترتیب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جس وقت پڑھنے کی غرض سے یورپ جا رہا تھا تو انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ فارسی کا سبق جو کبھی میں اپنے معلم سے پڑھوں اس کی اطلاع ہر ہفتے باقاعدہ انہیں بھیجوں تاکہ وہ اس سے باخبر رہیں کہ پڑھائی لکھائی میں مَیں نے کتنی ترقی کی۔ اتفاق سے ایک دفعہ ڈاک کے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اس پر میرے والد اتنے پریشان ہوئے کہ انہوں نے فوراً میرے معلم کو تار دیا اور اس تاخیر کی اسکو سزا دی۔

جو وقت وہ اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ گذارتے اس کے علاوہ کسی اور وقت وہ تفریح یا آرام پسند نہیں کرتے تھے اور پورے سال میں چند گھنٹے کے لئے ایک یا دو بار شکار کے لئے جاتے تھے۔ پیدل چلنا ان کی خاص تفریح تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنے دفتر میں بھی وہ ہمیشہ ٹہلتے رہتے تھے۔ وہ فوجی دستوں کے معائنے اور رفاہِ عام کے منصوبوں کی دیکھ بھال کے لئے پیدل ہی چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی شام کو اپنے باغ میں چہل قدمی کیا کرتے تھے اور ٹہلتے ہوئے ہی وہ اکثر لوگوں سے ملاقات بھی کر لیا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں لوگوں کو ان کے پیچھے چلنا پڑتا تھا۔ جس وقت رضا شاہ پیدل چلتے تھے تو اس وقت بھی وہ کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے تھے۔

میرے والد اپنے مذہبی عقائد میں بھی بہت سادہ تھے اور بہت سی ظاہری چیزوں کی پابندی نہیں کرتے تھے اور چونکہ انہوں نے مذہبی رہنماؤں کے ایک گروہ سے سخت باز پرس کی تھی اس لئے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دین کے اصولوں کے پابند نہیں ہیں حالاں کہ حقیقت اس سے بالکل برعکس ہے۔ در اصل وہ اس بات کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے کہ مذہب اور سیاست کو ایک ساتھ رکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مولویوں کی سیاسی معاملات میں مداخلت کو سخت ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا نہ کیا گیا تو حالات کے تقاضوں کے تحت جو اصلاحی کاموں کا پروگرام انہوں نے مرتب کیا تھا اگر ان پر تیزی سے عمل نہ ہوا تو یہ کام وقت پر نہ ہو سکیں گے اور آئندہ بہت وقت درکار ہوگا۔

لیکن یہ امر اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ دینی علماء کے وجود کو غیر ضروری سمجھتے تھے یا مذہبی عقائد کی طرف سے لاپروائی برتتے تھے بلکہ وہ روشن خیال اور ترقی پسند مولویوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے اعتقاد اور ایمان کی ایک علامت تو یہ ہے کہ ان کو امام رضا سے بہت عقیدت تھی اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے ہر لڑکے کے نام کے آگے "رضا" کا اضافہ کر دیا تھا اور جب کبھی ان کو موقع ملتا وہ آٹھویں امام کے مرقد کی زیارت کے لئے بڑے اشتیاق سے جاتے اور اسی طرح جب کبھی وہ کسی اصلاحی کام کو تہہ دل سے شروع کرتے تو خدائے پاک یا کسی امام کا نام ان کی زبان پر جاری رہتا وہ ان سے اپنی کامیابی کی بھی دعا مانگتے۔

وطن سے جتنی عقیدت ان کو تھی کسی کو نہ ہوگی اور یہ عقیدت عشق کے مرحلے تک پہنچ چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ خلوص نیت سے کہا کرتے تھے کہ ایرانی تمدن ہر لحاظ سے ساری دنیا کے تمدنوں سے بہتر ہے اور کبھی کبھی تو وہ دوسرے ملک کی ترقیات کو اپنے ملک کے تمدن کے سامنے ہیچ سمجھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ تعلیم و تربیت کے نئے طریقوں کو بیحد پسند کرتے تھے۔ جس قدر ایران کی اجتماعی بہبودی اور ترقی کے لئے انہوں نے کام کیا ہے کسی اور شخص نے نہیں کیا۔ اگر ایک طرف وہ اپنے وطن کے درخشاں اور قابلِ فخر ماضی کو عزت اور ستائش کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کے قدیمی رسم و رواج کو برقرار رکھنے میں بیحد دلچسپی لیتے تھے تو دوسری طرف ملک کی سالمیت، آزادی اور قوم کی خوشحالی کے خواہاں تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ مغربی دنیا کی طرح ایران بھی جس قدر جلد ہو سکے ترقی کے مراحل کو طے کرے۔

یہی وجہ تھی کہ باوجود اس کے کہ انہوں نے ایران کے باہر بہت کم سفر کئے تھے لیکن بجلی پیدا کرنے کے نئے کارخانوں، ذرائع آبپاشی، دریاؤں پر بند ھ، ریلوے لائن، پکی سڑکوں، شہروں کی آبادکاری اور طاقتور فوج کی تنظیم کے متعلق وہ ہر وقت سوچتے رہتے۔

موجودہ دور کی ترقیات کے بارے میں معلومات کن ذرائع سے انہوں نے حاصل کی تھیں اس کے متعلق تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن صنعتی، اقتصادی اور فوجی میدان میں جو تازہ ترین ترقیات ہوتیں اس کا انہیں علم رہتا تھا۔ ان کو چونکہ مطالعے سے گہری دلچسپی اور سائنسی باریکیوں کو سمجھنے کی جستجو تھی اس لئے کتب بینی ہی کو ان کی اطلاعات کا سرچشمہ کہا جا سکتا ہے۔

میرے والد نہ صرف محنتی اور سمجھدار انسان تھے بلکہ ان میں زود فہمی کی غیر معمولی صلاحیت بھی تھی۔ وہ بولتے کم اور سوچتے زیادہ تھے۔ ان کی گفتگو مختصر مگر بامعنی ہوتی تھی۔ وہ موضوع سے الگ ہٹ کر بات نہیں کرتے تھے اور جس موضوع پر بات کرتے تھے وہ واقعات اور حقائق پر مبنی ہوتا۔ اگرچہ آج کے علمی معیار کے مطابق ان کی تعلیم باقاعدہ نہیں ہوئی تھی لیکن یہ بات حیرت انگیز تھی کہ وہ ہر دشوار مسئلے کے اہم نکات کو خواہ وہ ایران کی ریلوے لائن سے متعلقہ ہوں خواہ غیر ملکی پالیسی کے بارے میں فوراً سمجھ لیتے تھے۔ ان کی باتوں سے محکم عزم اور مضبوط ارادے کی روشنی جھلکتی تھی اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ جو بات بھی ان کے دل سے نکلتی تھی وہ سننے والے کے دل میں اترتی چلی جاتی تھی اور اس پر اثر کرتی تھی۔

ان کو اپنے اعصاب پر پورا قابو تھا اور بعض لوگوں کی رائے کے بالکل برعکس پورے دورانِ حکومت میں ان کو کبھی غصہ نہیں آیا اور اگر کبھی انہوں نے غصہ ظاہر بھی کیا تو کسی مصلحت یا ضرورت کے تحت تھا لیکن اس پر بھی ان کو اپنے اعصاب پر پورا پورا اختیار رہتا تھا۔

میرے والد کی ایک حیران کن خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ سیاسی معاملات میں موقع و محل کو خوب سمجھتے تھے اور دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں کی طرح یہ بھی جانتے تھے کہ کس وقت کس کام کو شروع کرنا چاہئے اور کس وقت کوئی قدم اٹھانے سے بچنا چاہئے۔ وہ بڑے سے بڑے کام کا فیصلہ ایک منٹ میں بھی کر سکتے تھے اور اگر حالات اجازت نہ دیتے ہوں تو دس سال بھی بڑے صبر اور استقلال سے انتظار کر سکتے تھے۔ وہ اپنے خیالات و افکار پر اپنے دل میں خوب غور کر لیا کرتے تھے اور اس کے ہر پہلو پر اچھی طرح نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ اور مناسب وقت دیکھ کر کام شروع کر دیتے۔ یہ بات عجیب تھی کہ وہ ٹھیک اندازہ لگا لیتے تھے کہ اپنے نظریات کو کس وقت عملی جامہ پہنائیں اور اس معاملے میں وہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے ـــــــ

میرے والد جسمانی محنت اور قوت برداشت میں عام انسانوں سے برتر تھے۔ انہوں نے اپنی پوری قوت بیدریغ

ملک کے مختلف اداروں کی از سرِ نو تنظیم میں صرف کردی تھی اور دوسروں سے بھی یہی امید رکھتے تھے۔ انہوں نے تمام سرکاری دفاتر کو نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کے اصول و ضوابط کے جذبے اور بے لوث خدمت نے ملک کے تمام شعبوں پر گہرا اثر ڈالا۔ انہوں نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ بغیر کسی کو خبر کئے اچانک کسی بھی دفتر میں معائنے کے لئے جا پہنچتے زیادہ تر وہ دفتروں کے کھلنے کے وقت پہنچا کرتے تھے تاکہ وہ یہ جانچ کر سکیں کہ دفتر کے کام کرنے والوں میں سے کتنے حاضر ہیں اور کتنے غیر حاضر۔ چنانچہ اگر کوئی ملازم دیر سے دفتر پہنچتا تھا وہ ان کی نظر سے بچ کر نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک روز رضا شاہ دفتروں کے کھلنے کے تھوڑی دیر بعد وزارتِ مالیہ کی عمارت میں پہنچے اور حکم دیا کہ وزارت کی عمارت کے دروازے بند کردیئے جائیں۔ چنانچہ دفتر کے چند ملازم جن میں وزیر مالیات بھی شامل تھے دیر سے دفتر پہنچے اور خود کو بند دروازے کے باہر پایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہاں یہ واقعہ بطور مثال پیش کیا گیا ہے ایسے اور بھی بیشمار سستی اور کاہلی اور آرام طلبی کے واقعات ہیں جن سے میرے والد مسلسل جنگ کرتے رہے۔

رضا شاہ نے نہ صرف ایران میں ریلوے سروس شروع کرائی بلکہ ریلوں کی آمد و رفت کا وقت بھی وہی مقرر کرتے تھے اور پابندیٔ وقت کا سختی سے خیال رکھتے تھے۔ میرے پاس ان کا ایک فوٹو ہے۔ اس کو میں جب کبھی دیکھتا ہوں تو بیحد خوش ہوتا ہوں کیونکہ اس فوٹو میں دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک مسافر گاڑی میں سوار ہیں اور اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ خوشی اور اطمینان کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ریل ٹھیک وقت پر اسٹیشن پر پہنچی ہے۔

جدید ایران کی تاریخ میں میرے والد پہلے شخص ہیں جنہوں نے لوگوں کو وقت کی پابندی سکھائی اور ہمیشہ اس کی تنبیہہ کرتے رہتے تھے۔ تنبیہہ سے ان کی مراد کسی شخص کو شوق و رغبت دلانا نہیں بلکہ اس کی کوتاہیوں پر اس کو برا بھلا کہنا منظور ہوتا تھا کیونکہ ان کے خیال میں جو شخص اپنا کام اچھی طرح کر رہا ہے وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ دیکھتے تھے کہ کسی نے اپنے فرض میں کوتاہی کی ہے یا ٹھیک طرح سے اپنا کام انجام نہیں دیا ہے تو وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے کہ تمام عمر پچھتاتا تھا۔ لوگوں سے کام لینے کا رویہ جو میرے والد نے اختیار کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مشرقی لوگوں کی طبیعت اور مزاج سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہاں کے لوگوں سے کام طاقت کے بل پر حاکمانہ انداز سے ہی لیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ پچھلے چند سالوں میں ہماری سوسائٹی جمہوری اصولوں سے نسبتاً زیادہ واقف ہوگئی ہے اس لئے لوگوں سے کام لینے کے نئے طریقے جو میرے والد کے طریقوں سے الگ ہیں اپنائے گئے اور اس کے نتائج بھی بہت اچھے نکلے ہیں۔

لوگوں میں جدوجہد اور جان توڑ محنت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے میرے والد اپنی روحانی اور اخلاقی طاقت پر بھروسہ کرتے تھے جس کا نتیجہ کبھی منفی نہیں نکلا کیونکہ لوگ ایک تو ان کے احترام کی وجہ سے اور دوسرے ان کے غصے

کے خوف سے ان کے منصوبوں پر عمل کیا کرتے تھے۔

سلطنت کے شروع میں لوگ انہیں دل وجان سے چاہتے تھے لیکن آخری دور میں جبکہ ترقیاتی منصوبوں نے ان کو دباؤ اور طاقت کے استعمال کے لئے مجبور کیا تو ان کی محبّت اور احترام اطاعت میں بدل گئے۔ انہوں نے اپنی اخلاقی طاقت کی وجہ سے جب تک حکومت کی پوری قوم پر اپنا قابو رکھا۔

میرے والد نے ایران کی قدیم شان وشوکت اور دیرینہ عظمت کو زندہ رکھنے کے لئے بہت کام کیا ہے۔ انہوں نے قوم سے ہمیشہ یہی درخواست کی کہ اپنے وطن کا نام اسی طرح اونچا کرے جس طرح ماضی میں روشن تھا اور گذشتہ عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ مل کر آگے قدم بڑھائے۔ انہوں نے ہماری طرح آبادکاری کا دوسرا یا تیسرا سات سالہ منصوبہ جواب ختم ہونے کے قریب ہے نہیں بنایا بلکہ وہ ایک کے بعد دوسرا اصلاحی پروگرام بناتے چلے جاتے تھے۔ وہ کسی وقت خالی نہیں بیٹھتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ہو سکے ترقیاتی کاموں کا مجموعی نتیجہ سامنے آجائے۔ یہ مانا کہ ان کے ترقیاتی پروگرام کے بعض اقدامات زیادہ مفید اور دیر تک قائم رہنے والے تھے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اصلاحی پروگرام کو پورا کرنے کا جو روّیہ انہوں نے اپنایا کافی سخت تھا لیکن اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ قابلِ ستائش ہیں۔ جس وقت ہم ان کے کُل کاموں اور ملکی خدمات کو مجموعی طور پر شمار کرتے ہیں تو مشکل سے یقین آتا ہے کہ اپنی حکومت کے مختصر عرصے میں جس کی مدت سولہ[۱۶] سال سے زیادہ نہ تھی اتنے سارے ترقیاتی کام جن کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے کس طرح کئے ہوں گے۔

میرے والد فطرتاً شوخ طبع انسان تھے۔ اگرچہ وہ لوگ جن کے ذہنوں میں ان کے دورِ سلطنت کی یادداشتیں محفوظ ہیں اس بات کو جھٹلائیں گے لیکن حقیقت یہی ہے جو کہی گئی ہے۔ گھر کے لوگ جب ایک جگہ مل کر بیٹھتے تو وہ مجھ سے بڑی سادگی اور محبّت سے ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ گھریلو نشستوں کے علاوہ بھی ان کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ میرے خیال میں ان کو سب سے زیادہ ہنسی ان لوگوں کی مضحکہ خیز حالت پر آتی تھی جو اپنے چہرے پر وقار اور ادب کا پردہ ڈال کر ان سے ملنے آتے تھے۔

پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ میرے والد لوگوں کے اندرونی احساسات کو سمجھنے کی خاص صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کی نگاہوں اور چہرے سے ان کے دل کی بات سمجھ لیتے تھے اور آسانی سے دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے۔

جب کبھی وہ یہ دیکھتے کہ بعض درباری یا حکومت کے اعلیٰ افسر ریاکاری اور چاپلوسی سے کام لے رہے ہیں تو وہ ہنس دیا کرتے تھے اور ان باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ میرے خیال میں میرے والد کو درباریوں اور اعلیٰ افسروں کی ریا اور ظاہرداری سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ مبالغے اور بے مطلب باتوں سے ان کے قیمتی وقت کو ضائع کیا کرتے تھے اور اصل موضوع شیریں بیانی میں ختم ہو کر رہ جاتا تھا لیکن ان دنوں ایسا کرنا ضروری تھا کیونکہ ایران میں یہ مشہور جملہ

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستِ فتنہ انگیز (کسی مصلحت سے جھوٹ بولنا اس سچائی سے بہتر ہے جس سے فتنہ و فساد پھیلتا ہو) حد سے زیادہ لوگوں کی زبان پر جاری تھا لیکن میرے والد کے لئے چونکہ بہت صاف گو تھے اس قسم کا رویہ برداشت کرنا ناممکن تھا۔ وہ جب کبھی یہ دیکھتے تھے کہ ان کے چاروں طرف جو لوگ ہیں وہ اسی روش پر چل رہے ہیں تو ان کو بے اختیار ہنسی آجاتی۔

کچھ لوگ سوچتے ہوں گے کہ سپاہیانہ زندگی گذارنے کی وجہ سے ان کی طبیعت عامیانہ یا سخت و سُست جملے کہنے کی طرف راغب ہو گی لیکن ایسا سوچنا ہی غلط ہے کیونکہ میں نے کبھی ان کی زبان سے ایسے جملے نہیں سُنے اور وہ میرے علاوہ کسی اور سے ہنسی مذاق کے عادی بھی نہیں تھے۔ جو لوگ ان کے سامنے آتے تھے یا تو ان پر ان کا رعب اتنا بیٹھ جاتا تھا کہ کانپنے لگتے تھے اور یا عزّت واحترام کا پاس رہتا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں لطیفہ گوئی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ان کا پرانے اور قریبی دوستوں کے ساتھ بھی یہی رویہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک چچا جو ان سے بہت نزدیک تھے اسی طرح سے ملتے تھے۔ ان کی اعلیٰ شخصیت اور ذاتی وقار اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے کہ کوئی نامعقول حرکت ہو یا ناشائستہ الفاظ ان کے سامنے استعمال کئے جائیں۔

اسی وجہ سے کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ میرے والد اپنی اس عادت کی وجہ سے تنہائی محسوس کرتے ہوں گے لیکن جلدی ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ ان کی فطرت ہی اس طرح کی نہ تھی کہ لوگوں سے دوستانہ اور قریبی تعلقات پیدا کریں اور جن سے ان کی واقفیت تھی ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ زیادہ اُنسیت بڑھائیں۔ وہ ہمیشہ اپنے خیالات میں اور ان کاموں میں جن کو وہ کرنا چاہتے تھے مشغول رہتے تھے اور انہی کو اپنا سچا اور حقیقی دوست سمجھتے تھے۔ ان کی سلطنت کے آخری سالوں میں جبکہ ان کے مشیروں اور ندیموں کا حلقہ چھوٹا ہو گیا تھا تو ان کے چند قریبی دوستوں نے بیرونی ممالک میں دلچسپی لینے کا موقع دیا۔

تقریباً پانچ سال پہلے میں نے ایک رسالہ اپنے والد صاحب کی خصوصیات کے بارے میں لکھا تھا جو کتاب کی شکل میں دنیا کی کئی زندہ زبانوں میں چھپ بھی گیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں اپنے والد کے اخلاق و عادات کے ضمن میں لکھا تھا" مجھے امید ہے کہ اس رسالے کے ذریعے ایرانی قوم اور اس کی آب و خاک سے محبّت کرنے والے خاص طور پر نوجوان اُس بڑے آدمی کے بارے میں جس نے بیدریغ خود کو اپنے ہم وطنوں کی خوشی، ترّقی و فلاح کے لئے وقف کر دیا تھا غور کریں گے اور وطن کی خدمت اور ہم وطنوں کی محبت کے لئے ان کی زندگی کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں گے، فرض شناسی کا سبق ان سے سیکھیں گے اور یہ جانیں گے کہ ان کی مردانگی کا یہ تقاضا ہے کہ ڈر اور خوف پر غلبہ پا کر ہمت سے کام لیں اور جھوٹ و فریب کی جگہ حق اور سچائی کو دیں۔ بری عادتوں اور اخلاقی پستیوں سے بچیں۔ کاہلی اور سستی کرنے سے شرمسار ہوں۔ عمدہ کاموں کو اپنا مقصد بنائیں اور ان کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھیں اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں

کہ کام اور خدمت روح کی زینت اور افتخار کا باعث ہیں"۔ یہ تھا مختصر سا خاکہ میرے والد کی ان خصوصیات کا جنہوں نے میری طبیعت پر گہرا اثر ڈالا۔ یہاں اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اس سے پہلے کہ میرے بچپن کے حالات پڑھیں اُن حالات کو جان لیں جنہوں نے مجھ پر اثر کیا ہے۔

میری پیدائش ۲۶، اکتوبر ۱۹۱۹ء کو تہران کے قدیم محلّے کے ایک معمولی مکان میں ہوئی۔ اس وقت شہر کے چاروں طرف فصیل تھی جس کو خشک کھائی نے گھیر رکھا تھا۔ آمدورفت شہر کے دروازوں سے ہوتی تھی جو رات کو چوروں اور لٹیروں کے ڈر سے بند کر دیئے جاتے تھے۔ ان دروازوں کو میرے والد کی رہنمائی میں شہر کو صاف ستھرا اور جدید طرز پر آباد کرنے کے پیشِ نظر گروا دیا گیا۔

تھوڑے عرصے بعد گھر والوں نے چونکہ دوسرا مکان لے لیا تھا اس لئے پہلے گھر کی یادداشتیں میرے ذہن میں صاف محفوظ نہ رہ سکیں بچپن کی جو بات یاد رہ گئی ہے وہ البرز کے پہاڑی سلسلے کا دلفریب منظر ہے جس نے پورے شہر تہران کو گھیر رکھا ہے اور مجھ پر ہمیشہ الہام کی سی کیفیت طاری کی ہے۔ اسی طرح جن دنوں میں آسمان صاف ہوتا تھا اور میں شہر کے شمال مشرقی حصّے پر نظر ڈالتا تھا تو مجھے کوہ دماوند کی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ اس بلند چوٹی نے جو ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے میرے دل کو ہمیشہ فرحت بخشی ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی چوٹی ۱۸۶۰۰ فٹ بلند ہے جو ماؤنٹ بلانک سے کہیں زیادہ اور فوجی یاما سے ڈیڑھ گنی اونچی ہے۔

اس کے علاوہ بچپن کی یادداشتوں میں جو چیز میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ اپنے والد کا بارعب چہرہ اور بلند قد ہے۔ اُس وقت وہ وزیر جنگ تھے اور ہر روز وقتِ مقررہ پر بگھی میں بیٹھ کر دفتر آیا جایا کرتے تھے۔ جن لوگوں کو ادبی ذوق ہے اور تشبیہات سے لگاؤ ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ جن دنوں یہ بلند پہاڑ میرے احساسات کو جھنجھوڑ رہے تھے انہیں دنوں میرے والد جو جلدی ہی وزیر اعظم اور پھر شاہ ایران بننے والے تھے اپنی بلند ہمتی سے پہاڑ جیسی سخت دشواریوں کو راہ سے ہٹانے کے لئے سرگرم عمل تھے۔

بچپن میں میرا جسم کافی کمزور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں حمام میں پھسل کر زمین پر گر پڑا اور میرا سر بُری طرح زمین پر جا کر لگا۔ اس وقت ہاشم میاں، جو ہمارے بڑے وفادار ملازم تھے اور جن کا انتقال تھوڑے عرصے پہلے ہوا ہے میرے ساتھ تھے ان کی آنکھوں کی وحشت اور اضطراب نے جو میرے دل پر اثر کیا وہ چوٹ کے شدید درد سے زیادہ تھا۔

میرے بچپن کا سب سے زیادہ دلچسپ یادگاری دن وہ ہے جب میرے والد نے بڑی شان و شوکت سے رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کر کے ایرانی شہنشاہیت کا تاج سر پر رکھا اور میرے ولیعہد ہونے کا اعلان کیا۔ تاجگذاری کی عظیم الشان اور بے نظیر رسومات گلستان محل میں تختِ طاؤس پر قدیم روایات کے مطابق ادا کی گئیں۔ اُس وقت میری عمر چھ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اس دلکش منظر کی شان و شوکت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔

دورانِ ولیعہدی میں میں اپنے بھائی بہنوں اور والدہ کے ساتھ رہا لیکن تا چوشی کے بعد مجھے اپنے والد کے حکم کے مطابق ان سے جدا ہونا پڑا اور یہ حکم ملا کہ وہ خاص تربیت جس کو وہ تربیتِ مردانہ کہا کرتے تھے حاصل کروں تاکہ آنے والی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہو جاؤں اور مجھے فوجی مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ یہ مدرسہ میرے لئے اور میرے دوسرے چار بھائیوں کے لئے ہی قائم کیا گیا تھا جس کلاس میں میں تھا اس میں اکیس لڑکے اور بھی تھے جو فوجی افسروں اور اعلیٰ عہدیداروں کی اولاد تھے اور داخلے کے لئے ان کا انتخاب بڑی احتیاط اور غور و فکر کے بعد کیا گیا تھا میرے بھائی چونکہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے اس لئے ان کا داخلہ مجھ سے نچلی کلاسوں میں ہوا۔ اس اسکول کے طلبا فوجی وردی میں رہا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ ہمارا ٹائم ٹیبل بڑا مشکل تھا اور اس طرح میرا بچپن فوجی ماحول یعنی فوجی مشق و تربیت میں گذرا۔ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ میرے والد نے ایک فرانسیسی استانی بھی ملازم رکھی تھی جو فرانسیسی زبان پڑھانے کے علاوہ میری زندگی کے اندرونی معاملات کی بھی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس خاتون (چونکہ ایک ایرانی سے شادی کر لی تھی اس لئے بیگم ارفع کے نام سے مشہور تھی) کی کوشش سے میں فرانسیسی اتنی اچھی سیکھ گیا کہ پوری روانی اور سلاست سے مادری زبان کی طرح بول سکتا تھا اور اس طرح مغربی افکار کے دروازے میرے ذہن پر کھل گئے۔

یہ نیک خاتون جن کا میں ہمیشہ احسان مند رہوں گا ۱۹۵۹ء میں پیرس میں فوت ہو گئیں۔

اگرچہ جسمانی اعتبار سے میں ذرا کمزور تھا لیکن بہت پھرتیلا اور ہنس مکھ لڑکا تھا بہت کم نچلا بیٹھتا تھا۔ ہر وقت اچھلنا کودنا، دوڑنا، درختوں پر چڑھنا اور دوسرے لڑکوں کے کھیل کھیلنا بس یہی میرا کام تھا کشتی جو ہمارے ملک کی بڑی مشہور ورزش ہے بچپن میں مجھے بیحد پسند تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن کھانا کھانے کے بعد کشتی لڑنے کے جرم میں میری اچھی خاصی سرزنش ہوئی تھی۔ جاڑوں میں برف کے کھیلوں سے میں کبھی نہیں تھکتا تھا۔ جو کھیل میں بچپن میں اکثر کھیلا کرتا تھا اس میں سے ایک یہ تھا کہ موسمِ گرما کے محل سعد آباد میں نہر کے کنارے پتھر اور گارے سے اپنے دوستوں کی مدد سے پانی کی روک کے لئے دیواریں بنایا کرتا تھا اور اب کہہ سکتا ہوں کہ پانی کے روکنے کی وہ چھوٹی چھوٹی دیواریں ان بڑے باندھوں کا نمونہ تھیں جن سے پانی گرا کر بجلی کی قوت پیدا کی جاتی ہے اور آج ملک میں کئی جگہ اس طرح کے باندھ بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح نہروں کے کنارے لکڑی اور اینٹوں کے گھر بنانا یا کھیل کود کا جو سامان ہوتا تھا اس سے پل اور عمارتیں تعمیر کرتا تھا۔

فوجی اسکول میں دو گھنٹے کی چھٹی آرام کرنے کے لئے ہوتی تھی لیکن میرا سارا وقت اچھل کود میں گذر جاتا تھا۔ اگرچہ ایرانیوں کی یہ عادت ہے کہ دوپہر کے بعد بچے اور بوڑھے تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتے ہیں لیکن مجھے یہ عادت پسند نہ تھی اور اب بھی دوپہر بعد سونے کی عادت نہیں ہے اور یہ بات اب بھی نہیں بھول سکتا کہ اُن دنوں میں دوپہر بعد آرام کرنے کی بجائے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شور و غل کرنے اور کھیل کود میں لگ جاتا تھا جس سے بڑوں کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

بچپن کے کھیلوں میں جو کھیل مجھے بہت پسند تھا وہ چور سپاہی تھا۔ اس کھیل کے لئے میں اپنے ساتھیوں کو دو ٹولیوں

میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ محل میں جتنے بھی تہہ خانے اور جو خفیے بنے ہوئے تھے ان میں ہم گھستے پھرتے تھے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت چوروں کو پکڑنے کا ہمارا طریقہ بہت ناقص اور ابتدائی تھا۔ جب میں سن بلوغ کو پہنچا تو گھوڑے کی سواری اور شکار کا شوق ہوا۔ آتا بائے صاحب جو اِس وقت میر شکار کے عہدے پر فائز ہیں اُن دنوں ان کھیلوں میں میرے ساتھ رہا کرتے تھے۔ نئے کھیلوں میں فٹ بال اور باکسنگ مجھے بہت پسند تھے۔ جو صاحب ہمیں باکسنگ کی مشق کراتے تھے چشمہ استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک دن مشق کرتے کرتے ان کا چشمہ گر پڑا میں نے اُس کو زمین سے اٹھا کر ان کو دے دیا۔ انہوں نے آنکھوں پر لگا لیا اور پھر کھیل شروع ہو گیا۔ ایک اور کھیل جو اس وقت مجھے اور میرے دوستوں کو غیر معمولی طور پر دلچسپ لگتا تھا چوگان کا کھیل تھا جو ہم سائیکلوں پر سوار ہو کر کھیلا کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہم پہلے ایران کے چوگان کے کھلاڑی تھے جو اس کھیل کے لئے سائیکلیں استعمال کرتے تھے۔

بظاہر ایک ولیعہد کو چاہیئے کہ عادتاً مغرور ہو اور عام لوگوں سے دوری اختیار کرے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے دورانِ ولیعہدی میں مجھ میں یہ عیب نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ اب بھی نہیں ہے۔ اُس وقت میرا جگری دوست حسین فردوست تھا اس کے والد فوج میں لفٹنٹ تھے۔ حسین سوئٹزر لینڈ میں بھی میرا ہمدرس تھا۔ بعد میں کرنل کے عہدے کے ساتھ ہی ساتھ اس کو ملٹری کالج میں استاد مقرر کیا گیا۔ اِس وقت وہ شاہی محافظ دستے میں خدمت انجام دے رہا ہے۔

جب میں ولیعہد تھا تو میرے والد ہر روز میرے ساتھ ایک دو گھنٹے وقت گذارتے تھے اور جب نو سال کا ہوا تو کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ اس منظّم پروگرام سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ میری طرف سے پورے طور پر باخبر رہیں اور میں بھی ملک کے حالات سے آگاہ رہوں۔ والد کی تاجپوشی کے تھوڑے عرصے بعد مجھے ٹائیفائیڈ ہو گیا اور کئی ہفتے تک میں موت سے دست بگریبان رہا۔ اس بیماری کی وجہ سے میرے والد سخت پریشان رہتے تھے۔ اس سخت بیماری کے دوران میں نے عالمِ روحانیت میں قدم رکھا اور یہ راز میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا ہے۔ ایک رات جبکہ مجھے سخت بخار چڑھا ہوا تھا میں نے خواب میں جناب امیر حضرت علیؑ کو دیکھا۔ ان کی مشہور و معروف تلوار ذوالفقار ان کی گود میں تھی۔ وہ میرے قریب تشریف فرما تھے ہاتھ میں پیالہ تھا۔ مجھے حکم دیا کہ اس کو پی لوں میں نے ان کے حکم کی اطاعت کی۔ اگلے دن میرا بخار بالکل اتر گیا اور بڑی تیزی سے میری حالت بہتر ہونے لگی۔ اس وقت چونکہ میری عمر سات سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میری صحت یابی اور اس خواب میں کوئی قریب کا تعلق بھی ہے لیکن اسی سال دو واقعات اور ہوئے جنہوں نے میری روحانی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا۔

کوہ البرز کے دامن میں 'امام زادہ داوٗد' نامی ایک صحت افزا مقام ہے۔ بچپن میں تقریباً ہر سال گرمیوں کے موسم میں ہمارے خاندان کے سب لوگ وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اس جگہ پہنچنے کے لئے ڈھلوان اور پیچ دار راستے گھوڑے کی پیٹھ پر یا پیدل طے کرنا پڑتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ جو فوج میں افسر تھا آگے گھوڑے کی

دورانِ ولیعہدی کی ایک تصویر،
اس وقت میری عمر چھ سال تھی

تہران میں اپنے والد کے ہمراہ
ایک فوجی جوان کی حیثیت سے

میرے والد، ایک مشین کے معاینے کے دوران بجید دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے

میں، طالب علمی کے زمانے میں فٹبال کھیلتے ہوئے

زین پر بیٹھا تھا۔ اتفاق سے گھوڑے کا پیر لڑکھڑایا اور ہم دونوں زمین پر آ گرے۔ میں چونکہ ہلکا تھا اس لئے سر کے بل ایک کھردری چٹان پر آ پڑا اور فوراً بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ مجھے ذرا بھی چوٹ نہیں آئی ہے تو انہیں بیحد تعجب ہوا۔ آخر کار مجھے بتانا پڑا کہ جس وقت میں گھوڑے سے گرا تو حضرت علی علیہ السلام کے فرزند ارجمند حضرت ابوالفضلؑ ظاہر ہوئے اور مجھے گرنے سے پہلے اوپر اٹھا لیا اور میرے خراش تک نہیں آئی۔ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا میرے والد موجود نہ تھے لیکن جس وقت میں نے پورا ماجرا ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے اس کو سنجیدگی سے نہیں سنا اور چونکہ میں ان کی عادت کو جانتا تھا اس لئے میں نے بھی ان کو یقین دلانے کی کوشش نہیں کی لیکن اس بات میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے کہ میرے سامنے حضرت عباس بن علی رونما ہوئے۔ تیسرا واقعہ جس نے مجھے پہلے سے کہیں زیادہ روحانیت کی طرف مائل کیا یہ تھا کہ میں اپنے معلّم کے ساتھ سعد آباد کے شاہی محل کے نزدیک پکی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں مجھے ایک نورانی صورت والے بزرگ نظر آئے۔ جن کے چہرے کے گرد نور کا ایسا ہی ہالہ تھا جیسا مغرب کے نقّاش حضرت عیسیٰؑ کے گرد بناتے ہیں۔ اسی وقت میرے دل پر القا ہوا کہ امام آخرالزماں کے روبرو کھڑا ہوں۔ ابھی زیارت سے سیری بھی نہیں ہوئی تھی کہ آنحضرت نظروں سے غائب ہو گئے اور مجھے عالمِ حیرانی میں چھوڑ دیا۔ میں نے اسی وقت اپنے معلّم سے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"تم نے بھی حضرت کو دیکھا؟"۔

میرے معلّم نے حیرت سے جواب دیا "کس کو دیکھوں؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے"۔

لیکن جس حقیقت اور سچّائی کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس پر مجھے اتنا یقین تھا کہ میرے معلّم کی حیرانی اس میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ کر سکی۔ آج جبکہ میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں تو خاص طور پر مغرب کے لوگ سوچیں گے کہ یہ محض میرا وہم تھا یا کوئی معمولی نفسیاتی کیفیت۔ لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ عالمِ ارواح اور اس کی تجلّیات (جس کو مادہ پرست لوگ نہیں سمجھ سکتے) پر یقین رکھنا مشرقی لوگوں کا خاصہ ہے اور بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مغربی ممالک کے لوگوں کا بھی یہی اعتقاد ہے۔

یوں بھی اس بات کی مجھے ضرورت تو نہیں تھی کہ میں اپنے معلّم کے لئے یہ افسانہ گھڑتا اور آج بھی مجھے لاف و گزاف کی باتیں کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ یہ واقعہ سوائے ان چند لوگوں کے جو مجھ سے بہت قریب ہیں کسی کو نہیں معلوم تھا۔ یہاں تک کہ میرے والد جو مجھ سے اتنے نزدیک تھے ان کو بھی اسکے بارے میں کچھ علم نہیں۔

اس واقعہ کے بعد اگرچہ کئی بار کالی کھانسی، ڈپتھریا اور دوسرے امراض میں سخت بتلا ہوا لیکن کشف کی حالت کبھی نہیں ہوئی۔ آٹھ سال کی عمر میں ملیریا جیسی جان لیوا بیماری نے آن گھیرا اور چونکہ علاج کے وہ طریقے جو آج موجود ہیں اس وقت نہ تھے اس لئے بڑی مشکل سے اس مرض سے نجات ملی لیکن ان تمام بیماریوں کے دوران مجھے کوئی ایسا خواب

نظر نہیں آیا جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ۔

چھ یا سات سال کی عمر میں میرا یہ اعتقاد راسخ ہو گیا کہ مجھ پر خدا کی رحمت کا سایہ ہے اور رہے گا۔ اس اعتقاد نے میرے دل کو بڑا اطمینان بخشا۔ اسی لئے جب کبھی میں اپنے ارادے کا خدا کی مشیت سے مقابلہ کرتا ہوں تو مجھے سخت حیرت اور پریشانی ہوتی ہے اور میں یہ سمجھ نہیں پاتا کہ میں اپنے ارادے میں مجبور ہوں یا مختار اور اگر مشیت ازلی اور قدرت الٰہی میری حفاظت کر رہی ہے اور میں اس کی امان میں ہوں تو ضرور اس میں کوئی مصلحت ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو اہلِ ہوش و خرد کہتے ہیں وہ شاید میرے ان اعتقادات کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں۔ لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ خدائے تعالیٰ خطروں اور بلاؤں میں میرا محافظ و مددگار ہے (اور اس نے اپنی قدرت یکتا اور انصاف پسندی سے مجھے ایک مردِ مومن بنایا ہے) اور تمام ترقی یافتہ قومیں اس بات کا اعتراف کرتی ہیں چنانچہ انگریزوں کا نعرہ ہے 'خدا ہماری ملکہ کو سلامت رکھے' اور یہ کہنے میں وہ عار محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح امریکنوں نے اپنے دھات کے سکّوں پر یہ عبارت کندہ کرائی ہے "ہم خدا میں یقین رکھتے ہیں"۔

بچپن کے اِن واقعات کے علاوہ اور بھی چار حادثے میرے ساتھ پیش آئے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ بچپن میں جو میرا اعتقاد اور ایمان خداوند کریم پر تھا وہ اب بھی قائم ہے اور آیندہ بھی پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہوگا۔ پہلا واقعہ اس وقت رونما ہوا جبکہ میں ۱۹۴۸ء میں اصفہان کے قریب کوہ رنگ کے مقام پر ایک باندھ دیکھنے گیا جو اس وقت تک تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ واپسی کے وقت میں اس علاقے کے فوجی افسر بالا[1] کے ساتھ اپنے چھوٹے ہوائی جہاز میں سوار ہوا جو نزدیک ہی ایک تنگ سے میدان میں کھڑا تھا۔ چونکہ میرے پاس پرواز کا لائسنس بھی ہے اور مجھے اپنا جہاز بلکہ ہر ہوائی جہاز چلانے میں لطف آتا ہے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ یہ جہاز بھی میں ہی چلاؤں گا۔ یہ جہاز بہت ہلکا اور ایک انجن کا تھا۔ اُڑان لے چکنے کے دس منٹ بعد اچانک موٹر بند ہو گئی۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہیں تنگ درّے میں اترا جائے۔ جو لوگ ہوائی جہاز چلانے کے فن سے واقف ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ اگر ہوائی جہاز کی رفتار خاص حد سے کم ہو جائے تو پھر وہ چکر کاٹنے لگتا ہے۔ چونکہ موٹر بند ہو گئی تھی اس لئے میں ایسے تنگ درّے میں جہاز کو اس طرح نہیں گھما سکتا تھا جیسا کہ عام طور پر زمین پر اُتارنے کے لئے گھمایا جاتا ہے چنانچہ میں نے بڑی کوشش سے جہاز کی رفتار کو برقرار رکھا اور وہیں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے پہلے کہ جہاز زمین پر اترے میں نے دستے کو دبا دیا تاکہ جہاز کی نوک اوپر کو اٹھ جائے اور اُس بڑی بھاری پتھر کی سِل سے جو بالکل ہمارے سامنے تھی نہ ٹکرائے۔ جہاز کی رفتار اس قدر کم ہو چکی تھی کہ اگر بالفرض ہم اس سِل سے گذر بھی جاتے تو دوسری چٹان جو اس کے بالکل پیچھے تھی اس سے نہ بچتے۔ جیسے ہی جہاز سِل سے ٹکرایا اس کی پنکھڑیاں اکھڑ گئیں جس کی وجہ سے رفتار بالکل مدھم پڑ گئی اور پورا ڈھانچہ پتھریلی زمین پر زور زور سے ہلنے لگا۔ سامنے ایک اور سپاٹ پتھر کی سِل تھی جہاز اس سل سے ٹکرا کر الٹا ہو گیا اور اس کی پیٹھ زمین سے جا لگی۔ چونکہ پنکھڑیاں

1. GENERAL IN COMMAND

ہماری کمروں سے بندھی ہوئی تھیں اس لئے ہم پائلٹ کی سیٹ پر الٹے لٹکے ہوئے تھے لیکن یہ کوئی معجزہ ہی تھا کہ ہم کو ذرا بھی چوٹ نہیں آئی اور مصیبت سے بچ نکلے۔ یہ واقعہ اس قدر اچانک بلکہ ناقابلِ یقین، لیکن ساتھ ہی ساتھ دلچسپ تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ لیکن وہ افسر جو میرے ساتھ تھا اس کی یہ حالت تھی کہ وہ کسی طرح اس واقعہ کو اتنا معمولی نہیں سمجھ رہا تھا کہ جس پر ہنسا جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس واقعہ کو محض خوش قسمتی اور حسنِ اتفاق سمجھنا چاہئے یا کسی غیبی طاقت کا کرشمہ۔ ان یادداشتوں کو پڑھنے والے شاید مجھ سے بہتر فیصلہ دے سکیں ضمناً یہاں اس بات کا ضرور ذکر کروں گا کہ کوہرنگ باندھ بن کر تیار ہوگیا ہے اور اس علاقے کی قابلِ کاشت زمینوں کی سینچائی اسی کے پانی سے ہوتی ہے۔

دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب آذربائیجان کا زرخیز صوبہ غیروں کے پنجوں سے آزاد ہوا۔ یہ واقعہ اور آذربائیجان کی آزادی جو خداوند کریم کی مدد اور ایرانی قوم پرستی کے جذبے کے تحت حاصل ہوئی اس کو اگلے باب میں تفصیل سے بیان کروں گا۔

دورِ سلطنت کا تیسرا عجیب اور تلخ واقعہ فروری ۱۹۴۹ء میں اس وقت رونما ہوا جب کہ میں یونیورسٹی قائم ہونے کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ اس روز میں نے فوجی وردی پہن رکھی تھی جشن کی تقریبات کا اہتمام لا کالج میں کیا گیا تھا۔ موٹر سے اتر کر میں کالج میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ گولی چلنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ گولیاں میری طرف چلائی گئی تھیں۔ اگرچہ بظاہر بات تو عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن تین گولیاں فوجی ٹوپی میں لگیں اور میرے سر پر ذرا بھی آنچ نہ آئی، چوتھی گولی گال کے پاس سے ہوتی ہوئی اوپر کے ہونٹ پر ناک کے نیچے سے نکل گئی۔

جس شخص نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا وہ فوٹوگرافر بن کر کالج کی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان دو میٹر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ اس نے اپنا ریوالور میرے سینے کی طرف تان رکھا تھا اب ہم ایک دوسرے کے بالکل مقابل تھے اور ہمارے درمیان کوئی بھی شخص حائل نہ تھا اور میں نے سمجھ لیا کہ اس کی گولی کو میرے سینے تک پہنچنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنے گی۔ اس وقت جو میرا ردِ عمل ہوا وہ ناقابلِ فراموش ہے اور اس کی یادیں اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں نے سوچا کہ چھلانگ لگا کر اس تک پہنچ جاؤں لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ اگر میں اس کی طرف بڑھتا ہوں تو اس کو نشانہ باندھنے میں آسانی ہوگی اور اگر بھاگتا ہوں تو وہ میری کمر کو نشانہ بنائے گا۔ جب کوئی راہ نظر نہ آئی تو میں نے ایک فوجی حربہ استعمال کیا اور سانپ کے پھن کی طرح لہرانا شروع کر دیا تاکہ اس کا نشانہ خطا کر سکوں۔ قاتل نے ایک گولی اور چلائی جس سے میرا بازو زخمی ہوگیا۔ آخری گولی اس کے ریوالور میں پھنسی رہ گئی اور میں نے محسوس کر لیا کہ اب خطرے سے نکل گیا ہوں اور زندہ ہوں۔ قاتل نے غصے میں ریوالور زمین پر دے مارا اور فرار ہونا چاہا لیکن جو افسر اور دوسرے لوگ میرے چاروں طرف تھے انہوں نے اس کو گھیر لیا اور وہیں مار ڈالا اور یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس سازش میں کون لوگ شریک تھے لیکن بعد میں معلوم ہوگیا کہ اس کا میل جول بعض کٹر مولویوں سے تھا اور اسی کے ساتھ یہ ثبوت بھی فراہم ہوئے کہ اس

کے پیچھے ٹوڈی پارٹی (کمیونسٹ) کا ہاتھ تھا اور ایک دلچسپ بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اس کی معشوقہ انگریزی سفارت خانے کے مالی کی بیٹی تھی۔

میرے بدن سے خون فوارے کی طرح پھوٹ رہا تھا اور مجھے یاد ہے کہ میری یہ مرضی تھی کہ اسی حال میں اس دن کی تقریبات میں حصہ لوں لیکن میرے خیرخواہوں نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا اور مجھے ہسپتال لے گئے۔ وہاں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔ کچھ عرصے بعد میری خون آلود فوجی وردی نمائش کے لئے فوجی افسروں کے کلب میں رکھ دی گئی۔ جو لوگ اس کلب میں جاتے ہیں اب بھی اس وردی کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد میرا ایمان جو خدائے لایزال اور اس کے سایۂ رحمت پر تھا اور بھی قوی ہوگیا اور اس سے ناقابلِ شکست رشتہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوگیا۔

چوتھا معجزہ نما واقعہ جس کی تفصیل اس کتاب میں درج ہے جولائی ۱۹۵۳ء (۱۳۳۲ھ) کا ہے۔ یہ وہ تاریخی دن ہے جس دن ایران نے مصدق کے چنگل سے نجات پائی۔

ڈاکٹر مصدق ایک سیاسی رہنما ثابت ہو سکتا تھا لیکن اپنے اقتدار کے آخری دور میں وہ اپنے انتہا پسندانہ خیالات اور اپنے خوشامدیوں کی چاپلوسی کا شکار ہوگیا۔ اس کے پیچھے بالواسطہ طور پر ایک غیر ملکی حکومت کا بھی ہاتھ تھا۔

یہ میرا اعتقاد ہے کہ مصدق کی حکومت کا تختہ الٹنے میں وہ عام انسان شریک تھے جن کے دل مشیّتِ ایزدی کے نور سے منوّر ہیں۔

مسلّم ہے کہ جو کام میں نے اپنے دورِ سلطنت میں انجام دیئے ہیں ان کے پیچھے ایک غیبی طاقت کی مدد کارفرما ہے۔ میرے جو مذہبی اعتقادات ہیں اور جس پر میرا ایمان ہے اس کے اظہار کرنے میں مجھے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی لیکن کسی کو یہ نہ سوچنا چاہئے کہ میں (خدانخواستہ) اس کی طرف سے بھیجا گیا ہوں یا میرے ذریعے اس کے احکامات صادر ہوتے ہیں یہ بات یہاں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرا اس قسم کا اعتقاد بالکل نہیں ہے۔

میں یہ بات بچپن سے جانتا ہوں کہ دستِ قضا نے مجھے ایک ایسے ملک کی سرپرستی کے لئے مقرر کیا ہے جس کا تمدّن بہت قدیم اور میرا پسندیدہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اپنے ملک کے لوگوں کی اور خاص طور پر ان کی جو معمولی درجے کے ہیں فلاح و بہبود کے لئے کام کروں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ خداوند کریم جس پر میرا ایمانِ کامل ہے اس کام کو پورا کرنے میں میری مدد کرے گا۔ اور اس راہ میں جو بھی ترقی ہو سکتی ہے اس میں بجز اس کی مدد اور پشت پناہی کے کسی اور کا ہاتھ نہ ہوگا۔

۴۔ میری تعلیم و تربیت

میرے والد چونکہ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ایران میں مغربی طرزِ معاشرت کو اپنائیں گے اس لئے جب مجھے یورپ بھیجا گیا تو کسی کو بھی اس پر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ سب ہی کو علم تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ولیعہد زیادہ سے زیادہ مغربی تمدن سے واقفیت حاصل کرے تاکہ اس کو مغربی اقوام کی ترقی و کامیابی کے راز معلوم ہو سکیں۔

میری تعلیم کے لئے کون سا ملک مناسب ہو سکتا تھا اس پر میرے والد نے کافی عرصے تک غور و فکر کیا تھا۔ اگرچہ وہ مغربی تمدن اور اس کی ترقیات کو بڑی اچھی نظر سے دیکھتے تھے لیکن غیروں پر ان کو بھروسہ بھی نہیں تھا چنانچہ بہت سوچنے اور سمجھنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے سوئٹزرلینڈ بھیجیں۔ میرے خیال میں اس ملک کا انتخاب میرے والد نے اس لئے کیا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے لڑکے کی تعلیم ایسے ملک میں ہونی چاہیئے جو سیاسی جھگڑوں سے بالکل آزاد ہو۔ چونکہ سوئٹزر لینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے اور یورپ کی سیاسی کشمکش سے ہمیشہ الگ رہا ہے اسی لئے اس کو دوسرے ممالک پر برتری حاصل ہے۔ میرے والد کے صلاح کاروں نے یہی مشورہ دیا کہ اگر کوئی شخص سنجیدگی سے تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے سوئٹزرلینڈ کا ماحول زیادہ مناسب رہے گا۔

مئی ۱۹۳۱ء میں، مَیں ابتدائی فوجی مدرسہ تہران سے فارغ التحصیل ہوا۔ گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کے بعد میں اسی سال ماہ ستمبر میں سوئٹزرلینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر مؤدب نفیسی جو اپنے زمانے کے بہت مشہور ڈاکٹر تھے اور جنہوں نے بچپن میں میرا علاج کیا تھا والد کے حکم سے طبیبِ خاص اور سرپرست مقرر ہوئے۔ چنانچہ میرے تعلیمی اور ذاتی امور کی کُل ذمہ داری ان کو سونپ دی گئی۔

مستشار صاحب میرے فارسی ادب کے معلم تھے۔ ان کو بھی میرے ہمراہ روانہ کیا گیا تاکہ وہاں بھی میری فارسی کی تعلیم جاری رہ سکے۔ اس کے علاوہ میرے ایک بھائی اور فوجی مدرسے کے دو دوستوں کو بھی ساتھ بھیجنے کا میرے والد نے فیصلہ کیا۔

دوستوں کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا گیا۔ میں نے پہلا نام حسین فردوست کا (جس کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے) اور دوسرا نام والد کے وزیر دربار کے لڑکے مہرپور تیمور تاش کا پیش کر دیا۔ جب ان کے نام قبول کر لئے گئے تو میں ان کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ کی طرف روانہ ہوا۔

لیکن چند سال بعد میرے والد اور وزیر دربار کے درمیان سخت رنجش پیدا ہو گئی اسی لئے مہرپور کو مجبوراً واپس وطن آنا پڑا۔

میرے والد، والدہ اور دوسرے رشتے دار پہلوی بندرگاہ تک مجھے چھوڑنے آئے۔ ڈاکٹر نفیسی، مستشار صاحب، اپنے بھائی اور دوستوں کے ساتھ میں جہاز میں سوار ہوا۔ جہاز باد کوبہ کی طرف روانہ ہوا ہم پولینڈ اور جرمنی سے ہوتے ہوئے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا پہنچے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم چاروں نوجوانوں کے لئے جو کبھی اپنے وطن سے باہر نہیں نکلے تھے یہ سفر بہت ہی دلچسپ تھا۔ جنیوا میں ہم دو ہفتے اپنے قونصل خانے میں مقیم رہے۔ اس کے بعد ہمارا داخلہ لوزان کے ایک پرائیوٹ مدرسے میں ہو گیا۔ لوزان میں میں اور میرا بھائی ایک سوئس خاندان کے ساتھ رہنے لگے۔ اس خاندان کے سرپرست مسٹر مرسیر[1] تھے ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ یہ لوگ مجھ پر بہت مہربان تھے اور اسی لئے مجھے ان کے ساتھ رہنے میں بہت لطف آتا تھا۔ میرے دونوں ایرانی دوست مجھ سے الگ مدرسے میں رہتے تھے۔ ہم اس سوئس خاندان کے ساتھ ایک سال تک رہے۔ لوزان اور جنیوا کے درمیان لا روزی نامی بورڈنگ اسکول تھا۔ ہم اپنے سرپرست کے مشورے اور والد کے حکم سے اس اسکول میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے منتقل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے والد چاہتے تھے کہ میری تعلیم باضابطہ طریقے سے ہو اور بورڈنگ اسکول کے قاعدے و قوانین سے میں پورے طور پر واقف ہو جاؤں۔ پہلے مدرسے میں صرف دن کے وقت پڑھائی ہوتی تھی۔ اس مدرسے میں طالب علموں کی تعداد جن میں کچھ لڑکیاں بھی شامل تھیں ایک سو پچاس تھی۔ دوسرے مدرسے میں اگرچہ لڑکوں کی تعداد پہلے مدرسے کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا تھی لیکن لڑکیوں کے داخلے پر پابندی تھی۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ میرے اور چار بھائی بھی اس مدرسے میں آئندہ سال داخل ہوں گے۔

میں چار سال تک سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہا یہ چار سال میری زندگی کے بہت اہم سال تھے۔ والد صاحب کی شخصیت کے بعد جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے متأثر کیا وہ یہاں کا جمہوری نظام تھا۔

یہاں میرا جسم اس تیزی سے بڑھنا شروع ہوا کہ دوسروں کو تو کیا مجھے حیرت ہوتی تھی۔ پہلے بھی میں نے اشارہ کیا ہے کہ بچپن میں میں جسمانی طور پر کمزور تھا لیکن یہاں تن و توش نے وہ ترقی کی کہ ہاتھ پیروں میں بھرپور جان آ گئی یہاں مختلف کھیلوں کا (جیسے۔ ڈسک اچھالنا۔ نیزے سے نشانہ لگانا۔ اونچی چھلانگ۔ لمبی چھلانگ اور دو سو میٹر کی دوڑ وغیرہ) میں چیمپین رہا۔ کھیلوں میں حصہ لے کر میں نے بہت سے انعام بھی حاصل کئے اور اسکول کی فٹبال اور ٹینس ٹیم کا کپتان بھی چنا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب میں نے تعلیم کے ساتھ جوانوں کی تربیت کے لئے کھیل کی اہمیت کو سمجھا۔

میرا خیال ہے کہ میرے اس تیزی سے بڑھنے کا سبب اسکول کی غذا نہیں تھی کیونکہ میری فرانسیسی استانی نے ایران میں ہی مجھے فرانسیسی کھانوں کی عادت ڈال دی تھی۔ اس کے علاوہ سوئٹزرلینڈ میں جو غذا مجھے ملی وہ اس غذا سے زیادہ مختلف

1. MERCIER

نہ تھی جو میں اکثر ایران میں کھایا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سوئٹزرلینڈ کی ہوا بڑی صاف اور صحت بخش ہے لیکن تہران کی ہوا بھی سوئٹزرلینڈ کی ہوا سے کسی طرح کم نہیں۔ میری رائے میں میری جسمانی نشوونما کا تعلق میری ذہنی ترقی سے ہے جو مجھے اس نئے ماحول میں میسر آئی۔

جب میں تہران میں تھا تو ہر مضمون میں اچھے نمبر حاصل کرتا تھا۔ اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نمبر مجھے شخصی قابلیت کی بنا پر ملا کرتے تھے یا اس میں بھی میرے مقام و مرتبے کو دخل تھا۔ لیکن سوئٹزرلینڈ میں بھی، جہاں لوگوں کا ذاتی رسوخ امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے کے لئے اثر انداز نہیں ہوتا، میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ نہ معلوم کیوں پلین جیومیٹری سے مجھے زیادہ دلچسپی نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس مضمون میں مجھے زیادہ نمبر نہیں ملتے تھے۔ اس کے مقابلے میں مجھے الجبرا، ٹگنومیٹری، انالٹیکل جیومیٹری اور علوم طبیعی جیسے، فزکس، کیمسٹری وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ مجموعی طور پر میں سارے مضامین میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوا اور بہت سے انعامات حاصل کئے۔ تاریخ، جغرافیہ اور علوم طبیعی میری دلچسپی کے خاص مضامین تھے — فرانسیسی سیکھنے میں بھی میں نے کافی استعداد دکھائی اور فرانسیسی ادب پڑھنے میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔

اس مدرسے کے معلم اپنے کام میں بہت ماہر تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس نے اپنے تاثرات میرے ذہن پر چھوڑے ہوں یا میرا نزدیکی دوست رہا ہو بلکہ بعض تو ان میں ایسے تھے جن سے ڈر لگتا تھا۔ مدرسے کے ساتھی میرے مقام و مرتبے کی وجہ سے نہیں بلکہ خود میری شخصیت سے متاثر ہو کر مجھ سے میل جول رکھتے تھے اور یہ ایسی بات تھی جس سے مجھے بیحد مسرت ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے کمرے میں ہر وقت لڑکوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ان نشستوں میں مجھے بے لاگ تبصرہ اور کھُل کر بات کرنے کی اہمیت (جو مغربی جمہوریت کی خصوصیات ہیں) کا بخوبی اندازہ ہوا اور پڑھنے لکھنے کے معاملے میں میرے ذوق و جستجو کے جذبے کو انہی نشستوں نے اُبھارا۔ پڑھائی لکھائی، کھیل، ورزش اور لوگوں سے آزادانہ طور پر ملنے جلنے کے ساتھ نظم و ضبط کا جذبہ بھی یہیں بیدار ہوا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ بغیر جمہوریت کے نظم و نسق کا دوسرا نام ڈکٹیٹرشپ ہے اور اصول و ضوابط کے بغیر جمہوریت کا مطلب ہے طوائف الملوکی۔

ان سب باتوں کے باوجود مدرسے میں میری زندگی کی روش دوسرے سب ساتھیوں سے الگ تھی اور ان سے زیادہ مجھ پر پابندیاں تھیں کیونکہ جو سبق سب لڑکے پڑھا کرتے تھے مجھے اس سے زیادہ ہی پڑھنا پڑتا تھا۔ مدرسے کی پڑھائی تو اپنی جگہ تھی لیکن اس کے علاوہ مستشار صاحب نے فارسی ادب پڑھانے کا مفصل پروگرام بنا رکھا تھا جو میرے والد کے حکم سے تیار کیا گیا تھا کیونکہ وہ فارسی زبان و ادب کو میرے لئے بہت اہم سمجھتے تھے۔ دوسری طرف میرے سرپرست ڈاکٹر نفیسی میری رفتار و کردار بلکہ ہر فعل پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ افسوس کہ آج وہ زندہ نہیں ہیں۔ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کی یہ کڑی نگرانی براہِ راست والد کے حکم سے تھی یا اس لئے کہ میری تعلیم و تربیت سے ان کو گہری دلچسپی تھی حقیقت جو بھی ہو لیکن میری حالت تو بالکل قیدی کی سی تھی۔ زندگی مدرسے میں ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی اور اگر کبھی باہر جانے کا اتفاق بھی ہوتا تو

سرپرست صاحب میرے ساتھ رہتے۔
لڑکوں کو جب کبھی وقت ملتا وہ خوشی خوشی گھومنے پھرنے کی غرض سے شہر چلے جایا کرتے تھے لیکن مجھے ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کرسمس اور نئے سال کی چھٹیوں میں سب دوست تو بڑی آزادی اور خوشی سے رقص و سرود کی کی محفلوں اور رات کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے اور نئے سال کی آمد پر جشن مناتے تھے لیکن ایسے موقعوں پر میں اپنے کمرے میں تنہا رہتا اور تفریح کا سامان ریڈیو اور گراموفون ہوتے جس کا مقابلہ ان تفریحات سے ہو ہی نہیں سکتا جو میرے دوستوں کو اس وقت حاصل تھیں۔ میری رائے میں یہ رویہ مناسب نہ تھا اور اگر میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو میں ہرگز اس کی دیکھ بھال اس ڈھنگ سے نہ کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ مجھے زبردستی تفریحات سے دور رکھا گیا اس لئے میں نہ صرف سنجیدہ بلکہ ضرورت سے زیادہ متین ہو گیا تھا اور گوشہ نشینی کی عادت مجھ میں اب تک باقی ہے۔ حادثات اور خطرات کا جب کبھی سامنا ہوتا ہے تو مجھے پورا سکون اور اطمینان رہتا ہے اور بہت ہی کم ایسا ہوا ہے کہ اپنے اعصاب پر قابو نہ رہا ہو۔ خوش خلقی کی نعمت سے بھی میں بے بہرہ نہیں ہوں لیکن اس کے اظہار میں بہ نسبت اور لوگوں کے اعتدال سے کام لیتا ہوں۔

میں مناسب ہنسی مذاق اور سیاسی کارٹونوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہوں۔ معمولی درجے کے لوگوں اور عام آدمیوں سے بات کر کے بھی مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔ بچوں سے تو مجھے خاص لگاؤ ہے۔ میں اکثر اسکولوں کا معائنہ کر کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے بات چیت کرتا ہوں۔ ان کی سادہ اور بے ریا باتیں مجھے بےحد لطف دیتی ہیں۔

جب میں سوئٹزرلینڈ میں تھا تو اکثر اپنی مستقبل کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ میرے اور والد کے درمیان تو ہر ہفتے مراسلت رہتی تھی۔ البتہ بھائیوں، بہنوں اور والدہ کو خط کم ہی لکھتا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ نہایت عقلمندی سے حکومت کروں جو مجھے اس بات کے لئے مجبور کرتی تھی کہ علم و دانش کے لئے جتنی ایک طالب سے توقع کی جا سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ جستجو اور کوشش کروں۔ اس آرزو کے حصول کے لئے میں نے بڑے غور و فکر سے اپنے مضامین کا انتخاب کیا تھا اور علومِ طبیعی کے مطالعے کا فیصلہ اس غرض سے کیا کہ یہ آیندہ ملک کے صنعتی ذرائع کی ترقی میں میرے لئے مددگار ثابت ہوگا۔

پچھلی فصل میں مَیں نے اپنے روحانی ارتقاء اور دینی عقائد کا ذکر کیا ہے۔ یورپ کے قیام کے پہلے دو سالوں میں چونکہ میں نئے ماحول سے واقفیت حاصل کر رہا اس لئے اپنے دینی عقائد کے متعلق مجھے غور و فکر کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن جلد ہی مجھے اپنے عقائد میں پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں روزانہ کے دینی فرائض ادا کرنے لگا۔ سوئٹزرلینڈ کے قیام کے آخری تین سالوں میں تو اس فریضے کو بڑے راز و نیاز کے ساتھ میں بارگاہِ ایزدی میں خلوصِ نیت اور دلی عقیدت سے انجام دیتا کیونکہ میرا یہ عزم تھا کہ جس وقت تختِ سلطنت پر پہنچوں تو چراغِ ایمان سے اپنے راستے کو روشن رکھوں۔

اُس وقت میں یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ تختِ سلطنت پر پہنچنے کے بعد مجھے کون سے اصول اور لائحہ عمل اختیار کرنے چاہئیں۔ عوام اور خاص طور پر کاشتکار طبقے سے مجھے جو دلچسپی تھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انہی دنوں مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں

تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے بعد دو یا تین سال کے لئے ان کاشتکاروں کا جو سرکاری زمینوں پر کاشت کرتے ہیں لگان معاف کر دوں گا تاکہ ہر کاشتکار اپنے کنبے کے لئے کچھ نقد روپیہ بچا کر اپنا گھر بنا سکے اور کاشتکاری کا ضروری سامان خرید سکے یا اُن کاموں پر روپیہ لگا سکے جن کے لئے روپے کا ہونا اشد ضروری ہے۔ جوانی میں جو منصوبہ میں نے تیار کیا تھا اس کا نتیجہ کاشتکاروں کے درمیان سرکاری زمینوں کی تقسیم کی شکل میں ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کی تفصیل میں اگلی فصل میں بیان کروں گا۔

ان دنوں ایک خیال اور بھی میرے ذہن میں اکثر آیا کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اپنے عہدِ حکومت میں عوام کی شکایات کے لئے صندوقوں کا انتظام کروں گا تاکہ جس کسی پر ظلم ہو وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی فریاد مجھ تک پہنچا کر داد خواہی کر سکے۔ میں ان صندوقوں کو اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ عوام کی ضروریات، پریشانیوں اور دقتوں کی خبر مجھے براہِ راست ملتی رہے۔ میرے خیال میں یہ بات میرے ذہن میں اس انصاف کی گھنٹی کی وجہ سے آئی تھی جس کو نوشیروان نے اپنے محل میں لگوایا تھا اور جس کا ذکر پچھلی فصل میں آچکا ہے۔

جس وقت میرا دورِ حکومت شروع ہوا تو طالب علمی کے زمانے کی باتیں اور بھی پختہ ہو گئیں۔ سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ عوام کے لئے وقف کر دوں تاکہ ہر شخص اپنی دشواریاں میرے سامنے آکر بیان کر سکے لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ قوم کے تمام افراد سے ملاقات کرنا عملاً ممکن نہیں کیونکہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں میرے آٹھ گھنٹے دفتر کے کام اور سرکاری ملاقاتوں میں صرف ہوتے ہیں، آٹھ گھنٹے کھانے اور آرام کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ باقی آٹھ گھنٹے میں دس پندرہ لوگوں سے زیادہ بات چیت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس سے زیادہ لوگوں سے ملنے میں ان کی خاطر خواہ تشفی کا امکان نہ تھا۔ چنانچہ میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا جس کے ذریعے ہر شخص خواہ کسی مقام و مرتبے کا ہو وہ خاص میرے دفتر کی معرفت اپنے اہم اور ذاتی کاموں کے لئے مجھ سے خط و کتابت کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ اب تک جاری ہے اور کسان سے لے کر وزیرِ اعظم تک خواہ کسی کا بھی خط یا عریضہ ہو مجھ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ ہر ماہ کئی سو خط اور عرضیاں میرے پاس آتی ہیں جن کا خلاصہ (جس کو خاص میرے دفتر کا عملہ تیار کرتا ہے اور اصل درخواست کا مسودہ یا خط ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے) یا پورا مضمون میں خود پڑھتا ہوں اور ان سب کا جواب دیتا ہوں۔ اگر مجھ سے یا حکومت کے کسی شعبے سے کسی قسم کی مدد مانگی گئی ہو تو اس کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے۔ حکومت کے محکموں کا فرض ہے کہ وہ جو بھی کارگذاری کریں اور اس کے جو بھی نتائج برآمد ہوں اس کی مجھے اطلاع دیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ درخواست دینے والا ناامید نہ ہو اور اسی خیال کے پیشِ نظر تحقیق و تفتیش کا محکمۂ شاہی قائم کیا گیا ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ عام لوگوں کی شکایات کی تفتیش کرے۔ اس محکمے کا تفصیل سے ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔

۱۹۳۶ء کے بہار کے موسم میں میں نے ڈپلوما حاصل کیا اور گھر جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میرے رشتے دار جو پہلوی بندرگاہ پر رخصت کرنے آئے تھے اب ایک ایسے شخص کو لینے آرہے تھے جو چند سال میں اس قدر بدل چکا تھا کہ

پہلی نظر میں تو اس کے والد کے لئے بھی پہچاننا مشکل تھا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ بندرگاہ پہلوی کی مجموعی طور پر حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے اور جب میں یہاں سے یورپ کے لئے روانہ ہوا تھا اس وقت سے اب تک اس قدر تبدیلی آچکی ہے کہ دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایک ایرانی گاؤں کو کسی یورپی شہر میں بدل کر رکھ دیا گیا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ پورے ملک میں جو آبادکاری اور ترقیات کا کام ہو رہا ہے بندرگاہ پہلوی تو اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے اور رشتہ داروں سے ملنے کے بعد میں تہران کے ملٹری کالج میں داخل ہو گیا۔ کیونکہ میرے والد چاہتے تھے کہ میں اپنی تعلیم اسی کالج میں ختم کروں اور ان کی موجودگی میں شاہنشاہی کے رموز بھی سیکھ لوں۔ ان کی یہ خواہش مجھے پسند آئی کیونکہ مجھے خود اس بات کا شوق تھا کہ فوجی تعلیم کے اہم نکات اور باریکیاں مجھے معلوم ہو جائیں۔ اس کے علاوہ ان پر جو ذمہ داریاں تھیں ان کا بھی یہی تقاضا تھا کہ میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گذاروں۔ ان کی یہ تجویز واقعی بڑی دانشمندانہ تھی۔

اُس زمانے میں ہمارے ملٹری کالج میں فوجی مشیر فرانسیسی تھے اور ہمارا کالج سینٹ سیر[1] کا نمونہ تھا۔ آج ہم امریکی مشیروں کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارا کالج امریکہ کے ویسٹ پوائنٹ[2] ملٹری کالج کی پیروی کر رہا ہے اور اس کا تعلیمی نصاب دو سال کی بجائے تین سالہ کر دیا گیا ہے۔ ملٹری کالج میں عام اور مقررہ نصاب کے علاوہ میں نے فنِ جنگ اور صف آرائی[3] کے بھی خصوصی درس لئے اور بالآخر ۱۹۳۸ء کے موسمِ بہار میں اس کالج سے سکنڈ لفٹیننٹ کے درجے پر گریجویٹ ہوا اور فوراً شاہی فوج میں بہ حیثیت انسپکٹر میرا تقرر کر دیا گیا۔ میں صبح و شام دن میں دو بار سپاہیوں اور فوجی دستوں کے معائنے کے لئے چھاؤنی اور فوجی دفتروں میں جاتا اور خود بھی جنگی مشق میں حصہ لیتا اور دوسروں کی بھی رہنمائی کرتا۔ کبھی کبھی میں سپاہیوں کی مشق اور تربیت کی بھی نگرانی کرتا۔ کبھی کبھی رات کے وقت بھی جنگی مشق میں مَیں شریک ہوتا۔ یہ کام بہت سخت تھا اور زندگی اس نہج پر بے کیف سی ہو کر رہ گئی تھی لیکن چونکہ مجھے فوج سے دلچسپی تھی اور اس کی از سرِ نو تشکیل میرے ذمے تھی اس لئے مجھے تھکان کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا۔ انہی دنوں میری شادی مصر کی شہزادی فوزیہ سے ہو گئی اس کی تفصیل بھی آگے آئے گی۔

فوجی خدمات کے علاوہ والد کی خدمت میں حاضر ہونا بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ میں کبھی کبھی صبح اور اکثر اوقات ساڑھے گیارہ بجے کھانا کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے ان سے ملنے جایا کرتا تھا اور کھانے کے وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا کہ بعض ضروری باتوں کے لئے کھانے کے بعد بھی مجھے رُکنا پڑتا۔ روزانہ کی پوری ملاقات میں حالاتِ حاضرہ، ملک کی داخلی اور خارجی سیاست پر تذکرہ رہتا۔ میرے والد جب ایران کے مختلف حصوں میں سفر کے لئے جاتے تو میں بھی ان کے ہمراہ ہوتا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں لے جا کر

1. St. CYR 2. WEST POINT 3. TACTIES

مجھے عام لوگوں کی حالت، جغرافیائی کیفیت اور ہر علاقے سے متعلقہ مسائل سے واقفیت پیدا کرائیں۔ سفر کے دوران بھی مختلف مسائل اور ان کے جزئیات کا ہی تذکرہ رہتا۔ یہاں یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ لفظ "تذکرہ" اپنے اصلی معنوی میں استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ حکومت کے اعلیٰ افسران اور ذمے دار لوگ میرے والد سے بات کرتے وقت اس قدر مرعوب ہوتے اور ادب واحترام کا پاس رکھتے کہ وہاں "ذکر" یا "تذکرے" کی گنجائش ہی باقی نہ رہتی میں بھی زیادہ تر اشاروں اور کنایوں میں بہت ہی مختصر الفاظ میں اپنے نظریات ان کی خدمت میں پیش کر دیتا لیکن اس میں کوئی بحث یا دوسرے الفاظ میں "مذاکرے" کا پہلو نہ ہوتا۔ اگرچہ اس وقت میری عمر صرف انیس سال تھی لیکن کبھی کبھی مختلف مسائل پر میں اپنے نظریات بہت صاف اور کھلے الفاظ میں ان کے سامنے پیش کر دیتا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ میری رائے اور نظریات کو بڑے غور اور متانت سے سنتے اور میری تجاویز کو بہت کم رد کرتے مثال کے طور پر میرے بار بار سفارش کرنے پر بہت سے سیاسی قیدی رہا ہوئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر مصدّق بھی تھا جس نے اپنے عہدِ وزارت میں ملک کو کنگال کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور قریب تھا کہ جس خاندان کی حکومت میرے والد نے قائم کی تھی اس کا تختہ اُلٹ دے۔ اگرچہ میں نے مصدّق کو موت کے پنجے سے چھڑایا اور اس نے اس بات کا اعتراف بھی کیا لیکن ساری دنیا نے دیکھا کہ اس نے مجھے اس کا کیا صِلہ دیا اور میرے احسان کا بدلہ کس طرح اُتارا۔

میرے والد نے مصدّق کو اس الزام میں گرفتار کیا تھا کہ وہ ایک غیر ملکی حکومت سے ساز باز کئے ہوئے ہے اور ایرانی حکومت کو ختم کر دینا چاہتا ہے معلوم نہیں کیوں میرے والد کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کا جو بھی مخالف ہے اس کے پیچھے کسی غیر ملکی طاقت کا اور خاص طور پر انگریزوں کا ہاتھ ہے۔

مصدّق کو جہاں قید کیا گیا تھا وہ آب وہوا کے اعتبار سے نہایت ہی گندہ علاقہ تھا اور چونکہ وہ بوڑھا تھا اور بیمار رہتا تھا اس لئے قید خانے سے زندہ نہیں نکل سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس کی سفارش کی اور چند ماہ بعد اس کو رہا کر دیا گیا۔ اگلی فصل میں مَیں بتاؤں گا کہ اس نے اس رہائی سے کیسا غلط فائدہ اٹھایا۔ جب کبھی مصدّق کی رہائی کا خیال آجاتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ اس کی سفارش کر کے کیا میں نے صحیح قدم اٹھایا تھا۔ لیکن جب دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں جو میری کوشش اور سفارش سے رِہا ہوئے تھے تو مجھے خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

اس زمانے کا ایک اور دلچسپ واقعہ مجھے یاد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرے والد کے دل میں میرے لئے کس قدر محبت تھی۔ اس واقعہ کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ درست تھا اور میں نے اس کا مطلب غلط سمجھا۔ ایک روز میں ان کے ساتھ کلار دشت نامی مقام دیکھنے گیا۔ ہمارے آرام کرنے کے لئے وہاں خیمے لگا دیئے گئے تھے۔ ہم آرام کرنے کی غرض سے خیمے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ میرے والد نے ٹہلتے ٹہلتے ایک بات کہی کہ "میں چاہتا ہوں کہ حکومت کے دفتری نظام کو اس طرح سے ترتیب دوں کہ اگر کسی دن میری آنکھ بند ہو جائے تو ملک کا نظام بغیر افسرانِ بالا کی نگرانی

کے حسب معمول چلتا رہے۔"

چونکہ اُس وقت میں بالکل نوجوان تھا اور ذہنی طور پر پختگی نہیں آئی تھی اور طبیعت بھی حساس پائی ہے اس لئے مجھے ان کی یہ بات گراں گذری اور اپنی ہتک محسوس کی کیونکہ میں یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ مجھے اس کا اہل نہیں سمجھتے کہ ان کے بعد میں اپنے فرائض پوری طرح انجام دے سکوں گا اور ان کا صحیح جانشین بن سکوں گا۔ اس احساس نے مجھے بڑا افسردہ کیا لیکن میں یہ بات مُنہ پر نہیں لایا لیکن اکتوبر ۱۹۴۱ء کے واقعات کی وجہ سے میرے والد کو تختِ سلطنت سے دست بردار ہو کر وطن سے دور جانا پڑا تو حکومت کے تمام محکموں میں ایک دم بدنظمی پھیل گئی۔ ان حالات کو دیکھ کر مجھے ان کی وہ بات یاد آ گئی کہ آخر کیوں وہ آیندہ کے لئے پیش بندی کرنا چاہتے تھے اور اس بات کا مجھے افسوس رہا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کہ حکومت کا ڈھانچہ اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ خود بخود کام کرتا رہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ایران پر اتحادیوں کے قبضہ کئے جانے کی بہت سی غلط اور گمراہ کُن باتیں سُنی جا چکی ہیں اس کا پس منظر یہ ہے کہ میرے والد نے جرمنی حکومت سے اقتصادی اور ثقافتی تعلقات بہت ہی قریبی اور خوشگوار کرلئے تھے ۱۹۳۸ء تک یعنی عالمگیر جنگ سے ایک سال پہلے جرمنی نے ایران کی غیر ملکی تجارت میں پہلا مقام حاصل کر لیا تھا۔ دوسرے درجے پر روس تھا جرمنی ہم سے زیادہ تر خام اُون اور روئی خریدتا تھا اور اس کے بدلے صنعتی سامان اور مشینیں فروخت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے جرمن انجینئر اور تکنیکی ماہرین بھی ہمارے ملک میں تھے۔ یہ لوگ کارخانے قائم کرنے، ریلوے لائن بچھانے اور بندرگاہوں کی تعمیر میں ہماری مدد کر رہے تھے۔ اور اسی وجہ سے ہمارے بہت سے کارخانوں میں جرمنی کی بنی ہوئی مشینیں اور دوسرا سامان استعمال ہو رہا تھا۔ تہران ریڈیو اسٹیشن کا ٹرانسمیٹر بھی جرمنوں نے ہی لگایا تھا۔ جب کارخانے بن کر تیار ہو جاتے تو اُن کے چلانے اور دیکھ بھال کے لئے جرمن ماہرین ایران میں کچھ عرصے کے لئے قیام کرتے۔ اس کے علاوہ بہت سے جرمنی کارخانوں کے مالکان اور منڈیوں کے آڑھتی اور دلّال بھی ایران میں تھے بہت سے ایرانی پڑھنے کی غرض سے جرمنی جاتے اور جرمن استاد تہران یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ زراعتی اور جانوروں کے علاج کے کالج کے پرنسپل جرمن ہی تھے۔

نازیوں نے ایک بہت بڑا مجموعہ جس میں ان کے نظریات کی ترجمانی کرنے والی اور دوسرے مختلف مضامین کی کتابیں شامل تھیں ایران کے قومی کتب خانے کو پیش کیا۔ وہ ایران ریڈیو سے اپنے خیالات اور نظریات کا پرچار بھی کرتے اور ان کے خبر رسانی کے سرکاری دفاتر ہمارے اخباروں کے لئے خبریں بھی بھیجتے۔ انہوں نے ایران میں اپنے پروپگنڈے کا مرکز بھی قائم کر رکھا تھا۔ میرے والد نے جرمنی سے اگر بہت اچھے اقتصادی تعلقات قائم کر رکھے تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی، کیونکہ جرمنی کی بنی ہوئی چیزیں اور جرمن فنکاروں کی مہارت ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ان کی تجارتی شرائط بھی بہت آسان تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی کالونی بھی ایران میں قائم نہیں کی تھی اور ہمارے داخلی معاملات

میں بھی بہت ہی کم مداخلت کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان دو بڑی سامراجی طاقتوں کے سخت مخالف تھے جنہوں نے ہمارے لئے مصیبتیں پیدا کی تھی۔

چونکہ جرمن اور ایرانی دونوں ایک ہی آریائی نسل سے ہیں اس لئے جرمن اپنی نشر و اشاعت میں اس نسلی وحدت کا بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ ادھر ایرانی بھی مطلق العنان حکومت کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس بات سے غافل تھے کہ ہٹلر انسانی حقوق کو پائمال کرنے میں اسٹالین سے کسی طرح کم نہیں۔

اس کے علاوہ میرے والد کو آبادکاری، صنعت کی توسیع اور فوج کو طاقتور بنانے کے منصوبوں کے لئے فوری طور پر جرمنی سامان اور تکنیکی ماہرین کی ضرورت تھی۔ لیکن جس وقت اتحادیوں نے سمندروں پر اپنا قبضہ کر لیا اور بڑی حد تک جرمن مال کا ایران میں آنا کم ہو گیا تو انگریزوں نے ایران کو قرضہ دینے کی تجویز پیش کی تاکہ اس روپے سے ایران اتحادی طاقتوں سے اپنی ضرورت کا سامان خرید سکے۔ لیکن وزارتِ مالیات نے اس تجویز کو رد کر دیا کیونکہ جو سامان ہم خریدنا چاہتے تھے اتحادی طاقتوں کو بھی انہی چیزوں کی ضرورت تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب تک اتحادی طاقتیں ایران میں گھسی رہیں جرمنی سامان خشکی کے راستے سے ایران آتا رہا۔

مورخین کی رائے کے برعکس میرے والد ہٹلر کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ۱۹۳۴ء میں جو انہوں نے ترکی کا سفر کیا تھا اس کے دوران انہوں نے جرمنوں کی نخوت اور غرور کی بہت سی داستانیں سُنی تھیں (پہلی عالمگیر جنگ کے موقع پر ترک اور جرمن متحد ہو گئے تھے) اور ۱۹۳۰ء کے بعد سے وہ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں کا رویہ خود بھی دیکھ رہے تھے۔ اس سے قطع نظر پورے یورپ پر قبضہ کرنے کی جو پالیسی ہٹلر نے تیار کر رکھی تھی اس کے پیشِ نظر میرے والد ایران کو جرمنوں کے اثر و رسوخ سے پاک رکھنا چاہتے تھے اور چونکہ وہ خود ایک حد تک ڈکٹیٹر تھے اس لئے ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

جس دن یورپ میں دوسری عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑکے ایران نے جنگ میں حصّہ نہ لینے کا اعلان کر دیا کیونکہ میرے والد نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ملک اس مصیبت سے دوچار ہو۔ یہ اعلان اس لئے کیا گیا تھا کہ ایران اتحادی اور نازی طاقتوں کے ہر عمل کا جواب دے کر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکتا تھا۔ میرے والد کی پالیسی کا خلاصہ اس ایک جملے میں تھا کہ جنگ سے علیحدگی کے ساتھ فوجی طاقت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا' اس کے بعد بھی میرے والد اپنے اس فیصلے پر قائم رہے کہ ایران جنگ سے دور ہی رہے۔

روس پر جرمنی کے حملے نے ثابت کر دیا کہ اگر جلدی ہی امریکہ یا برطانیہ کی طرف سے مدد نہ کی گئی تو اس کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ دنیا کے نقشے کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اتحادیوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ روس کو مدد کس راستے سے پہنچائی جائے کیونکہ ولادی وستوک[1] اور مشرقِ بعید کی دوسری تمام روسی بندرگاہوں کی جاپانی بحری فوج کڑی نگرانی کر رہی

1. VALDIVOSTOK

تھی (ستمبر ۱۹۴۰ء میں جاپان نے عملی طور پر جرمنی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا لیکن ابھی جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا)۔
اس کے علاوہ یہ بندرگاہیں روس کے مغربی مورچے سے بہت دور تھیں۔ اتحادیوں نے مرمانسک[1] کی بندرگاہ کے راستے سے جو بحرِ منجمد شمالی کے کنارے پر واقع ہے کچھ مدد روسیوں کو بھیجی لیکن یہ راستہ بہت ہی خطرناک تھا کیونکہ جرمنوں کی آبدوز کشتیاں ناروے کے ساحل کے کنارے اتحادیوں کے جنگی سامان لے جانے والے جہازوں کی تاک میں لگی رہتیں اور آسانی سے جہازوں پر حملہ کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ مرمانسک کی بندرگاہ بہت چھوٹی تھی اور باربرداری کے لئے محکمہ ریلوے کے پاس جو سامان تھا وہ ناکافی تھا اور اس وقت یہ بھی ممکن نہ تھا کہ فوری طور پر بندرگاہ کو بڑھا لیا جائے۔ اگرچہ نظریاتی طور پر تو یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ بحرِ روم اور بحرِ اسود کے راستے سے روسیوں کو مدد بھیج دی جائے لیکن بحرِ روم میں اتحادی فوجوں کے جہازوں کے لئے روز بروز خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایران کی طرح چونکہ ترکی بھی خود کو اس جنگ سے الگ رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے درّہ دانیال کو بند کر دیا تھا۔ کہیں کہیں یہ درّہ چوڑائی میں ایک میل سے بھی کم ہے اس لئے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر زبردستی داخل ہوا جائے تو ترک اس میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ بلغاریہ اور یونان کا علاقہ جرمن پہلے ہی فتح کر چکے تھے اس لئے یہ بھی خوف تھا کہ اس راستے کو استعمال کیا گیا تو جرمن بیچ میں مداخلت کریں گے اتحادیوں کے لئے تمام مشکلات کا واحد حل صرف یہ تھا کہ خلیج فارس اور ایرانی ریلوے کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ روس و برطانیہ نے نہ صرف میرے والد کے وطنِ عزیز پر قبضہ کیا بلکہ انہیں اس طرح بھی دلی صدمہ پہنچایا کہ ریلوے لائن جو ابھی بن کر تیار ہی ہوئی تھی اور جس سے میرے والد کو بے حد دلچسپی تھی اپنے لئے استعمال کرنے لگے۔

اس وقت روس اور برطانیہ کی طرف سے یہ غلط پروپیگنڈا شروع کیا گیا کہ اتحادی اس لئے ایران میں داخل ہوئے ہیں کہ رضا شاہ نے جنگ سے الگ رہنے کا اعلان کرنے کے باوجود اپنے قول کی خلاف ورزی کی ہے اور جو جرمن ایران میں رہ رہے ہیں ان کو نکالنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں ہیں لیکن ان کی یہ دلیل بالکل بے بنیاد اور بچکانہ تھی کیونکہ اس وقت نہ صرف جرمن ماہرین بلکہ برطانوی اور اتحادی قوموں کے تکنیکی ماہرین بھی ایران میں کام کر رہے تھے اور سب ایرانی آئین و قانون کی حفاظت میں تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان حقائق کے پس منظر میں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اتحادیوں کے لئے جرمنوں کا ایران میں ہونا تو جزئی بات تھی لیکن ان کو اس سے بھی بڑا خطرہ نظر آ رہا تھا اور آج سب لوگ اس بات پر مجھ سے متفق ہیں کہ اگر اتحادیوں کو رسد پہنچانے کے لئے ایرانی راستوں کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ اس ملک کو دوسری جنگِ عظیم کی آگ میں ہرگز نہ جھونکتے۔ یہاں ہمیں یہ بات نہ بھول جانی چاہئے کہ اگر نازیوں نے روس کے قفقازی مورچوں کو توڑ دیا ہوتا جیسا کہ وہ ۱۹۴۲ء کے موسم بہار کے حملے میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے تو وہ یقیناً ایران میں پیش قدمی کرتے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ روزنبرگ[2] نقشے کے مطابق نازیوں کا یہ منصوبہ تھا کہ فتح کرتے ہوئے خلیج فارس تک پہنچ جائیں تاکہ ہندوستان پہنچنے کے لئے فاصلہ کم رہ جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی

1. MURMANSK 2. ROSENBERG

کئی اسباب تھے جن کی وجہ سے ان کا خلیج فارس تک پہنچنا بہت ضروری تھا۔ مثال کے طور پر وہ چاہتے تھے کہ قفقاز کے تیل کے ذخیروں پر اپنا قبضہ کرلیں اور روسیوں کو وہاں سے ایک بوند بھی نہ لینے دیں اسی طرح ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ایران کے تیل کے ذخیروں اور تیل صاف کرنے کے کارخانوں پر بھی اپنا قبضہ کرلیں تاکہ انگریزوں کو وہاں سے کچھ بھی نہ مل سکے۔
جرمن یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ انگریزوں کی بحری، بری اور ہوائی طاقت کا دارومدار ایران کے تیل پر ہے اور وہ اس بات کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے کہ اس راستے کو جس سے اتحادی اپنی مدد روس کو پہنچا سکتے تھے بالکل تباہ کردیں۔
اصل واقعات اور ان کے پیدا ہونے کے اسباب بھی ہمیں یہاں نظر میں رکھنے چاہئیں۔ اگر اتحادیوں نے ایران کے راستے سے روسیوں کو جنگی سامان نہ پہنچایا ہوتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ جرمن اپنے ۱۹۴۲ء کے حملے میں کامیاب ہوجاتے اور میرا ملک بری طرح تباہ ہوتا۔ میرے بعض ہم وطن اس لئے جرمنی کے حملے کو پسندیدہ نظر سے دیکھتے تھے کہ اس سے روس اور برطانیہ کا زور ٹوٹ جاتا لیکن ان کو اس وقت بڑی مایوسی ہوتی جب وہ ہٹلر کے دباؤ میں آجاتے جب میرے ہموطنوں نے یہ افواہیں ہر طرف سے سنیں کہ روس اور جرمنی کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا ہے جس کی رُو سے یہ طے پایا ہے کہ ایران پر روس اپنا تسلط قائم رکھے گا تو ان لوگوں نے اپنی رائے بدل دی کیونکہ یہ معاہدہ اس معاملے سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ تھا جو ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ کے درمیان ہوا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جرمنوں نے روس پر کامیاب حملہ کیا اور یہ قوی امکان تھا کہ جرمنی فوجیں قفقاز کے راستے سے جنوب کی طرف بڑھیں گی۔ اس حملے سے انگریز سخت پریشان تھے کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں ملک ہندوستان، نہر سوئز اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخیرے خطرے میں نہ پڑ جائیں۔
اسی سال کے آخر میں روسیوں نے بہت بڑے حملے کی تیاری کی جس نے جرمنوں کی پیش دستی کو ناکام بنا دیا چند ماہ بعد بہار کے موسم میں پھر جرمنوں نے حملہ کیا لیکن اس میں بھی انہیں روسیوں نے شکست دی اور آگے بڑھنے سے روک دیا لیکن اتحادیوں کو ان نتائج سے خاطر خواہ اطمینان نہ تھا چنانچہ چرچل نے اپنی دوسری جنگِ عظیم کی یادداشتوں میں لکھا ہے:
"اگست ۱۹۴۲ء میں شہر ماسکو میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں میں شریک تھا اور میرے ساتھ جنرل بروک بھی تھا۔ اس کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد تک جنرل بروک کی یہ رائے تھی کہ جرمنی فوجیں قفقاز کے پہاڑوں سے گذر کر بحر خزر کی گودی پر اپنا قبضہ کرلیں گی چنانچہ ہم نے پوری تیاری کے ساتھ اپنی دفاعی طاقت کو سوریہ[1] میں جمع کردیا۔"
معلوم نہیں غلط یا صحیح لیکن اتحادیوں کا یہ خیال تھا کہ جرمنی نے جو ایران سے دوستانہ اور خوشگوار تعلقات قائم کئے ہیں یہ ایران پر قبضہ کرنے کی طرف پہلا قدم ہے کیونکہ جرمنوں نے یورپ کی فتوحات کے دوران جو تجربات حاصل کئے تھے ان کے تحت وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں اپنا اقتدار و تسلط بڑھاتے تھے اور اندرونی طور پر اس کو بالکل کھوکھلا کردیتے تھے اس کے بعد بڑی سرعت سے حملہ کرکے اس کو بالکل ہی ختم کردیتے تھے۔ اتحادی طاقتیں جرمنوں کے پروپیگنڈے کا اثر ایران میں دیکھ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جرمن تخریب کار بڑی آسانی سے پوری ایرانی ریلوے

1. SYRIA

لائن پر اپنا قبضہ کرلیں گے اگر انہوں نے ضرورت محسوس کی تو ریل کی لائن، بڑے بڑے پل اور سُرنگیں سب برباد بھی کردیں گے اور ایک پُل یا سُرنگ کی تباہی پوری ریلوے لائن کو بیکار کرکے رکھ دے گی تیل کے ذخیرے اور تیل صاف کرنے کے کارخانے بم اور گولوں کے لئے اچھا نشانہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ اتحادی محسوس کرتے تھے کہ جنوبی ایران کے تیل کے میدان جرمنوں کو اس کام کے لئے اُکسا سکتے ہیں۔ شاید یہ بات یہاں بتادینی مفید ہوگی کہ جرمنی اور اٹلی کے آٹھ باربردار جہاز شاہپور بندرگاہ پر رُکے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان جہازوں کی نگرانی دن رات دو ایرانی کشتیاں کررہی تھیں لیکن ہر جہاز کا عملہ جہاز ہی میں تھا اس لئے اتحادیوں کو ڈر تھا کہ اگر ان میں سے کوئی جہاز حفاظتی کشتیوں سے اوجھل ہوکر بچ نکلا اور جان بوجھ کر شط العرب میں ڈبو دیا گیا تو آبادان کی بندرگاہ (جہاں تیل صاف کرنے کے کارخانے ہیں) تک پہنچنے کا جو واحد راستہ ہے وہ بند ہوجائے گا شاید اتحادیوں کا یہ خوف بیجا نہ تھا کیونکہ یہ خیال عام تھا کہ ان جہازوں میں سے کچھ میں آتشگیر مادّہ بھرا ہوا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ اسی مقصد کے لئے بھرا گیا ہو۔ چنانچہ جس وقت انگریزی فوجیں جنوبی ایران میں داخل ہوئیں تو دو جرمنی جہازوں کے ملاّحوں نے اپنے جہازوں کے آتشگیر مادّے کو اُڑا دیا۔ اور جہاز کو بالکل ناقابلِ استعمال بنادیا۔ لیکن یہ عمل شط العرب کے اس مقام پر کیا گیا جہاں جہازوں کی آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔

۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے سے ایران میں جرمنوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے برطانوی حکومت کو سخت تشویش تھی اور کئی بار دوستانہ طریقے سے ایرانی حکومت کو تنبیہہ بھی کی گئی اور یہ تجویز بھی رکھی کہ جرمن اور دوسری قوموں کے انجینئر اور مختلف شعبوں میں کام کرنے والے مشیروں کی تعداد کم کردی جائے۔ لیکن میرے والد نے انہیں یہ بات ذہن نشین کرادی کہ جرمن انجینئروں کا بدلنا دشواریوں سے خالی نہیں اور اگر ایسا کیا بھی گیا تو وہ یہ سمجھیں گے کہ ایران نے اپنی جنگ سے علیحدہ رہنے والی پالیسی کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے والد نے انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ اگر جرمن کوئی نامناسب حرکت کریں گے تو حکومت اس کا تدارک کرسکتی ہے اب جبکہ دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوگئی ہے اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ پوری جنگ کے دوران ایک بھی ایسا حادثہ رونما نہیں ہوا جس کی وجہ سے ایرانی ریلوے یا تیل کی صنعت کو کسی قسم کا نقصان پہنچا ہو۔ میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سب میری یا میرے والد کی یا حکومت کی کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن کسی حادثے کا ظاہر نہ ہونا ایک قابلِ ستائش امر ہے۔ یہ بات انصاف سے بعید ہوگی اگر یہاں یہ نہ کہا جائے کہ اتحادی فوجوں کے ایران میں داخل ہونے سے پہلے تک جرمنوں نے تخریبی کارروائیوں کو اس امید پر ملتوی کررکھا تھا کہ وہ خود قفقاز کے راستے سے ایران میں داخل ہوکر یہاں کی سڑکوں اور تیل کے ذخیروں پر قبضہ کرلیں گے۔

روس پر ہٹلر کی فوجوں کے حملے کے چار روز بعد ۲۶ جون ۱۹۴۱ء کو روس اور برطانیہ نے مل کر ایران سے احتجاج

کیا۔ انہوں نے ایران میں جرمنوں کے قیام پر سخت تشویش ظاہر کی اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ ان کے پاس ایسی دستاویز موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایران میں جرمنی حکومت کے افسر اور نمایندے فوجی انقلاب لانے کی اسکیم تیار کرنے میں مشغول ہیں۔

اسی سال ۱۹ جولائی کو روسی اور برطانوی حکومتوں نے مشترکہ احتجاجی نوٹ ایرانی افسران کو بھیجا۔ ۱۶ اگست کو ایک اور نوٹ بھیجا گیا اس دفعہ لہجہ بہت سخت اور درشت تھا۔ لیکن جو جواب حکومتِ ایران کی طرف سے دیا گیا وہ ان کے لئے تسلی بخش نہ تھا کیونکہ کابینہ کے وزیروں میں (جن کا اکثر اتحادیوں سے رابطہ رہتا تھا) اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ میرے والد کے سامنے یہ کہہ سکیں کہ اتحادیوں کا یہ فیصلہ ہے کہ جس بات کے لئے احتجاج کیا جا رہا ہے اگر اس کو نہ روکا گیا تو وہ طاقت کا استعمال کریں گے۔

۲۵ اگست کو ایک بار پھر حکومتِ برطانیہ اور روس کی طرف سے یادداشت ایرانی حکومت کو بھیجی گئی اور اس میں یہ بات واضح طور پر کہہ دی گئی کہ اب وہ مزید سخت قدم اٹھانے اور عملی طور پر احتجاج کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد شمال کی طرف سے روسی فوجوں نے اور جنوب کی جانب سے انگریزی لشکر نے ایران پر چڑھائی شروع کر دی۔ فوجوں کے حرکت میں آنے کے چند گھنٹے بعد میرے والد نے روس اور برطانیہ کے سیاسی نمائندوں سے تہران میں بات چیت شروع کی اور کہا کہ انہیں دونوں حکومتوں کی ہر تجویز منظور ہے لیکن انہیں یہ جواب دیا گیا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے ہی بڑھتی رہیں گی۔

ایرانی فوج پر اچانک حملہ ہوا اور ہمارے سپاہیوں پر فوجی بارکوں میں بمباری کی گئی۔ ہماری بحری فوج کو جو بہت بڑی نہ تھی، بغیر خبردار کئے سمندر میں غرق کر دیا گیا جس سے ہمارا بہت جانی و مالی نقصان ہوا۔ اگر میرے والد اور تمام ایرانی یہ کہیں کہ اتحادیوں نے ہم سے دغا اور بے ایمانی کی تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ دراصل میرے والد یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتحادی اس طرح برملا اور آشکارا ہماری آزادی اور حقِ حکمرانی پر تجاوز کریں گے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اتحادیوں کے پاس اتنا سامانِ جنگ موجود ہے کہ آسانی سے ہمارے ملک پر حملہ کر سکتے ہیں لیکن انہیں آخری لمحے تک اس بات کا یقین تھا کہ اتحادی بین الاقوامی قوانین کا پاس رکھیں گے اور یہ نوبت ہرگز نہ آئے گی۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں سے قطع نظر اتنی بڑی فوج سے ایرانی فوج کا مقابلہ کرنا بیسود تھا۔ پہلے ہی حملے کے بعد ہماری فوج نے یہ محسوس کر لیا کہ دشمن کے پاس اتنی طاقت ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ شمالی مورچے پر ہمارے سپاہیوں کے پاس صرف مشق کرنے کی بندوقوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

ہمارے وزیر اعظم نے تین دن میں ہی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور جس شخص نے یہ منصب سنبھالا اس نے فوجوں کو مقابلہ کرنے سے روک دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حکم کے صادر ہونے سے پہلے ہی مقابلہ ختم ہو چکا تھا۔

۹ستمبر کو نئے وزیراعظم نے پارلیمنٹ سے اتحادیوں کی درخواست کو قبول کرنے کی منظوری لے لی۔ اس وقت اتحادیوں کی فوجیں پایۂ تخت سے دور پڑی ہوئی تھیں لیکن چند روز بعد یہ اعلان کیا گیا۔ چونکہ ایرانی حکومت اپنے عہد کا پاس نہیں کر رہی ہے اس لئے اتحادی فوجیں ۱۸ستمبر کو دوپہر بعد تہران کے نواح میں داخل ہو جائیں گی۔

۱۶ستمبر کی صبح پارلیمنٹ نے یہ اعلان جاری کیا کہ میرے والد حکومت کی ذمہ داریوں سے الگ ہو گئے ہیں اور اسی روز عنانِ سلطنت مجھے سونپ دی گئی۔ میرے والد کو حکومت سے سبکدوش کر کے اتحادی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، اور انہوں نے ایران کے راستے سے روس کو جنگی سامان بھیجنا شروع کر دیا میں یہ بات بالکل برملا کہوں گا کہ اتحادیوں کا یہ فعل بیحد قابلِ افسوس تھا اور آیندہ کے لئے اختلافات اور پریشانیوں کا بیج انہوں نے بو دیا تھا۔

اگر ہم ماضی کی طرف نگاہ ڈالیں اور یہ سوچیں کہ جو اقدامات اتحادیوں نے کئے وہ نہ کرتے تو ان کے سامنے اور کون سا راستہ تھا۔ میرے خیال میں اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ اس سلسلے میں ہم مسٹر چرچل کی دوسری جنگِ عظیم کی تاریخ سے ان کا وہ قول نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے اتحادیوں کی رائے کے بارے میں اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایران کے راستے روس سے رابطہ قائم کرنا غیر معمولی اہم تھا کیونکہ ایک طرف تو بحرِ منجمد شمالی سے روس کو مختلف جنگی سامان بھیجنا دشوار تھا دوسری طرف آیندہ کے لئے بھی فوجی ضرورتوں کے پیشِ نظر اس راستے پر قبضہ رکھنا ضروری تھا۔ مشرقِ وسطیٰ پر فوج کشی کا مسئلہ میرے لئے سخت پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا لیکن میرے سامنے جو وجوہات پیش کی گئیں ان کی بنا پر یہ حملہ اشد ضروری تھا کیونکہ تیل کے کنوئیں جنگ کا بنیادی سبب تھے اور ہم نے سوچ رکھا تھا کہ اگر روسیوں کو شکست ہوئی تو ہم کو ان پر قبضہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

اس وقت ہندوستان کے لئے بھی شدید خطرہ تھا۔ عراق کی بغاوت کے دب جانے اور سخت جانی اور مالی نقصان کے بعد انگریزی اور فرانسیسی فوج کے سوریہ پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ کو فتح کرنے کا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ اگر کہیں روسیوں کو شکست ہو جاتی تو وہ کسی دوسری طرح حملے کی تیاری کرتے۔ جرمنوں کی ایک جماعت جس کے ممبر بڑے سرگرم کارکن تھے تہران میں مقیم تھی وہاں جرمنوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ قبل اس کے کہ میں پلاسنتیا[1] (خلیج پلاسنتیا نیوفاؤنڈلینڈ میں ہے۔ وہاں پہلی بار چرچل روزولٹ ملاقات ۹، اگست ۱۹۴۱ء کو ہوئی تھی) کا سفر کروں میں نے ایک خاص کمیشن مقرر کر دیا تھا تاکہ کمیشن کے ممبران ایران کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا متفقہ طور پر نقشہ تیار کریں اور اپنی بحث کے نتائج ٹیلی گرام کے ذریعے مجھے بھیجیں۔ کمیشن کی نشست ہوئی جس کی رپورٹ مجھے جنگی کابینہ کی منظوری کے بعد بھیج دی گئی۔ اس رپورٹ سے معلوم ہوا کہ ایرانی حکومت جرمن باشندوں اور جاسوسوں کو ملک سے باہر نکال دینے کے حق میں نہیں ہے اب ہمیں چاہئے کہ طاقت کا استعمال کریں۔ ۱۳، اگست کو مسٹر ایڈن[2] نے م۔ مایسکی[3] سے وزارتِ خارجہ کے دفتر میں ملاقات کی اور دونوں نے اتفاق رائے سے وہ اہم نوٹ تیار کئے جو دونوں حکومتیں الگ الگ ایرانی

1. PLACENTIA 2. MR. EDEN 3. M. MAISKY

حکومت کو بھیجنا چاہتی تھیں۔ ۱۷اگست کو برطانیہ اور روس کی طرف سے ایک مشترکہ نوٹ ایرانی حکومت کو بھیجا گیا اور چونکہ اس کا جواب غیر اطمینان بخش تھا اس لئے انگریزی اور روسی فوجیں ۲۵اگست کو ایران میں داخل ہو گئیں۔"

میں چرچل کی بعض باتوں سے جن کو اس نے بطور حقائق بیان کیا ہے متفق نہیں ہوں۔ اگر بالفرض چرچل کی تمام باتیں ٹھیک بھی ہوں لیکن یہ بنیادی بات ہے کہ اتحادیوں نے اپنے مقصد کے لئے جو بھی راستہ اختیار کیا تھا وہ میرے نقطۂ نظر سے سراسر غلط تھا۔ میری رائے میں اتحادیوں کو چاہئے تھا کہ وہ میرے والد سے ہر معاملہ ایمانداری سے طے کر لیتے حال ہی میں میں نے اتحادیوں کے ان اعتراضات کا مطالعہ کیا ہے جو بطور احتجاج انہوں نے میرے والد کی حکومت کو بھیجے تھے ان سب کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے سب اعتراضات بچکانہ ہیں اور سب میں جزئی باتیں ہیں ہر خط میں اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ ایران میں جرمن باشندے کیوں رہ رہے ہیں۔ روس کو جنگی سامان بھیجنے کے راستے، جرمنوں کی تیل کے ذخیروں تک پہنچنے کی روک تھام، مشرقِ وسطیٰ یا ہندوستان کا مسئلہ جیسے اہم امور کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

میرے والد بہت ہوشیار اور سمجھدار انسان تھے۔ وہ جنگی حربوں سے پورے طور پر واقف تھے۔ اگر انگریزوں اور روسیوں نے صاف الفاظ میں اپنا ارادہ ان پر ظاہر کر دیا ہوتا تو وہ بات کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ لیکن اتحادی ہمیشہ یہی بات دہراتے رہے کہ جرمن باشندے جو ایران میں مقیم ہیں ان کو ملک سے باہر نکالا جائے۔ میں نے اوپر بھی ذکر کیا ہے کہ بہت سے جرمن باشندے ایران میں بہت ہی اہم اور بنیادی صنعتی کاموں پر لگے ہوئے تھے۔ مردم شماری کے کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جرمنوں کی تعداد جن میں ان کے بیوی بچے بھی شامل تھے زیادہ سے زیادہ چار سو ستّر تھی (ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو بغیر رہائشی پرمٹ حاصل کئے اس ملک میں رہ رہے ہوں) اگر اتحادیوں کے بار بار دباؤ پر میرے والد کو غصہ آتا تھا تو یہ بات باعثِ تعجب نہ تھی۔ اتحادی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے والد اس معاملے میں بہت حسّاس ہیں اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جو نوٹ اتحادیوں کی طرف سے بھیجے جاتے تھے وہ مکر و فریب سے خالی نہ تھے۔ ان کا مقصد ایران سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا نہ تھا بلکہ وہ ایران پر قبضہ کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہتے تھے۔ رضا شاہ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اتحادی اپنے معاملات میں کسی اصول اور ضابطے کی پابندی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہیرا پھیری سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے شاہانہ آن بان کو پسِ پشت ڈال کر لندن میں مقیم وزیرِ مختار سے یہ بات معلوم کرانا چاہی کہ اتحادیوں کا اصلی مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ لیکن اب اس کام کے لئے وقت بیت چکا تھا۔ میرے والد نے جرمنی کے وزیرِ مختار کو جو تہران میں مقیم تھا یہ پیغام بھجوایا کہ ایرانی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو جرمن باشندے ایران میں رہ گئے ہیں ان کو بھی ملک سے باہر بھیج دے۔ ان کی روانگی کا انتظام بھی ترکی کے راستے سے کر دیا گیا تھا لیکن اتحادیوں کی جلد بازی کی وجہ سے اس کام کی تکمیل کا وقت بھی نکل چکا تھا۔

اتحادیوں کو نہ صرف سچائی اور ایمانداری سے میرے والد کے ساتھ پیش آنا تھا بلکہ ان کو چاہیئے تھا کہ بڑے احترام سے سیاسی اتحاد کی پیش کش ان سے کرتے شاید کچھ لوگوں کو اس بات سے اختلاف ہوگا اور وہ یہ اعتراض کریں گے کہ رضا شاہ اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر اس طرح کے اتحاد کے لئے تیار نہ ہوتے لیکن اتحادیوں کا فرض تھا کہ اس سے پہلے کہ وہ ہماری آزادی اور خود مختاری کا زبردستی گلا گھونٹیں اس موضوع پر ان سے بات تو کرتے اور مجھے یقین ہے کہ رضا شاہ اتحادیوں کی اس تجویز کو مان لیتے وگرنہ دوسری صورت میں وہ تخت وتاج سے دست بردار ہو کر مجھے اس کام کی تکمیل کی اجازت دیتے۔

یہاں میں ایک ایسی بات کا انکشاف کروں گا جس کا شاید آج تک کسی کو علم نہیں۔ میرے والد نے حکومت سے کنارہ کشی کرنے سے کئی سال پہلے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ میرے مفاد کے پیش نظر سلطنت سے دست بردار ہو جانا چاہتے ہیں اگرچہ اس بارے میں انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی لیکن ان کے ایک رازدار دوست نے، جو ان کا مشیر بھی تھا۔ یہ راز مجھ پر ظاہر کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سلطنت کی ذمہ داری مجھ پر سونپ کر ایک تجربے کار اور سلجھے ہوئے سیاستدان کی حیثیت سے ضرورت کے وقت اپنے تجربات اور معلومات سے مجھے فائدہ پہنچاتے رہیں گے لیکن میرے لئے اس امر کا باور کرنا محال ہے کیونکہ ایک صاحب اقتدار بادشاہ کے لئے اس قسم کا قدم اٹھانا حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے صورت حال جو بھی ہو لیکن میرے خیال میں وہ ۱۹۴۰ء تک یا اس کے تھوڑے عرصے بعد حکومت کے کاموں سے سبکدوش ہو جانا چاہتے تھے۔

میرے کہنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ اتحادیوں کو میرے والد کے دل کا راز معلوم کرنا چاہیے تھا۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا فرض تھا کہ ہٹلر کی طرح ایران پر حملہ کرنے اور جن اصولوں کے تحفظ کی خاطر وہ جنگ کر رہے تھے ان کو پامال کرنے کی بجائے کوشش کرتے کہ رضا شاہ سے باعزت طریقے پر عہد و پیمان کریں۔

اس میں شک نہیں کہ ہم کو اتحادیوں کے حملے کے چند ماہ بعد ان سے دوستی اور اتحاد کا عہد کرنا پڑا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ معاہدہ کشت وخون سے پہلے ہی ہو جاتا اور روسیوں، انگریزوں اور میرے ملک کے لوگوں کے درمیان دشمنی کا جذبہ پیدا نہ ہوا ہوتا۔

اس سے قطع نظر اگر اتحادیوں کو جرمن فوجوں کے ایران میں داخل ہونے سے پریشانی تھی تو آخر کیا وجہ تھی کہ انہوں نے ہم سے سیاسی یا فوجی عہد و پیمان نہیں کیا اور ہم سے فوجی مدد کی درخواست نہ کی۔ شاید بعض لوگ یہ سوچیں گے کہ چونکہ رضا شاہ پورے طور پر اس جنگ کی لپیٹ سے الگ رہنا چاہتے تھے اس لئے ان سے اس قسم کی درخواست کرنا غیر معقول بات ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میرے والد بڑے معاملہ فہم اور دور اندیش انسان تھے ملک کی ترقی و خوشحالی اور ایرانیوں کی فلاح و بہبود کو ہر چیز سے افضل سمجھتے تھے۔ اگر اتحادیوں نے اشاروں اور کنایوں میں کہنے کی بجائے صاف الفاظ میں اپنے فوجی پروگرام کو ان پر ظاہر کر دیا ہوتا اور یہ ثابت کر دیا ہوتا کہ اس امر میں ایران کا فائدہ ہے تو رضا شاہ فوراً ان کی بات بلا کسی جھجک کے مان لیتے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ یا تو وہ اتحادیوں کی تجویز کو تسلیم کر لیتے یا خود حکومت سے سبکدوش

ہوجاتے اور پوری ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیتے ۔ اگر ایسا ہوگیا ہوتا تو اتحادیوں کو وہ فوجیں جن کی دوسری جگہوں پر زیادہ ضرورت تھی ایران بھیجنے کی نوبت نہ آتی اور ہم بھی حملے کی مصیبت اور دوسری بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتے اور اس سے بہت پہلے ہی ہٹلر کے ظلم وستم کے خلاف عوام کے ساتھ جنگ میں شریک ہوجاتے ۔

سیاسی اور فوجی معاہدے کے بعد خواہ اس کا نتیجہ مفید ہوتا یا نہ ہوتا اتحادیوں کو چاہیئے تھا کہ جنگی سامان بھیجنے کے مسئلے کو (جس کا مقصد انہوں نے جنگ شروع ہونے سے پہلے واضح کر دیا تھا) اور چھوٹی قوموں کی آزادی کی حفاظت کے معاملے کو (جس کی ذمہ داری انہوں نے لی تھی) ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے دیتے ۔

اتحادیوں میں سے ذمہ دار شخصیتوں کو چاہیئے تھا کہ میرے والد سے اور اگر میں ان کا جانشین ہوگیا تھا تو مجھ سے یہ مذاکرہ کرتے کہ "ہم مجبور ہیں روس کو جنگی سامان بھاری مقدار میں پہنچائیں کیونکہ اِس وقت وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے ۔ جغرافیائی وجوہات اور عقلی دلائل کی بنا پر صرف ایران ہی ایسا ملک ہے جس کے راستے یہ مقصد پورا ہوسکتا ہے ۔ ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ ایرانی بندرگاہوں، ریلوں اور سڑکوں کو استعمال کرنے کا معقول معاوضہ ادا کریں ۔ ہم کسی طرح کی ظلم وزیادتی اور ایران کے جنگ سے علیحدہ رہنے کے اصول کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور اِس ملک کی آزادی کا احترام کریں گے اپنی فوجوں کو ایران میں داخل نہیں ہونے دیں گے اگر اجازت مل گئی تو صرف سامان کے لانے لے جانے کے لئے تکنیکی ماہرین بھیجیں گے تاکہ جنگی سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے میں اور اہم ناکوں پر سامان کی حفاظت کے لئے مدد مل سکے ۔ ایران کے راستے سے جنگی سامان بھیجنے کا مسئلہ ہماری زندگی کا مسئلہ ہے اور ہم اس بات کو ترجیح دیں گے کہ اس ملک کے سربراہ سے دوستانہ معاہدے کے ذریعے یہ کام انجام پائے ۔"

یہ بات بھی ہمیں ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہٹلر نے سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے ملکوں سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ جنگی سامان کے لئے اُن کی سڑکیں استعمال کرے گا اُس کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو لیکن وہ اُن ملکوں کے جنگ سے علیحدگی کے اصول کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اس نے یہ حق بھی نہیں مانگا کہ سامان کی نقل وحمل کے لئے اپنے پہرے دار اور تکنیکی ماہرین ان ملکوں میں بھیجے ۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اتحادی بھی اسی طرح سے ہماری جنگ سے الگ رہنے کی پالیسی کا احترام کرتے ؟

اگر اُس وقت تک میں مقامِ سلطنت تک پہنچ گیا ہوتا تو اُن کی تجاویز کو جس طرح اوپر میں نے بیان کیا ہے مان لیتا اور میرا خیال ہے کہ رضا شاہ نے بھی اگر سلطنت سے کنارہ کشی نہ کی ہوتی تو اُن شرائط کو قبول کر لیا ہوتا ۔ کیونکہ میں اُن کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا ۔ اگرچہ وہ اِن تجاویز کے انجام کو سوچ کر اندر ہی اندر رنجیدہ ہوتے لیکن ایران پر حملہ ہونے سے اِس کو بہتر سمجھتے ۔ اِس صورت میں مجھے تختِ سلطنت تک پہنچنے میں دیر تو لگتی لیکن میں اُس کو اہمیت نہ دیتا کیونکہ میرا ملک بہت سی سختیوں اور پریشانیوں سے بچ جاتا اور یہ بات اتحادیوں کے حق میں بھی بہتر ہوتی اور اُن کو اِس بات کی ضرورت پیش نہ آتی کہ ایران میں فوجوں کو پڑا رہنے دیں ۔

لیکن حالات کا رُخ بدل چکا تھا۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ میرے والد کا سلطنت سے کنارہ کشی کا مقصد یہ تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ یہ تاج و تخت اُن کے لڑکے کو ملے۔ لیکن یہ بات گمراہ کُن ہے۔ کیونکہ میری تعلیم و تربیت پر جو اُن کی خاص توجہ تھی وہ اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ میری جانشینی کا مسئلہ اُن کے ذہن میں تھا اور اس کا تعلق کسی خاص وقت سے نہ تھا۔ اُن کے حکومت سے دست بردار ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ اِس طرح کے آدمی نہ تھے کہ غیر اُن کے ملک پر قبضہ کر لیں، داخلی امور میں مداخلت کریں اور وہ بیٹھے دیکھتے رہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک بات کہی تھی جس سے اُن کے احساسات کی گہرائی اور وطن سے والہانہ محبّت کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا: "لوگ مجھے صاحب عزم، مقتدر، اپنے اور اپنے ملک کے مفاد کی حفاظت کرنے والے حکمراں کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اُن کو میری ذات پر پورا پورا اعتماد و اطمینان بھی ہے۔ ایسی حالت میں، میں ایک ایسے ملک کا برائے نام بادشاہ بن کر نہیں رہنا چاہتا جس پر دوسروں کا قبضہ ہو اور ایک معمولی روسی یا انگریز افسر مجھے کسی کام کا حکم دے۔" یہاں اِس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس وقت میں مقامِ سلطنت پر پہنچا تو اتحادیوں کے کسی نمائندے سے (بجز حکمرانوں اور اُن کے سفیروں کے) ملاقات تک نہیں کی۔

غیر ملکی یہ بات اچھّی طرح جانتے تھے کہ میرے والد کے ساتھ مِل کر کام کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور اِسی طرح میرے والد بھی ان کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ سلطنت سے دست بردار ہونے اور ترکِ وطن کے لئے اُن پر دباؤ ڈالا گیا تھا لیکن یہ بات بھی کتنی عجیب ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتے تھے۔ اِس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت جناب رضا شاہ نے اپنی مرضی اور اتّحادیوں کی رضامندی سے ہی اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا۔

میرے والد نے اپنے پیارے وطن پر آخری نگاہ انگریزی جہاز کے عرشے سے ڈالی جو اُن کو موریشس[1] کی طرف لے جا رہا تھا۔ پہلے یہ طے پایا تھا کہ جنوبی امریکہ لے جایا جائے گا لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا گیا اور اُن کو موریشس ہی لے جایا گیا (یہ جزیرہ مڈگاسکر کے مشرق میں واقع اور انگریزوں کی کالونی ہے) وہاں سے انہیں جونسبرگ[2] (افریقہ) بھیج دیا گیا جہاں تین سال بعد ۱۹۴۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے والد ایّامِ اسیری میں بہت افسردہ اور غمگین رہا کرتے تھے لیکن مجھے جو اطلاعات ملی ہیں وہ اِس کے بالکل برعکس ہیں۔ میری ان سے برابر خط و کتابت جاری رہی اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے متعلق میں دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔

میرے والد اپنے خطوں میں ملکی معاملات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ہر خط میں مجھے تاکید کیا کرتے تھے کہ مشکلات کا مقابلہ بہادری سے کروں خواہ اُس کے لئے کسی قسم کی قربانی ہی دینا پڑے۔

میں نے اُن کے سامنے کئی بار یہ تجویز رکھی کہ وہ ایران کی عصرِ حاضر کی تاریخ کے لئے اپنی یادداشتیں قلمبند کریں۔ لیکن انہوں نے ہر بار میری اِس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ بعض باتیں ایسی ہیں کہ اگر اتّفاق

1. MAURITIUS 2. JOHANNESBURG

سے وطن پرستی کے جذبے کے تحت اُن کے قلم سے نکل گئیں تو ہوسکتا ہے کہ اُس کا بُرا اثر اُن کے وطن پر پڑے۔

میرے والد نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ میں اور میرے مشیر ملکی معاملات کے حل کرنے میں اور اندرونی اور بیرونی سیاست میں بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے کام کر رہے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ہماری پالیسی کی راہ میں رُکاوٹ بنیں اور ہمیں مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑے۔ زندگی کے آخری روز بلکہ آخر سانس تک میرے والد کا دل اور اُن کی رُوح وطن کی محبت میں تڑپتی رہی اور اُن کے دل میں وطن کی خوشحالی کے علاوہ کوئی آرزو نہ تھی۔

جس وقت تخت و تاج کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آئی اُس وقت میری عمر صرف ۲۲ سال تھی اور مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ایران کی خارجہ پالیسی مرتب کی کیونکہ الگ تھلگ رہنے والی پالیسی جو میرے والد نے اختیار کی تھی اُس کے نتائج بہت خراب نکلے اور اُس پر قائم رہنے میں ہم کو سخت ناکامی ہوئی۔ میں نے اچھی طرح اِس بات کو محسوس کرلیا کہ اتحادیوں سے الگ رہنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ اُن کے ساتھ تعاون بے حد ضروری اور ملک کے لئے سُود مند ہے۔ میں نے محمد علی فروغی کو اپنا نیا وزیر اعظم مقرر کیا۔ اُن کا شمار ایران کے سیاستدانوں اور دانشمندوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے خارجہ پالیسی میں میرے تمام نظریات سے موافقت کی اور اُنہی کی کوشش سے روس، برطانیہ اور ایران کے درمیان دوستی اور تعاون کے معاہدے کے امکانات روشن ہوئے اور ۲۹ جنوری ۱۹۴۲ء کو اِس معاہدے پر برطانیہ اور روس نے دستخط کر دیئے جس کی رو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ روسی اور برطانوی فوجوں کی اب وہ حیثیت نہیں رہی کہ زبردستی ایران پر قبضہ کئے رہیں (اگرچہ ایرانی اِس کو فوجی قبضے سے ہی تعبیر کرتے تھے) انہوں نے اِس بات کا عہد کیا کہ ملک کی سالمیت، حقِ حکمرانی اور سیاسی آزادی کا احترام کریں گے اور جرمنی سے جنگ ختم ہوجانے کے چھ ماہ بعد اپنی فوجیں واپس بُلالیں گے اور یہ قول دیا کہ جنگ کی وجہ سے جو اقتصادی نقصان ہوا ہے اُس کو پورا کرنے میں ایران کو ہر طرح کی سہولت دیں گے اور ہم نے اتحادی فوجوں کو ایران کی شاہراہوں سے گذرنے، روس تک جنگی سامان پہنچانے اور دوسری ضروریات پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اپنی نئی پالیسی کے تحت ہم نے جرمنی، اِٹلی اور جاپان سے سیاسی تعلقات ختم کر دیئے اور ۹ ستمبر ۱۹۴۳ء کو نازیوں سے جنگ کا اعلان کر دیا۔

اتحادیوں کے ایران پر قبضہ کرنے کی وجہ سے اور ایکا ایکی میرے والد کا ڈکٹیٹرانہ عہد ختم ہوجانے سے ایرانیوں کو نئے خطروں سے دوچار ہونا پڑا اور اُن کے درمیان کشیدگی پھیل گئی۔ اتحادی میرے اختیارات کو کم کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسی صورت میں وہ آسانی سے ملک میں رہ سکتے ہیں۔

ایران کے سیاسی معاملات میں اتحادیوں کی مُسلسل مداخلت سے میرے اور میرے ہموطنوں کے دل میں اُن کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ اِس کی وجہ بتانے کے لئے ایک مثال کافی ہے۔ قیمتیں بڑھ جانے کے باعث جو مالی بحران پیدا ہوگیا تھا اُس سے قطع نظر اتحادیوں نے اعلان کیا کہ اُن کی فوجوں کے اخراجات اور ضروریات کو پورا کرنے

کے لئے ایرانی کرنسی نوٹ بہت زیادہ تعداد میں جاری کئے جائیں۔ لیکن یہ بات چونکہ ملک کے قانون کے خلاف تھی اِس لئے اتحادیوں نے قوام پر جو اس وقت وزیر اعظم تھا یہ زور ڈالا کہ قانونی بندشوں کی پروا کئے بغیر جس طرح بھی ہو سکے اِس کام کو پورا کرے۔ اور جب جواب میں یہ کہا گیا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے تو یہ دباؤ ڈالا کہ پارلیمنٹ سے نیا قانون پاس کرایا جائے۔ لیکن اس کے جواب میں اُن کو بتا دیا گیا کہ اس بات کا بھی قطعاً امکان نہیں کہ پارلیمنٹ اس قسم کا کوئی قانون پاس کردے۔

یہ باتیں ابھی چل ہی رہی تھیں کہ ایک دن برطانوی سفیر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اپنی حکومت اور روسی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ہم کو قوام پر پورا پورا اعتماد ہے لیکن موجودہ پارلیمنٹ نے اُس کو کسی کام کرنے کے قابل نہیں رکھا یہ کہہ کر اُس نے مجھ سے پارلیمنٹ کو توڑ دینے کی درخواست کی۔ مجھے اِس بات پر سخت حیرت ہوئی ایک غیر ملکی حکومت کا نمائندہ مجھ سے یہ درخواست کر رہا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ میری اور میری قوم کی ذمّہ داری ہے کہ اپنی حکومت پر اعتماد کریں یا نہ کریں۔ اگرچہ ہم آپس میں دوست ہیں لیکن یہ میرا اور میری قوم کا کام ہے کہ پارلیمنٹ کو توڑنے کا فیصلہ کریں اور میں اس بات کی ہرگز اجازت نہ دوں گا کہ بیگانے ہمیں اِس قسم کے کام کرنے کا حکم دیں اور میں نے اِس تجویز کو بُری طرح ٹھکرا دیا۔ اِس واقعہ کے کچھ عرصے بعد اسی سال کچھ غنڈوں نے تہران میں لُوٹ مار شروع کر دی۔ انگریزی فوج جو ایران میں داخل ہونے کے بعد تہران سے باہر چلی گئی تھی فساد کو دبانے کی غرض سے پھر شہر میں داخل ہو گئی اور اپنی مانگیں پوری کرانے کے لئے پارلیمنٹ کو دھمکی دینا شروع کر دی۔

اِسی اثنا میں کئی سال پہلے وہ قبائلی جن سے میرے والد نے ہتھیار چھین لئے تھے بھاگے ہوئے فوجیوں سے اور فوج کے گوداموں سے چوری چھپے ہتھیار خریدنے لگے اور دوبارہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ چاول، چینی اور دوسری تمام ضروریاتِ زندگی کی چیزوں پر راشن ہو گیا اور جب اتحادی راشن کے کوپن قبائلی سرداروں کو اِس غرض سے دیتے کہ اُن کو آس پاس کے لوگوں میں بانٹ دیں تو یہ سردارانِ کوپنوں کو بیچ ڈالتے اور اس طرح جو روپیہ اُن کو ملتا وہ ہتھیار خریدنے میں صرف کرتے۔ بہت ہی کٹّر قسم کے مذہبی علماء جن کو میرے والد نے کچل دیا تھا پھر اُبھرنے لگے۔ انگریز، سیاسی ایجنٹ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ کمیونزم کو روکنے میں کارآمد ثابت ہوں گے۔ بطور مجموعی انگریزی فوجوں کا رویہ بُرا نہ تھا۔ دوسری طرف روسی تھے جو سیاسی جماعتیں اور مزدوروں کی یونین بنانے میں مشغول تھے۔ اُن کی تحریک جس کے لئے کمیونسٹ بے دریغ روپیہ خرچ کر رہے تھے سستی ترکاری کی بیلوں کی طرح پھیل رہی تھی۔ ان تمام پارٹیوں میں سب سے زیادہ خطرناک توڈی پارٹی تھی۔

ایران کے شمالی صوبوں میں روسیوں نے ہمارے افسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے انکار کر دیا اور ان علاقوں پر فوجی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے پورا قبضہ کر لیا اور پورا علاقہ تقریباً ایک علیحدہ ملک بن کر رہ گیا۔ بعد کے واقعات سے یہ بھی پتہ چلا کہ روسیوں کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ اِس حصّے کو اسی طرح اپنے قبضے میں رکھیں۔

ایرانی پارلیمنٹ میں ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالی جانے لگی جس سے ہر کام میں بے ترتیبی اور بدنظمی پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ انتظامی اور قانونی معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگی جس کی وجہ سے قانونی کارگذاریوں میں

رُکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ سرکاری ملازمین اخلاقی اعتبار سے انتہائی پستی پر پہنچ گئے۔

اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں جن اہم کاموں کو میں نے انجام دیا اُن میں سب سے پہلا کام ملک میں آئینی جمہوریت کو دوبارہ زندہ کرنا تھا۔ اِس وقت ہماری سیاسی زندگی افراتفری سے اِس طرح دوچار تھی کہ اگر میں آئینی نظام سے بالکل مایوس ہو جاتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ لیکن خوش قسمتی سے میں اپنے سیاسی نظریات میں اِس قدر مضبوط تھا کہ خطرناک اور پریشان کُن حالات بھی مجھے اُن خیالات کو ترک کرنے پر مجبور نہ کر سکے جن کو جیفرسن[1] جیسے دنیا کے بڑے مدبّر نے بھی مان لیا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ آئینی جمہوریت کا ملک میں تحفّظ کروں گا۔

اقتصادی اعتبار سے ہمارے ملک میں قیمتیں وحشت ناک طریقے پر بڑھ رہی تھیں۔ وسط ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء کے آخر تک مالی بحران اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا اور زندگی کے اخراجات میں چار سو فی صدی اضافہ ہو گیا تھا۔ اتّحادی جو روپیہ ایران میں خرچ کر رہے تھے اُس کی وجہ سے تبادلۂ زر کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور کم ملنے والی چیزوں کی قیمتیں مسلسل بڑھتی جا رہی تھیں۔ شمالی صوبوں کی گیہوں اور چاول کی پیداوار پورے ملک کے لئے کافی تھی لیکن اِس وقت اُس کو روسی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے نہیں دیتے تھے کیونکہ اِس کو وہ اپنے لئے استعمال کر رہے تھے۔

لاریاں اور مال گاڑیاں چونکہ اتّحادی اپنے کام میں لا رہے تھے اِس لئے کھانے پینے کا سامان اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا سخت دشوار تھا جس کی وجہ سے قیمتیں اپنے آپ بڑھنے لگیں۔ اور کچھ فرض ناشناس ایرانی سرمایہ داروں نے بھی موقعے سے فائدہ اُٹھایا اور مال کو روکنے اور سٹّے بازی کے دھندے میں پڑ گئے جس نے ضرورت مندوں کی غربت اور سرمایہ داروں کے سرمائے میں کافی اضافہ کیا۔

اگرچہ یہ بات بالکل عجیب اور ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے کہ اتحادیوں نے یہی کوشش کی کہ ہمارے اسلحہ سازی کے کارخانوں پر بھی اپنا قبضہ کر لیں۔ روسی اِس بات پر بضد تھے کہ کارتوس بنانے کا جو کارخانہ میرے والد نے لگایا تھا اُس کو اپنے ملک میں لے جائیں۔ انگریز چاہتے تھے کہ ہماری ۱۰۵ ملی میٹر کی توپوں کو اپنے کام میں لائیں۔ لیکن میں نے دونوں کو اِن کے ارادوں سے باز رکھا۔

جتنے عرصے غیروں کا ملک پر تصرّف رہا میں کبھی غم واندوہ سے خالی نہ رہا اور اکثر راتیں ایسی گذری ہیں کہ میں صبح تک نہیں سو سکا۔ میں اصولی اور عملی طور پر اتّحادیوں کے قبضے کا مخالف تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ انہوں نے ہماری آزادی اور حقِ حاکمیت کا بُری طرح مذاق اُڑایا ہے۔ جدھر بھی نگاہ ڈالتا تھا میں ایرانیوں کو مصیبت اور پریشانیوں میں گرفتار پاتا تھا جو اتّحادیوں کی اقتصادی اور سیاسی چالوں کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ تکلیف مجھے جس چیز سے پہنچی تھی وہ بعض ایرانی سرمایہ دار تھے جنہوں نے اپنی کمائی کی خاطر لوگوں کے فائدے اور آرام کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

1. JEFERSON

اِن حالات میں اتحادی بڑی کامیابی سے ایران کے راستے سے جنگی سامان روس کو بھیج رہے تھے۔ سامان خلیج فارس کی بندرگاہوں سے تہران لایا جاتا اور یہاں روسیوں کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ وہ خود اپنے ملک میں پہنچائیں ۱۹۴۲ء کے آخر میں خلیج فارس کی امریکن فوجیں جن کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی انگریزی فوجوں سے مل گئیں۔ اِن دونوں ملکوں کی فوجوں نے بھاری سامان کے لانے اور لے جانے کے لئے بہت بڑی تعداد میں ریل کے انجن، مال گاڑی کے ڈبّے اور سیکڑوں ٹرک ایران منگوائے۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء کے وسط تک جتنا سامان ایرانی ریلوے اور سڑکوں کے ذریعے لے جایا جاسکتا تھا۔ اس کی تعداد ۱۹۴۳ء کے درمیان تک بڑھ کر دس گنا ہو گئی تھی اور یہ مشہور تھا کہ اتّحادیوں نے ایران کے راستے سے روس کو بطور مجموعی ساڑھے پانچ ملین ٹن جنگی سامان بھیجا ہے اور یہ سامان امریکہ اور کینیڈا کے کُل جنگی سامان سے آدھا تھا۔ یہ سامان تقریباً آدھا ریلوں کے ذریعے اور باقی آدھا ٹرکوں سے روس بھیجا جاتا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ روسی، انگریزی اور امریکی فوجوں کے پاس بہت بڑی تعداد میں فوجی ٹرک موجود تھے اور ایران کے پاس کُل چار ہزار جو گنے چُنے انگریزی افسروں کی نگرانی میں ایرانی چلاتے تھے لیکن اِن چار ہزار ٹرکوں میں جو مال ڈھویا جاتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا تھا جو امریکی، روسی اور برطانوی ڈرائیور اپنے ٹرکوں میں لاد کر لے جاتے تھے۔ اگرچہ جنگ کے دَوران ایران کی ریلوے لائن اور شاہراہوں پر کافی ترقیاتی کام ہوئے لیکن چونکہ دن رات سامان اِن پر سے لے جایا جاتا تھا اِس لئے جلدی ہی اِن کی حالت خراب ہو گئی۔

جنگی سامان ڈھونے میں بڑی سختیاں اور دشواریاں پیش آتی تھیں۔ جنوبی ساحل کی بندرگاہوں میں اُس وقت بھی جہازوں سے مال اُتار کر گوداموں میں لے جا کر رکھا جاتا تھا۔ جس وقت درجہ حرارت ۱۴۰ درجے فارن ہائٹ ہوتا تھا اور کبھی کبھی ریل کی سُرنگوں میں اتنی گرمی ہوتی تھی کہ انجنوں میں کام کرنے والے کاریگر نیچے اُتر پڑتے تھے تاکہ اندر کی گھٹن سے بچ کر باہر تازہ ہَوا میں سانس لے سکیں۔ جاڑوں میں ریلوں اور ٹرکوں کو پہاڑی راستوں پر برف وطوفان کے درمیان سے گذرنا ہوتا تھا۔ یہاں تینوں بلکہ چاروں قوموں کے لوگ آپس میں اس طرح مل جل کر کام کرتے تھے جس سے اُمید ہوتی تھی کہ آئندہ اچھے دن آنے والے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں کے دَوران انگریزوں اور امریکیوں نے ہماری گرتی ہوئی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں بھی مدد کی۔ چنانچہ پہلے سال انگریزوں نے ستّر ہزار ٹن غلّہ ہمارے لئے بھیجا جس سے کچھ حد تک کھانے پینے کے سامان کی کمی پوری ہو گئی اور قحط کا خطرہ ٹل گیا۔ مشرقِ وسطیٰ کی باہمی تعاون کی انجمنیں جن کی سرپرستی انگریز کر رہے تھے اور بعد میں امریکی بھی شامل ہو گئے تھے تکنیکی اور مادّی امداد بے دریغ کر رہی تھیں۔ امریکہ نے قرض دینے کے پروگرام کے مطابق کثیر تعداد میں کھانے پینے کا سامان اور جنگی ہتھیار فراہم کئے۔ اِس کے علاوہ ہماری مالی حالت، پولیس کی تربیت، حفظانِ صحت اور کاشت کاری کے طریقے بہتر بنانے کے لئے اپنے مشیر ہمارے ملک میں بھیجے۔

۱۹۴۲ء کی گرمیوں میں میری ملاقات ونسٹن چرچل سے اُس وقت ہوئی جبکہ وہ ایران کے راستے پہلی بار اِسٹالِن سے ملاقات کرنے ماسکو جا رہا تھا۔ اُس کا دو دن تہران میں قیام رہا۔ میں نے اُس کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے دَوران بڑی دل چسپ گفتگو رہی۔ جن مسائل پر ہم نے تبادلۂ خیال کیا اُن میں سے ایک مسئلہ اتحادی فوجوں کا برِّاعظم یورپ میں داخل ہونا اور ہٹلر کی فوجوں کو شکست دینے کا بھی تھا۔ میں نے چرچل کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اتحادیوں کو چاہیئے کہ سب سے پہلے اٹلی پر حملہ کریں اور جب وہاں قدم جم جائیں تو بلقان کے راستے سے بڑے حملے تیاری شروع کریں۔ چرچل نے میری تجویز کو بڑے غور سے سُنا اور اِس بارے میں وہ کچھ سوچتا بھی رہا اور میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں ایکدم چمک آگئی۔ اگرچہ اُس وقت تو اُس نے میری تجویز کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا لیکن بعد میں جو اُس نے یورپ کی فتح کا نقشہ تیار کیا تو اُس نے اِسی کمزور رگ یعنی اِٹلی کو پکڑا۔ اُس کا یہ پلان میری تجویز سے زیادہ الگ نہ تھا۔ البتہ یہ محض اتفاق تھا کہ فوجی حربے کے استعمال میں ہم دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے جُداگانہ تھے۔ اگر جنگ کا یہ نقشہ عملی طور پر کامیاب ہوگیا ہوتا تو یقیناً مرکزی یورپ کی قوموں کی تاریخ کسی اور طرح لکھی گئی ہوتی۔

نومبر ۱۹۴۳ء میں تاریخی "تہران کانفرنس" ہوئی۔ اِس کانفرنس میں روزویلٹ، چرچل اور اسٹالِن نے شرکت کی۔ اسٹالِن روسی سفارت خانے میں مقیم تھا۔ کانفرنس کے دوران نامعلوم کس وجہ سے روزویلٹ بھی وہیں منتقل ہوگیا۔ چرچل برٹش ایلچی[1] خانے کی عمارت میں سکونت پذیر تھا (اِس کانفرنس کے منعقد ہونے کے فوراً بعد برٹش ایلچی خانے کو سفارت کا درجہ دے دیا گیا) روزویلٹ جسمانی طور پر اس قدر کمزور تھا کہ اُس کے لئے چلنا پھرنا دشوار تھا۔ اُس کی جسمانی کمزوری نے میرے لئے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا اور مجھے اُس سے ملاقات کرنے کے لئے روسی سفارت خانے جانا پڑا۔ اگرچہ اسٹالِن مجھ سے ملاقات کرنے خود آیا تھا۔ کانفرنس کی تمام نِشستیں روسی سفارت خانے میں ہوئیں۔ بس ایک بار چرچل نے اپنے یومِ ولادت کے موقع پر انگریزی ایلچی خانے میں دعوت دی تھی۔

اِس ۳ ملکی کانفرنس میں ایران کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ لیکن میری تینوں ملکوں کے سربراہوں سے گفت و شنید جاری رہی۔ اسٹالِن نے ملاقات کے وقت بہت زیادہ ادب اور احترام کا پاس رکھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ پر اپنے اچھے تاثرات چھوڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے تو ایک رجمنٹ ٹی ۳۴[2] ساخت کے ٹینکوں کی اور ایک رجمنٹ لڑاکا ہوائی جہازوں کے پیش کرنے کی بھی تجویز میرے سامنے رکھی۔ چونکہ جدید ہتھیاروں کی کمی کی وجہ سے ہم سخت پریشانی میں مبتلا تھے اِس لئے میں اِس کی پیشکش کو قبول کرنا ہی چاہتا تھا کہ چند ہفتے بعد جب اِس کی تفصیلات کا پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ اِس تحفے کو قبول کرنے کی شرائط بڑی سخت ہیں۔ کیونکہ اس سامان کے ساتھ روسی افسروں اور نان کمیشن عہدے داروں[3] کا آنا ضروری تھا۔ ٹینکوں کے لئے قزوین اور لڑاکا جہازوں کے لئے مشہد میں جگہ پسند کی گئی تھی اور جب تک ایرانی پورے طور پر اس کا استعمال نہ سیکھ جائیں (جس کی مدت مقرر نہیں کی گئی تھی) یہ کل

1. BRITISH LEGATION 2. T-34 3. NON - COMMISSIONED OFFICER

سامان براہِ راست روسی جنرل اسٹاف (جس کا صدر دفتر ماسکو میں تھا) کے ماتحت رہے گا۔ یہ معاملہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ آج امریکی فوجی مشیر ایران کی فوج کو مضبوط بنانے کے لئے ہماری مدد کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایرانی فوج اُن کے حکم کے تابع ہو اور اگر ایسا نہ ہوا تو ہم مدد نہیں کریں گے۔ جن شرائط کے ساتھ اسٹالن یہ تحفہ پیش کر رہا تھا اگر کوئی اور ملک بھی انہی شرائط پر پیش کرتا تو میں قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ چنانچہ میں نے شکریے کے ساتھ یہ تحفہ لینے سے انکار کر دیا۔ دَورانِ گفتگو روزویلٹ نے اس بات کا اظہار کیا کہ جب اُس کا دورۂ صدارت ختم ہو جائے گا تو وہ ایران کے جنگلات کی پرورش کے لئے ایک ماہر کی حیثیت سے یہاں آنا پسند کرے گا۔ اِس میدان میں اُس کی دلچسپی کسی سے پوشیدہ نہیں اور جس ذوق و شوق سے اُس نے اِس موضوع پر بات کی اُس سے اُس کی خلوصِ نیت کا پتہ چلتا تھا۔ روزویلٹ کے متعلق میں نے یہ بات محسوس کی کہ وہ مغرب کی اُن عظیم اور درخشاں شخصیتوں میں سے ہے جن کو ایران اور اُس کی تہذیب سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔ باوجود اِس کے کہ مجھے روزویلٹ کی خارجہ پالیسی سے کہیں کہیں پورا پورا اتفاق نہ تھا لیکن دیگر حیثیت سے میں اُس کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور مجھے اِس بات کا سخت افسوس ہے کہ اُس کی بے وقت موت نے اُس کی اِس آرزو کو جو ہمارے لئے بڑی نعمت ہوتی پورا نہ ہونے دیا۔

جس وقت ایرانی قوم کو روزویلٹ، چرچل اور اسٹالن کی تہران کانفرنس کے نتائج کا علم ہوا تو اُس کو بےحد مسرت ہوئی۔ کیونکہ اِس ملک کے ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان اقتصادی بدحالی کی وجہ سے سخت پریشان تھے اور اب اُن کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا اِس جنگ کی مصیبت کے بعد اُن کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے گی بھی یا نہیں۔

تہران کانفرنس کے نتائج کا اعلان یکم دسمبر کو ہوا تھا۔ یہ اعلان اُن واقعات کے پیشِ نظر جو بعد میں رونما ہوئے بہت اہم ہے اِس لئے اِس کے بعض اقتباسات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

"ریاستہائے متحدہ امریکہ، ریاستہائے متحدہ سوویت یونین اور ممالک متحدہ انگلستان کی حکومتیں ایرانی حکومت کی اِس امداد کو سراہتی ہیں جو اُس نے جنگ میں مشترکہ دشمن کو کچلنے کے لئے پیش کیں اور خاص طور پر اُس مدد کو جو اُس نے سمندر پار سے آئے ہوئے جنگی سامان کو روس کی سرحدوں تک پہنچانے میں دی۔ یہ تینوں حکومتیں اِس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ جنگ نے ایرانیوں کے لئے خاص اقتصادی پریشانیاں پیدا کر دیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ جس قسم کی اقتصادی مدد ممکن ہو سکے گی کریں گی۔"

⁂ ⁂ ⁂

ریاستہائے متحدہ امریکہ، ریاستہائے متحدہ سوویت یونین اور ممالک متحدہ انگلستان کی حکومتیں اِس بات پر حکومتِ ایران سے متفق ہیں کہ اُس کی آزادی، اقتدار اور ملک کی سالمیت برقرار رکھی جائے گی۔ اور یہ یقین دلاتی ہیں کہ حکومتِ ایران اور دوسری تمام امن پسند اقوام کے تعاون سے اٹلانٹک چارٹر کے تحت بین الاقوامی سطح پر

امن و سلامتی اور جنگ کے بعد خوشحالی کے لئے مدد کریں گی جس کو چاروں حکومتیں اتّفاقِ رائے سے منظور کرتی ہیں"۔
اتّحادیوں کی آیندہ فتح کی اُمید میں جو بھی شخص اِس رنگین عبارت کو پڑھتا تھا اُس کو یقین ہو جاتا تھا کہ اب میرے وطن کی سختی کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ لیکن یہ واقعات اُن کے مقابلے میں جو اِس کے بعد رونما ہوئے کچھ بھی نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ میری تعلیم و تربیت ختم ہونے کے بجائے زیادہ سخت مراحل کے ساتھ شروع ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

۵۔ بحرانی دور

چند سال پہلے ڈاکٹر مصدق نامی ایک شخص انگریزی اور امریکی اخبارات کا سب سے بڑا موضوعِ بحث بنا ہوا تھا اور یہ بات افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ اِسی بنا پر ملک کے باہر بعض لوگوں نے اس کو ایران اور ایرانیوں کے کردار کا نمونہ سمجھ لیا لیکن اس کتاب کے پڑھنے والوں کو میں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں ہرگز وہ خصوصیات نہیں تھیں جن کی وجہ سے اس کو ایرانی قوم کا نمایندہ یا نمونہ کہا جا سکے۔

پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے کہ میرے والد نے مصدق کو ۱۹۴۰ء میں قید کر دیا تھا اور یہ شخص میری سفارش پر رہا ہوا تھا۔

۱۹۵۳ء میں اس نے ایک بار پھر دغا کی اور حکومت کا تختہ الٹنے کے جرم میں گرفتار ہوا۔ میں نے اس وقت ایک خط عدالت کو لکھا کہ اس نے میری ذات کو نقصان پہنچانے کے لئے جو بھی تصور کئے ہیں میں نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ ایران میں بلکہ ساری دنیا میں حکومت سے بغاوت کرنے والوں کو موت کی سزا دی جاتی ہے لیکن اس خط اور اس کے بڑھاپے کے پیشِ نظر اس کو پھانسی نہیں دی گئی بلکہ تین سال کے لئے نظر بند کر دیا گیا اور میری مداخلت کی وجہ سے وہ ایک بار پھر موت کے پنجے سے بچ نکلا۔

اس کو ۱۹۵۶ء میں جیل سے رہائی ہوئی۔ کیونکہ وہ دولت مند آدمی ہے اور تہران کے نزدیک اس کی زمین و جائیداد کافی ہے اس لئے وہ اپنی جاگیر میں منتقل ہو گیا اور اس وقت جب کہ یہ کتاب چھپنے کے لئے بھیجی جا رہی ہے وہ وہیں آرام و سکون کی زندگی اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے ساتھ گذار رہا ہے۔

کتنی ہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں مجبور ہوا ہوں کہ مصدق کی شخصیت کا مطالعہ کرکے اور اس کے اخلاق و کردار کا مقابلہ اس کے قول و فعل سے کروں تاکہ لوگوں کو اس بات کا علم ہو سکے کہ اس کے قول و فعل کا اس

ملک کے لوگوں پر کیا اثر پڑا۔ اس کی شخصیت کا نزدیک سے مطالعہ کرنے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب وہ وزیر اعظم بن چکا تھا۔ اپنی اجتماعی زندگی میں وہ کاغذ پر بڑا شریف آدمی نظر آتا تھا۔ وہ ۱۸۸۱ء میں ایک خوش حال زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا (لیکن بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے پیدا ہوا تھا) اس نے فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں قانون اور اس سے متعلقہ دیگر مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمّل کرنے کے بعد اس نے سرکاری ملازمت اختیار کرلی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ وہ وزیرِ مالیات، وزیرِ عدل وانصاف اور وزیرِ خارجہ بھی رہا۔ انگریزوں نے اس کو صوبہٴ فارس کا گورنر جنرل بھی مقرر کیا اور کچھ عرصے بعد اسی عہدے پر اس کو آذربائیجان کے صوبے میں بھیج دیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوا اور اپنے زوال کے عہد تک مسلسل اس کا ممبر رہا۔ اپریل ۱۹۵۱ء سے جولائی ۱۹۵۳ء تک وہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا اور یہی وہ زمانہ ہے جب اس کے اخلاق وعادات کا لوگوں کو علم ہوا۔ بہت سے لوگ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود بڑا نیک آدمی تھا (اب یہ ذکر آگے آئے گا کہ ان کے نزدیک نیکی کی تعریف کیا ہوسکتی ہے) وہ کبھی کمیونسٹ نہیں رہا اور بظاہر کمیونسٹوں سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا لیکن درحقیقت ان کی مدد پر پلتا تھا اور انہیں کو اس نے اپنی ترقی کا زینہ بنایا تھا۔ قاجاری عہد میں جب کہ اس کی عمر زیادہ نہ تھی خراسان میں شعبہٴ مالیات کا بڑا افسر تھا۔ کہتے ہیں کہ جعلی دستاویز پیش کرکے وہ دوسروں کی زمینوں کا مالک بن بیٹھا تھا اور اسلامی شریعت کے مطابق (جو آج بھی سعودی عرب میں نافذ ہے) اس کو ہاتھ کاٹ دینے کی سزا دی گئی تھی لیکن چونکہ میرے سامنے ایسی دلائل پیش نہیں کی گئیں جس سے اس بیان کی صحت کی تصدیق ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اس طرح کی سزا نہیں دی گئی اور لوگوں کو اس کی وہ پرجوش تقریریں ابھی تک یاد ہیں جن میں وہ بار بار ہاتھوں کو جنبش دیتا تھا۔ گمان غالب ہے کہ جوانی میں اس نے کچھ روپے پیسے کی خیانت کی ہو لیکن اس کے برُے انجام سے عبرت بھی حاصل کی ہوگی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک سیاست دان میں کن خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جن کی مصدّق میں کمی تھی۔

اوّل تو یہ کہ اس کی عام معلومات بہت محدود تھیں جس پر مجھے سخت حیرت ہے۔ اگرچہ اس کی تعلیم یورپ میں ہوئی تھی لیکن اس کو دوسرے ممالک کے متعلق کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری اقتصادیات سے لاعلمی تھی۔ اگرچہ میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں اقتصادیات کا ماہر ہوں لیکن قومی اور بین الاقوامی اقتصادیات کے اصولوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ایک حکومت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے میں ایسے بہت سے حکومت کے ماہر افسران سے ملا ہوں جن کے اقتصادی اور سیاسی بنیاد پر نظریات ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اور یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسے بہت ہی کم لوگ دیکھے ہیں جو ذمّے دار عہدوں پر فائز ہوں اور مصدق کی طرح پیداوار، تجارت اور اقتصادیات کے ابتدائی اصولوں سے ناواقف ہوں۔ یہ امر

میرے لئے باعث تعجب یوں بھی ہے کہ مصدق کوئی احمق آدمی نہیں تھا بلکہ دانش مند سمجھا جاتا تھا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقتصادیات سے لاعلمی کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ذہنی طور پر وہ ایسی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا جن کی بنا پر وہ گہرائی سے اس موضوع کا مطالعہ نہ کرسکا۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک اس کی منفی پسندی اور ہٹ دھرمی کی عادت تھی۔ اگر ہٹلر اور مصدق کا مقابلہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ ہٹلر نے ورسیلز[1] کے عہدنامے کی خلاف ورزی کی لیکن اس کا پروگرام خواہ کتنا ہی غیر معقول و منطقی ہو سب کو معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مصدق کے تمام خیالات اور مقاصد جو وقتی طور پر لوگوں کو بہت بھلے لگتے تھے سب منفی ہوتے تھے۔

مصدق جن اصولوں کا پرچار کرتا تھا ان کا نام بھی اس نے "منفی توازن" رکھا تھا۔

وہ اپنی بات جو منطقی بھی ہوتی تھی اس طرح شروع کرتا تھا کہ ایران بہت عرصے سے غیر ملکی اقتدار کے نیچے دبا رہنے کی وجہ سے سخت پریشانیوں سے دوچار ہے اور اس بات سے وہ یہ نتیجہ نکالتا تھا کہ ہمیں غیر ملکیوں کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہ برتنی چاہیئے اور نہ ہی ان سے کسی طرح کی مدد لینی چاہیئے۔ پہلی نظر میں تو یہ محسوس ہوتا کہ اس کا یہ طرز فکر بالکل ایسا ہی ہے جیسے امریکہ کے کچھ حصوں میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے پایا جاتا تھا کیونکہ وہ قوم خود کو جنگ سے الگ رکھنا چاہتی تھی لیکن مصدق اپنی منفی پسندی میں اِس سے کہیں آگے تھا۔ نہ صرف خارجہ پالیسی میں بلکہ داخلی امور میں بھی اس کا رویہ منکرانہ تھا۔

ایران میں ریلوے لائن کا نہ بچھانا اس کی منفی پسندی کی ایک روشن مثال ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن اس نے میرے سامنے بڑی گستاخی سے کہا تھا کہ میرے والد نے یہ کام کرکے ملک کے ساتھ خیانت کی ہے اور جب میں نے اس سے اس کا ثبوت مانگا تو اس نے کہا کہ انگریز چونکہ روس پر حملہ کرنا چاہتے ہیں میرے والد نے محض انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ لائن ڈلوائی تھی۔ میں نے اس سے سوال کیا کیا اس کے خیال میں میرے والد کو کسی اور طرف ریلوے لائن ڈلوانی چاہیئے تھی؟ اس نے جواب دیا کہ ایران میں ریلوے لائن ہونی ہی نہیں چاہیئے تھی کیونکہ ایران کو اس کی ضرورت ہی نہیں اور لوگ بغیر ریل گاڑی کے ہی زیادہ خوش حال تھے۔ جب ذرا اور جوش آیا تو اس نے کہنا شروع کیا کہ میرے والد کے دور حکومت سے پہلے ایران میں ریلوے لائن نہ تھی اور نہ ہی کوئی قابلِ ذکر بندرگاہ تھی اور جو سڑکیں اور راستے بنے ہوئے تھے ان کو کسی طرح آراستہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ چونکہ تارکول کی سڑکیں اور پٹریاں نہیں تھیں لوگوں کی گھٹنوں گھٹنوں تک ٹانگیں کیچڑ میں دھنسی رہتی تھیں لیکن ایران آزاد تھا۔ اس کی یہ بے دلیل باتیں سن کر میں نے اس کو یاد دلایا کہ میرے والد کی حکومت سے پہلے ایران کاپیچولیشن[2] کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا یعنی حقِ حکمرانی اور عدل و انصاف دوسروں کے ہاتھوں میں تھا۔ اُن دِنوں آدھا ملک

1. VERSAILLES 2. CAPITULATIONS

روسیوں نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا اور آدھے پر انگریز قابض تھے۔ لاقانونیت اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ سورج چھپنے کے بعد سمجھدار لوگ تہران میں چور اور لٹیروں کے ڈر سے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ کیا آزادی اسی کا نام ہے؟ مصدق کے پاس ان دلائل کا کوئی جواب نہ تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اپنی ضدی طبیعت کی وجہ سے جو نتائج اس نے اخذ کر رکھے تھے ان میں میری دلیلوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اس کی منفی پسندی کی ایک اور دلیل ملاحظہ ہو۔ ایک دن تہران یونیورسٹی کی فیکلٹی آف میڈیسن کے ڈین نے رامسر کا سفر کیا۔ مصدق نے اس سفر کے بارے میں کچھ سوال کئے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ سفر بہت عمدہ رہا لیکن راستوں کی حالت بڑی خراب ہے اور مرمّت کی سخت ضرورت ہے۔ مصدق کو اس بات پر غصّہ آگیا۔ کہنے لگا کہ آخر سفر کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بہتر ہے کہ آدمی سفر نہ کرے بلکہ گھر میں رہ کر آرام کرے۔

وہ لوگ جو مصدق کی غیر منطقی طرزِ فکر سے واقف ہیں ان کا کہنا ہے کہ مصدق شاید اس بیتے ہوئے دور کو بہت اچھا سمجھتا ہے جب مغربی اقوام کے علوم و فنون نے دنیا کی کایا پلٹ نہیں کی تھی۔ وہ ایک دیوانے کی طرح جو اپنی ہی دُنیا میں خوش رہتا ہے چاہتا ہے کہ ایران میں گھڑی کی سوئیوں کو اُلٹا گھما دیا جائے۔ لیکن اس بات کا یقین نہیں آتا کہ مصدق جیسے شخص نے ایسی بے بنیاد بات کہی ہوگی کیونکہ اس طرح کی بات اگر کوئی گوشہ نشین فلسفی کہے تو باور کیا جا سکتا ہے لیکن ایک ذمّہ دار آج کی دُنیا کا سیاست دان جس کے ہاتھ میں ملک کی عنانِ حکومت بھی ہو اس قسم کا طرزِ فکر رکھے تو بہت زیادہ خطرناک ہوگا۔ اس کے علاوہ مصدق کی منفی پسندی صرف مغربی دُنیا کی ایجادات تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس کا دامن اتنا وسیع تھا کہ دوسرے تمام مسائل بھی اسی میں شامل تھے۔ مثال کے طور پر جس وقت وہ وزیرِ اعظم ہوا تو اس نے غریب کسانوں میں شاہی اراضی تقسیم کرنے کا جو میرا پروگرام تھا اس کو روک دیا۔ اگرچہ یہ طریقہ ایک بہترین وسیلہ تھا جس کے ذریعے عام آدمی کا معیارِ زندگی اونچا کیا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصدق اس مفید اور مثبت اقدام کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور میں نے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا منصوبہ تیّار کیا تھا وہ اس کو قطعی ناپسند تھا اور میرا خیال ہے کہ لوگوں میں اراضی تقسیم کرنے کے پروگرام سے اس کو حسد پیدا ہوا کیونکہ وہ خود ایک بہت بڑا زمیندار تھا اور اپنی جائیداد سے اس کو دلی لگاؤ تھا۔ اس لئے حکومت کے زمینیں تقسیم کرنے کے منصوبے سے خود اس کو شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ خوش قسمتی سے اس سے پہلے کہ مصدق اپنی مخالفت کو عملی جامہ پہنائے وہ اقتدار کھو بیٹھا اور یہ بات میں اگلے باب میں بیان کروں گا کہ اس کے زوال کے بعد کس طرح میرا تقسیم آراضی کا پروگرام دوبارہ شروع ہوا اور اس میں ترقی و توسیع ہوئی۔

مصدق کی منفی پسندی کا اثر ملک کے دفاعی اور اندرونی امن و تحفظ جیسے مسائل پر بھی پڑا۔ اس نے مجھ سے کئی بار کہا کہ ایران نے بڑی طاقتوں کی دست درازی کی وجہ سے سخت نقصان اُٹھایا ہے۔ اس لئے ہمیں

ملک کے دفاع کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات ملک سے باہر پھیلے بلکہ ملک کے اندر ہی لوگوں تک محدود رہے کہ اگر کوئی بیرونی طاقت حملہ کرے تو ہمیں اس کی روک تھام نہ کرنی چاہیے۔

جب کبھی ملک میں فتنہ وفساد بپا ہوتا تھا تو وہ اپنے اس نظریے کا نہ صرف لوگوں میں پرچار کرتا بلکہ عملاً اس کی پیروی بھی کرتا تھا۔

جس وقت مصدق وزیراعظم تھا تو ۱۹۵۲ء و ۱۹۵۳ء کے دوران "ٹوڈی پارٹی" کے لوگوں اور غنڈوں نے پایۂ تخت اور دوسرے شہروں میں فتنہ وفساد بپا کر رکھا تھا۔ مصدق نے ان کی روک تھام کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس نے یہ طریقہ اپنا رکھا تھا کہ جہاں کہیں فساد ہوتا چند ٹینک اور سپاہیوں سے بھری ہوئی لاریاں مختلف حصّوں میں جمع کر دیتا لیکن ساتھ ہی ان کو کوئی موثر قدم اُٹھانے کے لئے منع بھی کر دیتا۔ چنانچہ سڑکوں پر سپاہیوں کے سامنے لوٹ مار ہوتی رہتی اور وہ کھڑے تماشا دیکھتے رہتے۔

مصدق کی کوتاہیوں کی وجہ سے فسادات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کے زبردست حامیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کی اس حرکت کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ مصدق یا تو جان بوجھ کر یا انجانے میں ملک کو کیمونزم کی طرف لے جا رہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصدق کا بیرونی دفاع اور اندرونی امن کے سلسلے میں منفیانہ رویّہ کسی فلسفے یا مذہبی نظریے کے تحت ہوگا جس کا مقصد صلح و آشتی ہو۔

میرے خیال میں اس کے متعلق یہ نظریہ درست اور حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی میں عدم تشدّد کے فلسفے کا حامی نہیں تھا اور نہ ہی گاندھی جی کے خیالات کی پیروی کرتا تھا بلکہ اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کچھ غنڈے اور اوباش قسم کے لوگ جمع کر رکھے تھے جو شہر میں ہر طرف ادھم مچاتے اور غریب بے گناہ لوگوں کو تنگ کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد گاندھی جی کے راستے پر چلنے والوں نے عدم تشدد سے یہ مراد نہیں لی کہ ملک میں بدامنی، بے چینی پھیلائی جائے ہندوستان کے پاس بحری، بری اور ہوائی فوج ہے۔ جب کبھی بمبئی یا دوسرے اہم مقامات پر دنگے اور فساد ہوئے تو پولیس نے پوری طاقت سے امن برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کام میں کبھی غفلت نہیں برتی۔

مصدق کی غیر منطقی طبیعت نے اس کو نہایت عجیب وغریب کام کرنے پر مجبور کیا۔ مجھے پہلی بار اس کی اس فطرت کا علم اس وقت ہوا جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور اتحادی فوجوں نے ایران پر قبضہ کر لیا چونکہ اتحادی فوجوں کے افسران ہمارے انتخابات اور نمایندوں کے تقرر میں بے جا دخل اندازی کر رہے تھے اس وجہ سے میں سخت پریشان اور دل برداشتہ تھا۔ وہ پارلیمنٹ کے نمایندوں کی فہرست خود تیار کرتے اور حکمران وزیراعظم کے

سامنے پیش کر دیتے اور اس پر یہ زور ڈالتے کہ یہی نمایندے پارلیمنٹ کے لئے چنے جائیں۔ میرے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس شرم ناک رویّے کی روک تھام کے لئے مصدّق سے مشورہ کر دں۔ اس وقت چونکہ اس کا شمار ملک کے اچھے خدمت کرنے والوں میں ہوتا تھا اور وہ ایران پر ہر طرح کے غیر ملکی دباؤ کا مخالف تھا اس لئے میرے اور اس کے درمیان تعلقات بہت خوشگوار تھے چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو آئین کے بنیادی قوانین کے مطابق وزیرِ اعظم مقرر کر دوں اور کہوں کہ اپنی کابینہ کی تشکیل کرے اور نئے انتخابات اس ڈھنگ سے کرائے کہ اس میں غیر ملکیوں کا ہاتھ بالکل نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنے پاس بلایا اور اپنا خیال اس پر ظاہر کیا۔ مصدّق نے جواب دیا کہ وہ دو شرطوں پر اس ذمّہ داری کو قبول کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ دو شرطیں کیا ہیں تو اس نے جواب دیا کہ سب سے پہلے تو اس کی حفاظت کے لئے مسلّح پہرے دار مقرر کئے جائیں میں نے اس کی اِس شرط کو فوراً مان لیا۔ میں نے دوسری شرط پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کام کی تکمیل کے لئے انگریزوں کی رضامندی ضروری ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا اور روسیوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔

"ان کو کون پوچھتا ہے۔ اس ملک میں تو صرف انگریز ہی ہیں جو ہر کام کا فیصلہ کرتے ہیں۔"

چنانچہ میں نے اس سے جرح شروع کی اور کہا کہ میرے والد تو کبھی کوئی کام کرنے کے لئے انگریزوں سے اس کی منظوری نہیں لیتے تھے لیکن مصدّق پر اس بات کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ ابھی آپ جوان ہیں اور سیاسی مسائل کا تجربہ کم ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی اس بات پر بضد رہا کہ انگریزوں کی موافقت کے بعد ہی وہ مجھ سے تعاون کر سکتا ہے۔

اس کا یہ طرزِ فکر اور رویّہ مجھے بہت خطرناک لگا اور اس کی وجہ سے مجھے تشویش بھی ہوئی لیکن ملک کی خستہ و زبوں حالی بھی پیشِ نظر تھی جو اتحادیوں کے پنجے میں جکڑا ہوا تھا اور یہ لوگ ہمارے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرتے تھے۔ اس بحرانی دور میں مصدّق کی وطن پرستی اور عوام میں مقبولیت کو ملک کی فلاح کے لئے میں نے غنیمت جانا۔ چنانچہ اپنے اوپر جبر کر کے کہا کہ کسی کو برطانوی سفیر (مقیم تہران) کے پاس بھیجوں گا اور اپنے ارادے سے اس کو مطلع کروں گا۔ مصدّق نے تو صرف برطانوی سفیر سے مشورہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ لیکن میں نے اس کو بتا دیا کہ میں روسی سفیر کے پاس بھی ملاقات کے لئے کسی آدمی کو بھیجوں گا تاکہ اس کو بھی میرے ارادے کا علم ہو جائے۔ اگلے روز میرے مقرر کردہ افسروں نے دونوں سفیروں سے ملاقات کے نتائج کی مجھے اطلاع دی۔ اس زمانے میں برطانوی سفیر سر ریڈر بولارڈ تھا۔ اس نے اس منصوبے سے قطعی اختلاف کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ نئے عام انتخابات سے ملک میں کشیدگی بڑھ جائے گی۔ لیکن یہاں مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ روسی سفیر نے کسی طرح کا اعتراض نہ کیا اور اس کا یہ رویّہ اس کے مقابلے میں جو بعد میں روسیوں نے اختیار کیا نہایت خوشگوار تھا۔

دونوں سفیروں کے نظریات کی اطلاع پاکر میں نے ڈاکٹر مصدق کو ٹیلی فون کیا اور تمام واقعات اس کو بتائے ۔اس نے جواب میں صرف میرا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد نئے انتخابات کی بات میرے اور اس کے درمیان ختم ہوگئی۔ اور اس کو وزیر اعظم بنانے کا معاملہ بھی اِلتوا میں پڑ گیا۔

مصدق کے ظاہری رویّے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ غیر ملکی دباؤ کا سخت مخالف ہے لیکن چند ماہ بعد ایک ایسا عجیب واقعہ پیش آیا جس سے اس کے نظریات کی تردید ہوئی۔ اس وقت پارلیمنٹ کے دستور کے مطابق کسی مسئلے پر بحث کرنے کے لئے دو تہائی ممبران کی موجودگی اور کسی قانون کو پاس کرنے کے لئے تین چوتھائی ممبران کی رائے لینا ضروری تھا ۔نمایندگان کی اقلیتی جماعت جن کی تعداد چالیس تھی پارلیمنٹ کے اس اصول کا فائدہ اُٹھاتی اور ہمیشہ پارلیمنٹ کے اجلاس سے غیر حاضر رہتی جس کی وجہ سے کثرت رائے میں کمی واقع ہوتی۔ اس گروہ کا سربراہ مصدّق تھا۔ مصدق کا یہ فعل چونکہ اصولِ وطن پرستی کے خلاف تھا اس لئے تنگ آکر میں نے مصدّق اور اس کے اقلیتی گروپ کو بُلایا اور ان سے دریافت کیا آخر کیوں وہ لوگ حکومت کے کاموں میں رخنہ اندازی کرتے ہیں۔ اس نے جو جواب دیا وہ میرے لئے حیرت انگیز تھا۔ اس نے کہا کہ روسی موجودہ وزیر اعظم سے خوش نہیں ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر وہ کیوں روسیوں کی ہی رضامندی اس معاملے میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی چھوٹی طاقت ہمارے وزیر اعظم پر اعتراض کرتی تو کیا وہ یہی رویّہ اختیار کرتا۔ مصدّق کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

اسی دوران انگریزی اور امریکن تیل کی کمپنیوں نے جنوبی علاقے سے مزید تیل نکالنے کی اجازت لینے کی خواہش ظاہر کی اور روسی حکومت بھی شمالی علاقے سے تیل نکالنے کے حقوق حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ان مسائل کی بنا پر مصدّق کی قومی اہمیت اور بھی بڑھ گئی کیونکہ ۱۹۴۴ء میں پارلیمنٹ نے اس کا پیش کردہ یہ بل منظور کر لیا تھا کہ ایرانی حکومت پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر تیل نکالنے کے حقوق کسی کو نہیں دے گی۔

اگرچہ یہ بل بڑے اچھے موقعے پر پیش کیا گیا تھا لیکن اس سے مصدّق کی منفی پسندی کی شہادت بھی ملتی ہے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد مصدّق نے کوشش کرکے انتہا پسندوں کی ایک جماعت بنائی (جو اپنے کو قوم پرست کہتے تھے) اور اس کا نام "قومی محاذ"[1] رکھا اور آہستہ آہستہ مختلف قسم کے لوگ جیسے کٹر خیالات کے مذہبی علماء، کالج کے طلباء، دوکان دار اور اشتراکیت پسند اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس جماعت کے لوگوں کو جس چیز نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا وہ تھی غیر ملکیوں سے نفرت اور ان کے اقتدار سے حقارت۔ چنانچہ اس جماعت کے لوگ غیر ملکیوں کے خلاف تخریبی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور چونکہ یہ جماعت ملک کی فلاح کے لئے کوئی تعمیری کام نہ کر سکی اس لئے جلد ہی اس کا وجود ختم ہوگیا۔

۱۹۴۹ء میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ جیسے ہی میرے ہم وطنوں کا اس بات کا علم ہوا وہ ایک دل اور ایک

1. NATIONAL FRONT

زبان ہوکر میری مدد کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ اور اس کے بعد "ٹوڈی پارٹی" کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ ایرانی قوم کی وفاداری نے مجھے اس بات کا موقع دیا کہ میں اپنی آئینی حیثیت کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرلوں۔

۱۹۰۶ء کے پاس شدہ آئین کی رُو سے اس بات کی گنجائش رکھی گئی تھی کہ قومی اسمبلی کے علاوہ مجلس قانون ساز[1] بھی قائم کی جائے۔ لیکن قومی اسمبلی کی مخالفت کی وجہ سے مجلس قانون ساز کی تشکیل ۱۹۴۹ء تک نہ ہوسکی چنانچہ اسی سال قانون ساز اسمبلی وجود میں آئی اور اس کی باقاعدہ نشست ہوئی۔ تقریباً اس کے فوراً بعد ایک بل پاس ہوا جس کی رُو سے مجھے یہ اختیار دیا گیا کہ دوسرے تمام جمہوری ممالک کے سربراہوں کی طرح مجلسِ قانون ساز اور قومی اسمبلی کو ختم کرکے نئے انتخابات کا حکم جاری کروں۔ ۱۹۴۹ء کے اواخر میں میں نے امریکہ کا سفر اس مقصد کے تحت کیا کہ ایران کو مزید فوجی اور اقتصادی مدد مل سکے۔ وہاں میرا استقبال نہایت گرم جوشی اور پورے شاہانہ وقار سے کیا گیا لیکن مجھے مایوس ہوکر لوٹنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں پریزیڈنٹ ٹرومین نے کمیونزم کے روکنے کی غرض سے ایک اصول مرتب کیا تھا جس کے تحت ترکی اور یونان کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے امریکہ مدد دے رہا تھا لیکن امریکی حکومت نے اس وقت تک کوئی واضح اور روشن پالیسی مشرقِ وسطیٰ کے لئے مرتب نہیں کی تھی اس مشن میں ناکامی کی ذمّہ داری ایک حد تک خود ہم پر تھی کیونکہ امریکی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم اُس وقت تک پوری سنجیدگی سے اپنے داخلی معاملات کو سُلجھانے کی طرف متوجّہ نہیں ہوئے تھے۔ اسی سال کے شروع میں قومی چین کی تباہی اور شکست نے امریکہ کے لئے تشویشناک صورتِ حال پیدا کردی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ مدد صرف انہی ممالک کو دی جائے گی جو اپنے اندرونی معاملات کو سلجھانے میں دلچسپی لیں گے۔ ایران واپس آنے کے بعد میں پوری لگن سے اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلا قدم میں نے یہ اٹھایا کہ تمام نااہل اور ناکارہ افسروں کو جو سالوں سے حکومت کے اعلیٰ مراتب سے چمٹے ہوئے تھے الگ کردیا اور شاہی زمینوں کی تقسیم کے پروگرام کو جس پر مدّت سے غور ہو رہا تھا فوراً عملی جامہ پہنایا۔

اسی اثناء میں امریکہ نے نکتہ چہار[2] کے نام سے ایک پروگرام مرتب کیا جس کو مختلف ممالک میں نافذ کیا گیا۔ جون ۱۹۵۰ء میں جنرل علی رزم آرا کو میں نے وزیر اعظم مقرر کیا۔ اس نے امریکہ سے گفت وشنید کے ذریعے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کے تحت امریکہ نے مختصر سی امداد ہمیں دینی شروع کردی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے رشوت ستانی اور اندھیر گردی کو ختم کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا لیکن اس کے ممبران میں چونکہ شدید اختلاف پیدا ہوگیا تھا اس لئے یہ کمیشن خاطر خواہ کام نہ کرسکا ۱۹۴۹ء میں پہلا سات سالہ اقتصادی ترقیاتی منصوبہ میں نے ماہرین کی مدد سے تیار کیا اور پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد اس پر عمل شروع کردیا۔ میرا یہ عزم تھا کہ امریکہ اور ساری دُنیا پر یہ ثابت کردوں کہ ایران کو جو بھی مدد دی جائے گی وہ مفید اور نفع بخش کاموں پر خرچ ہوگی۔

1. SENATE 2. POINT FOUR

باوجود ان تمام کوششوں کے ہمیں بڑے پیمانے پر مدد نہیں مل سکی اور کسی معقول رقم کی بجائے نکتہ چہار کی مد سے بہت مختصر سی رقم ہمیں دی گئی۔ البتہ واشنگٹن کے درآمدی اور برآمدی بینک نے ہمیں ۲۵ ملین ڈالر دینے کا وعدہ کیا۔ جنگ کے دوران اتحادی فوجوں کے ایران میں گھس آنے کی وجہ سے جو اقتصادی بحران پیدا ہو گیا تھا اس کو پورا کرنے کے لئے یہ رقم قطعی ناکافی تھی۔

ہماری مدد میں امریکہ کی کوتاہی کی وجہ سے ایرانیوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ امریکہ نے ہمیں بالکل بیچ میدان میں چھوڑ دیا ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں میں امریکہ کے خلاف جذبات بھڑکنے لگے اور مصدق کی پارٹی قومی محاذ کو پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے سات سالہ منصوبے میں کمی کرنی پڑی۔ جن امریکی ماہرین کو اقتصادی ترقی کے لئے بلایا گیا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ واپس جانے لگے۔ جنوبی ایران سے تیل ایک انگریزی کمپنی نکالتی تھی چنانچہ ہمارے اور اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے نمائندوں کے درمیان گفت و شنید ہوئی اور ہم نے ان سے درخواست کی کہ تیل سے جو رقم ہمیں ملتی ہے اس کا حصہ بڑھایا جائے لیکن اس گفت و شنید کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ جب ہمیں امریکی امداد ضرورت کے مطابق نہ مل سکی تو ہم نے مجبوراً بیس ملین ڈالر کا تجارتی معاہدہ روس سے کیا۔ اس معاہدے پر دستخط ۱۹۵۰ء میں ہوئے۔ یہ تمام واقعات مصدق کے حق میں مفید ثابت ہوئے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیل کو قومی ملکیت قرار دینے سے پہلے اینگلو ایرانین آئل کمپنی نے ایرانی عوام کے جذبات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ کمپنی کا یہ رویہ اس کے لئے ایسا ہی نقصان دہ تھا جیسے مصدق کی سرگرمیاں اس کے اور پورے ملک کے لئے تباہ کن تھیں۔

کمپنی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ یورپ کی دوسری کمپنیاں جو سعودی عرب اور مرکزی و جنوبی امریکہ میں تیل نکال رہی ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ معاوضہ دے رہی ہیں جو ہم معاہدے کے تحت ان سے لے رہے تھے۔ اس کے علاوہ کمپنی کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ہم اس سے اس لئے بھی سخت ناراض ہیں کہ جو رقم بطور معاوضہ ہم کو دی جاتی ہے اس سے کہیں زیادہ رقم یہ کمپنی ٹیکس کی شکل میں حکومت انگلستان کو ادا کرتی ہے اور کمپنی اس سے بھی بے خبر نہ تھی کہ ہم اس سے یوں بھی شاکی ہیں کہ اس کو جو کچھ ایران کے تیل سے آمدنی ہوتی ہے وہ اس کے ایک بہت بڑے حصے کو دنیا کے دوسرے ملکوں میں اپنے ترقیاتی کاموں میں صرف کرتی ہے۔ باوجود ان تمام مسائل کے کمپنی نے ہمارے اعتراضات پر کبھی توجہ نہیں دی جس سے اس کے اس عظیم سرمایے کو خطرہ لاحق ہو گیا جو اس نے ایران میں لگا رکھا تھا۔ برطانوی حکومت اگر چاہتی تو وہ کمپنی کو اس بات کے لئے مجبور کر سکتی تھی کہ وہ اپنا رویہ نرم کرنے اور دور اندیشی سے کام لے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی حکومت اور کمپنی نے ایرانی قوم کے جذبات کو بھڑکایا اور قومی محاذ کی تحریک پہلے سے کہیں زیادہ زور پکڑ گئی۔ لوگ مصدق کے فریب میں آنے

گئے۔ اوران میں تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کا جوش وخروش بڑھنے لگا۔ رزم آراجو اس وقت وزیر اعظم تھا اس کا مخالف تھا کیونکہ اس کو امید تھی کہ تیل کی کمپنی سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے لیکن مصدق اور اس کے ساتھیوں نے رزم آرا اور غیر ملکیوں کے خلاف سخت مظاہرے شروع کر دیئے۔

انہی دنوں فدائیان اسلام نامی جماعت عالم وجود میں آئی جو مصدق کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ ۷۔ مارچ ۱۹۵۱ء کو جس وقت رزم آرا ایک عالم دین کی فاتحہ میں شرکت کے لئے مسجد شاہ کے صحن سے گذر رہا تھا اس جماعت کے ایک رکن نے اس کو بڑی سفاکی اور بے رحمی سے قتل کر دیا۔ اس کے چند روز بعد پارلیمنٹ نے تیل کی صنعت کو قومیانے کا قانون جس میں میری بھی رضامندی شامل تھی پاس کر دیا۔ میں نے رزم آرا کی جگہ حسین علاء کو وزیر اعظم مقرر کر دیا کیونکہ سیاست داں کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں اس کا بڑا احترام تھا اور سیاست کا اس کو طویل تجربہ بھی تھا۔ حسین علاء صلح جو انسان تھا وہ چاہتا تھا کہ تیل کی صنعت قومی ملکیت میں بھی رہے اور غیر ملکی ماہرین بھی تیل نکالنے، باہر بھیجنے اور کارخانوں کو چلانے میں مدد دیں لیکن انتہا پسندوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور کچھ فسادیوں نے جنوبی ایران کے تیل کے ذخیروں کے خطوں میں پہنچ کر مزدوروں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ "ٹوڈے پارٹی" جس کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا دوبارہ منظم ہو کر ان فسادیوں کی مدد کرنے لگی۔ اس فساد میں تین انگریز اور کچھ ایرانی مارے گئے۔ تیل کمپنی نے اپنا کام بند کر دیا اور تیل سے جو رقم بطور معاوضہ ایران کو ملتی تھی منقطع ہو گئی۔ مصدق نے لوگوں کو یہ سبز باغ دکھا رکھے تھے کہ جلد ہی ان کے پاس دولت کی فراوانی ہو گی اور یہ دولت تیل کی آمدنی سے جو ایران کا جائز حق ہے ملے گی۔ وہ تیل کی کمپنی سے تین لاکھ پونڈ روزانہ وصول کیا کرے گا۔ ان باتوں کو سن کر کون اس کی مخالفت کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے لوگوں سے وعدے کئے تھے کہ وہ ہر شخص کو روپے پیسے سے مالا مال کر دے گا۔ ہر غیر ملکی سے لڑے گا۔ اور ایرانیوں کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ ان تمام وعدوں کو سن کر مختلف لوگوں کے گروہ جیسے یونیورسٹی کے طالب علم، تاجر، دستکار اور مزدور اگر اس کے گرد جمع ہو گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مصدق نے یہ دم دلاسے دے کر اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ حسین علاء کو وزیر اعظم ہوئے ابھی دو ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ وہ اس عہدے سے الگ ہو گیا۔ اور میں نے مصدق کو اس کی جگہ وزیر اعظم مقرر کیا۔ اس وقت ایسا کوئی بھی شخص نہ تھا جو اس کے مقابلے میں ٹھہر سکتا یا اس عہدے کو قبول کرنے کی کوشش کرتا۔ اب مصدق کے لئے بڑا اچھا موقع تھا کیونکہ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو وہ کامیابی حاصل ہوئی تھی اور ان کی وہ مرادیں بر آئی تھیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے سامنے دو سال کا عرصہ تھا۔ جس کے دوران وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اگرچہ اس کی پشت پناہی کرنا میری طبیعت کے لئے گوارا نہ تھا لیکن اس کو میری پوری پوری حمایت حاصل تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مصدق نے کیا کیا اور اس ملک کے لوگوں پر کیسے کیسے مصیبتوں کے پہاڑ ڈھائے۔ انہی دنوں میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اپنے چھاتہ بردار سپاہیوں کو قبرص روانہ کرے گی۔ یہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ یہ فوج ایران میں بھی بھیجی جاسکتی ہے۔ موریشس نامی برطانوی جنگی جہاز آبادان کے پاس لنگرانداز تھا جس کی وجہ سے یہ بات پھیلنے لگی کہ برطانوی بحری فوج خلیج فارس کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔

میں نے برطانوی سفیر کو بلایا اور اس کو خبردار کر دیا کہ اگر برطانوی حکومت نے ایران کی آزادی اور حقِ حکمرانی پر دست درازی کی تو میں خود اپنی فوجوں کی کمان سنبھال لوں گا اور ہر ظلم و زیادتی کا مقابلہ کروں گا۔ یا تو میری صاف گوئی اور دلیری کے سبب یا کسی اور وجہ سے یہ افواہیں اپنے آپ ہی ختم ہو گئیں اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

تیل کے مسئلے پر جو اختلاف تھا اس کا کوئی مفید حل تلاش کرنے کیلئے اگر مصدق چاہتا تو میری طرح سخت قدم اٹھا سکتا تھا لیکن اس معاملے میں اس نے کبھی پہل نہ کی بلکہ یہ کام کمپنی پر چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی وزارت کا پورا عہد کمپنی سے اوچھے طریقوں پر لڑنے میں صرف کیا جس کا ملک کی حالت پر کوئی اچھا اثر نہ پڑا۔ پہلے دن سے آخری روز تک جب کہ اس کو وزارت سے ہٹایا گیا اس نے اس مسئلے کو حل کرنے میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔

بین الاقوامی سلامتی کونسل، بین الاقوامی بینک، بین الاقوامی عدالت، صدر ٹرومین، صدر آئزن ہاور اور دنیا کی دوسری امن پسند انجمنوں کے ممبران نے یہ کوشش کی کہ اس مسئلے کا کوئی سُود مند حل نکل آئے اور آپس کے اختلافات دور ہو جائیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ مصدّق اپنے ساتھیوں اور ضدّی طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ اپنے منفی پسندانہ رویّے پر برقرار رہا جس کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنا وقت اصلاحی اور ترقیاتی کاموں میں صرف کرتا وہ ہمیشہ کاٹ چھانٹ میں لگا رہتا۔ یہاں ہم یہ بیان کریں گے کہ اس نے اپنے عُہدے کو برقرار رکھنے کے لئے کیا کیا اقدامات نہ کئے۔

مصدّق نے انگریزی حکومت اور تیل کی کمپنی سے معاملات طے کرنے میں دو بڑی غلطیاں کیں۔ اوّل یہ کہ اس کو اس بات کا یقین تھا کہ ایرانی تیل کے بغیر دنیا کی صنعتی اور اقتصادی بقا ممکن نہیں جس کا نتیجہ اس نے یہ اخذ کیا تھا کہ جلدی ہی تیل کی کمپنی اور اس کے بھی خواہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔ لیکن جیسے ہی ایران میں تیل نکالنا بند کیا گیا دوسرے تمام ملکوں نے جہاں جہاں سے تیل نکلتا تھا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے تیل نکالنے کی مقدار بڑھادی۔ چونکہ آج دُنیا میں بہت سے ایسے ملک ہیں جہاں سے تیل نکالا جاتا ہے۔ اس لئے کوئی ایک ملک اپنی اجارہ داری قائم نہیں رکھ سکتا۔ درحقیقت مصدّق اور اس کے ساتھیوں نے تیل کے نکالنے میں مشکلات پیدا کرنا چاہی تھیں لیکن حالات کچھ اس طرح بدلے کہ ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں کیونکہ مصدّق کے

زوال کے بعد جب تیل نکالنے کا کام دوبارہ شروع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دُنیا کی منڈیوں میں تیل ضرورت سے زیادہ موجود ہے۔ چنانچہ چند ملکوں کو تیل نکالنے کی مقدار کو کم کرنا پڑا تاکہ تیل کی فراہمی اور اس کی کھپت میں توازن برقرار رہ سکے۔ مصدق اور اس کے ساتھیوں نے یہ غیر دانش مندانہ قدم میری رائے میں اس لئے اُٹھایا تھا کہ وہ سمجھے تھے کہ صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جو ساری دُنیا کو تیل فراہم کرسکتا ہے۔

دوسری غلطی مصدق کی یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ بغیر غیر ملکیوں کی مدد کے وہ دُنیا کی منڈیوں میں تیل بھیج سکتا ہے۔ درحالیکہ اس وقت ایران کے پاس ایک بھی تیل لے جانے کے لئے پانی کا جہاز نہ تھا اور نہ ہی کوئی ایسا ادارہ تھا جو بین الاقوامی سطح پر تیل فروخت کرسکے۔ اگلی فصل میں اس بات کا ذکر آئے گا کہ کس طرح میں نے اور میری حکومت نے تیل بردار جہاز حاصل کرنے اور بیرونی ممالک میں تیل کی فروخت کے انتظامات کئے ہیں۔ مصدق نے ایک طرف تو تمام کمپنیوں سے تعلقات قطع کرلئے اور دوسری طرف وہ تمام ذرائع مہیا نہیں کئے جن سے تیل باہر بھیجنے میں دوسروں کی مدد کی ضرورت نہ پڑتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔

جس وقت ایران میں تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دیا گیا اور مصدق وزیر اعظم مقرر ہوا تو انگریزی حکومت اور تیل کی کمپنی نے دیکھ لیا کہ انجام کیا ہونے والا ہے چنانچہ انھوں نے فوراً اپنی حکمتِ عملی کو بدل دیا اور قومی ملکیت کے قانون کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا۔ کچھ عرصے کے بعد اسٹاک مشن[1] کے نام سے ایک وفد برطانوی حکومت نے تہران بھیجا اور یہ طے پایا کہ تیل کی کل آمدنی کا نصف حصہ ایران کو دیا جائے گا اور نصف کی حق دار برطانوی حکومت ہوگی۔ اگر اس وقت مصدق نے دانش مندی سے کام لیا ہوتا اور اس پیشکش کو مان لیا ہوتا تو میرے ہم وطن اس اقتصادی بحران کی مصیبت سے بچ جاتے جس کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ میری رائے میں مصدق باوجود اپنی تمام ہٹ دھرمی اور ضدی پن کے جو اس میں خطرناک حد تک موجود تھی اس بات کے لئے تیار تھا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان اتفاق رائے ہوجائے لیکن اس کے ساتھیوں کے بارے میں مجھے شک ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو اس بات کے خواہش مند تھے کہ ذرا بھی مصالحت کی راہ پیدا نہ ہو تاکہ ملک اقتصادی طور پر بالکل تباہ ہوجائے اور غیر ملکیوں کا اس پر غلبہ ہوجائے۔ اس تخریبی قوم پرستی کا ذکر میں آیندہ فصل میں کروں گا۔

جس وقت مصدق نے اسٹوکس مشن کی پیشکش کو ٹھکرایا تو تیل کی کمپنی اور برطانوی حکومت نے الگ الگ بین الاقوامی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کیا اور ربطور سند ۱۹۳۳ء کے اس معاہدے کا حوالہ دیا جو میرے والد کی حکومت نے کمپنی سے کیا تھا اور جس پر عمل تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دینے سے قبل تک ہوتا رہا تھا۔ اس معاہدہ میں اس بات کا بھی ذکر تھا کہ اگر کمپنی اور ایران کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو معاملہ ثالث کے سامنے پیش کیا جائے اور اسی وجہ سے بین الاقوامی عدالت سے یہ درخواست کی گئی کہ چونکہ معاہدے میں ثالث مقرر کرنے کی گنجائش

1. STOKES MISSION

موجود ہے اس معاملے کے تصفیے کے لئے ایک جج مقرر کرے۔

مصدق نے بین الاقوامی عدالت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے یہ معاملہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔ سلامتی کونسل نے کافی بحث و مباحثے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں یہ طے کیا کہ اس معاملے کو اس وقت تک نہ اُٹھایا جائے جب تک کہ بین الاقوامی عدالت یہ فیصلہ نہ دے دے کہ آیا یہ معاملہ اس کی دسترس میں ہے یا اس سے باہر۔ جس وقت مصدق سلامتی کونسل میں ایران کی نمائندگی کرنے نیویارک روانہ ہوا تو میں نے اس کو ہمت افزائی کی خاطر ایک تار دیا جس کا اس نے مجھے یہ جواب دیا:

نیویارک۔ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

بحضور اعلیحضرت مبارک شاہنشاہ ایران۔

سرکار والا تبار کا ارسال کردہ تار باعثِ شرف اور انتہائی موجبِ مسرت ہوا۔ یہ بندہ دربار خداوندی میں نیاز مند ہے کہ وہ اعلیحضرت شاہنشاہ کو تندرستی، سلامتی، درازیٔ عمر اور کامیابی سے سرفراز فرمائے۔ خدمتِ اقدس میں دست بستہ عرض ہے کہ اس ناچیز بندے کو جہاں کبھی کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی ہے وہ آنجناب کی اس عنایتِ شاہانہ کا طفیل ہے جس کی ذاتِ بابرکات سے ہر وقت حکومت کی پشت پناہی اور رہنمائی ہوتی ہے۔ جناب وزیر دربار نے بھی خدمتِ اقدس میں یہ اطلاع گذارنی ہے کہ یہ بندۂ ناچیز دوشنبہ کو فلے ڈیلفیا روانہ ہو جائے گا اور سہ شنبہ کو واشنگٹن پہنچے گا اور اس کے بعد کی کارروائی حضور کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے گا۔ ایک بار پھر یہ بندۂ خاکسار حضور شاہنشاہ مبارک کی عنایات اور کرم فرمائیوں کا شکریہ ادا کرنے کی اجازت چاہے گا۔

ڈاکٹر مصدق

وہ واقعات جو بعد میں رونما ہوئے ان کی روشنی میں یہ فیصلہ میں پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں کہ اس تار میں جس خلوص کا اظہار کیا گیا ہے اس میں کس حد تک صداقت ہے۔

۱۹۵۱ء کے اواخر اور ۱۹۵۲ء کے شروع میں بین الاقوامی تعمیری اور ترقیاتی بینک نے دوستانہ طریقے سے درمیان میں پڑ کر اختلافات کو دور کرانے کا بیڑا اُٹھایا۔ شروع شروع میں اس بات کا امکان نظر آیا کہ گفتگو کامیاب رہے گی کیونکہ جو شرائط بینک نے رکھی تھیں وہ سب مصدق کو منظور تھیں۔ لیکن اس کے بعض ساتھیوں نے اپنی اغراض کے تحت اس کو مجبور کیا کہ ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور یہ گفتگو قطعی طور پر ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد مصدق نے حکم دیا کہ ایران میں جتنے بھی برطانوی کونسل خانے ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔ پارلیمنٹ کے سترھویں اجلاس کے افتتاح کے موقع پر بھی مصدق کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی چنانچہ وہ دوسری مرتبہ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اس نے ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو اعلان کیا کہ جب تک اس کو غیر معمولی اختیارات نہ دیئے جائیں گے وہ اس عہدے پر کام نہ کر سکے گا چونکہ

وہ اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے پارلیمنٹ اور عوام سے خوف زدہ تھا اس لئے اس نے درخواست کی کہ چھ ماہ تک اس کو پارلیمنٹ کی بازپرس کے بغیر حکومت کرنے کے اختیارات دئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مزید اس نے یہ بھی درخواست کی کہ اس کو وزیرِ جنگ بھی مقرر کیا جائے۔ ایرانی آئین کی رو سے میری حیثیت تمام مسلح فوجوں کے کمانڈر اِن چیف کی ہے۔ وہ وزارتِ جنگ حاصل کر کے چاہتا تھا کہ میرے اختیارات سلب کرلے اور میں بے دست وپا ہو کر رہ جاؤں۔

میں نے اس کی ان درخواستوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ مجھے یہ یقین تھا کہ اگر مصدق کو اختیارات دے دئے گئے تو کمیونسٹ ہمارے بہت سے کاموں میں دخل اندازی کریں گے۔ چنانچہ اس کتاب کو پڑھنے والے یہ دیکھیں گے کہ آیندہ آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ ۷ اجولائی کو مصدق نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے احمد قوام کو وزیرِ اعظم مقرر کر دیا کیونکہ یہ شخص پہلے بھی اس عہدے پر مامور رہ چکا تھا۔ بعض سیاسی حلقوں کا یہ خیال تھا کہ یہ شخص تخریب کاروں کے خلاف سخت کارروائی کر سکتا ہے۔

احمد قوام کے برسرِ اقتدار آتے ہی 'ٹوڈی پارٹی' کے کارکن مصدق کے ساتھیوں سے مل گئے اور ہر جگہ فسادات اور احتجاج شروع کر دئے۔ ہر طرف لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ قوام کی حکومت ان فسادات کو کچلنے میں سخت ناکام رہی۔ انہی دنوں قوام نے ریڈیو سے اپنی تقریر نشر کی اور تیل کو قومی ملکیت بنانے کی جو تحریک زور پکڑے ہوئے تھی اس کی سخت مخالفت کی۔ جس سے حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ قوام بوڑھا آدمی تھا اور صحت بھی خراب رہتی تھی۔ جس وقت بعض اہم سیاسی معاملات پر بحث ہوتی تھی وہ اکثر بحث کے دوران سوجاتا تھا۔ اگرچہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ مسائل کو حل کرنے میں طاقت سے کام لیا جائے لیکن میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس جیسے ضعیف آدمی کو سخت اقدامات کرنے کی اجازت دوں۔ چنانچہ چار روز بعد وہ میرے مشورے پر وزارت سے سبکدوش ہو گیا اور یہ بات پورے طور پر واضح ہو گئی کہ ان دنوں کوئی بھی شخص مصدق کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو داخلی جنگ کو روکنے کی غرض سے میں نے مجبوراً مصدق کی تمام شرائط مان لیں اور اس کو دوبارہ وزیرِ اعظم کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ انہی دنوں بین الاقوامی عدالت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا کہ ایران اور برطانوی حکومت کے درمیان جو جھگڑا ہے وہ اس عدالت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ ثالث جماعت کے انگریز جج نے ایران کے حق میں اپنی رائے دی لیکن روسی نمایندے نے اپنی رائے کے اظہار سے انکار کر دیا کیونکہ اس نے ثالث جماعت کی کسی بھی نشست میں شرکت نہیں کی تھی۔

بین الاقوامی عدالت نے جو فیصلہ صادر کیا تھا اس سے ایرانیوں میں اگرچہ مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی لیکن اس فیصلے نے ہماری مشکلات کو حل نہ کیا۔ البتہ مصدق کی منفی کامیابیوں میں ایک اور کامیابی کا اضافہ ہو گیا۔ لوگ خوشی سے دیوانے ہو گئے اور مصدق نے کسی بڑی منفی کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنا شروع کیا۔

ایران کی اقتصادی اور سیاسی بدحالی کو دیکھ کر امریکی حکومت کو سخت تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ ۳۰-اگست ۱۹۵۲ء کو امریکہ کے صدر ٹرومین اور انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے مشترکہ مراسلہ مصدّق کے نام بھیجا جس میں تیل سے متعلقہ اختلافات کو دور کرنے کا نیا حل پیش کیا گیا تھا۔ لیکن مصدّق نے ان کی پیشکش کو بھی قبول نہ کیا بلکہ ۲۲-اکتوبر کو انگلستان سے سیاسی تعلقات بھی ختم کر لئے۔

آبادان کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ جو دُنیا کا سب سے بڑا کارخانہ شمار کیا جاتا ہے اس عرصے میں بالکل بند رہا اور ایران کو اس سے جو آمدنی ہوتی تھی قطعی طور پر بند ہو گئی۔

مصدّق نے تیل فروخت کرنے کی پیشکش ان غیر ملکی کمپنیوں سے بھی کی جو چھوٹے پیمانے پر تیل کا کاروبار کرتی تھیں۔ یہ کمپنیاں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ برطانوی کمپنی ان کے خلاف یہ قانونی کارروائی کر سکتی ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر کیوں اس کے مال پر ناجائز قبضہ کرنے پر آمادہ ہیں، تیل نکالنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ لیکن ان کمپنیوں نے تیل فروخت کرکے جو رقم حاصل کی وہ اس رقم سے کہیں کم تھی جو ہم کو ایک دن میں بطور منافع کارخانے سے حاصل ہوتی تھی۔

اسی اثناء میں آئزن ہاور، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے انھوں نے اور مسٹر چرچل نے ایک اور مشترکہ مراسلہ حکومتِ ایران کے نام بھیجا جس میں آپس کے اختلافات دور کرنے، تیل کے کارخانوں کو دوبارہ چلانے اور تیل کی آمدنی مقرر کرنے کی پیشکش کی گئی تھی۔ مصدّق نے گذشتہ تجاویز کی طرح اس کو بھی رد کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اور بھی منفی کامیابیاں حاصل کیں۔ جس روز میں نے مجلس قانون ساز کے نئے اجلاس کا افتتاح کیا تو مصدّق نے دو ہفتے بعد قومی اسمبلی کے ممبران کو مجبور کیا کہ قانون ساز مجلس کو ختم کر دیں لیکن اس نے قومی اسمبلی کو برقرار رکھا کیونکہ اس کے تمام ممبروں کو اس نے خود چنا تھا اور سب اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں پارلیمنٹ نے میری مرضی اور کثرت رائے سے مصدّق کے فوری اختیارات کی مدّت کو بڑھا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ مصدّق کو مزید مدت کے لئے اختیارات دے دئے جائیں تاکہ تیل کے جھگڑے کو ختم کرکے کوئی مفید حل نکالنے میں وہ کامیاب ہو سکے لیکن افسوس کہ اس نے ان اختیارات کو ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ اس نے اخبارات پر سخت پابندی لگا دی اور ان کے مدیروں کو گرفتار کرا لیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبر ایسے بھی تھے جو اس پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس نے ان کی زبان بندی کے لئے پارلیمنٹ کے اختیارات کم کر دئے اور اپنے ساتھیوں کو پارلیمنٹ کے اجلاس سے غیر حاضر رہنے کا حکم دیا تاکہ ضروری کارروائی کے لئے حاضرین کی تعداد پوری نہ ہو سکے۔ پارلیمنٹ کے جو ممبر اس کے مخالف تھے ان کو اس کے پالے ہوئے غنڈے اُن کے گھروں پر یا سڑکوں پر راہ چلتے دھمکی دیتے۔

جو شخص لوگوں کو روپے کی قیمت گر جانے کا بار بار خوف دلایا کرتا تھا اس نے ہی کافی مقدار میں سونا یا غیر ملکی زرمبادلہ محفوظ کئے بغیر کروڑوں روپے کے نوٹ چھاپ کر یہ خطرہ پیدا کر دیا۔ فوج کے کمانڈر وہ لوگ مقرر کئے جو اس کے

وفادار اور قریبی دوست تھے۔ اور بہت سے ٹوڈی پارٹی کے کمیونسٹوں اور رخنہ اندازوں کو لالچ دے کر فوج میں بھرتی کر لیا۔ اس نے مارشل لا کی مدت بڑھادی۔ پارلیمنٹ کو مجبور کیا کہ اس کے وفادار ساتھیوں میں سے سات افراد کی کمیٹی مقرر کی جائے جو مسلح فوجوں کا کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے میرے اختیار کو کم کرنے پر غور کر کے اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی نے بڑی مفصل رپورٹ تیار کی جس کو مصدق نے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کی درخواست کی لیکن پارلیمنٹ نے مصدق کی درخواست اور اس رپورٹ پر توجہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے پارلیمنٹ کے گذشتہ ساتھیوں میں کاشانی نے جو سب سے پیش پیش تھا اس کے اس رویّے کو قطعی پسند نہ کیا۔

مصدق نے عدالتِ عالیہ[1] کو بھی ختم کر دیا اور قومی اسمبلی کے انتخابات کو بھی ملتوی کرادیا۔ بعض پارلیمنٹ کے ممبران نے جرأت سے کام لیا اور اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس پر وہ بہت برافروختہ ہوا اور یہ اعلان کیا کہ رائے عامّہ کے ذریعے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آیا موجودہ اسمبلی برقرار رکھی جائے یا اس کو ختم کر دیا جائے۔

پارلیمنٹ کے نمایندوں کو بخوبی یاد تھا کہ جس وقت قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تھا تو مصدق نے مختصر سی تقریر کی تھی اور اس میں یہ کہا تھا۔ اس وقت پارلیمنٹ میں اسیٌ فیصدی ممبران حقیقی معنوں میں عوام کے نمایندے ہیں۔ مصدق نے جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ آزادانہ انتخابات اس کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ رائے عامّہ حاصل کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ دو ایسے صندوق لئے جن کے رنگوں میں نمایاں فرق تھا اور یہ اعلان کیا کہ جو پارلیمنٹ کو ختم کرنے کے حق میں ہیں وہ ایک صندوق میں اپنا ووٹ ڈالیں اور جو اس کے مخالف ہیں وہ دوسرے صندوق میں۔ سب کو اس بات کا علم تھا کہ اگر کسی نے پارلیمنٹ کو ختم کرنے کے خلاف رائے دی تو مصدق کے غنڈے اور ٹوڈی پارٹی کے لوگ جو ان سے مل گئے ہیں اور دونوں میں تمیز کرنا تقریباً ناممکن ہے اس قدر پریشان کریں گے کہ جینا مشکل ہو جائے گا۔ رائے عامّہ کا نتیجہ وہی نکلا جو مصدق چاہتا تھا (اس سے پہلے ہٹلر نے بھی یہی رویّہ اختیار کیا تھا) ننانوےٌ فیصدی رائے مجلس کے ختم کر دینے کے حق میں تھی۔ ایک قصبے سے جس کی کل آبادی تین ہزار تھی اٹھارہ ہزار ووٹ مجلس کو ختم کر دینے کے حق میں حاصل ہوئے تھے۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس قصبے میں اور دوسرے شہروں و قصبوں میں بھی مُردوں نے قبر سے نکل نکل کر ووٹ دیئے۔ ایک طریقے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مُردوں نے اس انتخاب میں اور مصدق کے دوسرے جعلی انتخابات میں یقیناً شرکت کی ہوگی کیونکہ جو لوگ یہ چاہتے ہوں گے کہ وہ آزادانہ اپنی رائے دیں ان کا انجام یہ ہوا کہ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔

مصدق کافی عرصے تک پارلیمنٹ کا نمایندہ رہا۔ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ گویا وہ جمہوریت کے اصولوں، اکثریت کے نمایندوں کی حکومت اور نظم و نسق کا سختی سے پابند ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ اس کو

1. SUPREME COURT

مارشل لا سے سخت نفرت ہے اور آزادانہ انتخابات اور آزادیِ تحریر کا زبردست حامی ہے۔

اسی مصدق نے چند ماہ کے عرصے میں مجلس قانون ساز اور عدالتِ عالیہ کو ختم کرا دیا۔ قومی اسمبلی کو ختم کرنے کے لئے لوگوں کے جذبات کو اُبھارا۔ اخبارات کی آزادی کو گھونٹ کر رکھ دیا۔ آزاد انتخابات کا خاتمہ کر دیا۔ مارشل لا کی مدّت بڑھا دی۔ آئین کے اعتبار سے جو مجھے اختیارات دئے گئے تھے ان کو کم کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ پچاس سالہ آئین کو جو بڑی جدّوجہد سے تیار کیا گیا تھا پامال کر کے رکھ دیا۔ اور یہ سب اقدامات اس لئے کئے گئے تھے کہ ملک کے سربراہ کو ہٹا کر خود مطلق العنان حکمراں بن جائے مگر اس کی یہ آرزو بر نہ آسکی۔

باوجود اس کے میں نے اُس کی جان بچائی، پوری پوری اس کی مدد اور حمایت کی لیکن جیسے ہی وہ وزیرِاعظم بنا میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ میرے خاندان کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ ایسے بہت سے قرائن ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے وہ پہلوی خاندان کا سخت دشمن تھا۔ اس کا قاجاری خاندان سے خونی رشتہ تھا۔ اور جب میرے والد برسرِ اقتدار آئے تو اس نے ان کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ پہلوی خاندان کو جس طرح بھی ہو سکے نیچا دکھائے اور آہستہ آہستہ اندر ہی اندر اس کو ختم کر دے، اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پہلوی خاندان کا دشمن ہے میں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہ کی اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے خود یہ موقع دیا کہ وہ قومی مقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہو۔ جیسے جیسے پہلوی خاندان کے لئے خطرہ بڑھ رہا تھا مجھ پر یہ عیاں ہو رہا تھا کہ مصدق غیر ملکی نظریات کے سامنے جھکتا چلا جا رہا ہے۔ میں یہ سب دیکھتا تھا اور اندر ہی اندر غم و غصّے سے سُلگتا تھا۔

فروری ۱۹۵۳ء میں مصدق نے مجھے مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لئے ملک کے باہر چلا جاؤں۔ میں نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ وہ جن مقاصد کو پورا کرنا چاہتا ہے ان پر آزادی سے عمل کر سکے اور میں اس کے مکر و فریب سے دُور رہوں اس لئے میں نے اس کی اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ یہ ساری بات راز ہی میں رہے اور یہ طے پایا کہ وہ فاطمی کو جو اس وقت وزیرِ خارجہ تھا شخصاً یہ حکم دے گا کہ میرا، میری ملکہ اور دیگر رشتے داروں کے پاسپورٹ اور تمام ضروری کاغذات جلد تیار کر دے۔

سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ مصدق نے اپنے مخصوص درشت لہجے میں مجھے مشورہ دیا کہ میں ہوائی جہاز سے سفر نہ کروں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا تو وہ مجھے اس ارادے سے باز رکھیں گے اور ایک جمِ غفیر ہوائی اڈّے پر جمع ہو جائے گا اور میرا ہوائی جہاز پرواز نہ کر سکے گا۔

اگرچہ اس نے یہ تجویز میرے سامنے رکھی کہ میں عراق اور بیروت کا سفر اس طرح کروں کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ میں نے اس کی یہ بات بھی مان لی۔ لیکن یہ راز فاش ہو گیا چنانچہ لوگ کثیر تعداد میں جمع ہونے لگے اور جگہ جگہ مظاہرے کر کے اپنی شاہ دوستی اور وفاداری کا ثبوت دینے لگے۔ ان کے عزم و ارادے اتنے مضبوط اور دلیلیں اس قدر محکم

تھیں کہ ان کے آگے مجھے جھکنا پڑا اور وقتی طور پر ترکِ وطن کا خیال چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کے بعد ٹوڈی پارٹی نے مصدّق کے ساتھیوں سے مل کر شہنشاہیت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کیا۔ چنانچہ ایرانی قوم جو اپنی ذہانت میں بے مثال ہے وہ میری ذات اور سلطنت کی سب سے بڑی شخصیت (جس کا مظہر میں ہوں) کے تحفظ کے لئے متحد و متفق ہوگئی۔

اب جب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ایران سے باہر جانے میں میں نے عجلت کی اور یہ قدم اٹھا کر سخت غلطی کی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ سفر میرے حق میں نہایت مفید ثابت ہوا۔

۱۹۵۳ء کے درمیانی عرصے میں ایرانی قوم کے فکر و نظر میں ایک نمایاں تبدیلی آئی اور پوری قوم مصدّق سے بددِل ہوگئی۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ لوگ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ مصدّق نے جو غیر ملکیوں کے خلاف رویہ اختیار کیا ہے اس میں جانب داری آگئی ہے اور اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انگریزوں کو باہر نکال کر ان کی جگہ کمیونسٹوں کو لے آئے۔ جو واقعات سامنے آرہے تھے انہوں نے اچھی طرح یہ بات واضح کر دی تھی کہ ملک بڑی تیزی سے سیاسی اور اقتصادی تباہی کی طرف جارہا ہے۔ مصدّق کا پارلیمنٹ کو ختم کر دینے کا ارادہ بھی عوام کے خیالات کو نہ دبا سکا۔ اخباروں کے مدیر مصدّق کے پالے ہوئے غنڈوں اور ٹوڈی پارٹی کے لوگوں سے قطعی خوف زدہ نہ ہوئے اور انہوں نے مصدّق کے ارادوں کو بالکل بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

بہت سے علمائے دین، یونیورسٹی کے طالب علم اور تاجر جو کبھی مصدّق کی حمایت کرتے تھے اب اس سے نفرت کرنے لگے اور اس کی مخالفت پر اتر آئے۔ لیکن یہ بات بھی مسلّم تھی کہ اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے طاقت اور مل کر قدم بڑھانے کی ضرورت تھی۔

جب تک مصدّق کا دور رہا امریکہ کو ایران کے حالات سے سخت تشویش رہی جو روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ اور امریکی حکومت کی پالیسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کے سیاست دانوں کو ایران میں اقتصادی ترقی اور سیاسی استحکام غیر یقینی امور معلوم دیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے مالی سال میں (یکم جولائی ۱۹۵۰ء سے ۳۰ جون ۱۹۵۱ء تک) نکتۂ چہارم کے تحت امریکہ نے صرف پانچ لاکھ ڈالر کی مختصر سی رقم تکنیکی امداد کے لئے دی۔ ۱۹۵۱ء کے مالی سال میں یہ رقم بڑھا کر سولہ لاکھ ڈالر کر دی گئی۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب مصدّق نے عنانِ اقتدار سنبھالی تو یہی رقم دو کروڑ چونتیس لاکھ ڈالر تک پہنچ گئی تاکہ تیل کے کارخانے بند ہوجانے کی وجہ سے جو ایران کو غیر ملکی زرِ مبادلہ میں نقصان ہوا ہے اس کی تلافی اس رقم سے کی جاسکے۔

جون ۱۹۵۳ء میں آئزن ہاور نے مصدّق کو آگاہ کر دیا کہ جب تک تیل کا مسئلہ حل نہ ہوگا ریاستہائے متحدہ امریکہ ایران کی مدد کے لئے رقم میں توسیع نہ کرے گی۔ البتّہ وہ رقم جو پچھلے سال دی گئی تھی بحال رہے گی۔

آئزن ہاور نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ ایران اپنے قدرتی ذخائر کو استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اُٹھانے میں کوتاہی نہ کرے۔ ۱۹۵۳ء کے مالی سال میں ایران کی امدادی رقم قدرے کم کردی گئی اور اس کو صرف دو کروڑ اکیس لاکھ ڈالر دئے گئے۔ امریکہ کے رویّے سے اندازہ ہوتا تھا کہ مصدق کی غلطیوں کی وجہ سے جو نقصان ایران کو ہو رہا ہے اس کو پورا کرنے کے لئے اس کو چنداں دلچسپی نہیں ہے لیکن پورے طور پر امدادیوں بھی بند نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایران کمیونسٹوں کے حلقے میں شامل ہو جائے۔

امریکہ کے امدادی پروگرام کے ساتھ جو رویّہ مصدق نے اختیار کیا وہ نہایت مضحکہ خیز تھا۔ کیونکہ اس کو غیر ملکیوں سے بغض تھا اس لئے وہ ۱۹۵۱ء میں اس بات کے لئے راضی نہ ہوا کہ دوسرے ممالک کے سربراہوں کی طرح امریکی سفیر کے ساتھ تکنیکی امداد کے عہد نامے پر دستخط کرے۔ اس کی بجائے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ایران میں امریکی امداد کے لئے جو شخص ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تھا اس کو خط لکھا اور اس سے درخواست کی ایران کو جو سالانہ تکنیکی امداد ملتی ہے اس کو برقرار رکھا جائے۔ ڈائرکٹر نے بھی تحریری جواب دیا اور اپنے خط میں لکھا تکنیکی امداد شرائط کے مطابق بحال کردی گئی ہے۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں جب اس کے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تو وہ لاف زنی پر اُتر آیا اور بار بار یہ دہراتا کہ اس کو امریکہ کی حمایت حاصل ہے اور امریکی حکومت کو یہ کہہ کر ڈراتا رہتا کہ اگر زیادہ سے زیادہ مدد نہ کی گئی تو ایران کمیونسٹوں کے حلقۂ اثر میں آجائے گا۔ دوسری طرف اس کا رویّہ ٹوڈی پارٹی کے ساتھ کافی نرم تھا۔ اور اس کی حمایت کی وجہ سے وہ روز بروز طاقت پکڑتے جا رہے تھے۔ میرے خیال میں امریکہ کے ذمّہ دار لوگ مصدق کی اس متضاد پالیسی سے بے خبر نہ تھے لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ زیادہ اچھا ہو کہ ایرانی خود ہی اپنے اندرونی سیاسی معاملات کا کوئی حل نکالیں۔ چنانچہ ہم نے بھی آخر کار یہی راستہ اختیار کیا۔

مصدق کی ایک کوٹھی تہران میں بھی تھی۔ اپنی حکومت کے آخری دنوں میں اس نے زِرہ بکتر پوش فوج اور مسلح سپاہیوں کی تعداد اپنی رہائش گاہ کی حفاظت کی غرض سے بڑھا دی اور اسی کے ساتھ اس نے سعد آباد محل کے (جہاں میں ملکہ ثریا کے ساتھ گرمیوں میں رہتا تھا) حفاظتی ٹینکوں کی تعداد کم کردی۔ اس کے مکان کی حفاظت بارہ امریکہ کے درمیانی ساخت کے ٹینک کرتے تھے اور سعد آباد کے وسیع محل کے لئے صرف چار رہ گئے تھے۔ جو ٹوڈی پارٹی کے اچانک حملے کو روکنے کے لئے قطعی ناکافی تھے۔

اس صورت حال کے پیشِ نظر میں اپنی ملکہ کے ساتھ رامسر چلا گیا اور کچھ عرصے اس محل میں مقیم رہا جو میرے والد نے بحرِ خزر کے کنارے بنوایا تھا۔ اس کے بعد میں کلاردشت والی کوٹھی میں منتقل ہو گیا (کلاردشت کی خوب صورتی اور وہاں کے حسین مناظر کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں)

۱۳۔ اگست ۱۹۵۳ء کو میں نے ایک فرمان پر دستخط کئے جس کی رُو سے مصدق کو وزیرِ اعظم کے عہدے سے

معزول کر کے جنرل زاہدی کو اس کی جگہ مقرر کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ بہت نازک مسئلہ تھا لیکن میں نے اس کو شاہی محافظ دستے کے کمانڈر کرنل نعمت اللہ نصیری کے سپرد کیا۔ اس نے اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیا اور تمام واقعات بعد میں مجھے تفصیل بتائی۔ نعمت اللہ نصیری نے جو واقعات مجھے سنائے اس سے الگزانڈر ڈوما کی کتاب تھری مسکیٹر[1] کی یاد تازہ ہوگئی۔ لیکن دونوں کے واقعات میں ذرا فرق ہے۔ وہ محض ایک داستان ہے اور کرنل نصیری کے ساتھ جو کچھ گذری وہ ہمارے عہدِ حاضر کی تاریخی حقیقت ہے۔

کرنل نصیری نے رامسر سے سعد آباد محل پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جنرل زاہدی کو میرا فرمان پہنچایا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ زاہدی کے مصدق سے بہت ہی قریبی تعلقات تھے اور اس کے دور میں وہ کچھ عرصے تک وزیر داخلہ بھی رہا تھا۔ رزم آرا کے ابتدائی عہد میں وہ انسپکٹر جنرل پولیس تھا اور پارلیمنٹ کے انتخابات میں اس نے مصدق کو دوسری بار کامیاب کرانے کی بھی کوشش کی تھی۔ ان دنوں زاہدی تہران کے آس پاس ہی تھا۔ اور چونکہ ہر روز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا تھا اس لئے اس کے چند نزدیکی دوستوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ چونکہ وہ مصدق پر کڑی نکتہ چینی کیا کرتا تھا اس لئے اس کو ایک بار جیل بھی جانا پڑا اور وہاں سے رہائی کے بعد اس کو پارلیمنٹ کی عمارت میں بھی پناہ لینی پڑی جہاں سے نکل کر وہ گرفتاری اور جان کے خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا۔

کرنل نصیری نے مختلف ذرائع سے جنرل زاہدی تک رسائی حاصل کی اور میرا فرمان پیش کیا۔ اور وہ فوراً ہی اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے تیّار ہوگیا۔

اب وقت آگیا تھا کہ مصدّق کو اس کی معزولی کا پیغام پہنچا دیا جائے۔ سب سے پہلے جنرل زاہدی کے حکم سے کرنل نصیری نے مصدق کے ان تین ساتھیوں کو گرفتار کیا جو اس سے بہت ہی قریب تھے تاکہ ان سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ آئندہ مصدّق کا کیا ارادہ ہے۔

زاہدی کی کرنل نصیری کو یہ ہدایت تھی کہ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ وہ خود مصدّق کو اس کی معزولی کا پیغام پہنچائے اور اس کی رسید حاصل کرلے تاکہ وہ اس کی وصولیابی سے انکار نہ کر سکے اور میں نے بھی نصیری کو یہ تاکید کر دی تھی کہ مصدّق کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے۔

۱۸۔ اگست ۱۹۵۳ء کی رات کو گیارہ بجے کے قریب کرنل نصیری اپنے ساتھ دو افسروں کو لے کر سعد آباد محل سے مصدّق کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ اس روز کمیونسٹ اخباروں نے اپنے مقالات کے عنوان موٹے موٹے الفاظ میں یہ لکھے تھے کہ ممکن ہے کہ آج کرنل نصیری قومی انقلاب بپا کرے اور اسی وجہ سے یہ تینوں افسر بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔

1. THREE MUSKEETERS BY ALEXANDER DUMA

مصدق کی کوٹھی کے نزدیک پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ پوری کوٹھی کو سپاہیوں اور ٹینکوں نے گھیر رکھا ہے اور ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو اور خاص طور پر شاہی محافظ دستے کے لوگوں کو کوٹھی میں داخل نہ ہونے دیا جائے کرنل نصیری اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور توپوں کے دہانوں کے سامنے گذرتے ہوئے کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گئے۔ کرنل نصیری نے یہ اندازہ ٹھیک لگایا تھا کہ پہرے دار اور ٹینکوں پر بیٹھے ہوئے سپاہی اس کو خوب پہچانتے ہیں اور اس کے عہدے کا احترام کرتے ہیں اس لئے کسی کو گولی چلانے کی ہمت نہ ہوگی۔ مصدق کی کوٹھی پر جو افسر اس وقت ڈیوٹی پر تھا اس کے ذریعے کرنل نصیری نے مصدق سے ملاقات کی درخواست کی لیکن یہ درخواست قبول نہ ہوئی۔ مصدق کے مقرر کردہ افسروں میں ایک شخص جو کچھ حد تک قابل اطمینان تھا اس سے وعدہ لیا گیا کہ وہ یہ پیغام مصدق تک پہنچا کر رسید لے آئے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ شخص رسید لے کر واپس آیا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ رسید لانے میں اتنا وقت اس لئے صرف ہوا تھا کہ مصدق نے اپنے ساتھیوں سے ٹیلیفون پر مشورہ کیا تھا کہ اب کیا راہ اختیار کی جائے) مصدق نے رسید اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی اور چونکہ کرنل نصیری مصدق کے خط کو پہچانتا تھا اس لئے یہ اطمینان کر کے کہ رسید جعلی نہیں ہے رات کے ڈیڑھ بجے وہ وہاں سے واپس آیا۔

مصدق کی فوج کا افسرِ اعلیٰ جنرل ریاحی تھا۔ اس سے پہلے کہ کرنل نصیری مصدق کی کوٹھی سے باہر نکلے اس کو یہ اطلاع دی گئی کہ جنرل ریاحی کا حکم ہے کہ اس کو فوجی دفتر میں حاضر کریں۔

کرنل نصیری نے اپنی جگہ یہ سوچا کہ اس وقت جنرل ریاحی سے ملاقات کا ایک موقع ملا ہے اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ اس کو بھی مصدق کے وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف کر دینے کی خبر پہنچا دے۔ چنانچہ وہ فوراً وزارتِ جنگ کی طرف چلنے کو تیار ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں وہ جنرل ریاحی کے دفتر میں تھا۔ کمرے کا دروازہ جیسے ہی کھلا کرنل نصیری نے جنرل ریاحی کو دراز سے پستول نکالتے ہوئے دیکھا جس کو اس نے اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا۔

جنرل ریاحی نے کرنل نصیری پر یہ اتہام لگایا کہ اس نے فوجی انقلاب کا نقشہ تیار کر کے نہایت بربریت کا ثبوت دیا ہے۔ نصیری نے کہا کہ میں نے تو صرف شاہ کا پیغام مصدق تک پہنچایا ہے۔ فوجی انقلاب کا تو یہاں کوئی ذکر نہیں اور یہ کہہ کر مصدق سے جو رسید اس نے وصول کی تھی جنرل کو دکھا دی۔ ریاحی نے پوچھا آخر یہ کہاں کا قانون ہے کہ فرمان آدھی رات کو پہنچایا جائے۔ نصیری نے اس پر جواب دیا اور یہ کون سا فوجی اصول ہے کہ رات ڈھلنے کے بعد گفتگو کے لئے کسی شخص کو بلایا جائے۔ ریاحی نے کہا کہ نصیری میں تمہیں اس گستاخی کی سزا دیئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ نصیری کی وردی اتار لی جائے اور اس کو جیل میں رکھا جائے۔

جس وقت نصیری کے بھائی کو اس کی گرفتاری کا علم ہوا تو اس نے رات کے سونے کے کپڑے اور دوسری ضروری چیزیں نہایت ہوشیاری سے اس اخبار میں لپیٹ کر جس میں میرا مصدق کو برطرف کرنے کا فرمان چھپا تھا پہنچا دیں۔

اگلی صبح فوجی عدالت کے جج نے جس کو مصدق نے ہی اس عہدے پر مقرر کیا تھا کرنل نصیری سے تحقیقات شروع کی اور یہ جرم عائد کیا کہ یہ فرمان جعلی ہے اور شاہ کی طرف سے جاری نہیں کیا گیا بلکہ اس نے خود فوجی انقلاب لانے کی غرض سے یہ چال چلی ہے۔ نصیری نے وہ اخبار جو اس کے بھائی نے اس تک پہنچایا تھا عدالت کے سامنے پیش کر دیا چنانچہ تفتیش یہیں پر ختم ہوگئی اور اس کو دوبارہ جیل بھیج دیا گیا۔

جیل میں نصیری کے ساتھ جو شخص تھا اس نے بڑی چالاکی سے باہر سے اپنے استعمال کے لئے ریڈیو منگا لیا تھا۔ اگلے روز اس ریڈیو کے ذریعے کرنل نصیری کو معلوم ہوا کہ شہر میں تو انقلاب بپا ہے اور لوگوں نے مصدق کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ باہر سے لوگوں کی چیخ و پکار اور بندوقوں کے چلنے کی آوازوں نے اس خبر کی تصدیق بھی کر دی۔ تھوڑی دیر بعد جیل کا کمانڈر آیا اور نصیری کو وردی پہننے کا حکم دیا اور کہا کہ یہاں سے چلنے کے لئے تیار رہے۔ یہ حکم جیل کی عمارت کو خالی کر دینے کی غرض سے دیا گیا تھا۔

جس وقت کرنل نصیری اس کوٹھری سے باہر نکلا جس میں اس کو قید کیا گیا تھا تو اس کو معلوم ہوا کہ لوگ لاٹھیاں لے کر جیل پر حملہ کرنے کے لئے آگئے ہیں۔ اگرچہ جیل کے پہرے داروں نے انکو روکنا چاہا لیکن ہجوم آگے بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ پہریداروں نے انکو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک بوڑھی عورت اور بہت سے نوجوانوں کی لاشیں خون میں تڑپ رہی تھیں۔ جو لوگ زخمی ہوئے تھے ان کی تعداد الگ ہے لیکن ان گولیوں کے ڈر سے لوگ ہمت نہ ہارے اور آگے بڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ پہرے کے سپاہی جیل چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے اور جیل پر لوگوں کا قبضہ ہوگیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے جیل کا احاطہ لوگوں کے لئے تفریح گاہ بن گیا۔ سیکڑوں لوگ جو مجھ پر جان نثار کرتے تھے اور مصدق کے ہاتھوں قید ہوئے تھے اب پھر آزاد کئے جا رہے تھے۔ جس شخص کو میں نے فوج کا جنرل مقرر کیا تھا اور مصدق نے اسکو قید میں ڈلوا دیا تھا جب اپنی کوٹھری سے نکل کر باہر آیا تو لوگوں نے مارے جوش کے اس کو کندھوں پر اٹھا لیا اور پورے جوش و ولولے کے ساتھ اس کو فوجی دفتر لے گئے۔

اس جوش و خروش سے نہ صرف لوگوں نے یہ ظاہر کیا کہ ان کی ہمدردی اور وفاداری میرے ساتھ ہے بلکہ ان کی خوشی اور مسرت کا سبب یہ بھی تھا کہ ان کو مصدق کی دہشت پسندیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ریاحی جس کو مصدق نے جنرل مقرر کیا تھا فرار ہو چکا تھا۔ کرنل نصیری نے فوجی افسروں اور دوسرے ساتھیوں کو جو مصدق کی قید سے رہا ہوئے تھے اپنے ہمراہ لیا اور یہ سب لوگ مشرقی تہران کی طرف جہاں فوجی چھاؤنی ہے روانہ ہوگئے

تاکہ شاہی محافظ دستے کے افسروں کو جو ابھی تک قید میں تھے آزاد کرا سکیں۔ جن راستوں سے کرنل نصیری اور اس کے ساتھی گذرے وہاں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ یہ لوگ مصدق کی لگائی ہوئی پابندیوں سے آزاد اور بے پروا خوشیوں سے سرشار اور جوش و خروش سے لبریز جھوم رہے تھے۔ اس روز سخت گرمی تھی۔ اس لئے عورتوں نے گھر کے دروازے کھول دئے تھے اور انقلابیوں کو کھانے کا سامان اور پینے کے لئے ٹھنڈی چیزیں پیش کر رہی تھیں۔

اسی روز صبح کے وقت ملٹری کالج میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل میجر خسرو داد نے بتائی تھی کیونکہ ان دنوں وہ وہاں معلم کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور فوج میں اس کا عہدہ فرسٹ لیفٹیننٹ کا تھا (اب وہ شاہی محافظ دستے میں کرنل نصیری کا نائب[1] ہے) اس نے یہ تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ حسب معمول وہ اس روز بھی کلاس لینے کی غرض سے کالج گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ جنرل ریاحی کا یہ حکم آیا ہے کہ تمام استاد، طالب علم اور دوسرے افسر جو شہر کے مختلف حصوں میں تعینات ہیں ٹھیک دس بجے شاہ اور موجودہ حالات سے متعلق اس کی تقریر سننے کے لئے کالج کے ہال میں جمع ہو جائیں۔ یہ اعلان سن کر استاد اور طالب علم سب ہی پریشان ہو گئے۔ ان میں نوّے فیصدی لوگ ایسے تھے جو مصدق کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ان سب نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ریاحی نے اپنی تقریر میں شاہ کی توہین کی تو اس کو وہیں جان سے مار دیں گے۔ کیونکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فوج اسی وقت اپنے فرض کو ٹھیک طرح سے انجام دے سکتی ہے جب کہ وہ سیاست دانوں کی رخنہ اندازیوں سے بالکل پاک ہو اور شاہ کے حکم پر عمل کرے۔

یہ ریاحی کی خوش قسمتی تھی کہ جو واقعات شہر میں رونما ہو رہے تھے ان کے متعلق اور جو فیصلہ طالب علموں نے کیا تھا اس کے بارے میں اس کو علم ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کالج میں نہیں آیا۔ اس کی غیر حاضری کی وجہ سے لوگوں کو مایوسی ہوئی اور کالج میں چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔

لیفٹیننٹ خسرو داد کالج سے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں جب وہ سڑک پار کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ شہر کے ایک بڑے چوراہے پر لوگ چاروں طرف سے جوق در جوق آ رہے ہیں اور مصدق کی مسلح فوجیں مشین گنوں سے ان پر گولیاں برسا رہی ہیں۔ اگرچہ ان میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے جن کے پاس اپنے بچاؤ کے لئے ہتھیار نہ تھے لیکن ان کو گولیوں کی بوچھاڑ کی بالکل پروا نہ تھی اور وہ برابر آگے بڑھ رہے تھے اور اپنے سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے۔ لیفٹیننٹ خسرو داد نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراً ٹیکسی لی اور گھر سے پستول لانے کے لئے روانہ ہوا۔ جب واپس آیا تو دیکھا کہ ٹینکوں کی پوری بٹالین راستہ روکے کھڑی ہے۔ بٹالین کی ایک کمپنی کا کمانڈر خسرو داد کا دوست تھا۔ وہ مصدق سے ناراض ہو کر اس کے مخالفوں میں شامل ہو گیا تھا۔ دوسری کمپنی کی کمانڈ جس شخص کے ہاتھ میں تھی وہ مصدق کے ساتھیوں میں سے تھا۔ چنانچہ یہ دونوں اپنے ٹینکوں سے نیچے اتر کر بحث و مباحثہ میں الجھے ہوئے تھے۔

1. ADJUTANT

خسرو داد کا دوست یہ چاہتا تھا کہ مصدق کے ٹینکوں پر حملہ کیا جائے لیکن کمانڈنگ افسر کا یہ اصرار تھا کہ ٹینکوں کو واپس چھاؤنی لے جایا جائے۔ دونوں میں اختلاف حد سے زیادہ بڑھ گیا اور کمانڈر نے اپنا پستول نکال لیا اور اپنے ماتحت کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ اس عرصے میں لوگ وہاں جمع ہو گئے اور کمانڈر سے پستول چھین لیا۔ اب کمانڈنگ افسر کے لئے بجز فرار کوئی چارہ نہ تھا اور اس کے بعد ٹینکوں کے دستے نے مصدق کی فوج پر حملہ شروع کر دیا۔

اب لڑائی مصدق کی کوٹھی کے چاروں طرف شروع ہو چکی تھی۔ اس نے پہلے ہی سے اپنی حفاظت کے لئے ٹینک، پیادہ و مسلح فوج، توپیں اور ٹینک شکن بندوقیں جمع کر رکھی تھیں۔ اس کی کوٹھی کے چاروں طرف جو بھی مکانات تھے ان پر مصدق کی فوج کا قبضہ تھا جہاں سے اس کے سپاہی نہتے لوگوں پر کھڑکیوں میں سے گولیاں برسا رہے تھے۔ جن لوگوں نے مصدق کی کوٹھی کو گھیر رکھا تھا ان میں طالب علم، دست کار، مزدور، دوکاندار، سپاہی اور فوجی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگ اس محاصرے میں شریک تھے۔

جو لوگ فوجی وردی میں وہاں موجود تھے انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر گرفتار ہوئے تو ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا اور بعد میں گولی مار دی جائے گی مصدق کے مقرر کردہ افسروں کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا۔ ان میں زیادہ تر فوجی ایسے تھے جن کے پاس عام شہریوں کی طرح سوائے لاٹھیوں اور پتھروں کے کچھ نہ تھا۔ اس بغاوت میں ان کے ساتھ کچھ عورتیں اور بچے بھی شریک تھے۔ مصدق کی فوج تو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ شاہی محافظ دستے کے سب ہی لوگوں سے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں اور اس وقت سب ہی قید میں ہیں لیکن تعجب ہے کہ وہ نہ جانے کس طرح ایک دستے کو بھول گئے۔ اس دستے نے جیسے ہی مصدق کے برطرف کئے جانے کی خبر سنی عوام کے ساتھ مل گیا اور مصدق کے خلاف عام بغاوت میں شریک ہو گیا۔ اگرچہ اس کے پاس بہت ہی معمولی اور ہلکے ہتھیار تھے لیکن اس نے مصدق کی کوٹھی پر جو چاروں طرف سے ٹینکوں سے گھری ہوئی تھی حملہ کر دیا۔ شاہی محافظ دستے کے دوسرے افراد جن کو کرنل نصیری نے قید سے آزاد کرا لیا تھا جیل سے نکل کر سیدھے مصدق کی کوٹھی کی طرف لڑنے والوں کی مدد کے لئے روانہ ہوئے اور دستی بم مار مار کر وہ بُرا حال کیا کہ سپاہیوں کو مجبوراً اپنے ٹینکوں کے دریچے بند کرنے پڑے۔ دستی بموں کا حملہ نہ صرف ایک بہادرانہ اقدام تھا بلکہ بہت مناسب وقت پر کیا گیا تھا کیونکہ مصدق کی کوٹھی کے پیچھے ذرا فاصلے پر جو لڑائی ہو رہی تھی اس میں یہ ٹینک کسی طرح کی مداخلت نہ کر سکے مصدق کی کوٹھی کے سامنے جو سڑک تھی اس پر تمام ٹینک اور ٹینک شکن ہتھیار جمع کر دئے گئے تھے۔ کوٹھی کے پیچھے والی سڑک پر اور اس گلی میں جو مصدق کی کوٹھی کو دوسرے مکانوں سے الگ کرتی تھی پیادہ فوج کا پہرہ تھا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ مشرقی جانب کی سڑک پر پیادہ فوج ہے تو لوگوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ اس مجمع میں ایک عورت ایسی بھی تھی جو لوگوں کے جذبات میں مصدق کے خلاف حملے کے لئے جوش و خروش پیدا کر رہی تھی۔

اگرچہ اس لڑائی میں کافی لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے لیکن حملہ کرنے سے باز نہ آئے یہاں تک کہ مصدق کی پیادہ فوج جو اس کی کوٹھی کی حفاظت کر رہی تھی ہمت ہار گئی۔

اسی اثنا میں اُس گلی میں ایک ٹینک بھی گھس آیا۔ اس کی ایک ہی ضرب ایسی کاری لگی کہ مصدق کی فوج کا صفایا ہو گیا۔ اس ٹینک کا کمانڈر ایک نان کمیشن[1] افسر تھا جو کبھی مصدق کے حامیوں میں سے تھا لیکن جب اس نے دوسرے ہزاروں قوم کے افراد کی طرح یہ محسوس کیا کہ مصدق کیونزم کی طرف جھک رہا ہے اور چاہتا ہے کہ حکومت کا تختہ پلٹ دے تو اس نے مصدق کا ساتھ چھوڑ دیا اور جس ٹینک پر خود سوار تھا اس کو لے کر وہ گلی میں گھس آیا اور مشین گن و بندوق سے گولیاں برساتا ہوا مصدق کی کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا۔ مصدق کا حفاظتی دستہ اپنے ٹینک یا ٹینک شکن ہتھیار اس کے خلاف استعمال نہ کر سکا۔ مصدق کی کوٹھی کو نشانہ بنانے میں اب اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی چنانچہ توپ کے ایک ہی گولے نے اس لڑائی کا فیصلہ بھی کر دیا۔ آدھی کوٹھی فوراً ہی خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی اور مصدق باغ کی دیوار پھلانگ کر بھاگا لیکن اڑتالیس گھنٹے کے اندر ہی گرفتار کر لیا گیا۔

جنرل زاہدی کا یہ پلان تھا کہ اصفہان جا کر وہاں کی فوج کو تہران کی طرف بڑھنے کے لئے آمادہ کرے۔ کرمانشاہ علاقے کی فوج بھی میری طرف دار تھی۔ اس لئے اس نے یہ بھی منصوبہ بنا لیا تھا کہ وہاں کی فوج کو بھی تہران کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے۔ لیکن عام شہریوں نے سب سے پہلے رشت میں اور اس کے بعد تمام شہروں میں میری طرف داری کا اعلان کر دیا۔ اب زاہدی کو صرف تہران میں حالات کا مقابلہ کرنا تھا چنانچہ پوری توجہ سے اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جس مکان میں وہ چھپا ہوا تھا وہاں انقلابیوں نے ایک ٹینک بھیج دیا۔ وہ اس ٹینک پر سوار ہو کر تہران کے ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا جہاں لوگ پہلے سے ہی اس پر قبضہ کر چکے تھے مصدق کے آدمیوں نے بھاگنے سے پہلے ریڈیو اسٹیشن کے بعض حصوں کو بے کار کر دیا تھا لیکن ان کو فوراً ہی ٹھیک کر لیا گیا جہاں سے نئے وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں عوام کے تاریخی انقلاب کی کامیابی کا اعلان کیا۔

اس سے پہلے کہ انقلاب کی کامیابی کی خبر ملے میں اور ملکہ، تہران سے باہر جا چکے تھے۔ ہماری روانگی ایک سوچی سمجھی تجویز کے تحت عمل میں آئی تھی۔ کیونکہ یہ بھی ایک احتمال تھا کہ مصدق اپنے برطرف کئے جانے کے فرمان کی اطاعت نہ کرے اور فوج سے مدد طلب کرے اسی لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ میں تھوڑی مدت کے لئے ملکہ کو ساتھ لے کر ایران سے باہر چلا جاؤں۔

اس تجویز کو میں نے دو وجہ سے منظور کیا تھا۔ اوّل تو یہ کہ میں جانتا تھا کہ میرے باہر چلے جانے سے مصدق اور اس کے ساتھیوں کی قلعی کھل جائے گی اور رائے عامہ ان کے خلاف ہو جائے گی اور اس کی حیثیت خود اپنی جگہ رائے شماری کی ہو گی جو مصدق کی رائے شماری کے بالکل برعکس ہو گی کیونکہ مُردے اس میں شرکت نہ کر سکیں گے۔

1. NON-COMMISSIONED

دوسرے یہ کہ منظرِ عام سے ہٹ جانے سے مجھے امید تھی کہ داخلی جنگ کا خطرہ ٹل جائے گا اور بے گناہ لوگ کشت و خون سے بچ جائیں گے۔ اس تجویز پر عمل درآمد کرنے کے لئے میں نے سعد آباد محل اور رامسر کے شاہی محل کے درمیان ریڈیو کے ذریعے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ جس وقت کرنل نصیری کو گرفتار کیا گیا تو اس کا ڈرائیور سعد آباد محل اس کا پیغام لے کر پہنچا اور وہاں سے یہ پیغام میرے پاس کلاردشت (رامسر) بھیج دیا گیا۔ لیکن یہ وجہ معلوم نہ ہو سکی کہ یہ پیغام میرے پاس دیر سے کیوں پہنچا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ میں مسلسل دو رات برابر جاگتا رہا۔ علی الصبح جب میں نے تہران ریڈیو سنا جس پر مصدق کے ساتھیوں کا قبضہ تھا تو یہ خبر نشر کی گئی کہ مصدق کو برطرف کئے جانے کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد کرنل نصیری نے ٹرانسمیٹر کے ذریعے یہ خبر بھیجی کہ مصدق کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

کلاردشت کا ہوائی اڈہ بہت چھوٹا ہے۔ اس کو ایک انجن والے جہاز کے لئے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں یہاں سے ملکہ ثریا کو ساتھ لے کر رامسر روانہ ہوا اور بیس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ یہاں میرا ذاتی دو انجن والا جہاز تیار تھا۔ میں نے خود ہی اس کو اڑایا اور بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔ اگرچہ عراقی حکام کو میرے اچانک وہاں پہنچنے پر تعجب تو ہوا لیکن انہوں نے بڑی گرم جوشی سے دوستانہ انداز میں میرا استقبال کیا۔ البتہ ایرانی سفیر جو بغداد میں مقیم تھا اس نے مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی لیکن چند روز بعد جب میں واپس تہران جا رہا تھا تو بغداد کے ہوائی اڈے پر وہ ہی سب سے پہلا شخص تھا جو مجھے خوش آمدید کہنے آیا۔

ہم نے دو روز بغداد میں قیام کیا اور اس کے بعد روم کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہاں کے ایرانی سفارت خانے میں میری ذاتی کار موجود تھی لیکن نائب وزیر[1] اس بات کے لئے رضامند نہ ہوا کہ اس کی کنجی میرے حوالے کر دے۔ البتہ ایک قابلِ اعتماد پرانے ملازم نے چپکے سے کنجی مجھے دے دی۔

روم میں بھی ہمارا قیام کچھ زیادہ دن نہ رہا۔ زاہدی کے زمامِ اختیار سنبھالنے کے تیسرے روز ہی ۲۲-اگست ۱۹۵۳ء کو میں دوبارہ اپنے وطن واپس آ گیا۔ یہاں ہر طبقے کے افراد نے میرا پُرجوش استقبال کیا۔ اس روز لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا اور جب میں نے اس جوش و ولولے کا مقابلہ ان کھوکھلے نعروں سے کیا جو مصدق کے حکم سے تُوڈی پارٹی کے لوگ لگاتے تھے تو میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بلکہ اس نے میرے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑا۔

جب مصدق اور اس کے ان تمام ساتھیوں پر جو بغاوت کے جرم میں ماخوذ تھے، مقدمہ چلایا گیا تو اس کے عہد کے ایسے گھناؤنے اعمال اور مشکوک واقعات سامنے آئے جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جس وقت مصدق کو وزیرِ جنگ مقرر کیا گیا تھا اس وقت فوج میں ستّر افسر ایسے تھے جن کا تعلق تُوڈی پارٹی سے تھا لیکن جن دنوں وہ وزیرِ اعظم کے عہدے سے برطرف ہوا اس سے ایک سال قبل فوج میں تُوڈی پارٹی کے ممبروں کی تعداد چھ سو سے زائد ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ شاہی محافظ دستے کا کمانڈر جس پر مجھے پورا پورا اعتماد تھا وہ بھی کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم

1. Charge d'affairs

کارکن نکلا۔

مصدق کے ساتھیوں نے مقدمے کے دوران اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کا یہ سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ جب مصدق، پہلوی حکومت کا تختہ اُلٹ دے گا تو اس کو فوجی انقلاب کے ذریعے قتل کرا کر دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی کمیونسٹ حکومت قائم کریں گے لیکن عوام نے میرے ہاتھ مضبوط کرنے کی نیت سے ٹوڈی پارٹی کے ارادوں کو ناکام بنا دیا اور جب عام لوگوں نے ٹوڈی بچوں کا مقابلہ کیا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جو لوگ مصدق کا دم بھرتے تھے (اگرچہ بعض وجوہات کی بنا پر اس نے ان لوگوں کو زیادہ قریب نہیں آنے دیا تھا) انہوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور رُوپوش ہو گئے۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ قوم کی سخت مخالفت ہی مصدق کو موت سے نجات دلانے کا سبب بنی۔

مصدق اور اس کے ساتھیوں نے جو تخریبی کارروائیاں کی تھیں نہ صرف ان کے دستاویزی ثبوت عدالت کے سامنے پیش کئے گئے بلکہ اور بھی گہری تفتیش و تحقیق عمل میں لائی گئی جس کے نتیجے میں کئی ذخیرے ہتھیاروں اور جنگی سامان کے برآمد ہوئے جن کو کمیونسٹوں نے حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی غرض سے جمع کیا تھا۔ ان ذخیروں کی تصاویر اور دیگر تفصیلات ایران اور بیرونی ممالک کے اخبارات نے چھاپ کر کمیونسٹوں کی ناپاک سازش کو بے نقاب کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی معلومات ہمیں حاصل ہوئیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ٹوڈی پارٹی کے ممبر چاہتے تھے کہ ہمارے قوم پرستی کے دھارے کو موڑ کر اپنے مفاد کے لئے غلط راستے پر ڈال دیں اور یہ سب تخریبی کارروائیاں بیرونی طاقتوں کے اشارے پر اس ملک میں کی جا رہی تھیں۔

حسین فاطمی کو مصدق نے وزیر خارجہ مقرر کیا تھا۔ مصدق کے زوال کے بعد وہ بھی روپوش ہو گیا اور سات ماہ تک ٹوڈی پارٹی کے ممبروں کی مدد سے چھپا رہا۔ بالآخر پکڑا گیا۔ گرفتاری کے وقت اگر میں نے اس کی حفاظت کے لئے سخت اقدامات نہ کئے ہوتے تو لوگ اس کو وہیں مار ڈالتے جہاں سے وہ گرفتار ہوا تھا۔ اس شخص پر بعد میں مقدمہ چلایا گیا اور عدالت کے حکم کے مطابق اس کو سزائے موت دی گئی۔ مصدق کی کابینہ کے دوسرے ممبران پر بھی مقدمہ چلایا گیا جن میں سے زیادہ تر سزائے قید کے مستحق ہوئے لیکن اب ان میں سے سب رہا ہو چکے ہیں۔

بعض افسر اور ٹوڈی پارٹی کے ممبر ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے مخالف گروپ کے لوگوں کو بیدردی سے قتل کیا تھا۔ ان میں سے کچھ کو سزائے موت دی گئی اور کچھ کو قید کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے اپنے کئے پر شرمندگی اور پشیمانی ظاہر کی اور سچے دل سے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ وطن اور جمہوری حکومت کے وفادار رہیں گے ان کو میری طرف سے عام معافی دے دی گئی۔ اگرچہ ان لوگوں کو سرکاری ملازمت سے محروم کر دیا گیا ہے لیکن حکومت کوشش کر رہی ہے کہ ان کو زندگی کے دوسرے شعبوں میں کام کرنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو نیم سرکاری انجمنوں

اور اداروں میں کام بھی مل گیا ہے۔

مصدق کے زوال اور ٹوڈی پارٹی کی شکست سے قبل ساری دنیا ایران کے بحرانی حالات کی وجہ سے سخت فکر مند تھی اور اب کبھی کبھی یہ سوال بھی اُٹھتا ہے کہ آیا مصدق کی طاقت کو کچلنے کے لئے امریکہ یا برطانیہ نے مالی مدد دی تھی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ٹوڈی پارٹی کے قیام میں ایک غیر ملکی طاقت کا ہاتھ تھا اور بہت شروع سے ہی یہ پارٹی غیر ملکی چندے کی مدد پر زندہ تھی۔ یہ بات ذہن میں آنا بالکل طبعی امر ہے کہ مصدق اور ٹوڈی پارٹی کے مخالفین کو بھی باہر سے مدد مل رہی ہوگی۔ میرے ملک میں افواہیں بہت جلدی پھیلتی ہیں۔ چنانچہ یہ بات بھی بڑی جلدی پھیل گئی: چونکہ مصدق کی طاقت کو عوام نے کچلا ہے اس لئے ان میں ایک بہت بھاری رقم ڈالر کی صورت میں (اور دوسری افواہ یہ بھی ہے کہ پونڈ کی شکل میں) تقسیم کی گئی تھی۔

جس وقت ملک میں انقلاب بپا ہو رہا تھا اگرچہ میں اُس وقت وطن سے باہر تھا لیکن جو واقعات رُونما ہو رہے تھے ان سے میں پورے طور پر باخبر تھا اور واپس آنے کے بعد بھی جو کچھ ہوا اس کا بھی مجھے علم ہے۔ میں اس بات سے قطعی انکار نہیں کرتا کہ قومی انقلاب پیدا کرنے میں شاید میرے ہم وطنوں نے کچھ رقم بھی خرچ کی ہو لیکن یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی ہے۔

جو کارنمایاں میرے وفادار ہم وطنوں نے قومی انقلاب کو کامیاب بنانے میں انجام دیا ہے وہ کسی زرخرید آدمی سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ مصدق اور ٹوڈی پارٹی کو اُکھاڑ پھینکنے کے لئے جو انقلاب لایا گیا تھا اس میں بجز جذبۂ قوم پرستی کے جو اس سرزمین کی خصوصیت ہے اور کوئی چیز کارفرما نہ تھی۔ یہ ذکر اُوپر آچکا ہے کہ نہتے لوگوں نے مصدق کے ٹینکوں اور مشین گنوں کا کس بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچوں نے بھی وطن کی راہ میں جان دینے سے دریغ نہ کیا۔ میں یہ بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ان لوگوں نے جذبۂ وطن پرستی اس لئے ظاہر کیا ہو کہ ان کو کسی طرف سے اس کا معاوضہ ملنے کی امید تھی۔ میری رائے میں ان لوگوں کے سامنے اعلیٰ مقاصد تھے جن کے حصول کے لئے سینہ سپر ہو کر وہ آگے بڑھ رہے تھے۔

اس کے علاوہ جو لوگ اس سلسلے میں غیر ملکی امداد پر واویلا مچائے ہوئے ہیں اس وقت کیوں خاموش رہتے ہیں اور مخالفت پر نہیں اُترتے جب یہ مدد کمیونسٹ ذرائع سے ملک میں آتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ریاکاری کی باتوں سے ان کا کیا مقصد ہے اور وہ کن لوگوں کو فریب دے کر بے وقوف بنانا چاہتے ہیں۔

جنرل زاہدی نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالتے ہی ملک میں پھیلی ہوئی ابتری اور بدامنی کو درست کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ حکومت اس وقت تک بالکل دیوالیہ ہو چکی تھی۔ لیکن مصدق کے برطرف ہو جانے کے فوراً بعد امریکی امداد مل جانے سے مالی پریشانی کی وجہ سے جو مایوسی تھی وہ دور ہو گئی۔ اور ہمیں یقین ہو گیا کہ امریکی قوم اس بحران میں جس سے ہم دوچار ہیں تنہا

نہ چھوڑے گی۔

اسی سال یعنی ستمبر ۱۹۵۳ء میں صدر آئزن ہاور نے فوری طور پر ہمارے بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کی غرض سے پینتالیس ملین ڈالر کی رقم دے کر ہماری مدد کی (یہ مدد اس سے علیحدہ تھی جو نکتہ چہار[1] کے تحت قرار پائی تھی) اور مصدق کے زوال سے تین سال تک یہ رقم ہمیں ہر ماہ اوسطاً پچاس لاکھ ڈالر کے حساب سے ملتی رہی۔ اس کے علاوہ نکتہ چہار کے تحت جو تکنیکی مدد مل رہی تھی وہ دو سال بعد تک تقریباً وہی رہی جو مصدق کے عہد میں تھی۔ لیکن جب ہم کو تیل سے آمدنی ہونے لگی تو ۱۹۵۶ء میں یہ مدد بہت حد تک کم کر دی گئی۔ امریکی امداد اور اس کے اثرات پر آئندہ فصل میں تفصیل سے بحث کروں گا۔

ایران کی مالی حالت خراب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مصدق کے عہد میں تیل کی صنعت بالکل بند ہو چکی تھی۔ اگرچہ کچھ انتہا پسندوں نے مخالفت بھی کی لیکن تیل کی صنعت کو دوبارہ جاری کرنے سے پہلے جنرل زاہدی نے یہ مناسب سمجھا کہ حکومتِ برطانیہ سے سیاسی روابط استوار کر لئے جائیں۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد اینگلو ایران آئل کمپنی کی بجائے خود حکومت نے بین الاقوامی سطح پر اس سلسلے میں مذاکرات شروع کئے۔ امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور ہالینڈ کی کمپنیوں نے ان مذاکرات میں شرکت کی اور ستمبر ۱۹۵۴ء میں ایک قرارداد پر سب کمپنیاں متفق ہو گئیں اور اگلے ہی مہینے ایرانی پارلیمنٹ نے بھی اس کو منظور کر لیا اور میرے دستخط ہونے کے بعد اس قرارداد پر عمل کیا جانے لگا۔ اس کے فوراً بعد تیل کے کارخانوں میں تیل نکالنے کا کام شروع ہو گیا اور آبادان سے تیل صاف ہو ہو کر جنوبی ساحل کی بندرگاہوں پر کھڑے جہازوں میں بھرا جانے لگا۔ تیل کی آمدنی اور امریکہ کی تکنیکی اور اقتصادی مدد کے ذریعے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے ملک کے ترقیاتی کاموں کو از سرِ نو شروع کیا گیا۔ جس میں سب سے اہم مسئلہ لوگوں کی سیاسی اور اخلاقی زندگی کو بحال کرنا تھا۔

مصدق کے بعد غنڈہ گردی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور پارلیمنٹ نے حسبِ سابق اپنا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ایران نے ایک بار پھر ساری دنیا میں اپنا وقار اور اعتماد حاصل کر لیا۔

کئی بار میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہے کہ مصدق نے اس وقت جب کہ وہ وزیرِ اعظم تھا کون سا ایسا تعمیری کام کیا جس سے عوام کو فائدہ پہنچا ہو۔ اس سوال کا جواب پانے کی میں نے ہر ممکن کوشش کی۔ میری نظر میں اس نے صرف ایک ہی کام عوام کی فلاح کے لئے کیا اور وہ تھا کاشتکاروں کا کاشت میں حصہ دار ہونے کا قانون جو اس نے پارلیمنٹ سے پاس کرایا اور ضرورت سے زیادہ اس کو شہرت دی۔ اس نے یہ حکم جاری کیا کہ زمیندار کاشتکاروں کو بٹائی کے علاوہ مزید بیس فیصدی اناج اپنے حصے میں سے دیں۔ کاشتکاروں کو بیس فیصدی زائد اناج جو زمینداروں سے ملتا تھا اس میں آدھا تو اُن کے پاس رہتا تھا باقی آدھا گاؤں کی پنچایت کو دے دیا

1. POINT FOUR

جاتا تھا تاکہ اس سے گاؤں سدھار کا کام ہو سکے۔ جس قانون کو مصدق نے اس قدر ہوا دی تھی دراصل اس قانون کی نقل تھی جو ۱۹۴۷ء میں پاس ہوا تھا۔ اس وقت احمد قوام وزیر اعظم تھا۔ چونکہ ایران میں کاشت کاروں اور زمینداروں کے درمیان کاشت کاری کی شرائط ہر جگہ الگ الگ ہیں اور آس پاس میں جو معاملہ طے پاتا ہے وہ بھی زبانی ہوتا ہے اس لئے مصدق کے قانون کو جاری کرنا نہ صرف ایک مشکل مرحلہ تھا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں بھی سخت دشواریاں درپیش تھیں۔ کیونکہ اس قانون سے لوگ بالکل خوش نہیں تھے۔

اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں رزم آرا (مرحوم) نے جو اس وقت وزیرِ اعظم تھا نکتۂ چہار سے ملنے والی رقم کی مدد سے دیہی ترقیات کا ایک پروگرام اس طرح مرتب کیا تھا کہ عام دیہاتیوں کی زندگی پر اس کا براہ راست اثر پڑے۔ کسانوں کو نئے ڈھنگ سے کھیتی کرنے کے طریقے سکھانے، صفائی ستھرائی اور صحت عامّہ کو بہتر بنانے کا منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ درحقیقت جو کام آج نکتۂ چہار کے تحت ایران میں ہو رہا ہے اسی منصوبے کی بُنیاد پر ہے۔

جس ادارے کے تحت نکتہ چہار کا ترقیاتی پروگرام ایران میں چل رہا تھا اس کا ڈائرکٹر ولیم وارن[1] تھا۔ اس نے مصدق کا عروج بھی دیکھا ہے اور زوال بھی۔ اس نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے مصدق کی اخلاقی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب مصدق نے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا تو اس نے معاہدۂ نکتۂ چہار جس کا مقصد دیہی ترقی تھا اور وزیرِ اعظم سابق جس نے اس معاہدے پر دستخط کئے تھے دونوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی مفید کام اس شخص کے نام پر ختم ہو جو اس سے پہلے اس کو شروع کر چکا تھا۔ چنانچہ نئے سرے سے معاہدہ تیار کیا گیا جس پر مصدق نے دستخط کئے اور زاہدی کے برسر اقتدار آنے تک اس معاہدے پر عمل ہوتا رہا۔ جنرل زاہدی نے نکتہ چہار کے تمام پچھلے معاہدوں کو جس میں رزم آرا کا معاہدہ بھی شامل تھا تسلیم کر کے دوبارہ ان کو نافذ کیا۔

اتنا عرصہ گذرنے کے بعد لوگوں کے جذبات اور احساسات یقیناً اعتدال پر آ گئے ہوں گے۔ میں ساری دُنیا کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ مصدق کے اعمال و افکار پر غور کرے اور از روئے انصاف اپنا فیصلہ دے۔

مصدق بعض ایسے واقعات میں اُلجھ کر رہ گیا تھا کہ اُن کا سمجھنا ہی اس کے لئے دشوار تھا۔ وہ ایک بہت ہی عمدہ بہروپیا تھا اور اپنے ناٹک کے بول اس نے اچھی طرح یاد کر رکھے تھے اور اس کے بولنے کا انداز ایسا اچھا تھا کہ سننے والے پر اس کا اثر ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہتا تھا مطلب خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی حالت اس مشین کی طرح تھی جو اپنی مرضی کے بغیر کسی طاقت کے ذریعے چلتی ہو۔ مشین چل تو سکتی ہے اور بعض آوازیں بھی پیدا کر سکتی ہے لیکن اس طاقت کو جو اس کے پیچھے کام کر رہی ہے نہیں سمجھ سکتی۔

ان سب باتوں کے باوجود مصدق نے ایک وقتی ضرورت کو پورا کر دیا۔ دوسری عالمگیر جنگ اور غیر ملکیوں

1. WILLIAM E. WARNE

کے اقتدار کے بعد ملک کے اندرونی خلفشار نے ایسے حالات پیدا کر دئے تھے کہ ان پر قابو پانے کے لئے ایک ایسے جذباتی انسان کی ضرورت تھی جو فکر و فہم اور احساسِ ذمہ داری سے بالکل آزاد ہو۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہی اور غیر ملکی اقتدار کے خاتمے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ایران میں ایک بار پھر قوم پرستی کے جذبات کو اُبھارا جائے کیونکہ اس وقت ایران قوم پرستی کے لحاظ سے اس دور سے گذر رہا تھا جہاں عقل و دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارا ملک اُس وقت اُس مرحلے پر تھا جس پر دُنیا کے بہت سے ملک اب پہنچے ہیں۔ دراصل قوم پرستی کی نئی تحریک کو جو آج کل بہت سے ممالک میں پھیلی ہوئی ہے اگر سمجھنا ہو تو ضروری ہے کہ ایران کی حالت جو مصدق کے عہد میں تھی اس کا مطالعہ کیا جائے۔

مصدق بغیر کسی جھجک کے جیسا بھی حالات کا رُخ دیکھتا ویسا ہی ڈھونگ رچا لیتا۔ جب وہ وزیرِاعظم مقرر ہوا تو اس نے کبھی چکنی چپڑی باتوں سے کبھی رو کر اور کبھی بے ہوشی کا بہانہ کر کے لوگوں کو فریب دیئے۔ کبھی وہ خوابگاہ کا پاجامہ پہنے ہوئے ہی مجمع کے درمیان تقریر کرنے چلا آتا اور ذرا ذرا سی بات پر بیماری کا بہانہ بنا کر بستر پر لیٹ جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز مصدق پارلیمنٹ میں تقریر کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا۔ جیسے ہی ڈاکٹر نے اس کے کپڑے اُتارنے شروع کئے مصدق نے اپنا ہاتھ بٹوے پر رکھ دیا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے غشی کا بہانہ کر کے لوگوں پر رعب ڈالنا چاہا تھا۔

یہ واقعہ جس کو بہت سے لوگوں نے دیکھا اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں خلوص نام کو بھی نہ تھا بلکہ مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نہایت افسوس کے ساتھ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مصدق ان لوگوں کا بھی اعتماد حاصل نہ کر سکا جو اس کو ایک عمدہ اور صحیح العمل آدمی سمجھتے تھے کیونکہ ایسا شخص جلد ہی لوگوں کی نظر سے گر جاتا ہے۔ میری طرح جو لوگ اس کو نزدیک سے جانتے ہیں وہ اس کی حالت پر افسوس کریں گے اور یہ کہہ کر یاد کیا کریں گے کہ نہ تو اس میں اخلاقی بلندی تھی، نہ مردانہ شجاعت اور نہ رہبری کی صلاحیت۔ البتہ منفی پسندی، ریاکاری اور خودستائی جیسی چیزیں اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن کر رہ گئی تھیں۔

شروع شروع میں تو اس نے اپنے وطن کی بہت اچھی طرح خدمت کی اور منفی پسندی کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں کے جذبات کو غیر ملکیوں کے خلاف اُبھارا بھی۔ اگرچہ وہ ہر کام میں ذاتی فائدے کو پیشِ نظر رکھتا تھا اور اسی لئے وہ ملک کے لئے مفید بھی ثابت ہوا لیکن یہ بات نہایت عجیب ہے کہ جیسے ہی وہ وزیرِاعظم کے عہدے پر پہنچا ملک کی بہتری کے لئے کوئی کام نہیں کر سکا۔

کسی بھی ملک کا سربراہ اگر یہ چاہتا ہے کہ ملک میں اس کی شخصیت با اثر ہو تو اس کو چاہیئے کہ مثبت راہ اختیار کرے لیکن مصدق نے شاید انجانے میں اپنے ہم وطنوں سے خیانت کی۔ اس نے لوگوں سے وعدہ کیا کہ ان کی زندگی

مستقبل میں اب سے بہتر اور زیادہ خوشحال ہوگی۔ لیکن اس نے کوئی وعدہ پورا نہ کیا۔ کچھ عرصے تک تو لوگ اس کے وعدوں پر جیتے رہے لیکن آہستہ آہستہ ان کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ محض وعدوں سے وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سیاسی بددیانتی کی وجہ سے ملک کا اتحاد تباہ و برباد ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے عام لوگ اس کے خلاف ہو گئے اور ایک دن اس کا قلع قمع کر کے رکھ دیا۔

جس زمانے میں مصدق وزیر اعظم تھا تو اس کے ہمعصر دوسرے ملکوں کے سربراہ تیل کی آمدنی کو قومی ترقیات اور اصلاحی کاموں پر خرچ کر رہے تھے لیکن مصدق نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا۔ اس کا فطری ضدی پن (جس کے متعلق سب ہی جانتے ہیں) اور شہرت و جاہ طلبی کی ہوس ملک کے لئے اور ان کے لئے جو ملک کے لئے خلوصِ نیت سے کام کر رہے تھے نہایت مضر ثابت ہوئی۔

مصدق کے بعد جب ہم نے تیل کے مسئلے کو حل کیا تو ہم نے اس بات کا خیال رکھا کہ مسئلے کا حل ان شرائط کے تحت ہو جو تیل کو قومی صنعت بنانے کے لئے رکھی گئی ہیں۔

اگرچہ مصدق کے بعض ساتھیوں نے اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس بات کا خیال رکھا کہ تیل کا معاہدہ اس قانون کے تحت ہو جس کے مطابق مصدق کے عہد سے قبل ہی تیل کو قومی صنعت قرار دے دیا گیا تھا اور پارلیمنٹ نے اس کو منظور کر لیا تھا۔

اس کے علاوہ ہم نے اور بھی بہت سے معاہدے کئے جس نے تیل پیدا کرنے والے اور خرچ کرنے والے ممالک کے درمیان خوشگوار تعلقات کے نئے دروازے کھولے اس کا ذکر آئندہ فصل میں کیا جائے گا۔

اقتدار انسان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ بعض لوگ اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی اخلاقی اقدار کے پابند رہتے ہیں اور اعلیٰ مراتب پاتے ہیں لیکن ایسے بھی کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اقتدار حاصل کرنے کے بعد پستی کی طرف چلے جاتے ہیں اور جب ہم مصدق کے اقتدار کے بارے میں سوچتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ اخلاق اور انسانیت کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترا۔

ملکی اُمور میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر ہمارے ملک نے مصدق کے عہد سے کوئی تجربہ حاصل کیا اور ملکی انتظامات کو درست رکھنے کا کوئی سبق سیکھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا عہد بے فائدہ اور رائیگاں نہ تھا۔

ہمارے ملک کے لوگ ہر سال ۱۹-اگست کو مصدق کے زوال اور ان بیرونی طاقتوں کی شکست کی یاد میں جشن مناتے ہیں جنھوں نے ہمارے چراغِ آزادی کو بجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مجھے امید ہے کہ جو درس عبرت ہم کو اس تاریخی دن سے ملا اس کو میرے ہم وطن کبھی فراموش نہ کریں گے۔

۶- میری مثبت قوم پرستی

مصدق کے زوال کے بعد ۱۹۵۶ء میں میں نے ماسکو میں روسی رہنماؤں سے ملاقات کی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ تک ہمارے تعلقات روسی حکومت سے بہت خوشگوار رہے۔ لیکن ۱۹۵۸ء سے واقعات اس طرح بدلے کہ غلط فہمیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے امید ہے کہ اس وقت جب کہ یہ کتاب لکھی جارہی ہے اقوامِ متحدہ کے دوستانہ ماحول اور رائے عامہ کی کوششوں سے یہ اختلاف دور ہو چکے ہوں گے۔

حکومت برطانیہ جو دنیا کی دوسری بڑی طاقت سمجھی جاتی تھی اور ہمارے ہر معاملہ میں مداخلت کیا کرتی تھی ۱۹۵۴ء کے بعد سے اس نے بھی اپنا رویہ بدلا اور ہمارے ساتھ صلح پسندانہ طریقہ اختیار کیا۔

پچھلے پچاس ساٹھ سالوں میں دنیا کی یہ دو بڑی سامراجی طاقتیں ہماری راہ میں کئی بار رکاوٹیں ڈال چکی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمیں حقیقی اور غیر حقیقی قوم پرستی کے معنیٰ بھی سکھا دیئے ہیں۔ اور ہمارے ملک کا روشن فکر طبقہ اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ کون شخص واقعی قوم پرست ہو سکتا ہے۔ اور کون قوم پرستی کے نام پر دھوکہ دے سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایرانیوں نے ان سامراجی طاقتوں کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ طریقے بھی سیکھ لئے ہیں جن سے ان کے حربوں کا توڑ کیا جا سکے۔

پچھلی فصل میں مختصر طور پر یہ بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح روسی اور انگریزی حکومتوں نے ایران کے سیاسی اور تجارتی میدان میں اقتدار حاصل کیا اور ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے رہے اور میرے والد نے ان کو روکنے کے لئے کیا اقدامات کئے۔ انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ دراصل یہ ایرانیوں کا ہی قصور تھا کہ انہوں نے ان غیر ملکیوں کی خفیہ سازش کو نہ سمجھا۔ اور ان کو رفتہ رفتہ اپنے ملک میں قدم جمانے اور طاقت بڑھانے کا موقع دیا اور اچھی طرح واضح کر دیا کہ اگر ایرانی قوم اپنے ارادے میں مضبوط ہو تو کوئی طاقت ان کو اس بات کے

لئے مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی مرضی اور منفعت کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں۔

برطانوی سامراج کے پہلے اقتصادی سیاسی اور فوجی دَور کو تو اس وقت زبردست شکست ہوگئی تھی جس وقت ۱۹۱۹ء کا معاہدہ ختم ہوا اس کے بعد تھوڑے عرصے تک حکومت برطانیہ اور دوسری حکومتیں مشروط معاہدے کے تحت تیل نکالنے کا کام کرتی رہیں۔ اور جو مراعات انہیں دی گئی تھیں اُن سے فائدہ اٹھاتی رہیں لیکن آخر میں میرے والد نے مشروط معاہدے کے طریقے کو ہی منسوخ کر دیا اور جو رعایتیں کمپنیوں کو دی جاتی تھیں اوّل تو ان کو بالکل ختم کر دیا اور اگر کچھ دیں بھی تو ان پر ایرانی حکومت کی طرف سے سخت پابندیاں بھی لگا دیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران انگریزوں نے ایک بار پھر ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ لیکن ۱۹۴۲ء کے سہ طاقتی (روس، برطانیہ اور ایران) معاہدے کے تحت برطانوی حکومت نے اپنی فوجوں کو ایران سے ہٹا لیا اور فوجوں کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد برطانیہ کی براہ راست دخل اندازی بھی ہمارے ملک سے ختم ہوگئی۔

اِس کے بعد اگر انگریزوں نے ہم سے کبھی کوئی ناروا سلوک کیا تو اس کا سبب تیل اور اس سے پیدا شدہ سیاسی اور اقتصادی مسائل تھے۔ پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ میرے والد نے ۱۹۳۳ء میں اینگلو پرشین آئل کمپنی سے ایک نیا معاہدہ کیا جس کی رو سے ایرانی حکومت کو پہلے سے زیادہ تیل کی آمدنی کا حصّہ ملنے لگا اور تیل کی نگہداشت کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ حقوق حاصل ہوگئے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے تیل کو قومی صنعت قرار دے دیا گیا اور حکومت ایران کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہوگئے۔

حالات کی ستم ظریفی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی مصدّق نے اپنے عہد میں اپنی دھواں دھار تقریروں کے ذریعہ جس قدر سخت نکتہ چینی غیر ملکیوں پر کی اس کا اُلٹا ہی اثر ہوا اور پہلے سے کہیں زیادہ انگریزوں کو ملک میں عروج اور اثر و رسوخ حاصل ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصداق نے اپنی منفی پسندانہ تحریکوں سے انگریزوں کو موقع دیا کہ وہ اپنے کاموں میں ہر طرح سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

وزیر اعظم مقرر ہونے سے روزِ زوال تک اس کے لئے بس یہی ایک کام رہ گیا تھا کہ انگریز جو بھی حرکت کریں اس کی جوابی کارروائی بڑے زور شور سے کرے۔ اس کی حالت اس اناڑی گھونسے باز کی سی تھی جو گھبراہٹ میں مُٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے حریف پر پل تو پڑے لیکن کبھی اس بات کی کوشش نہ کرے کہ اپنی طرف سے پہل کر کے آگے بڑھے اور میدان مار لے جائے۔ معلوم نہیں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر انگریزوں نے مصدّق کو اس حال پر پہنچا دیا کہ وہ جو کچھ بھی کریں مصدّق ان کے خلاف پورے جوش و خروش سے ضرور آواز اٹھائے۔

1. CAPITULATION SYSTEM

مصدق کے ناپاک ارادے سب پر ظاہر ہوگئے اور اس کو وزیر اعظم کے عہدے سے برطرف ہونا پڑا۔
مصدق کے معزول ہونے کے بعد ۱۹۵۴ء میں حکومتِ برطانیہ سے از سرِ نو تیل کا معاہدہ ہوا اور برطانیہ اور ایران کے درمیان خوشگوار تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس معاہدے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیل سے ایران کو آمدنی کئی گنا بڑھ گئی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل کی صنعت پر سے انگریزوں کی اجارہ داری قطعی طور پر ختم ہوگئی۔ اب کسی بڑی کمپنی کی یا کسی ایسے ادارے کی جس کے پیچھے انگریزی حکومت کا ہاتھ ہو یہ مجال نہیں کہ ہماری اقتصادیات کے بڑے حصے پر قابض رہے۔ اس معاہدے کی رو سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اب سے انگلستان اور ایران کے درمیان جو بھی معاملہ ہوگا وہ بالکل مساوات اور برابری کی سطح پر ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہمارے تعلقات حکومتِ برطانیہ سے پہلے سے کہیں زیادہ خوشگوار ہیں۔

اگرچہ مستقبل کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن حالات یہ بتا رہے ہیں کہ شاید ایران اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان ایک بار پھر کشیدگی ہو۔ لیکن جب تعلقات برابری کی سطح پر استوار ہوں اور سیاست داں تدبّر اور دوُر اندیشی سے کام لیں تو کوئی وجہ تناؤ یا کشیدگی کی نظر نہیں آتی۔

ایک مدّت سے ہمارے تعلقات فرانس سے نہایت خوشگوار چلے آرہے ہیں۔ اس ملک کی حکومت نے کبھی ہم پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ہم پر اپنی سامراجیت کی لعنت کو لادنا چاہتی ہے۔ بلکہ ثقافتی اور اقتصادی ترقی میں ہماری بڑی مدد کی ہے۔ بہت سے بڑے آدمی جنہوں نے ایران کی ترقّی میں نمایاں حصّہ لیا ہے فرانس کے ہی تعلیم و تربیت یافتہ ہیں۔ بلکہ ہمارے ملک کا دانشمند طبقہ فرانسیسی زبان بہت اچھی طرح بولتا ہے۔ ایک روزنامہ ہمارے ملک سے فرانسیسی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ فرانسیسی کی بہت سی کتابیں کثرت سے کتاب فروشوں کے ہاں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ تہران میں "انجمن فرہنگی ایران و فرانسہ" کے نام سے ایک ثقافتی ادارہ ہے جس کا کام یہی ہے کہ اپنے درخشاں تمدّن سے ہماری معلومات میں اضافہ کرے۔ ۱۹۵۹ء میں فرانس کی تکنیکی اور صنعتی نمائش کا افتتاح تہران میں ہوا جس عمارت میں یہ نمائش کی گئی تھی، بعد میں وہ عمارت اور بہت سا ساز و سامان تہران یونی ورسٹی کو بطور تحفہ دے دیا گیا۔ فرانسیسی انجنیئروں اور ٹھیکے کی کمپنیوں نے بھی ہمارے ملک میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے ذمّہ جو بھی منصوبہ سونپا گیا انہوں نے اس کو وقت سے قبل ہی پورا کر کے ہمیں دے دیا۔

اسی طرح ہمارے دنیا کی بہت سی آزاد قوموں سے دوستانہ اور ثقافتی تعلقات ہیں۔ امریکہ نے جو ہمیں تکنیکی مدد دی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا، اور یہ بھی بتایا جائے گا کہ اٹلی نے کس طرح ہماری تیل کی صنعت میں گہری دلچسپی لی۔

۱۹۵۸ء میں اٹلی کی طرف سے صنعتی اور تجارتی نمائش تہران میں لگائی گئی اور اسی سال میں نے اٹلی کی

میں اور میرے والد مطمئن ہیں کہ ٹرین ٹھیک وقت پر پہنچی

۱۹۴۹ء میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا۔ حملے کے فوراً بعد قوم کے نام پیغام نشر کرتے ہوئے

آذربائیجان کی ایک دیہاتی دوشیزہ

میں کسانوں کے درمیان زمینوں
کے قبالے تقسیم کر رہا ہوں۔

حکومت کی دعوت پر اس ملک کا دورہ کیا۔

ہمارے تجارتی تعلقات امریکہ، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور دیگر ممالک سے برابر بڑھ رہے ہیں۔ لیکن سوویت روس سے اس معاملے میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جس وقت روس میں انقلاب آیا تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ روس سے اب سامراجیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور ایران پہلا ملک تھا جس نے سوویت روس کی نئی حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کیا۔ لینن نے اعلان کیا تھا کہ جتنے بھی چھوٹے چھوٹے ملک ہیں ان کو پوری پوری آزادی ملنی چاہیئے۔ ہم نے لینن کے اس قول کا اعتبار کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ایران روس دوستی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) لیکن افسوس کہ دوستی کی یہ امید مایوسی میں بدل گئی۔

ہمسایہ ہونے کی وجہ سے روسیوں کی حریص نگاہیں ایک عرصے سے ایران پر لگی ہوئی تھیں ان کے نقطۂ نظر سے ہمارا ملک ایسی جگہ واقع ہے کہ آسانی سے اس کی سیاسی چالوں اور حربوں کے لئے نہایت مناسب اکھاڑہ بن سکتا ہے۔ پہلے بھی اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں روس اور ایران کے درمیان دوستی کے معاہدے کی گفتگو جاری تھی۔ بات مکمل ہوگئی اور میرے والد کے فوجی انقلاب کے ایک سال بعد اس معاہدے پر دستخط بھی ہوگئے۔ جس وقت دوستی کے معاہدے کی بات چیت چل رہی تھی روسیوں نے بڑی عجیب حرکت کی اور ہم پر سخت زیادتی شروع کر دی۔ میرزا کوچک خاں جنگلی کا شمار ایران کے باغیوں اور سرکشوں میں ہوتا تھا روسیوں نے اس کی حمایت کی اور مدد دے کر اپنی فوجوں کو بندرگاہ انزلی (جس کا نام بعد میں میرے والد نے بندرگاہ پہلوی رکھا) پر اُتار دیا۔ اور اس غدّار نے ہمارے ملک کی حدود میں ہی اپنی حکومت قائم کرلی جس کا نام اس نے "سوویت جمہوریہ گیلان" رکھا۔

کمیونسٹ سامراجیت کا یہ پہلا تجربہ تھا جس سے ہم کو دوچار ہونا پڑا اگرچہ ہم نے اس کے خلاف احتجاج بھی کئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ باوجود اس کے کہ روسیوں کا یہ فعل نہایت شرمناک تھا لیکن ہم نے دوستی کے عہد و پیمان کی بات چیت جاری رکھی۔ جیسے ہی معاہدے پر دستخط ہوئے روسیوں نے میرزا کوچک خاں کی سرپرستی اور حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کے بعد میرے والد کے لئے میرزا کوچک کو سرکوب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ چنانچہ انہوں نے میرزا کوچک کو مغلوب کرکے روس کی اِس کوشش کو ناکام بنا دیا کہ وہ ہماری حدود میں اپنی حکومت قائم کرے۔

کمیونسٹوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی سیاسی شکست یا حکمتِ عملی کی ناکامی کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں لینن اور اس کے بعد اسٹالن نے بظاہر یہ تسلیم کر لیا کہ جمہوریہ گیلان کی ریاست کا وجود جس کی پشت پر اُن کا ہاتھ تھا ایک نہایت غیر دانشمندانہ اور ناشائستہ قدم تھا۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ وہ دوستی کے پردے میں زیادہ بہتر طریقے سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے، بشرطیکہ جب تک میرے والد برسرِاقتدار تھے دوستی کے عہد نامے کی خلاف ورزی نہ کرتے اور ہمارے ملک کے کسی حصّے پر قبضہ کرنے کی غرض سے نظر نہ اٹھاتے۔

اس واقعہ کے پچیس سال بعد جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو روسیوں نے اپنی دیرینہ آرزو کو پورا کرنے کی دوبارہ کوشش کی۔ چنانچہ ہماری حدود میں خفیہ طور پر اپنے آدمی بھیجنے شروع کر دیئے۔ ان کو پورا پورا اطمینان تھا کہ تُوڈی پارٹی کے بن جانے کے بعد وہ ہمارے قومی اتحاد کی بنیادوں میں لرزش پیدا کر دیں گے۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے میرے ملک میں ایک نہیں بلکہ دو دو خود مختار ریاستیں جوان کے اشارے پر چلتی تھیں قائم کیں۔ پہلی ریاست انہوں نے ایران کے شمال جنوبی علاقے مہاآباد میں بنائی جہاں خالص کُردوں کی آبادی ہے۔ اور اس ریاست کا نام "جمہوریہ کُردستان" رکھا دوسری خود مختار حکومت آذربائیجان کی تھی جو روس کے بالکل ہی نزدیک واقع تھی۔ یہ دونوں حکومتیں دسمبر ۱۹۴۵ء میں وجود میں آئیں اور ایک سال بعد صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔

لیکن ان ریاستوں کے وجود میں آنے سے مٹنے تک کی ایک سال کی مدت عہدِ حاضر کی تاریخ کا نہایت بحرانی اور پُرخطر دور تھا۔ اس مدت میں ہم نے کیمونسٹوں کی چالوں اور سازشوں سے بہت کچھ سیکھا۔

اس نام نہاد کُرد جمہوریت کی بنیاد کُرد قبیلے کی قومی تحریک پر رکھی گئی تھی۔ اس تحریک کا بیج انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم کے دَوران کُردوں میں بویا تھا۔ اور روسیوں نے دوسری عالمگیر جنگ میں اس پودے کو پروان چڑھایا۔ کُرد ایران میں اور دوسرے ملکوں میں جن کی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں آباد ہیں۔ نسل اور زبان کے اعتبار سے سب ایرانی ہیں۔ کیمونسٹوں نے ان کُردوں کے درمیان جو ایران میں آباد ہیں غیر ایرانی کُردوں کے جتھے خفیہ طور پر بھیجنے شروع کئے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ ایران کے شمال مشرقی علاقے میں ایک ایسی ریاست قائم کر لیں جو ان کے اشاروں پر چلے۔ اور انہی مقاصد کے تحت انہوں نے کُرد جمہوریت کے قیام کو عملی جامہ پہنایا۔ کُرد جمہوریت بن جانے سے روسیوں کو امید تھی کہ عراق اور ترکی کے کُرد بھی اس ریاست میں شامل ہو جائیں گے۔

کرد باغیوں نے علی الاعلان مرکزی حکومت سے سرکشی اور حکم عدولی شروع کر دی۔ ان کے لئے احکام ملک کے باہر سے آتے جن کی وہ اطاعت اور پیروی کرتے۔ انہوں نے سوویت روس کی حمایت اور ہدایت پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اکثر کُرد قبائل ایسے بھی تھے جو اس خود ساختہ حکومت سے بدظن اور شاکی تھے لیکن غیر ملکی فوجوں کے وہاں ہونے کی وجہ سے آواز نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن تھوڑے عرصے بعد ان قبائلیوں نے اس علاقے کو مرکز کے تحت لانے کے لئے ہماری مدد بھی کی۔

آذربائیجان کی بغاوت کو فرو کرنا اور روسی پٹھوؤں کی طاقت کو اس صوبے سے ختم کرنا جس قدر ہمارے لئے اشد ضروری تھا اتنا ہی دشوار بھی۔ پہلے بھی اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ سہ طاقتی اتحاد کے معاہدے پر دستخط کرنے والوں میں روس بھی شامل تھا۔ اور اس معاہدے کی رو سے حکومتِ روس پر یہ پابندی عائد ہوتی تھی کہ جنگ ختم ہونے کے بعد چھ ماہ تک اپنی فوجوں کو ایران سے ہٹالے۔

میں نے "عہد نامہ تہران" کا کچھ حصّہ گذشتہ باب میں نقل کیا ہے۔ اس عہد نامہ میں یہ بات ضبطِ تحریر میں آئی ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، روس اور انگلستان کی حکومتیں اس بات کے لئے پابند ہیں کہ وہ ایران کی آزادی، حقِ حکمرانی اور ملک کی سالمیت کا احترام کریں۔ میرا خیال ہے کہ تمام ایرانی سوچتے ہوں گے کہ اسٹالین نے سچّے دل سے اس عہد نامے کا احترام کیا ہوگا اور اپنے وعدوں پر قائم رہا ہوگا۔ ۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو جنگ ختم ہوئے چھ ماہ گذر چکے تھے اس وقت تک اتحادی فوجوں کو ملک سے باہر چلا جانا چاہیئے تھا۔ انگریزی اور امریکی فوجیں اس وقت تک جا بھی چکی تھیں لیکن حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اسٹالین نے اپنے قول کا پاس نہ کیا اور روسی فوجوں کو ایران سے نکلنے کا حکم نہیں دیا۔

شہر تبریز آذر بائیجان کا صوبائی دارالخلافہ ہے۔ اگست ۱۹۴۵ء میں ٹوڈی پارٹی نے اس شہر کی سرکاری عمارتوں پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ روسی فوجوں نے ہمارے سپاہیوں کو ان کی بارکوں میں قید کر دیا۔ جس وقت ہم نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے وہاں مدد بھیجی تو روسی فوج کے سُرخ دستے نے ہماری فوج کو تبریز سے چار سو کلو میٹر کی دوری پر قزوین کے قریب آگے بڑھنے سے روک دیا۔

ٹوڈی پارٹی نے خود کو از سر نو تشکیل کیا اور ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے لوگوں کے سامنے آئی۔ نومبر تک پورے صوبے پر ڈیموکریٹک پارٹی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے قانون ساز اسمبلی قائم کر کے ۱۲ دسمبر کو خود مختار آذر بائیجان جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ اس خود ساختہ خود مختار جمہوریت کی قانون ساز اسمبلی نے جعفر پیشہ وری کو اپنا وزیر اعظم چُنا۔ یہ شخص کافی عرصے تک روس میں رہ چکا تھا اور کمیونسٹوں کا گرگا سمجھا جاتا تھا۔ اس شخص نے روسی جنگی سامان اور سپاہیوں کی مدد سے پولیس راج قائم کیا۔ جو در حقیقت دہشت پسندوں کی آماجگاہ تھا۔

جب ہماری فوجیں باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئیں اور روسیوں نے ان کو آذر بائیجان کی طرف بڑھنے سے روکا تو اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ روس ہمارے حکمرانی کے حق کو بُری طرح پامال کر رہا ہے۔ چنانچہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، انگلستان اور ہماری طرف سے سخت احتجاجی مراسلے ماسکو بھیجے گئے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں جو وزرائے خارجہ کی کانفرنس ماسکو میں ہوئی تھی وہاں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ انہی دنوں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل وجود میں آئی تھی۔ ہم نے ایک احتجاجی مراسلہ اس کو بھی روانہ کیا۔

یہ سب سے پہلا مراسلہ تھا جو سلامتی کونسل کے سامنے پیش ہوا۔ روسیوں نے ہمارے ان رجحانات پر کوئی توجہ نہ دی، شاید وہ بھول رہے تھے کہ دوسرے اس بات کو اس قدر ہلکا اور غیر اہم نہ سمجھیں گے۔ ۳ مارچ ۱۹۴۶ء کی شام کو روسی فوج نے تبریز کو خالی کرنا شروع کر دیا لیکن ان کا رُخ روسی سرحد کی طرف نہ تھا بلکہ پوری فوج تین ٹکڑیوں میں بٹ گئی اور یہ تینوں ٹکڑیاں تہران، عراق اور ترکی کی سرحدوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ آئندہ چند ہفتوں میں سیکڑوں

ٹینک اور ان کے ساتھ امدادی دستے اور پیادہ فوجیں روس سے ایران کی طرف آتی رہیں اور تین مختلف سمتوں میں (تہران، عراق اور ترکی کی سرحد) انہی راستوں پر جن سے پہلے فوجیں جا چکی تھیں گزرتی رہیں۔

اسی کے ساتھ روسی فوج کا ایک اور لشکر ترکی کی اس سرحد پر جو یورپ سے لگتی ہے جمع ہونے لگا اس نے ترکی کے خلاف سیاسی سطح پر جارحانہ جوئی اور پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی جس کا مقصد ترکوں میں خوف و دہشت پیدا کرنا تھا۔

اُن دِنوں قوام وزیرِاعظم تھا اس نے روسی حکومت سے مذاکرہ کیا اور کہا کہ اگر وہ اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لے تو اس کو بہت سی مراعات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایرانی پارلیمنٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کرے گا کہ ایران اور روس کے اشتراک سے تیل کی کمپنی قائم کی جائے۔ (جس میں ۵۱ فی صدی روس کا حصّہ ہوگا) اور شمالی ایران کے تیل کے ذخائر کو دریافت کر کے ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس نے یہ بھی وعدہ کر لیا کہ تین تُوڈی پارٹی کے ممبروں کو وہ اپنی کابینہ میں شامل کر لے گا۔ آذربائیجان کی انقلابی حکومت کو سرکاری طور پر اپنی حکومت سے تسلیم کرائے گا۔ اور ایران نے روس کے خلاف اقوامِ متحدہ کے سامنے جو شکایت پیش کی ہے اس کو واپس لے لے گا۔

علاء، جو آج کل وزیرِ دربار ہے اُن دِنوں واشنگٹن میں سفیر اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایران کا نمائندہ تھا اس نے وزیرِاعظم کی اس تجویز کو ماننے سے اِنکار کر دیا اور سلامتی کونسل کے ایجنڈے سے ایران کی شکایت واپس لینے کی مخالفت کی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ میں خود اس کے حق میں نہیں ہوں کہ ایک جائز شکایت کو سلامتی کونسل سے واپس لیا جائے۔ اور قوام نے بھی روسی دباؤ کے تحت یہ اقدام کیا ہے۔ سلامتی کونسل کی پہلی نشست ۲۱ مارچ کو ہوئی علاء نے ایران کی شکایت کو اس قدر مؤثر طریقے سے پیش کیا اور اس ضمن میں اتنی عمدہ تقریر کی کہ اس کا بیان سلامتی کونسل کی تاریخ میں یادگار بن کر رہے گا۔

پانچ روز بعد سلامتی کونسل کی دوسری نشست ہوئی اس نشست میں روس کے نمائندے گرومیکو کے بیان نے تمام حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا اس نے اعلان کیا کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آیا تو پانچ یا چھ ہفتہ کے اندر روسی فوج ایران کی حدود سے باہر چلی جائے گی۔

اس موقع پر قوام نے نہایت عجیب و غریب رویّہ اختیار کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر بھی روسیوں کا اثر ہے۔ اس نے ایک روز آ کر مجھ سے کہا کہ تمام معاملات میں یا تو میں خود کوئی فیصلہ کُن قدم اٹھاؤں یا اس کو تمام اختیارات سونپ دوں۔ البتہ دوسری بات پر اس کا زیادہ زور تھا۔ لیکن عوام اس کی کمیونسٹوں کے ساتھ اس نرم اور مسالمت آمیز پالیسی سے زیادہ خوش نہ تھے۔ اُدھر جنوبی ایران کے قبائلیوں نے بغاوت شروع کر دی کیوں کہ ان کا مطالبہ تھا کہ تُوڈی پارٹی کے ممبروں کو کابینہ سے نکالا جائے۔

قوام کا یہ نظریہ تھا کہ ایرانی فوج کے اُن تمام غدّار افسروں کو جو ایرانی فوج سے نکل کر پیشہ وری سے جا کر مِل گئے تھے اور ان تمام لوگوں کو جن کو پیشہ وری نے مختلف عہدوں پر مقرر کیا تھا دوبارہ فوج میں شامل کر لیا جائے۔ اس نے میرے پیروں پر پڑ کر بڑی عاجزی سے یہ درخواست کی کہ میں اس کی اس تجویز کو مان لوں لیکن میں نے اس پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ میں اپنے ہاتھ قلم کرانا پسند کروں گا لیکن اس طرح کی کسی تجویز پر دستخط نہ کروں گا۔

قوام اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے سمجھتا تھا کہ وہ اپنے اس مسالمت آمیز رویّے سے نہ صرف اپنے مقام و منزلت کی حفاظت کر سکے گا بلکہ پورے ملک کی سالمیت بھی برقرار رہے گی۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں نے ایک روز قوام کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ اپنی کابینہ کو ختم کر دے اور تُوڈی پارٹی کے ممبروں کو نکال کر نئی کابینہ بنائے۔ اور اسی کے ساتھ ہی میں نے نئے انتخابات کرانے کا فرمان جاری کیا، اور یہ بات بالکل صاف طور پر کہہ دی کہ انتخابات میں آذربائیجان کا صوبہ بھی شامل رہے گا۔ ظاہر ہے کہ آذربائیجان کے خود مختار پولیس راج کو یہ فیصلہ بالکل پسند نہ آیا ہو گا۔ اس موقع پر روسی عجیب کشمکش در پیچ میں پھنس گئے۔ ایک طرف تو وہ اپنے بٹھائے ہوئے پٹھوؤں کی حکومت کی حفاظت کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف وہ شمالی علاقے کا تیل حاصل کرنے کی خاطر تہران سے خوشگوار تعلقات بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

اِن حالات کے پیشِ نظر میں نے اپنے ضمیر کی آواز پر قدم اٹھایا اور حکم دیا کہ آذربائیجان کو فتح کرنے کے لئے فوج روانہ کر دی جائے۔ یہ حکم جاری کرنے کے بعد میں نے خود ہوائی جہاز میں بیٹھ کر باغیوں کے اڈوں پر پرواز کی تاکہ ان کی طاقت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اُس وقت تک روسی اپنے بٹھائے ہوئے پٹھوّں کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہماری فوجیں فاتح کی حیثیت سے تبریز میں داخل ہوئیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ باغی پہلے ہی اپنے پولیس راج کو چھوڑ کر روسی حدود میں فرار کر گئے ہیں۔

تبریز اور رضائیہ کے لوگ اپنی آزادی پسندی کی وجہ سے ملک کی تاریخ میں ہمیشہ مشہور رہے ہیں۔ یہی دو شہر تھے جن کے بسنے والے آذربائیجان کی نام نہاد پولیس راج کا تختہ پلٹنے میں پیش پیش رہے۔ اس شہر کے عوام نے بہت سے کیمونسٹ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اگر ایرانی فوج آڑے نہ آگئی ہوتی تو عوام قید خانوں اور جیلوں پر حملہ کر دیتے، اور کیمونسٹ قیدیوں کو چُن چُن کر مار ڈالتے۔ نام نہاد پولیس راج کا قلع قمع کرنے میں کُرد قبائلیوں اور کُردستان کے مقامی لوگوں نے بھی ایرانی فوج کی مدد کی۔

ان ہنگامہ خیز دلوں میں جو واقعہ پیش آیا میں اسے کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ ایک دن روسی سفیر نے تہران میں مجھ سے فوراً ہی شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اس کو باریاب ہونے کی اجازت دیدی۔ جس وقت وہ میرے سامنے حاضر ہوا تو اس نے بڑے دُرشت لہجے میں یہ اعتراض کیا کہ ایرانی فوجوں کو آذربائیجان بھیج کر ہم نے دنیا کے امن کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

اس نے اپنی حکومت کی جانب سے یہ درخواست کی کہ میں ایران کا شاہنشاہ اور فوج کا کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے ایرانی فوج کو آذربائیجان سے واپس بلانے کا حکم دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب تک جو حالات اور واقعات آذربائیجان میں رُونما ہوئے ہیں انہوں نے دنیا کے امن کے لئے خطرہ پیدا کیا ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اس کی درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اور اس کو وہ ٹیلیگرام دکھایا جو مجھے آذربائیجان کی نام نہاد حکومت کے گورنر نے بھیجا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ تمام باغی بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈالنے کو تیّار ہیں۔ اس کے بعد روسی سفیر کو کچھ کہنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اور حیران و سراسیمہ ہو کر رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

روسی حکومت کو ابھی تک یہ امیّد باقی تھی کہ قوام نے جو تیل کی تجویز ایرانی پارلیمنٹ کے سامنے رکھی تھی وہ منظور ہو جائے گی۔ لیکن نئی کابینہ نے اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اس تجویز پر غور کرنے میں جلد بازی سے کام لیا جائے۔ آخر کار ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایرانی پارلیمنٹ نے اتفاقِ رائے سے روس کی اس پیش کش کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ہمارے عہد میں آذربائیجان کا جھگڑا مشرقِ وسطیٰ کا ایک بہت اہم تاریخی مسئلہ ہے۔ کیوں کہ عالمگیر جنگ کے بعد پہلی مرتبہ اسٹالینی عہد کے روس کے ناپاک ارادے آذربائیجان میں ظاہر ہوئے۔ جو کچھ سوویت روس نے آذربائیجان میں کیا اس کی جزئیات پر جب سلامتی کونسل میں بحث ہوئی تو ان کو سن کر ساری دنیا لرز کر رہ گئی اور پہلی دفعہ دنیا کے مختلف ممالک کمیونسٹ سامراجیت کی چالاکیوں سے باخبر ہوئے۔

میرا خیال ہے کہ مستقبل میں آنے والی نسلوں کے مورّخ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ سرد جنگ کا آغاز درحقیقت ایران سے ہوا۔ اگرچہ دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی اس کی علامات ملتی ہیں۔ لیکن سب سے پہلے ایران میں ہی یہ نمایاں طور پر شروع ہوئی۔ اور تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکہ نے آذربائیجان کے معاملے میں دلچسپی لے کر مشرقِ وسطیٰ میں قیادت کا حق ادا کیا۔ آذربائیجان کے معاملے میں بھی صدر ٹرومین کے اسی اصول کا نفاذ کیا گیا جو ترکی اور یونان کو کمیونسٹ سامراجیت کے چنگل سے چھڑانے کے لئے مرتّب کیا گیا تھا، اور ٹرومین کے اس اصول نے ہی آئزن ہاور کے نظریات کے لئے راستے کو ہموار کیا۔

آذربائیجان کا واقعہ ہماری زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس دن یہ فتنہ ختم ہوا اس دن کا نام ہی یوم آذربائیجان پڑ گیا۔ اور ۱۹۴۶ء سے ہم ہر سال اس دن آذربائیجان کی آزادی اور ملکی حدود کی سالمیت کی یاد میں جشن مناتے ہیں۔ میرے خیال میں نہ صرف ایرانیوں کو اس دن کی یاد تازہ رکھنی ضروری ہے بلکہ دنیا کی تمام قوموں کو چاہیئے کہ اس تاریخی واقعے کو اپنے سامنے رکھیں اور ہرگز اپنے دل سے فراموش نہ ہونے دیں۔ آذربائیجان کی جنگ کے بعد ایرانیوں کے قومی احساسات میں واقعی جوش و ہیجان پیدا ہو گیا۔ قوم کے تمام افراد نے خواہ وہ کسی طبقے کے

ہوں اس واقعہ سے عبرت حاصل کی اور انہوں نے جہاں کہیں بھی تھے ہر ذریعے اور وسیلے سے میرے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ مقامی کمیونسٹوں کو صبر کرتے ہی بن پڑی۔ ان کو اس دن کا انتظار رہنے لگا کہ ملک میں پھر فتنے فساد بپا ہوں۔ اور وہ ان کو اپنے دامن سے ہوا دیں۔ اور موقع کی نزاکت سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ ان کا صبر بھی پھل لایا اور مصدّق کے دورِ حکومت میں ان کو یہ بیش قیمت موقع ایک بار پھر مل گیا۔ لیکن یہ بات بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھی کہ ہم نے خدائے واحد و بی ہمتا کی مدد سے اس خطرے سے نجات پائی جس نے ہمارے پورے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

اسٹالن کی موت ۴ مارچ ۱۹۵۳ء کو واقع ہوئی اور اسی سال ۹ اگست کو مصدّق کی حکومت ختم ہوگئی۔ جس طرح اسٹالن کے مرنے سے روس میں تاریخ کا ایک نیا باب کھلا بالکل اسی طرح ایران میں مصدّق کے برطرف کئے جانے سے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا، اور ہمارے روس سے تعلقات بہتر اور خوشگوار ہونا شروع ہوئے۔ تودی پارٹی بالکل غیر قانونی سیاسی جماعت تھی، روسی جو اس کی حمایت کا دم بھرتے تھے انہوں نے بھی اس کے حق میں پروپیگنڈا کرنا چھوڑ دیا۔ روسی حکومت نے میرے ساتھ اور نئی حکومت سے جو ایران میں تشکیل ہوئی تھی تعاون کرنے کا ہر ممکن اظہار کیا۔

۱۹۵۶ء میں میں نے اور ملکہ ثریّا نے سوویت یونین کی دعوت پر روس کا سرکاری دورہ کیا ہمارا بہت شاندار استقبال کیا گیا اور ہمیں ملک کے مختلف مقامات دکھائے گئے۔ یہاں خروشچیف اور اُس کے ساتھیوں سے جن میں ورشیلف، بُلگانن، مکویان اور شپلیف شامل تھے آزاد فضا میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

روسیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ آپس میں صلح و آشتی کے ساتھ مل جل کر رہنے میں یقین رکھتے ہیں اور دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت قطعی پسند نہیں کرتے۔ ان کو اس بات کی تشویش تھی کہ ہم بغداد پیکٹ میں کیوں شامل ہوئے۔ جبکہ ان کا پڑوسی ملک (روس) ان کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب وہ ایران اور روس کے تعلقات کی روشنی میں تلاش کریں۔ میں نے اپنے میزبانوں کو یاد دلایا کہ روسی پچھلے کئی سو سالوں سے جنوبی ایران کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ایران پر حملہ اس غرض سے کیا تھا کہ وہاں آئینی حکومت کی تحریک کو کچل دیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے موقعے پر بھی انہوں نے ملک میں زبردستی گھس کر مجرمانہ حرکت کی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران باوجود اس کے کہ دوستی کا عہد نامہ برقرار تھا روس نے ایران پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے آذربائیجان میں ان لوگوں کی حکومت قائم کی جو ان لوگوں کے ہاتھ میں مہرے کی حیثیت رکھتے تھے تاکہ آذربائیجان کا زرخیز صوبہ ایران سے ہمیشہ کے لئے کٹ جائے۔ خروشچیف اور اُس کے ساتھیوں نے جواب دیا کہ ان تمام حملوں اور دست درازیوں کے وہ ذمے دار نہیں ہیں کیونکہ ان واقعات کا تعلق ان سے پہلے

کی حکومت سے ہے۔

خروشچیف نے اعتراف کیا کہ روس نے یقیناً غلطیاں کی ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایرانی قوم کو اس کی اور تمام اعلیٰ عہدے داروں کی نیک نیتی پر جو اس وقت وہاں موجود تھے اعتماد کرنا چاہیئے۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ ایرانیوں کے دل میں اس کی لئے اور اس کے ملک کے لئے دوستی کے جذبات موجزن ہیں۔ لیکن یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر انسان پچھلے واقعات سے عبرت حاصل نہ کرے تو یہ اس کے لئے انتہائی افسوس ناک بات ہوگی۔ خروشچیف یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایران بغداد پیکٹ کی ممبری کو قبول کرے جبکہ برطانیہ بھی اس کا ممبر ہے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے موقعے پر برطانیہ بھی ایران پر حملہ کرنے کا اتنا ہی قصوروار تھا جتنا روس اور حملے کی پیش کش سب سے پہلے اسی کی طرف سے ہوئی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ انگریزوں نے کم از کم اپنے وعدے کا تو پاس کیا اور کہنے کے مطابق ٹھیک وقت پر اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لیں لیکن روسیوں نے تو اپنے قول کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

خروشچیف بغداد پیکٹ کے اس پہلو پر زیادہ زور دے رہا تھا جس میں فوجی امداد اور حملہ آوروں کے دفاع کا ذکر تھا۔ اُس نے کہا کہ شروع شروع میں تو اُس کا خیال تھا کہ یہ معاہدہ فوجی نوعیت کا نہیں ہے لیکن بعد میں اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن میں نے یہ بات واضح کو دی کہ بغداد میں کوہ البرز اور کوہ الوند کے اطراف کے علاقوں کی حفاظت کا ذکر ہے اور ان میں سے کوئی بھی پہاڑی سلسلہ روسی سرحد میں واقع نہیں ہے بلکہ دونوں سلسلے ایران میں ہی ہیں۔

خروشچیف کو بالآخر یہ بات تسلیم کرنا پڑی کہ ایران کا بالکل یہ ارادہ نہیں ہے کہ وہ روس کی طرف دست درازی کرے لیکن اس نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ ہو سکتا ہے کوئی بڑی طاقت ہماری مرضی کے خلاف ہم کو اس لئے مجبور کرے کہ ہم اپنے ملک کو روس پر حملے کی خاطر اس کے حوالے کر دیں۔ اُس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا شاید اسی مقصد کے تحت ہم مجبوراً اس معاہدے میں شامل ہوئے ہوں۔ میں نے بڑی تاکید سے یہ بات کہی کہ ہم بغداد پیکٹ میں اپنی مرضی سے شامل ہوئے ہیں اور ہمارے حقوق کسی طرح بھی دوسرے ممبران سے کم نہیں اور کسی نے ہم کو اس بات کے لئے مجبور نہیں کیا کہ ہم اس معاہدے میں شامل ہوں اور اگر ہم پر اس طرح کا کوئی دباؤ ڈالا جاتا تو ہم اس کی سختی سے مخالفت کرتے۔ میں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ میں ہرگز اس بات کی اجازت نہ دوں گا کہ کوئی بھی ملک ایران کے راستے سے روس پر تجاوز اور دست درازی کرے۔ میں نے شانِ سرفروشی کے ساتھ خروشچیف کو قول دیا کہ جب تک ایران کے تخت سلطنت پر میں متمکن ہوں اگر کوئی ملک روس کے خلاف حملہ کی مجھ سے درخواست بھی کرے گا تو میں اس کی درخواست کو رد کر دوں گا۔ اور میرا ملک روس کے خلاف کسی بھی سازش میں شریک نہ ہوگا۔

خروشچیف اور اس کے ساتھیوں نے نہایت خندہ روئی اور کشادہ دلی سے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر انہیں پورا پورا اعتماد ہے، اور ان کی خواہش پر ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا جس میں اس بات کا ذکر تھا کہ ہماری گفتگو

خالص دوستانہ ماحول میں انجام پائی اور دونوں حکومتوں کا مصمم ارادہ ہے کہ خوشگوار تعلقات کو مستحکم کیا جائے۔

روسی لیڈروں سے جو میری گفتگو ہوئی تھی اس نے بہت سے معاہدوں کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ دونوں ملکوں کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے سرحدی تنازعات کا حل بھی نکال لیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے روس کے راستے سے مغربی یورپ اور دوسری جگہوں پر اپنا مال درآمد اور برآمد کرنے کے حقوق بھی حاصل کر لئے۔ دریائے اَرَس اور اترک ہماری اور روس کی مشترکہ سرحد کے ساتھ متوازی بہتے ہیں ان دونوں دریاؤں سے تقریباً دو ہزار ایکڑ سے زیادہ بنجر زمین سینچی جا سکتی ہے۔ ہم نے معاہدہ کیا کہ دونوں ملک ان دریاؤں کے پانی سے فائدہ اٹھائیں۔ ہم نے روس کے ساتھ اپنی تجارت کو فروغ دیا اور دوستانہ ورزشی مقابلوں کے لئے مواقع فراہم کئے۔ ہم نے ایرانی ممبران پارلیمنٹ کا وفد روس بھیجا اور وہاں کی پارلیمنٹ کے وفد کو ایران آنے کی دعوت دی۔ اور دونوں طرف سے ثقافتی تعلقات کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی۔ روس میں انقلاب ۱۹۱۷ء میں آیا۔ شاید ایران اور روس کے درمیان اس سے پہلے کبھی اتنے عمدہ تعلقات نہیں رہے۔ اسی طرح ہم نے دوسرے کمیونسٹ ممالک سے بھی اپنے تعلقات قائم کئے۔ باوجود ان تمام خوشگوار تعلقات اور معاہدوں کے روسیوں نے پھر اشتعال انگیز حرکات شروع کر دیں۔ مثلاً مارشل ورشنین نے ایک اعلان جاری کیا جس میں یہ دھمکی دی کہ روسی میزائلوں سے ایران اور ترکی کو ایک دفعہ ہی تباہ کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلان کی وجہ سے خروشچیف کا وہ بیان جس میں اس نے روس کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کی تھی اور یقین دلایا تھا کہ اس پالیسی سے ایک نئے باب کا آغاز ہوگا مشکوک نظر آنے لگا۔ کیونکہ جب روسی لیڈر اپنے ذمّے دار افسروں کو اس طرح کی باتیں کہنے کی اجازت دے سکتے ہیں تو ہم سے کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم ان کی باہمی ملاپ کی چکنی چپڑی باتوں پر یقین کریں گے۔

روسیوں کی زیادتی برابر جاری رہی تہران سے مشہد تک ابھی ریلوے لائن تیار ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے اعتراض کر دیا اور الزام لگایا کہ ہم یہ سب جنگی مقاصد کے تحت کر رہے ہیں۔ وہ ہم سے بات کرتے، تو اس طرح گویا ساری دنیا پر ان کی اجارہ داری ہے ہم کہیں ہوائی اڈے بناتے تو ان کو یہ کہنے کا بہانہ مل جاتا کہ یہ ہم لڑاکا جہازوں کے لئے بنا رہے ہیں۔ بندرگاہیں بنائی جاتیں تو ان کو یہ شک ہوتا کہ بحری بیڑے کے لئے تیاری ہو رہی ہے۔

روس کے اس ناروا سلوک نے بین الاقوامی سطح پر نیکی اور شرافت کے معیار کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور علی الاعلان ہماری حکومت اور حقِ حکمرانی پر دراز دستی کی۔ ہمیں اچھّی طرح معلوم ہے کہ روسی اپنے ملک کے اندر اور باہر ریل کی لائنیں بچھانے، ہوائی اڈّے اور بندرگاہیں بنانے میں مشغول ہیں کیا ہم نے کبھی ان کے اس عمل پر کوئی اعتراض کیا یا مخالفت کی؟ کیا روسی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اس حصّے میں صرف انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ جدید ترین آمد و رفت کے وسائل اپنے پاس رکھیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم واپس قرونِ وسطیٰ میں چلے جائیں؟ روسیوں کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وقتِ ضرورت ریلیں، ہوائی اڈّے اور بندرگاہیں ہم فوجی مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ یہی بات

روسیوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ جو اصول و ضوابط ایک طرف جائز ہوں دوسری طرف ان کو ناجائز قرار دیا جائے۔

عراق میں فوجی انقلاب ۱۹۵۸ء میں آیا اس انقلاب کے بعد بغداد پیکٹ کے تمام ممبران نے ایک جلسے میں شرکت کی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت سے درخواست کی کہ وہ بھی اس پیکٹ میں شریک ہو۔ اگرچہ امریکی حکومت بغداد پیکٹ کی بہت سی کمیٹیوں کی ممبر تھی لیکن سردست اس معاہدے کی ممبری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے بدلے اس نے یہ تجویز رکھی کہ ترکی پاکستان اور ایران کے درمیان دو جانبہ دفاعی معاہدے پر دستخط ہوں۔ جس کے مطابق امریکی حکومت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اگر بین الاقوامی کمیونسٹ طاقتوں نے ان تین ملکوں میں سے کسی پر حملہ کیا تو وہ ان کی مدد کرے گی۔ چنانچہ ترک اور پاکستانی دوستوں کے ساتھ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس تجویز کو قبول کر کے امریکہ سے معاہدہ کر لیں۔

جب روسیوں کو ان سب باتوں کا علم ہوا تو انہوں نے بہت سخت اعتراضات کے ساتھ ہمیں ایک مراسلہ بھیجا۔ اس سے پہلے کہ یہ مراسلہ سرکاری طور پر ہمیں ملے انہوں نے ڈپلومیٹک اصولوں کی خلاف ورزی کر کے تمام اعتراضات ریڈیو پر نشر بھی کر دیئے اور اپنے سفیر کو جو تہران میں مقیم تھا یہ ہدایت کی کہ ایرانی پارلیمنٹ کے تمام ممبران سے مل کر ان اعتراضات کا مطلب سمجھا دے۔ ہم نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا اور روسیوں کو بتا دیا کہ وہ اس عمل سے اُن غلطیوں کو دہرا رہے ہیں جو چند سال قبل ان سے سرزد ہو چکی ہیں اور جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات ہی ختم ہو گئے تھے۔ اور ان کو یہ بات سمجھائی کہ اتنی بڑی اور مضبوط مسلّح فوج کے ہوتے ہوئے ہمارے معمولی سے دفاعی معاہدے سے ڈرنا نہایت مضحکہ خیز امر ہے اور یہ بھی صاف کہہ دیا کہ دونوں ملکوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہی دوستانہ تعلقات جو پہلے تھے برقرار رہیں۔

ہم کو اس دو جانبہ معاہدے سے روکنے کے لئے روسیوں نے ایک چال اور چلی۔ ہمارے درمیان میں کچھ آدمیوں کو لائے اور ان کے ذریعے ہم سے طویل مدّت تک عدم تجاوز کے معاہدے اور دل کھول کر اقتصادی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ دو جانبہ معاہدہ جس صورت میں پہلی دفعہ پیش کیا گیا تھا اس میں ان مطالب کا ذکر نہ تھا جو ہم چاہتے تھے۔ اس میں ہمارے تحفّظ کی کوئی خاص ضمانت نہ تھی اور جنگی سامان ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قطعی ناکافی تھا۔

جب ہم نے خود کو فوجی طاقت کے اعتبار سے بہت ہی کمزور پایا اور جو گارنٹیاں نا ٹو معاہدے کے ممبر ملکوں کو دی گئی تھیں ہمیں نہ ملیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم روس سے طویل المدّت عدم تجاوز کے معاہدے پر گفتگو کریں۔

روسیوں نے اس موقع پر سخت غلطی کی اور ہمارے ملک میں اپنا مشن بھیجنے میں دو ہفتے کی تاخیر کر دی۔ اِس عرصے میں دو جانبہ معاہدے کی شرائط میں تبدیلیاں کچھ اس طرح سے کی گئیں جو ہمارے لئے تشفّی بخش تھیں۔ جس

وقت روسی نمائندے ایران پہنچے ان سے ایک اور خطا سرزد ہوئی گفتگو کے پہلے ہی دور میں انہوں نے ہم سے درخواست کی ہم معاہدہ بغداد سے علیحدہ ہو جائیں لیکن جب انہوں نے ہماری طرف سے سخت ردّعمل دیکھا تو اس موضوع پر انہوں نے گفتگو ترک کر دی۔ لیکن اس بات پر آخیر تک مُصر رہے کہ ہم بغداد پیکٹ پر دستخط نہ کریں۔ ہم روسیوں کی اس چال کو سمجھ گئے، دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ طویل المدّت عدم تجاوز کے معاہدے کے ذریعے وہ ہم کو ہمارے دوست ممالک سے جدا کر دیں۔ انہوں نے نہ صرف امریکہ کے ساتھ معاہدے پر دستخط نہ کرنے کے لئے ہم سے اصرار کیا بلکہ عدم تجاوز کے معاہدے کا کچّا خاکہ جو انہوں نے تیّار کیا تھا اس میں ایسے جواز بھی رکھّے جن سے ہمارے اپنے دوست ممالک سے تعلقات کمزور ہونے کا امکان تھا۔

ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہماری فوجی طاقت اور تیّاری قابلِ اطمینان نہیں ہے اور ہمارے دوست ممالک جو ہماری مدد کرنا چاہتے تھے وہ بھی ناکافی تھی لیکن ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے دوستوں سے تعلقات استوار رکھیں تاکہ کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہو جس سے ہمارے حق آزادی اور حاکمیت کو نقصان پہنچے۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہمارے اور روسیوں کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو سکا اور روسی ہمیں بغیر مطلع کئے ایران سے چلے گئے۔

ہماری آزادی پر کاری ضرب لگانے کا جو روسیوں نے تہیّہ کیا تھا وہ جاری رہا اور تھوڑے عرصے بعد انہوں نے ریڈیو کے ذریعہ ہمارے خلاف مہم شروع کر دی۔ انہوں نے سرکاری ریڈیو اسٹیشن سے فارسی زبان میں تقریری سلسلہ جاری کیا اور میرے ملک میری حکومت اور حتیٰ کہ میرے خاندان کے متعلق دروغ گوئی اور لغو باتیں گھڑنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ چند ماہ بعد دوسرے ریڈیو اسٹیشن سے "ایرانی قومی آواز" کے نام سے ایک اور سلسلہ شروع کیا جس میں پہلے سے بھی زیادہ بُری اور غیر مناسب باتیں بیان کی جاتیں۔ ہم کو اچھی علم تھا کہ یہ ریڈیو اسٹیشن روس کے جنوبی حصّے میں ہے اور روسی بھی بخوبی سمجھتے تھے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اسٹیشن کس جگہ واقع ہے۔ یہ ریڈیو اسٹیشن ہر قسم کے لغو، بیہودہ، بازاری اور گندے پروپیگنڈے پر ہی اکتفا نہ کرتا بلکہ لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر بھی ابھارتا۔ بعض قنوطیت پسند اور ضعیف الارادہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح کے پروپیگنڈے تو ایرانی قوم کے حوصلے پست کر دیں گے۔ لیکن نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا اس پروپیگنڈے نے ایرانی قوم میں وہ یکجہتی پیدا کی کہ سب ایک دل اور ایک زبان ہو گئے۔ اور یہ وحدت اس حد تک لوگوں میں بڑھی کہ میں نے حکم دیا کہ روس سے جو بھی پروپیگنڈا نشر ہوتا ہے وہ دوبارہ ایرانی ریڈیو سے سُنایا جایا کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس جھوٹے پروپیگنڈے کو جو اُن کے ملک کے خلاف ہوتا ہے اور جس کی حقیقت ان کو معلوم ہی ہے سُن سکیں۔

جلفا نامی شہر روسی سرحد پر واقع ہے روسیوں نے اس شہر میں ایک اور گمراہ کُن پروپیگنڈے کا طریقہ اختیار کیا انہوں نے اپنی سرحد کے کنارے کنارے بڑی تعداد میں لاؤڈ سپیکر نصب کر دیئے اور ان کے ذریعے ہمارے

خلاف پروپگنڈا شروع کر دیا۔ لیکن نتیجہ بالکل برعکس نکلا کیونکہ ہم نے بھی جوابی کارروائی کی خاطر اپنی سرحد کے ساتھ ساتھ بہت سے لاؤڈ سپیکر لگا دیئے اور سرحد پر بسنے والے روسیوں کو کھری کھری سنانا شروع کر دیں۔ روسی حکّام نے لوگوں کو غیر ملکوں سے جو خبریں نشر کی جاتی ہیں سننے سے روکا اور بے دریغ روپیہ محض اس کام کے لئے صرف کیا کہ عام لوگوں کے ریڈیو صرف ان چند ریڈیو اسٹیشنوں کو پکڑ سکیں جو ملک کی حدود میں ہیں لیکن ہمارے سپیکروں کی آواز سب کے کانوں تک پہنچتی تھی اور وہ لوگ جنہوں نے اپنی ساری عمر میں آزادی کا مزہ نہیں چکھا تھا ہماری باتوں کو بڑے غور سے سنتے تھے۔ ہمارا یہ طریقہ روسی حکّام کی مرضی کے بالکل خلاف تھا چنانچہ جلد ہی وہ اپنے لاؤڈ سپیکر اکھاڑ کر لے گئے اور ہمارے خلاف جو جنگ جاری کی تھی بند کر دی۔ اور جواباً ہم نے بھی نشریات کا پروگرام ختم کر دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر سوویت روس نے ہمارے ساتھ کیوں اس طرح کا ناروا سلوک برقرار رکھا۔ روسی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اُس معاہدے کے سراسر خلاف ہے جو ان کے اور ہمارے ملک کے درمیان طے پایا ہے وہ یہ بھی بخوبی سمجھتے تھے کہ اگر اس قسم کی کوئی قرارداد ہوتی بھی کہ جس کی رو سے ان کو ہر ناروا سلوک کا مجاز ہوتا تو وہ قرارداد اقوام متحدّہ کے منشور کے مطابق باطل اور بے معنی قرار دی جاتی۔ کیوں کہ بین الاقوامی منشور کی دفعہ ۱۰۳ کے تحت بین الاقوامی سطح پر وہ تمام معاہدے اور قراردادیں جن کا مفہوم و مطلب بین الاقوامی منشور کے مفہوم و مطالب کے خلاف ہے ناقص و باطل قرار دیئے گئے ہیں۔

روسیوں کو یہ بات ذہن نشین کراتا چلوں کہ ۱۹۴۷ء میں مجلس اقوام متحدّہ میں خود انہوں نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ کسی کے خلاف ایسے پروپگنڈے کی جس سے دنیا کے امن و سلامتی کو خطرہ ہو روک تھام کی جائے۔ چنانچہ مجلس اقوام متحدّہ نے مکمل اتفاق رائے سے اس تجویز کو منظور کر لیا کہ کسی بھی قسم کا پروپگنڈا جس سے نقضِ امن کا خطرہ ہو کسی بھی طرف سے خواہ عمداً خواہ احتمالاً ہو اس کی مذمّت کی جائے۔ کیا روسی اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اُس وقت وہ اس قرارداد کے حامی اور طرف دار تھے اور جس چیز کے لئے وہ دوسروں کو منع کرتے ہیں کیا خود ان کو اس سے گریز نہ کرنا چاہیئے۔

روس اور ایران کے درمیان جو غیر ضروری کشیدگی پیدا ہوگئی ہے اس کا مجھے سخت افسوس ہے اگرچہ میں روسی عوام کو بیحد پسند کرتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ اپنے ملک کی آزادی کی حفاظت کرنا بھی میرا فرض ہے۔ مجھے روس اور ایران کے درمیان تعلقات کے کشیدہ ہونے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی اگر انہوں نے ہمارے ساتھ بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہوتا جو ان کا ترکی کے ساتھ ہے تو اپنے شمالی پڑوسیوں کے ساتھ ہمارے ناخوشگوار تعلقات کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔

ساری دنیا کے لوگوں حتیٰ کہ روسی دوستوں کو بھی یہ بات جان لینی چاہیئے کہ دنیا اس مرحلے پر پہنچ گئی ہے کہ

خواہ کسی طرف سے بھی ہو دراز دستی اور تجاوز کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۴۶ء سے اب تک جبکہ ہم آذربائیجان کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ اُس وقت اقوام متحدہ کے اراکین ایران کے معاملہ پر اس قدر متوجہ نہیں تھے جس کی ہمیں ان سے امید تھی۔ تہران میں مقیم امریکی سفیر نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اس کی حکومت اس بات کے لئے تیار نہیں ہے کہ ایران کے بچاؤ کی خاطر کسی قسم کی جدوجہد کرے۔

باوجود اس کے میں نے خود سوچا کہ اگر میں اس وقت حملہ نہ کروں تو یقیناً تفرقہ انداز طاقتیں زور پکڑتی جائیں گی اور الٹا ہم پر حملہ کر دیں گی۔ اس وقت تک کامیابی کی چنداں امید نہ تھی اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ معاملہ کہاں تک طول پکڑے گا لیکن پھر خیال آیا کہ عزت کی موت مرنا وطن کی آزادی کھو دینے سے کہیں بہتر ہے اور خدا نے بھی ایک بار پھر میری مدد کی۔

۱۹۴۶ء میں جو ہم پر بحرانی دور گذرا ہے اس کے مقابلے میں آج میں اور میری قوم بہت کم تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ آج ساری دنیا کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی طرف سے دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہو تو اس کے بچاؤ کے لئے فوری سخت اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ اس ایٹمی دور میں لوگ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اگر کسی بھی ملک پر زبردستی اور زیادتی کی گئی تو تمام ممالک کا امن خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ آج اقوام متحدہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے، اور اقوام متحدہ کی پولیس فورس کا نظریہ اصولی اور عملی طور پر ساری دنیا نے تسلیم کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران نے اپنے سمجھ دار اور طاقتور دوستوں کی مدد سے دو جانبہ دفاعی معاہدے کی پہلے سے کہیں زیادہ پُرزور حمایت کی ہے۔ اور ایران کے تمام معاہدے اور قراردادیں ہر لحاظ سے مجلس اقوام متحدہ کے منشور کے عین مطابق ہیں۔ ہم نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد پچھلے تجربات کی روشنی میں رکھی ہے۔ ایران کی جنگی نقطۂ نظر سے جو اہمیت ہے وہ سب کو معلوم ہے ہم نے پچھلی دو عالمگیر جنگوں میں غیر متعلق رہ کر جو تلخ تجربہ حاصل کیا اس کا نتیجہ ہم پر ظاہر ہو گیا۔ دونوں موقعوں پر جنگ سے دوری غیروں کو ایران کے اندر زبردستی گھس آنے سے نہ روک سکی۔ اور ہر جنگ کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارا ملک دنیا میں کئی بڑی طاقتوں کی کش مکش کے درمیان میدانِ کارزار بن کر رہ گیا ہے۔

مصدق کے دور میں اس کی منفی پسندانہ خارجہ پالیسی اور ہماری کمزوری کی وجہ سے غیر ملکیوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ اور ایسی تحریکیں جن کو چلانے کے لئے ملک کی سرحدوں کے باہر سے ہدایات دی جاتی تھیں، پھیلنے لگیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہم نے آہستہ آہستہ اپنی نئی خارجہ پالیسی مرتب کی جو ہماری حیات اور زندہ دلی کی آئینہ دار ہے۔ اور اسی لئے میں نے اس کا نام مثبت قوم پرستی رکھا ہے۔

آج کل چونکہ نیشنلزم (قوم پرستی) اور امپیریلزم (سامراجیت) جیسے لفظ اکثر سننے میں آتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ دونوں اصطلاحوں کا مطلب ہم بخوبی سمجھیں۔ معمولی فرہنگوں میں نیشنلزم کی تشریح و تعریف

اس طرح کی گئی ہے :

" قومی مفاد یا اتحاد و آزادی کے لئے دلی عقیدت اور حمایت" اور اسی طرح لفظ "امپریلزم" کی تعریف کی گئی ہے :

"ایک قوم کی شاہنشاہیت کو توسیع، تسلط اور اقتدار دینے کی کوشش یا پالیسی"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مثبت قوم پرستی[1] کی تعریف کیا ہو سکتی ہے اور کیا عملی قدم اس کی روشنی میں اٹھایا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں مثبت قوم پرستی سے مراد ایسا رویہ ہے جس کی رو سے ایک ملک کو زیادہ سے زیادہ اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل ہو اور جس میں اُس ملک کا اپنا فائدہ ہو۔ ہم ایرانیوں کے نزدیک مثبت قوم پرستی سے مراد کنارہ کشی یا علیٰحدگی نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے دوسرے ممالک کے مفاد اور حکمت عملی کو پیش نظر رکھے بغیر ہم کوئی بھی ایسا معاہدہ یا قرارداد پاس کر سکیں جو ہمارے لئے نفع بخش ہو اور ان لوگوں کی دھمکیوں میں نہ آئیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم کس سے دوستی کریں اور کس سے نہ کریں۔

ہم نے مبہم اصولوں کے تحت یا محض اس خیال سے کہ کسی نہ کسی سے متحد ہونا ہی ہے اتحادی رشتے قائم نہیں کئے ہیں بلکہ ہم نے یہ قدم ان فائدوں کے پیشِ نظر اٹھایا ہے جو ہمارے سامنے نمایاں ہیں۔ ہم سب ہی ممالک سے دوستی چاہتے ہیں اور ان کے علمی و فنی تجربات سے فائدہ اٹھانے کو بھی تیار ہیں بشرطیکہ اس دوستی اور اتحاد سے ہماری آزادی اور فلاح و بہبود کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ہم کو اپنے اس رویّے سے عمل کی آزادی ملتی ہے جو اُن اصولوں سے کہیں بہتر ہے جو بعض ممالک کو اپنے میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں اسی کے ساتھ ہی اقوامِ متحدہ کے اصولوں اور قوانین کے بھی سختی سے پابند ہیں۔

ہم لاتعلقی اور علیٰحدگی کے فرسودہ اور بے جان اصول کے حق میں نہیں ہیں اور دوستوں سے تعلقات میں کسی ہم کی ریا یا مکر نہیں رکھتے اور ان سے بھی اس طرح کے برتاؤ کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ اگر بعض ممالک ہمارے رویے سے رنجیدہ خاطر ہو کر ہماری توہین پر اُتر آتے ہیں اور ہمیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ منفی پسندانہ راہ اختیار کر لیتے ہیں اور نہ ہی اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی آنے دیتے ہیں ہم تو نہیں کہ ویرانے میں بیٹھ کر شور و غل مچاتے رہیں یا دوسرے الفاظ میں ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو میناروں پر چڑھ کر یا بین الاقوامی ریڈیو کے ذریعہ ہر شخص کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں۔ اور سب کو قصوروار ٹھیرا کر خود کو کمزور، مجبور اور لاچار سمجھیں اس کے برخلاف ہم روز بروز زیادہ قوی اور زیادہ دولت مند ہو رہے ہیں اگر ایک طرف ہم اپنے ملک میں ترقیاتی کام کر رہے ہیں دوسری طرف وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبات کی بھی حفاظت کر رہے ہیں۔

سامراجیت کوئی نئی چیز نہیں ہے پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ ایرانی شہنشاہیت حقیقی معنوں میں دنیا کی سب سے

1. POSITIVE NATIONALISM

پہلی شہنشاہیت تھی اگرچہ قوم پرستی آج دنیا میں بہت بڑی طاقت شمار کی جاتی ہے لیکن لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اہل ایران میں قوم پرستی کی تحریک کورش اعظم کے زمانہ سے ہی چلی آرہی ہے اور اسی قوم پرستی کے جذبے نے کئی صدیوں بعد امریکہ کے نوآبادیاتی باشندوں میں یہ جوش و خروش پیدا کیا کہ ایک مستقل اور آزاد متحد حکومت قائم کی جائے۔

پچھلے چند سالوں میں قوم پرستی کی ایک نئی لہر مشرقِ وسطیٰ اور ان دوسرے ممالک میں جو اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ ہیں بڑے جوش و خروش سے اُبھری ہے۔

قوم پرستی بھی سامراجیت کی طرح ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ حقیقی قوم پرستی ایک ملک کو بہت بلندی پر لے جاسکتی ہے چنانچہ امریکہ کی ترقیات کا ایک بہت بڑا حصہ اس حقیقی نیشنلزم کا ہی مرہونِ منت ہے۔

اسی طرح میرے والد نے جو بھی بڑے بڑے کام کئے وہ سب اسی حقیقی قوم پرستی کے تحت انجام پائے کیونکہ انہوں نے اس جذبہ کو قوم کے ہر فرد میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ دوسری طرف اگر اسی قوم پرستی کے جذبے سے ملک کے اندر بدمعاش اور بے ایمان لوگ اور بیرونی طاقتیں ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں تو اس کی آڑ میں سامراجیت ہم پر مسلّط ہو جائے گی اور قوم پرستی دم توڑ دے گی۔

جس وقت مصدّق اور اس کے ساتھیوں نے عورتوں کی طرح واویلا مچانا شروع کیا اور دیوانوں کی طرح جنون آمیز بیانات انگریزوں کے خلاف دینا شروع کئے تو بہت سے مخلص قوم پرستوں نے شروع شروع میں سمجھا کہ یہ بیانات ہی اصلی قوم پرستی کی دلیل ہیں۔ لیکن جیسے ہی کچھ وقت گذرا تو قوم پرستوں کو اندازہ ہو گیا کہ مصدّق درحقیقت ان کے ملک پر سامراجیت کے دروازے کھول رہا ہے۔

مصدّق کی منفی پسندانہ پالیسی نے ملک کے اندر سیاسی اور اقتصادی بے چینی اور بحران پیدا کر دیا اور غیر ملکی ایجنٹوں کے لئے اس نے ایسا موقع فراہم کیا جس کے وہ سخت آرزومند تھے۔ جس سامراجیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے میرے والد کمربستہ ہوئے تھے اسی سامراجیت کو پروان چڑھانے کے لئے وہ میدان ہموار کر رہا تھا۔ اور غیر ملکی طاقتوں نے اس سے فائدہ حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

دنیا میں کسی فرد یا قوم کے لئے اس فعل سے زیادہ خطرناک کوئی فعل نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے جال میں جکڑ کر رہ جائے اور خود کو خود پرستی کا غلام بنالے۔ اگر غور کیا جائے تو مصدّق سے زیادہ مجھے ذاتی طور پر انگریزوں سے دشمنی اور نفرت ہونی چاہیئے تھی کیونکہ انہوں نے ہی تو میرے والد کو تاج و تخت سے محروم اور ترکِ وطن کے لئے مجبور کیا اور دوسری جنگ کے دوران ان انگریزوں نے ہی روسیوں کو ایران میں گھس آنے کی دعوت دی تھی۔

جس وقت مصدّق اپنی ذاتی اغراض کے لئے جوش میں آتا تھا اور جذبات میں بہہ جاتا تھا تو میری نظر بڑے

قومی مفاد پرستی تھی۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مصدّق کی منفی قوم پرستی نے نہ صرف کمیونسٹوں کے لئے وہ مواقع فراہم کئے جس کے وہ آرزومند تھے بلکہ انگریزوں کے لئے ایسے حالات سازگار کئے کہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہمارے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگے۔

اگر مصدق کے طریقہ کار کو قوم پرستی کہا جاسکتا ہے تو پھر حقیقی قوم پرستی کے لئے کوئی دوسری اصطلاح وضع کرنی ہوگی۔ یہ تو مسلّم ہے کہ مصدّق کی پالیسی بالکل منفی پسندانہ تھی اور اس کا کوئی تعلق مثبت قوم پرستی سے نہ تھا۔ میری رائے میں مصدّق کے منفی رویّے اور اس قوم پرستی میں جو مخلص وطن پرستوں کا شیوہ ہے امتیاز پیدا کرنے کے لئے مثبت قوم پرستی کی اصطلاح نہایت سودمند ثابت ہوگی۔

بہت سے ممالک میں جہاں ابھی تک قوم پرستی کے جذبات موجزن ہیں وہاں لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ کس طرح ان لوگوں کو پہچانیں جو واقعی قوم پرست ہیں، اور وہ جو محض دھوکہ باز ہیں، اور قوم پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چونکہ سب ملکوں میں حالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لئے میں نہیں چاہتا کہ تمام ممالک کے حالات اور واقعات پر اپنی رائے کا اظہار کروں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ ہمارے تجربات سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ اور تمام اقوام کے قوم پرست عہد حاضر کی ایران کی تاریخ پڑھیں اور ان نکات کو سمجھیں جو ان کے لئے قومی تحریک میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاکہ وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان فرق پیدا کر سکیں۔ قوم پرستی کی تحریک سے جو سبق ہم نے سیکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص بھی منفی قوم پرستی کا پرچار کرے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا چاہیئے کیوں تخریبی کام تو ہر شخص کر سکتا ہے لیکن تعمیری کام ہر آدمی نہیں کر سکتا۔ تمام دنیا میں انسانی فطرت کا یہ عجیب خاصّہ ہے کہ لوگ ان شور و غوغا کے کاموں میں جن کو شیطانوں اور بھوتوں سے منسوب کیا جاتا ہے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ترقیاتی اور تعمیری کاموں کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کو اکھاڑ کر پھینکا جاتا ہے تو لوگوں کو اس میں مزا ملتا ہے ان کے جذبات میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ لیکن تعمیری کام آہستہ آہستہ ہی ہوتے ہیں اور ان میں وقت بھی کافی صرف ہوتا ہے۔

بعض تخریب کار عوام کو دھوکا دے کر خود قوم کے بڑے مخلص اور غم خوار و خدمت گار بنتے ہیں اور کچھ جان بوجھ کر غیروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتے ہیں۔ لیکن جس چیز کو یہ دونوں قوم پرستی سمجھتے ہیں خود بہت بڑا فریب ہے۔ یہاں میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں جائز تنقید کا مخالف ہوں، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ معقول اور مدلل نکتہ چینی اور تخریب کار عوام فریبی میں بڑا فرق ہے۔

دوسرا سبق جو ہم نے اِن واقعات سے سیکھا وہ یہ ہے کہ جو شخص قوم پرستی کے نام پر ایک طرح کی سامراجیت پر تنقید کرتا ہے اس کو بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ مصدّق کو انگلستان کی سامراجیت

تبریز میں طلبا کا ہوسٹل

زیر تعمیر سفید رود باندھ
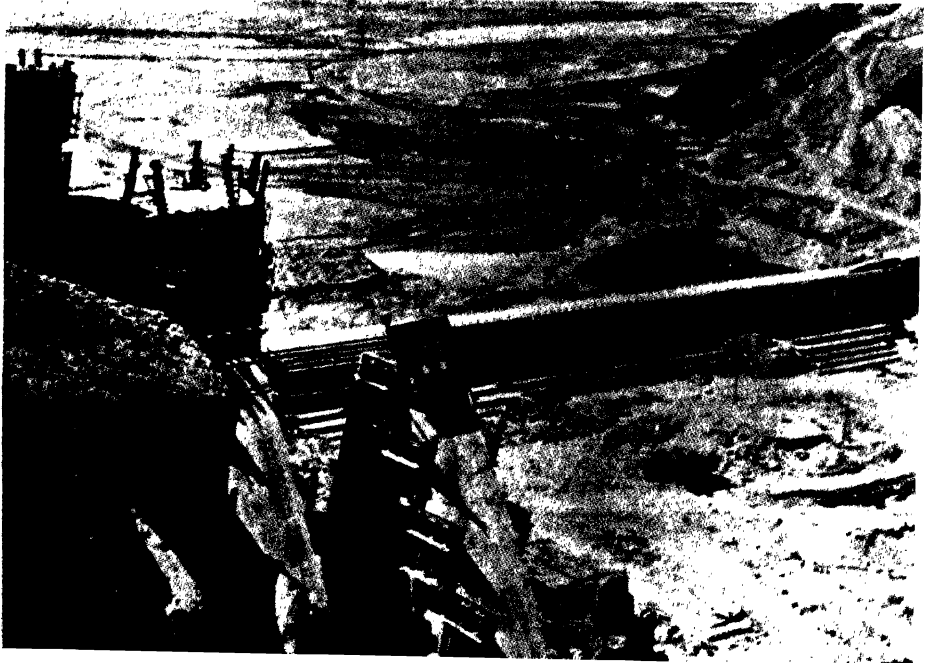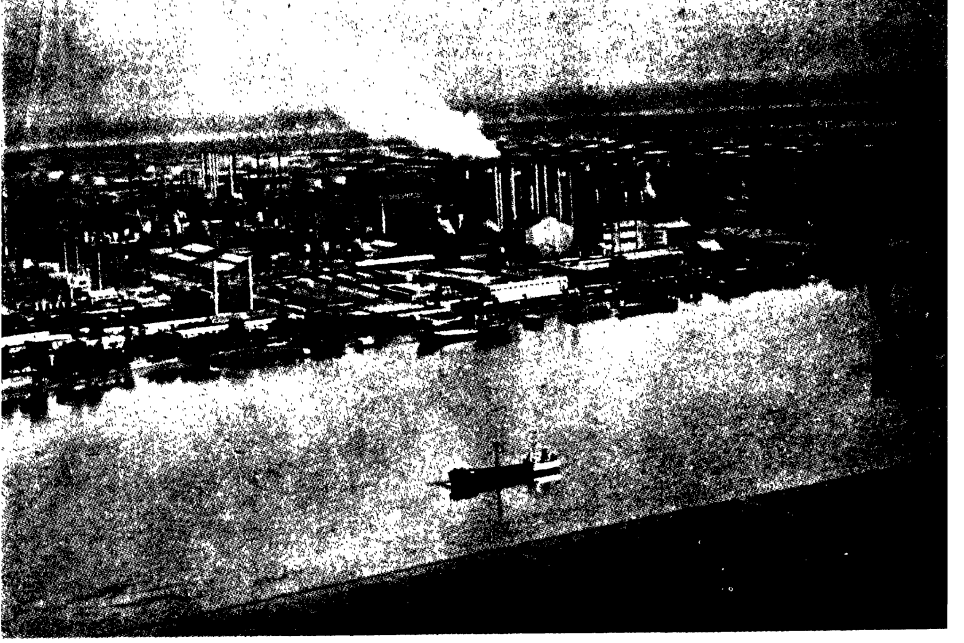
آبادان میں دنیا کے سب سے بڑے تیل کے کارخانے کا ایک دلکش منظر

ایران کی ریلوے لائن پر ایک پُل

ہمیشہ ایک خوفناک دیو دکھائی دیتی تھی جس کے خلاف وہ چیخا کرتا تھا۔ لیکن اپنے عہد کے آخری دَور میں جبکہ وہ ٹوڈی پارٹی سے مل گیا تھا تو کبھی اس سرخ نوآبادیاتی نظام کو اپنی زبان پر نہ لاتا جو انگلستان کی سامراجیت سے زیادہ خطرناک تھا۔ معلوم نہیں وہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر لوگوں کے خیالات اور جذبات بڑے خطرے سے موڑ کر چھوٹے خطرے کی طرف مرکوز کر دیتا تھا۔

تیسرا سبق میں نے یہ سیکھا کہ جو لوگ قوم پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے بیانات کا غیر قوموں اور حکومتوں کے افراد کے خیالات سے مقابلہ کرنا چاہیئے اس طرح مقابلہ کرنے سے دونوں کے خیالات میں جو باتیں مشترکہ ہوں گی وہ سامنے آجائیں گی مثال کے طور پر اگر سنو اخبار دنیا کے مختلف حصّوں سے شائع ہوتے ہوں اور ایک دوسرے پر ہر روز کڑی نکتہ چینی کرتے ہوں اور ان کی مخالفت اور موافقت کا ڈھنگ ایک سا ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان سب کے لئے ایک ہی مرکز سے احکام صادر ہوتے ہیں جن کی یہ اخبار پیروی کرتے ہیں۔ اگر کسی ملک میں اس قسم کے اخبار چھپتے ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ جھوٹی قوم پرستی کے آئینہ دار ہیں اور ان کا حقیقی قوم پرستی سے کوئی سروکار نہیں۔

چوتھا سبق میں نے یہ حاصل کیا کہ حقیقی اور نقلی قوم پرستوں کو جاننا ہو تو ان سے نڈر ہو کر یہ سوال کیا جائے کہ ملک کی ترقی کے لئے انہوں نے کیا پروگرام مرتّب کیا ہے اگر ان کے پاس کوئی مفید منصوبہ نہ ہو یا اگر ہو تو اس میں کوئی گہرائی اور اعلیٰ مقاصد نہ ہوں بلکہ اُلٹی سیدھی باتوں اور فریب پر مشتمل ہو یا کوئی پروگرام تو سامنے ہو مگر اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی راہ نہ ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن کی قوم پرستی مشکوک ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ کوئی تعمیری منصوبہ پیش کریں اور اس پر عمل کرنے کا بھی کوئی مناسب طریقہ بتائیں اور پورے عزم و ارادے سے قومی خدمت کے لئے تیّار ہوں تو ان کے اس جذبے پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

سب لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ آج تمام آزاد ممالک میں تخریب کار عناصر درپردہ توڑ پھوڑ کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ حقوق اور مراعات جو ایک آزاد سوسائٹی کو حاصل ہوتے ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر ہر وقت اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح اس کی آزادی کو نقصان پہنچایا جائے۔ یہ لوگ قوم پرستی کی نقاب مُنہ پر ڈال کر اور اس کی راہ میں قربانی کے نام پر بڑی چالاکی اور مہارت سے پوری قوم کو بے جان کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس کو روکنے کے لئے مختلف طریقے جو ہم نے سوچے ہیں وہ یہ ہیں کہ حکومت کو چاہیئے کہ وہ تخریب کاری کے اڈّوں پر کڑی نگرانی رکھے۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام افراد کو اظہار رائے کی پوری آزادی دے دی جائے۔ آج کی دنیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے امریکیوں اور آزاد اقوام نے یہ حل نکالا ہے کہ جن جماعتوں کا مقصد غیر قانونی طریقوں سے جمہوریت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا ہے ان کی سخت نگرانی کی جائے۔ یا کم از کم ان کے دائرۂ عمل کو محدود کر دیا جائے۔

مصدق کے زوال کے بعد جب لوگوں پر مقدمے چلائے گئے تو مقدمے کے دوران دلچسپ شواہد سامنے آئے جس سے معلوم ہوا کہ کس طرح فوجی افسروں کو جو تودہ پارٹی کے ممبر تھے قسم کھلائی جاتی تھی کہ وہ اپنے ملک کے بادشاہ اور مغربی طاقتوں کے مخالف لیکن سوویت یونین کے وفادار رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایسی منظم جماعت ہو جس کا کام اس طرح کی قسمیں کھلانا ہو تو اس کو ہرگز ایرانی قوم پرست جماعت نہیں کہا جاسکتا۔ اور خاص طور پر جب کہ روس جیسا ملک ہمارا پڑوسی ہو تو اس طرح کی جماعتوں کو پنپنے اور پروان چڑھنے دینا انتہائی غیر ذمہ دارانہ فعل ہوگا۔

بہت سی آزاد قومیں ایسی تخریب کار جماعتوں کو آگے بڑھنے سے روکتی یا ان پر کڑی نگرانی ہی نہیں رکھتیں بلکہ ان جماعتوں کے کارکن خود ہی سوسائٹی میں اپنا مقام کھو کر بہت سی مراعات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کی طرح ایران میں بھی جو لوگ کمیونسٹ سمجھے جاتے ہیں ان کو عام طور پر سرکاری عہدے نہیں دیئے جاتے۔

دوسری طرف میری رائے یہ بھی ہے کہ عوام کو اظہار خیال کی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ اور اُن پر کسی طرح کا دباؤ نہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے نظریات کو پورے طور پر سب کے سامنے پیش کرسکیں۔ اس طرح نہ صرف ملک کا فاسد مادّہ باہر نکل آئے گا بلکہ وہ عیب اور کوتاہیاں بھی جن کی اصلاح ضروری ہے سامنے آجائیں گی۔ کچھ لوگ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ مصدّق کے پورے عہد میں ایران پر مارشل لا نافذ رہا جس نے لوگوں کے لئے گھٹن پیدا کردی۔ اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کو ختم کرکے رہوں گا۔ چنانچہ جس وقت مصدّق کا اقتدار ختم ہوا میں نے پہلے تو اس میں کچھ نرمی کی اور اس کے بعد بالکل ختم کردیا۔

آج ہمارے ملک میں جو رسائل اور کتابیں چھپتی ہیں ان میں حکومت کی کچھ پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی ہوتی ہے۔ ہم نے دانستہ اِن تنقیدوں کی اجازت دی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس طرح کے نظریات اور تنقیدیں اُن ملکوں کے لئے جہاں جمہوریت ہے مفید ہوتے ہیں۔ ایران میں عام جلسوں میں اور یونی ورسٹی کے لیکچروں میں براہ راست حکومت پر تنقید کی جاتی ہے۔ ان جلسوں میں جو شخص بھی چاہے بغیر روک ٹوک کے شرکت کرسکتا ہے۔ کبھی کبھی قوم کے کسی فرد کے منہ سے اور کبھی یونی ورسٹی کے طالب علموں کی طرف سے یہ نعرہ بلند ہوتا ہے کہ "ایران میں آزادی نہیں ہے"۔ اِن نعروں پر کسی قسم کی سزا نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ایران میں آزادی ہے۔ اگر کوئی شخص حق وانصاف اور ایمان داری سے ایران کی یونی ورسٹیوں کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق کرے گا کہ یہاں بحث ومباحثے تحقیق اور اظہار خیال کی پوری پوری آزادی ہے۔

ایران کے باہر بہت سے لوگ یہ جاننے کے مشتاق ہوں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جو اپنے کردار کے اعتبار سے کمیونسٹ ثابت ہوچکے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے ہی ہم وطنوں کو قتل کیا یا خیانت کرکے ملک کے اہم راز تک غیروں کو پہنچائے ان کو سزا دی جاچکی ہے لیکن کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے کئے پر پشیمان ہوچکے ہیں اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ انہیں شاہ اور وطن کی خدمت کا ایک بار پھر موقع دیا جائے اور ہم نے یہ موقع فراہم کرنا ہی زیادہ

مناسب سمجھا کیونکہ ہم نے سوچا کہ اگر واقعی یہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان ہیں تو ان کو شامل کر کے کیوں نہ ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ کر لیا جائے جو اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے صحت مند ہیں اور اگر ان کی بات میں صداقت نہیں ہے تو پھر بھی ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ ہم کو ان کی پوری کیفیت معلوم ہے اور وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کی کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں۔ ان میں سے بہت سے ایران کے ترقیاتی پروگراموں میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بعض نے ماہانہ رسائل بھی جاری کئے ہیں اور مضامین کے ذریعے اُن تجربات کو بیان کیا ہے جو انہوں نے کمیونسٹوں کے زیر اثر رہ کر اور ان کے ساتھ کچھ دن گذار کر حاصل کئے ہیں تاکہ عام لوگوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ انہوں نے کیوں اس روش کو ترک کیا اور ان کی زندگی میں اب کون سی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں کو اور دوسرے ملکوں کے بسنے والوں کو چاہیئے وہ آئینی آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں لیکن وطن سے غداری کرنے میں خود کو آزاد نہ سمجھیں۔

میری رائے میں اگر ایک طرف تخریبی طاقتوں کے لئے شدید ردّعمل کی ضرورت ہے تو دوسری طرف یہ بھی لازمی ہے کہ فرد کے ساتھ اس کے اظہار رائے میں نرمی برتنی چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اقوام جنہیں آزادی کی نعمت حاصل ہے اگر اس رویّے کو اپنائیں گی تو آخر کار انہی کو فائدہ حاصل ہوگا۔

تخریبی اور مفسدانہ کارروائیوں کی روک تھام کے سلسلے میں اہمیت اس بات کو دینا چاہیئے کہ اُن افعال کی مدافعت کرتے وقت اجتماعی عدل و انصاف کو انتقام اور سخت گیری کے جذبہ پر ہمیشہ ترجیح دی جائے اور اسی کے ساتھ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیئے کہ ایک ایسے ملک میں جس کی فوجی اعتبار سے اہمیت ایران جیسی ہو اگر کچھ لوگ اور خاص طور پر وہ جن کو باہر سے مدد مل رہی ہو غیر آئینی طریقوں سے حکومت کا تختہ الٹنا چاہیں تو ان کے خلاف فوری اور فیصلہ کن اقدامات عمل میں لانے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ آج دنیا کے ہر آزاد ملک کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیاسی حفاظت کا محکمہ قائم کرے جو حکومت کے دوسرے شعبوں کے تعاون سے تخریب کاروں کی کارروائیوں کا سراغ لگا کر ان کو ناکام بنا سکے۔ آج، موجودہ حالات کے پیش نظر کوئی اور روش اختیار کرنا احتیاط اور دور اندیشی کے قطعی منافی ہوگا۔

تخریب کاروں کا قلع قمع کرنے کے لئے محض پولیس کی مدد پر بھروسہ کرنا کوتاہ نظری ہوگی۔ کمیونسٹ تخریب کاروں یا دوسرے مفسدین سے مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کو ملک کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو اور عوام کی حمایت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ حکومت اجتماعی عدل و انصاف کو زیادہ سے زیادہ توسیع و ترقی دے۔

اجتماعی عدل کی تفصیل میں اگلی فصل میں بیان کروں گا۔ یہاں اِس قدر ہی کہوں گا کہ وسیع معنوں میں اجتماعی عدل سے میری مراد یہ ہے کہ عوام اپنے ملک کی حکومت میں شریک رہیں۔ سب کے لئے قانون یکساں ہو۔ عوام کی ضروریات

کو پورا کرنے کے لئے کافی مقدار میں اقتصادی وسائل ہوں اور اجتماعی مسائل کو اس طرح حل کیا جائے جیسے کہ میں آئندہ بیان کروں گا۔

پولیس کے ذریعہ تخریب کاروں کو ایک ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک دو سال تک دبایا جاسکتا ہے۔ لیکن اجتماعی عدل وانصاف ہو تو تمام تخریبی کارروائیاں خود بخود ختم ہوسکتی ہیں۔ اگر کوئی حکومت اپنی حدود میں کمیونسٹوں کا قلع قمع کر بھی دے تو ملک کے اجتماعی حالات تھوڑے ہی عرصے میں نئے لوگوں کو ابھرتے اور پروان چڑھنے کا موقع دیں گے۔ اور پرانے تخریب کاروں کے مٹنے تک یہ نئی جماعت ان کی خالی جگہ کو پُر کردے گی۔ یہ بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ داخلی کمیونزم کا مقابلہ صرف اجتماعی عدل وانصاف کے طریقے سے ہی ہوسکتا ہے۔

بیرونی سامراجی طاقتوں سے ہمارا واسطہ کافی عرصے سے ہے اور حق تو یہ ہے کہ ہم مقابلہ اور مجادلہ کرکے کچھ حد تک یہ سیکھ گئے ہیں کہ ان سے کس طرح معاملات طے کرنے چاہئیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم کبھی کسی سامراجی طاقت کی کالونی نہیں بنے لیکن بعض معاملات میں ہماری حالت کالونیوں سے بھی بدتر رہی ہے کیوں کہ سامراجی حکومتیں اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ اپنے حریفوں کو اپنی کالونیوں میں داخل نہ ہونے دیں اور وہاں استحکامی حالات برقرار رکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سامراجی طاقتیں اپنی کالونیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ وہاں مفید تعمیری کام بھی کرتی رہتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارا ملک سامراجی حریفوں کی کش مکش کا اکھاڑہ تو بنا رہا اور ہر بڑی حکومت یہ کوشش کرتی رہی کہ دوسروں سے زیادہ اپنا تسلط ہم پر قائم رکھے۔ اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ لیکن یہ حکومتیں ہم پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے اخراجات کو خود ہی تقسیم کرلیتیں اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے منصوبے تیار کرتی رہتیں چنانچہ اس قسم کا ایک منصوبہ ۱۹۰۷ء میں تیار کیا گیا تھا جس کی رو سے پورے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا اور بھی دوسرے معاملات میں یہ سامراجی طاقتیں ایران کے قومی مفاد کو نظرانداز کردیتیں یا بالکل پسِ پشت ڈال دیتیں۔

پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ایران سے برطانوی سامراجیت کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ خاتمہ اُس بڑی تبدیلی کا نتیجہ ہے جو پرانے سامراجی ڈھانچے میں آئی ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں میں برطانوی حکومت نے کروڑوں انسانوں کو آزادی دی ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنی رضا ورغبت سے کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فرانس کی فرسودہ حکومت بھی بڑی تیزی سے کامن ویلتھ کے رویئے کو اپنا رہی ہے اور ہر جگہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سامراجیت کے فرسودہ سرمایہ دارانہ نظام نے تمام کم ترقی یافتہ ممالک میں اقوام متحدہ کی تکنیکی مدد اور کولمبو پلان کی صورت میں باہمی تعاون کی شکل اختیار کرلی ہے۔

بعض انتہا پسند لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اس پرانے مفاد پسندانہ سامراجی نظام کو ازسرِ نو زندہ کر دیا ہے اور اس کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ امریکی فوجی مشیر، نکتہ چہار کے نمائندے اور بہت سی تجارتی کمپنیاں جو کئی ملکوں میں کھلی ہوئی ہیں بغیر کسی مصلحت کے کام نہیں کر رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کے مشن بھیج کر اور فوجی مدد پہنچا کر امریکہ چاہتا ہے کہ اپنے فوجی اڈے قائم کرے۔ اور اقتصادی طور پر چھا جائے۔

سچ تو یہ ہے کہ امریکیوں کے بارے میں میرا مشاہدہ اور تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم کو اُن سے جس احترام اور مساوی حقوق کی توقع تھی وہ ہم کو ملے۔ ہم نے امریکی نکتہ چہار اور فوجی مدد کو اس لئے بخوشی قبول کر لیا ہے کہ اس سے ہماری اقتصادی ترقی ہوگی اور آزادی کے اعلیٰ مقاصد کو تقویت ملے گی۔ ہم امریکہ کی تجارتی کمپنیوں کو اسی وقت تک برداشت کریں گے جب تک ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا وجود ہمارے مقاصد میں معاون و مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

امریکی حکومت نے کبھی پرانی سامراجی طاقتوں کی طرح ہم پر مسلّط ہونے کی کوشش نہیں کی اور اگر وہ اس بات کی کوشش کریں گے بھی تو ہم اس کو ہرگز برداشت نہ کریں گے۔ ہمارا یہ رویّہ نہ صرف امریکہ کے ساتھ ہے بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ بھی یہی رہے گا۔

میں نے سامراجیت کے دیو سے مقابلہ کرنے کے لئے دو طریقے سوچے ہیں پہلا طریقہ اگرچہ نیا نہیں ہے لیکن ہر ملک اور خاص طور پر وہ ممالک جو پورے طور پر ترقی یافتہ نہیں ہیں اس بات پر پوری توجہ دیں۔ اور یہ معلوم کریں کہ "بھیانک خطرہ" کس طرف ان کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ اپنے تجربات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ کمیونسٹ سامراجیت سب سے بڑا خطرہ ہے اور کم ترقی یافتہ ممالک اس خطرے سے باخبر رہیں کیونکہ یہ نئی سامراجیت حقیقی قوم پرستی کا زرق برق جامہ اوڑھ کر ان ملکوں کے سامنے آتی ہے جو ترقی کی راہ پر ہیں اور اُن ممالک میں قومی تحریک کی شکل اختیار کر کے داخل ہوتی ہے اور اندر ہی اندر ان کو ختم کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سامراجیت منفی قوم پرستی اور تخریب کاری کی بنیاد پر اپنا کام کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فتنے فساد اور بے چینی کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔

یہ عمل بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی گوشت خور گوشت کو خوب گلا کر نرم کر لے تاکہ ہضم کرنے میں آسانی ہو۔ مصدّق کے عہد میں ہم نے یہ ساری کیفیات اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہی وطن میں دیکھیں۔ اس کے دور میں ہمارا ملک اس نئی سامراجیت کے رحم و کرم پر تھا اس مصیبت کے چنگل میں اور بھی کئی ملک پھنس کر اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے محروم ہو چکے ہیں۔

دوسرا نتیجہ جو میں نے اخذ کیا ہے کہ سامراجیت خواہ نئی ہو یا پرانی اس سے مقابلہ کرنے کے لئے کسی قسم کا ڈر یا خوف یا عجز و انکسار سب بیکار ہیں۔ ہم نے اپنے اور دوسروں کے تجربات سے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ اس امر میں ثابت قدمی بہت ضروری ہے۔ اور یہ ثابت قدمی اور استواری قوم کے مختلف فرقوں کے درمیان برابری اور مساوات کے حقوق کی بنیاد پر ہونی چاہیئے۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تمام چھوٹے چھوٹے ملک اپنے پڑوسی ملکوں کا ہمّت اور حوصلے سے مقابلہ کریں۔ اور ان

کی عظمت اور طاقت سے قطعی مرعوب نہ ہوں۔ اس کے علاوہ تمام چھوٹے چھوٹے ملکوں کو چاہیئے کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق اپنے دوستوں کے ساتھ مشترکہ دفاع اور تحفظ کے لئے عہدِ دوستی استوار کریں۔

مشرق وسطیٰ اور ایران کے دفاعی موضوع پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا لیکن یہاں اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ سامراجیت کا مقابلہ ہمیشہ طاقت سے کرنا چاہیئے۔ اور یہ طاقت قومی اتحاد اور بین الاقوامی سطح پر طاقتور دوستوں کے درمیان دوستی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔

آج ساری دنیا میں تمام آزادی پسند لوگوں کے سامنے ایک بہت ہی بھیانک خطرہ ہے کوئی بھی باہمت قوم اُسی وقت ان خطروں کا مقابلہ کر سکتی ہے جب اس کو اپنے دوستوں کا تعاون حاصل ہو کیونکہ اس تعاون سے ہی اس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی مثبت قوم پرستی کی پالیسی کی وجہ سے جو ہمارے رگ و ریشہ میں ہمارے درخشاں ماضی کے ساتھ رچی بسی چلی آرہی ہے اپنے ملک میں اور ملک سے باہر سرخ روئی اور عزت حاصل کی ہے۔

ہم اپنے دوستانہ تعلقات سے جو تقریباً دنیا کے سب ہی ممالک سے ہیں بیحد خوش ہیں جس طرح سے ایک آدمی مصیبت کے وقت اپنے دوستوں پر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح ہم بھی اپنے دوستوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ ہم ہر وقت اس بات کے لئے تیار ہیں کہ دوستی کے حلقے کو اور زیادہ وسیع کریں۔ اور اسی کے ساتھ ہم سامراجیت کو روکنے کے لئے اُن کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں۔

۷۔ نئے تمدّن کو قبول کرنے کا مسئلہ

۱۹۵۸ء میں میں نے مشرق بعید کا سفر کیا تھا۔ اس وقت مجھے کناڈا کے سابق وزیر خارجہ مسٹر لسٹر پیرسن کی ایک بات یاد آگئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ کوکا کولا کبھی بھی کنفیوشس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں یہ بات اُن تمام ممالک پر صادق آتی ہے جو اقتصادی اعتبار سے تو کم ترقی یافتہ ہیں لیکن مغرب کی رَو میں بہہ کر خود کو مصیبت میں ڈال لیا ہے۔ اب ایران کو ہی لے لیجئے۔ اس کا تمدّن بہت سی مغربی اقوام کی بہ نسبت زیادہ قدیم ہے اور بعض اعتبار سے بہت ہی وسیع اور عمیق ہے۔ اگر مغربی اقوام بعض باتوں میں ہمیں متمدّن بنا سکتی ہیں تو ہم بھی ان کو اپنی تہذیب کی بہت سی قدیم اور سود مند چیزیں دے سکتے ہیں۔

ایران میں کئی ایسے کارخانے ہیں جو لوگوں کے لئے نہایت صفائی اور صحت کے اصولوں کے تحت عصرِ حاضر کی سب سے زیادہ عام استعمال میں آنے والی مشروبات (کوکا کولا اور پیپسی کولا وغیرہ) تیار کرتے ہیں۔ شاید غلط نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ یہ کارخانے موجودہ تہذیب کے پُر فریب جال ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ ہم نے مغربی تمدّن کو کن بنیادوں پر اپنایا ہے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک کی کئی صدیوں تک سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیشرو کی حیثیت رہی ہے لیکن قاجاریوں کے طویل دَورِ حکومت میں یہ ترقی رُک گئی اور علم و دانش کے سوتے بالکل خشک ہو گئے لیکن اس عرصے میں کئی چھوٹی چھوٹی یورپین قومیں آگے بڑھیں اور علم و ہنر کو حاصل کرنے اور اس کو پھیلانے کے لئے انہوں نے جدوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ ہم بالکل پیچھے رہ گئے۔ آج ہمیں مغربی علوم سیکھنے کے لئے بڑے راستے کو طے کرنا ہے اور یہ راستہ طے کر کے ان تک پہنچ جانا ہی کافی نہیں بلکہ ان سے آگے بھی بڑھنا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے طور طریقے اور حالات مغرب سے بہت مختلف ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ یورپی علم و فنون سے وہ چیزیں جو ہمارے ملک کی ضروریات کے متقاضی ہیں اپنا لیں اور اپنے ذوق اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان میں تبدیلیاں کر لیں۔ یا دوسرے الفاظ میں اگر ہم مغربی علوم و فنون کو اپنے تمدّن کے ساتھ اور اپنے تمدّن کو علوم و فنون کے ساتھ

ہم آہنگ کرلیں تو ہم اس راہ میں پیشرو شمار کئے جائیں گے۔ میری دُور رس آنکھیں وہ دن دیکھ رہی ہیں جبکہ ہماری یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل لڑکے اور لڑکیاں اپنی ماضی کی درخشاں روایات کو لے کر آگے بڑھیں گے تو ایرانی قوم کو دنیا میں مغرب و مشرق اور قدیم و جدید کے درمیان امتزاج پیدا کرنے میں مقامِ رہبری حاصل ہوگا۔

مغرب سے ہمارے تمدنی تعلقات آج کے نہیں بلکہ صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ مقدونیہ کو آج مغرب کا ہی ایک حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ سکندر اعظم اسی علاقے کا رہنے والا تھا جس نے ۳۳۱ قبل مسیح میں ایران کو فتح کیا تھا اور ہم نے ۲۶۰ء میں قیصر روم والرین[1] کو میدان جنگ میں قید کیا تھا۔ یہ شخص بڑا تجربہ کار اور مشہور انجنیئر تھا۔ اُس نے اپنے فن سے ہمارے ملک میں کتنے ہی مفید کام کئے اور وہ چیزیں ہمارے لئے مہیا کیں جن کو آج کی اصطلاح میں مغربی تمدن کی دین کہا جا سکتا ہے کیونکہ ایران کے بادشاہ شاپور نے اس کو اور اس کے بہت سے سپاہیوں کو جو جنگ میں قید ہوئے تھے خوزستان بھیج دیا تھا اس لئے انہوں نے وہاں دریاؤں پر باندھ تعمیر کئے جن کے کھنڈرات آج بھی نظر آتے ہیں اور چند سے تو تھوڑے عرصے پہلے تک سنچائی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

پچھلی صدیوں میں جو بھی سپاہی، مہم جو، سیاح، تاجر اور مبلّغ دین مغرب سے ایران آئے انہوں نے یہاں کے واقعات تفصیل سے قلمبند کئے ہیں۔ مارکو پولو کو جدید علم جغرافیہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ وہ ۱۲۷۱ء میں وینس سے ایران آیا اور کافی عرصے تک یہاں مقیم رہا۔ یہاں رہ کر اس نے فارسی زبان سیکھی جس کو وہ بہت روانی سے بول سکتا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے "ایران بہت بڑا ملک ہے۔ قدیم عہد میں یہ بہت مشہور و معروف اور طاقتور تھا لیکن اب تاتاریوں کے ہاتھوں برباد ہو چکا ہے"۔ آگے چل کر ہرمز جزیرے کے متعلق لکھتا ہے "ہندوستانی تاجر جہازوں میں گرم مسالے، ہیرے جواہرات، موتی، ریشم، زری کے کپڑے اور ہاتھی دانت وغیرہ لاد کر لاتے ہیں اور اس کو جزیرے کے تاجروں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں"۔ مارکو پولو نے جو عجیب و غریب چیزیں اس ملک میں دیکھیں اور ان کو اپنے سفرنامے میں درج کیا ان کو پڑھ کر وینس کے دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ایران کے سفر کا شوق پیدا ہوا۔

چودھویں صدی عیسوی میں تیمور لنگ (جس کی قلمرو میں ایران بھی شامل تھا) کو انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم سے مراسلت کرنے کا خیال آیا۔ ان دنوں جان گرین لا[2] نامی ایک انگریز راہب تبریز میں مقیم تھا۔ تیمور نے اس کو اپنا سفیر مقرر کر کے ہنری چہارم کے دربار میں بھیجا۔ اِسی دوران میں کاسٹیل[3] کے بادشاہ ہنری سوم نے روے گونزالز ڈی کلاویجو[4] نامی شخص کو تیمور کے دربار میں ایلچی بنا کر بھیجا۔ یہ ایلچی تیمور کے باعظمت اور پُرشکوہ خیموں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "ایک خیمہ اتنا بڑا اور اس قدر اونچا تھا کہ دور سے اچھا خاصہ قلعہ معلوم ہوتا تھا"۔ اور یہی شخص امیر تیمور کے عدل و انصاف کے متعلق لکھتا ہے کہ "جب کبھی کسی بڑے آدمی کو سزائے موت دی جاتی تھی تو اس کو دار پر لٹکایا جاتا تھا اور معمولی آدمی کی گردن ماردی جاتی تھی"۔

جزیرہ ہرمز کی رونق اور گرم بازاری نے پرتگالیوں کی توجہ کو بھی اپنی طرف مرکوز کیا۔ چنانچہ ۱۵۰۸ء میں انہوں نے اس پر حملہ کر کے اپنا قبضہ کر لیا۔ تقریباً نصف صدی بعد ۱۵۶۱ء میں انتھونی جنکنسن[5] نامی ایک انگریز تاجر بحر بالٹک پار کر کے

1. VALERIAN 2. JOHN GREENLAW 3. CASTILE
4. RUY GONZALEZ DI CLAVIJO 5. ANTHONY JENKINSON

روس کے راستے سے ایران میں داخل ہوا تاکہ اسی راستے سے ایران اور انگلستان کے درمیان تجارتی روابط قائم کر سکے۔ اس کو صوبہ گیلان کا ریشم بیحد پسند آیا۔ اس نے کچھ مال خریدا بھی لیکن ایک تو بار برداری کے خرچ کی زیادتی کی وجہ سے اور دوسرے روسیوں کی مخالفت کے باعث اس کو وہ فائدہ نہ ہوا جس کی اس کو امید تھی۔ سولہویں صدی کے اواخر میں روبرٹ نیوبری[1] نامی ایک اور انگریز تاجر خلیج فارس کے کنارے بندرگاہ عباس میں لنگر انداز ہوا۔ وہ ایران اور ایشیائے صغیر سے ہوتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا۔ یہ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ شرلی برادرز (سر آنتھونی اور سر رابرٹ) نے کس طرح شاہ عباس کی مدد کی اور شاہ عباس نے عیسائی تاجروں کو جو ایران سے تجارتی تعلقات بڑھانا چاہتے تھے بہت سی مراعات بخشیں اور آج بھی ایرانیوں کے دل میں غیر ملکی تاجروں کے لئے وہی دوستانہ جذبہ موجود ہے۔

سنہ ۱۶۱۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شیراز میں ایک فیکٹری قائم کی (ان دنوں یہ فیکٹریاں ٹریڈنگ اسٹیشن کہلاتی تھیں) پانچ سال بعد یعنی سنہ ۱۶۲۲ء میں ہم نے انگریزوں کی مدد سے جزیرہ ہرمز پر حملہ کیا اور اس کو پرتگالیوں کے پنجے سے چھڑا لیا۔ اس حملے کی وجہ سے پرتگالیوں کی خلیج فارس میں ساکھ خراب ہوگئی اور اس کی بجائے انگریزوں کی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس سے اگلے سال شاہ عبّاس نے ولندیزیوں کو بندرگاہ عبّاس میں تجارتی کمپنی قائم کرنے کی اجازت دیدی سنہ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسیوں نے بھی بندرگاہ عبّاس اور اصفہان میں تجارتی منڈیاں قائم کرلیں لیکن انگریزوں کی روز افزوں ترقّی کی وجہ سے فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کو وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔

سترھویں صدی میں سر تھومسن ہربرٹ نامی ایک انگریز اور سر جان شاردن فرانسیسی نے (جو انگریز بادشاہ کی ملازمت میں آگیا تھا) الگ الگ ایران کا سفر کیا اور اپنے سفر کے حالات قلمبند کئے۔ روسیوں کا پہلا سیاسی وفد جو دو ایلچیوں اور آٹھ سو ملازمین پر مشتمل تھا امپرر الکزیس[2] کی طرف سے سنہ ۱۶۶۴ء میں ایران بھیجا گیا۔ سنہ ۱۷۰۸ء میں پیٹر اعظم کا سفیر اصفہان آیا اور اس کے سات سال بعد دوسرا سفارتی وفد اس طرف روانہ کیا گیا۔ روسیوں کے ایران پر حملے اور موجودہ تعلقات کے بارے میں تفصیل سے پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے مغربی دانشمند اور سیاسی مرتبے کے لوگ ایران میں آئے۔ ان میں "حاجی بابا اصفہانی" سفرنامے کا مصنف جیمس موریا اور تاریخ ایران کا مولف سر جان مالکم بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں نے اہل یورپ کے دلوں میں فارسی ادب کا ذوق و شوق پیدا کیا اور انہی لوگوں کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ وہاں کے لوگوں نے میرے ملک کے حالات میں گہری دلچسپی لینا شروع کی۔

امریکہ کے عیسائی مبلغین ایران اور امریکہ کے درمیان تعلقات پیدا کرانے میں پیشرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مبلّغین کی سب سے پہلی جماعت سنہ ۱۸۲۹ء میں ایران میں وارد ہوئی اور جلد ہی انہوں نے ایک اسکول قائم کرلیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اور بھی کئی اسکول اور ہسپتال کھولے۔ انہی میں سے ایک اسکول تہران کا مشہور و معروف مدرسۂ البرز ہے اور آج کی بہت سی ایران کی اہم شخصیتیں اسی اسکول کی پیدا کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک سے عیسائی مبلغ ایران آئے

1. ROBERT NEWBERRY 2. EMPEROR ALEXIS

اور یہاں رہ کر تبلیغی کام کرتے رہے۔ چنانچہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ جان گرین لا چودھویں صدی میں اور سترھویں صدی میں اور بھی بہت سے مبلغ یورپ کے مختلف ممالک سے ایران آئے اور یہاں اپنا بڑا گہرا اثر چھوڑا۔

۱۸۸۳ء میں امریکی سفارت خانہ تہران میں قائم ہوا۔ امریکہ کے وزیر مختار ایس۔ جی۔ ڈبلو۔ بنجامین نے ایران کے متعلق دو کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی سے اب تک ہمارے اور امریکہ کے درمیان تعلقات برابر بڑھ رہے ہیں اور ہم دن بدن ایک دوسرے کے قریب آتے جارہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب ۱۹۰۹ء میں رجعت پسندوں اور جمہوریت نوازوں کے درمیان تبریز میں فساد ہوا تو امریکی مشنری کے ایک اسکول ٹیچر ہاورڈ باسکرول[1] نے ہمارے ۱۹۰۶ء کے آئین کی حفاظت کی خاطر اپنی جان دیدی۔

ایران پر مغربی تمدن کے اثرات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات کو کبھی فراموش نہ کریں کہ آج جو "مغرب پرستی" سے مُراد لی جاتی ہے وہ خود مغربی اقوام کے لئے ایک نئی چیز ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے پچاس سال میں امریکہ کے رہن سہن کے طریقوں میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ نہ صرف پچھلے پچاس سال میں بلکہ گذشتہ دس سال میں ہی بہت بڑا فرق آگیا ہے۔ میں امریکہ تین بار گیا ہوں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں، دوسری بار ۱۹۵۵ء میں اور تیسری دفعہ ۱۹۵۸ء میں۔ دوسری اور تیسری بار جب میں وہاں پہنچا تو میں نے ہر بار کچھ ایسی تبدیلیاں پائیں جو اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ اس تیزی سے جو ترقی ہورہی ہے اور تبدیلیاں آرہی ہیں اس کے اسباب و علل کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ امریکہ میں آج کل جو رقم سائنس کی تحقیقات اور ترقیات پر خرچ ہورہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو وہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اس مد پر خرچ کیا کرتا تھا۔ اور اسی نسبت سے اس کو فائدہ بھی حاصل ہوا۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ نے مغرب پرستی کی وجہ سے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی اور کم و بیش ترقی کی یہی رفتار میں نے انگلستان، فرانس، جرمنی، روس اور دوسرے ممالک میں جاکر دیکھی ہے۔ کسی کم ترقی یافتہ ملک کے لئے مغربیت کو اپنانے کے سلسلے میں بعض امریکی اور یورپی انجنیئروں اور ماہرینِ اقتصادیات کے مخصوص نظریات ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان ممالک میں جدید تکنیکی طریقوں کو اپنانے کے لئے فضا سازگار نہیں ہے۔ ان کو چاہیئے کہ بہت ابتدائی دور سے اس کام کو شروع کریں۔ مثال کے طور پر ابھی وہ ان طریقوں کو استعمال کریں جو امریکہ میں خانہ جنگی کے دوران مستعمل تھے۔ ان نظریات کے حامیوں میں سے بعض ہمارے ملک کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ ایران میں معمولاً اب بھی کسان لکڑی کے ہل سے جس کا صرف پھل لوہے کا ہوتا ہے زمین جوتتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایرانیوں کو سردست وہی ہل دیئے جائیں جو امریکہ میں خانہ جنگی کے عہد میں استعمال ہوتے تھے اور ان کو ٹریکٹر یا جدید آلات دے کر ان کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ابھی تک ان اوزاروں کے استعمال سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے وہ ان کی صحیح طور پر دیکھ بھال بھی نہیں کرسکتے۔ اس طرح ان انجنیئروں اور ماہرین اقتصادیات کی ان کم ترقی یافتہ ممالک کے متعلق یہ رائے ہے کہ ان کو پیچیدہ اور غیر معمولی فنی مشینیں (جیسے آٹی ہیونگ، الکٹرونک اور فضانوردی کا سامان) بھی استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ ممالک تمدن کی ابتدائی منازل سے گذریں تاکہ آگے چل کر ترقی کی راہوں پر دوڑ سکیں۔

1. HAWARD BASKER VILLE

ایران کے متعلق ان انجنیئروں اور ماہرینِ اقتصادیات کا یہ نظریہ ہے تو میں اس سے قطعی طور پر متفق نہیں ہوں اور مندرجہ ذیل دلائل میرے اس اختلاف کے محکم دلائل ہیں۔

تہران کے بین الاقوامی ہوائی اڈّے کے قریب آج بھی اونٹوں کے قافلے آس پاس کے دیہات سے مختلف قسم کا سامان لاتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہی ہوائی اڈّہ جو ۱۹۵۸ء میں بن کر تیار ہوا یورپ اور امریکہ کے بہت سے ہوائی اڈّوں سے اپنے ساز و سامان اور جدید آلات کے اعتبار سے کہیں بہتر ہے۔ اس کو ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ تہران کی مدّتوں سے یورپ اور مشرقِ بعید کے ہوائی راستوں پر خاص اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں جو ہوائی راستوں کا جال پھیلا ہوا ہے اُن کا مرکز بھی یہی ہوائی اڈّہ ہے۔

دوسری طرف لوگوں کا ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرنے کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک ہوائی جہاز سے سفر کرنے والوں کی تعداد دس گنا ہو چکی ہے۔ چنانچہ اقتصادی، تیز رفتاری اور لوگوں کے اطمینان کے پیشِ نظر ہم نے بعض راستوں پر جدید ترین ہوائی جہازوں کا استعمال شروع کر دیا ہے اور جیٹ جہازوں کا استعمال تو ہوائی فوج میں ہو ہی رہا ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں جو پسٹن ٹائپ کے لڑاکا ہوائی جہاز استعمال ہوتے تھے وہ اب متروک ہو چکے ہیں اور ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

آج مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا دودھ پاسچور کرنے کا کارخانہ تہران میں ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ کارخانہ اپنی وسعت کے اعتبار سے دنیا کے کسی جدید دودھ پاسچور کرنے والے کارخانے سے کم نہیں۔ اگرچہ پُرانے ڈھنگ کے کارخانے سے بھی ہمارا کام چل سکتا تھا لیکن نیا کارخانہ اپنی صفائی اور کام کی خوبی کے اعتبار سے اُس سوسائٹی کے لئے زیادہ مناسب ہے جس کے لئے ہم اس وقت ترقیاتی کام کر رہے ہیں۔

شیراز میں نمازی ہسپتال نہ صرف اپنی طرز کا جدید ہسپتال ہے بلکہ بقول اس امریکی ماہر کے جو ہسپتال کے انتظامیہ میں شامل ہے یہ مشرقِ وسطیٰ کا ہر اعتبار سے بہترین ہسپتال ہے۔

ایران، جہاں کئی صدی پہلے دنیا کا مشہور حکیم بوعلی سینا پیدا ہوا تھا ایک بار پھر اپنے ماضی کی طرف لوٹ کر قدیم طرز کا ہسپتال قائم کر سکتا تھا لیکن یہ ہسپتال یقیناً پورے طور پر لوگوں کی خدمت کا حق ادا نہ کر پاتا۔ اگرچہ ہم وہ دوائیاں بھی استعمال کر سکتے تھے جو قدیم عہد میں ہوتی تھیں لیکن شاہی سوشل سروس کا ادارہ اس کی بجائے نئی سے نئی غیر ملکی دوائیں اور اینٹی بیوٹک کو شہروں، قصبوں اور دور دراز علاقوں میں پہنچا کر ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم تک شہر تہران میں سواری اور نقل و حمل کے لئے تانگے اور بگھیاں استعمال ہوتی تھیں لیکن آج تقریباً دس ہزار ٹیکسیاں سڑکوں پر دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ۱۹۵۸ء سے وہی دو منزلہ بسیں جو لندن میں چلتی ہیں تہران کی سڑکوں پر بھی بہت بڑی تعداد میں نظر آنے لگی ہیں۔ میرا ملک جس کو اقتصادی اعتبار سے پس ماندہ کہا جاتا ہے اس کا پایۂ تخت اس تیزی سے وسعت

پا رہا ہے کہ اب ہم بڑی سنجیدگی سے زمین دوز ریلوے لائن بچھانے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔

ہمارے ملک کے دیہی علاقوں میں بے چارہ غریب اور بے زبان گدھا ہی ایک ایسا جانور ہے جس سے صدیوں سے باربرداری کا کام لیا جا رہا ہے۔ ایک دفعہ تو یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک آدمی گدھے پر سوار ہے۔ گدھا اپنی راہ چلا جا رہا ہے اور یہ آدمی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کار چلاتے وقت کوئی آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کا افسوس ہے کہ ہمارے کھیتوں سے گدھوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ دیہاتوں میں جیپ کے استعمال کا رواج بھی بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہم نے ایران میں ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا ہے جہاں فی الحال باہر کے ملکوں سے منگائے ہوئے جیپ کے الگ الگ پُرزوں کو ایک ساتھ جوڑا جاتا ہے اور اس طرح سینکڑوں جیپ گاڑیاں لوگوں کے استعمال کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔ اب وہ دن دُور نہیں جبکہ ہمارے ہی ملک میں سارے پُرزے بنائے جایا کریں گے اور شروع سے آخر تک جدید ترین ڈیزائن کی جیپ گاڑیاں یہاں سے تیار ہو کر نکلا کریں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کی موٹریں بنانے والی مشہور کمپنیاں اپنے کارخانے ہمارے ملک میں قائم کریں کیونکہ نئے ٹایر بنانے اور پُرانے ٹایر مرمت کرنے کا کارخانہ ہم پہلے ہی قائم کر چکے ہیں۔

اب سے پہلے تہران میں ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک اور گھروں میں خطوط یا زبانی پیغام چپراسیوں اور ملازموں کے ہاتھ بھجوائے جاتے تھے اب یہی کام بہت ہی اچھے طریقے پر ٹیلیفون انجام دیتے ہیں۔ اگرچہ اپنے بزرگوں کی طرح ہم بھی دوسرے شہروں سے ٹیلیگراف کے ذریعے پیغام پہنچا کر رابطہ قائم رکھ سکتے تھے لیکن اِس کے بجائے ہم نے ٹیلیفون کے تار تمام پہاڑوں اور صحراؤں میں بِچھانا مناسب سمجھا اور ابھی اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمارا ارادہ تو یہ ہے کہ رسل و رسائل کے جو جدید ترین برقیاتی طریقے ہیں ان کو بھی استعمال کریں۔ جنوب مغربی ایران میں کوہ الوند کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ اگر اس پہاڑ کے دامن میں ریل سے سفر کریں تو آپ کو اس پہاڑ کی اونچی چوٹیوں پر برقی ٹیلیفون کی لہریں پکڑنے والے برج نظر آئیں گے۔ یہ برج اس بڑھتے ہوئے ریڈیو ٹیلیفون سسٹم کا ہی ایک حصّہ ہیں جس کی توسیع کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لوہے کے بھاری ستون اور پیغام رسانی کے نازک سامان کو ہزاروں آدمیوں نے جانوروں کی مدد اور اپنی سر توڑ کوشش سے سات آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا کر یہاں نصب کیا ہے۔ ایران کا ریڈیو ٹیلیفون سسٹم نہ صرف پورے ملک میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک صاف آواز پہنچاتا ہے بلکہ اس کے ذریعے دوسرے ممالک سے بھی بہتر طریقے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اگر میں یہ کہتا ہوں کہ میرے ملک میں جدید ترین تکنیکی اور صنعتی سامان و آلات کا عام استعمال ہونا چاہیئے تو اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ وہ کام جو اقتصادی اعتبار سے مفید نہیں ہیں ہم ان پر بھی اپنی کوششیں صرف کریں۔ مثال کے طور پر میں اس کے بالکل حق میں نہیں ہوں کہ بعض ملکوں کی دیکھا دیکھی محض شہرت اور نام آوری کی خاطر فولاد کا کارخانہ ہم بھی لگائیں کیونکہ فولاد سازی کے کارخانے کے لئے کافی مقدار میں پانی، کچا لوہا، پتھر کا کوئلہ اور چونا بنیادی طور پر ضروری ہیں۔ اور کارخانہ چلانے کے لئے

تکنیکی ماہرین و منتظمین اور تجربے کار کاریگر بھی اتنے ہی اہم ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی یہاں بجلی، باربرداری کے وسائل اور فروخت کے لئے منڈیوں کا ہونا بھی لازمی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے یہ اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ اقتصادی اعتبار سے ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنے ملک میں ایک بہت ہی معقول اور جدید طرز کا کارخانہ قائم کر سکیں۔ چنانچہ ہم نے محض شہرت کی خاطر نہیں بلکہ اقتصادی ضروریات کے پیش نظر فولاد سازی کا کارخانہ کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایران جیسے ملک میں مغربی علوم و فنون کو منتقل کرنے اور صحیح طریقے پر ان سے کام لینے کے لئے گہری اور دقیق نظر کی ضرورت ہے اور اپنے ماحول کے مطابق اس میں ترمیم بھی ضروری ہے۔ یہ کام ہمارے ملک کے وہی نوجوان کر سکتے ہیں جو یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلے ہیں اور اپنے علم کی تکمیل اور نئے مغربی علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے ملک سے باہر پڑھنے گئے ہیں۔ ان نوجوانوں کا فرض ہے کہ تحصیلِ علم اور تحقیق کے دوران یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کس طرح یہ نئے علوم و فنون ان کے ملک کے ماحول کے لئے سازگار اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ سائنس کے ایسے بہت سے شعبے اور ان کی اختراعات ہیں جن کو ہم فطری اور غیر ارادی طور پر اپنا لیتے ہیں لیکن بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے لئے غور و فکر اور تحقیق و مطالعے کی سخت ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کے ایک متمول اور معتبر تاجر کے لڑکے نے ہارورڈ گریجویٹ اسکول آف بزنس اڈمنسٹریشن میں تعلیم حاصل کی اور پڑھائی کے دوران اس نے ایک تحقیقی رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا "موجودہ ٹیلیویژن کی نشریات کس طرح ایرانی ضروریات کو پورا کر سکتی ہیں۔" اپنے وطن آنے کے بعد وہ پہلا شخص تھا جس نے ایران میں ٹیلیویژن کی صنعت قائم کی۔ ہمارے ملک کے ایک اور نوجوان نے سات سال تک زراعتی انجنیئری کی تعلیم انگلستان میں حاصل کی جہاں دنیا کے دوسرے ممالک کی نسبت زراعتی کام زیادہ تر مشینوں سے ہوتا ہے۔ تحصیلِ علمِ زراعت کے دوران وہ اس مسئلے پر غور و فکر کرتا رہا کہ اس کی تعلیم کس طرح اس کے اپنے ملک کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے۔ اسی اثنا میں اس نے ایک انگریز عورت سے شادی کر لی۔ وطن آنے کے بعد اس نے اپنی معلومات کو یہاں کے ماحول اور ضروریات کے مطابق سازگار کیا اور تہران سے پندرہ میل کی دوری پر ایک فارم پر کامیاب تجربات شروع کر دیئے اور جدید زراعتی طریقوں کی مدد سے کاشت شروع کر دی اور اب لمبے ریشے کی روئی، مختلف قسم کے میوے اور سبزیاں کافی مقدار میں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بہترین قسم کے امریکی چوزے بھی وہاں نکالے جا رہے ہیں۔

کسی قوم کی زندگی کو جدید اصولوں پر ڈھالنے سے پہلے اس کے لئے پروگرام مرتب کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا حملے سے پہلے جنگی نقشہ تیار کرنا۔ ۱۹۴۸ء میں جیسے ہی میرے ملک نے جنگ سے پیدا شدہ خلفشار اور پریشانیوں سے سنبھلنا شروع کیا تو حکومت نے امریکہ کی ایک تجربے کار فرم کو جو ماہر انجنیئروں پر مشتمل تھی ایران آنے کی دعوت دی اور اس فرم کے افراد سے کہا گیا کہ وہ ایران میں اقتصادی توسیع و ترقی کے امکانات کی جانچ کریں اور ہم کو یہ مشورہ دیں کہ ہم اپنی تیل کی آمدنی کو کس طرح ملک کی صنعتی اور سیاسی ترقی اور تجدید میں خرچ کریں۔ اسی سال فرم کے انجنیئروں نے اپنی ابتدائی مراحل کی رپورٹ

چنانچہ ہم نے فوراً ہی [illegible]

اداروں اور فرموں کو ایران بلایا تاکہ وہ بھی ہمارے منصوبوں کی تکمیل میں حصہ لیں۔ ماہرین و متخصصین کی اس جماعت نے اپنی مفصل رپورٹ پانچ جلدوں میں پیش کی جس میں سات سالہ ترقیاتی پروگرام کا مکمل نقشہ بڑے غور فکر اور دقیق نظری کے بعد پیش کیا جس میں ہمارے ہر اقتصادی پہلو کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس رپورٹ کی روشنی میں ہم نے صحت تعلیم، زراعت، صنعت، کان کنی، تیل کی مصنوعات وغیرہ کی توسیع و ترقی کا منصوبہ تیار کیا۔

امریکی ماہرین و متخصصین کی سفارشات کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا جس کی سب شرائط کو ممبران نے تسلیم کر کے پہلے سات سالہ ترقیاتی منصوبے کا قانون پاس کر دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد تقریباً ایک خود مختار محکمہ قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر پروگرام کے مطابق عمل درآمد کرے اور تیل کی آمدنی سے حاصل ہونے والی رقم کو حکومت کے دوسرے شعبوں پر خرچ کرنے کی بجائے اس منصوبے کی تکمیل کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اس منصوبے کے کُل مصارف کا تخمینہ چالیس کروڑ ڈالر لگایا گیا تھا۔ جس میں سات سال تک اوسطاً ۵ کروڑ اسّی ہزار سالانہ خرچ کرنا تھا۔ ان مصارف کو پورا کرنے کے لئے چار کروڑ ڈالر سالانہ تیل کی آمدنی سے امّید تھی اور باقی اخراجات کی فراہمی کے لئے ملک کے اندر اور باہر سے قرضے لینے کی تجویز تھی۔

ہمارا یہ سات سالہ منصوبہ تقریباً ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی ایسی انتظامی دشواریاں جن کی کوئی توقع نہ تھی ہماری راہ میں آئیں۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ تیار کرنے والوں نے انتظامی مسائل اور اس کی دشواریوں پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ بھی ہم کو معلوم ہوا کہ تیل کی آمدنی کو الگ کر کے حکومت کے معمولی کاموں کو چلانا بھی قطعی دشوار ہے۔

تیل کی آمدنی سے جس قدر رقم پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے اس منصوبے پر خرچ کرنے کے لئے مقرر کی تھی اس سے بہت ہی کم منصوبہ بندی کے محکمے کو ملی۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۹ء میں تیل سے آمدنی تین کروڑ اسّی لاکھ ڈالر ہوئی جس میں سے منصوبہ بندی محکمے کو ڈیڑھ کروڑ ڈالر دیئے گئے۔ اس سے اگلے سال تیل کی آمدنی ساڑھے چار کروڑ ڈالر سے زائد ہوئی مگر منصوبہ بندی کے محکمے کو صرف تین کروڑ بیس لاکھ ہی ملے۔

ہمارے پہلے سات سالہ منصوبے کی ناکامی کی پوری ذمہ داری مصدق پر آتی ہے کیونکہ تیل کے معاملے میں اس نے جو رویّہ اختیار کیا تھا اس سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ منصوبہ بُری طرح ناکام ہوگا اور عام آدمی کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ تیل کی آمدنی صفر کو پہنچ گئی (بلکہ صفر سے بھی نیچے گر گئی کیونکہ حکومت کو تیل کی کمپنی کے ملازمین کو اپنے پاس سے نہ صرف تنخواہ دینی پڑی بلکہ جب کام بند پڑا تھا اس وقت کے بھی تمام مصارف برداشت کرنا پڑے) اور تیل کی آمدنی بند ہو جانے سے ایک طرف تو حکومت کے کاموں میں خلل واقع ہونے لگا اور دوسری طرف قومی ترقیاتی منصوبہ مشکلات میں پڑ گیا۔

۱۹۵۳ء میں مصدق کے زوال کے بعد تیل کی آمدنی دوبارہ بڑھنی شروع ہوئی اور ہم نے اپنے پہلے سات سالہ

منصوبے کو از سر نو شروع کیا۔ منصوبہ بندی کے محکمے کی نئے سرے سے تنظیم و توسیع کی گئی۔ منصوبہ بندی کے محکمے اور حکومت کے مختلف شعبوں کے دل پژمردہ ہو چکے تھے۔ ان کی پھر سے حوصلہ افزائی کی گئی اور منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچنے لگا۔ اسی اثنا میں ہم نے دوسرے سات سالہ منصوبہ کا مسودہ تیار کر لیا چنانچہ مارچ ۱۹۵۶ء میں میں نے اس پر دستخط کئے اور اس کے اجراء کے لئے پارلیمنٹ نے بل منظور کر دیا۔

ترقیاتی اور تعمیری کاموں کو انجام دینے کے لئے میں بھی اپنے والد کی طرح کبھی سستی اور کاہلی کو پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ اس وقت ہمارا دوسرا سات سالہ منصوبہ کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن ابھی تک ہمارے بہت سے بنیادی ترقیاتی کام منظر عام پر نہیں آسکے ہیں کیونکہ اس کے لئے غیر ملکی ماہرین کی مدد سے بڑے غور و فکر کے ساتھ اقتصادی اور تکنیکی نقشہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف منصوبوں پر عملی طور پر کام جاری ہے۔ کچھ کام پورا ہو چکا ہے اور کچھ زیر تکمیل ہے۔ کسی منصوبے کو شروع کرنے سے پہلے لوگ اکثر اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ایک عمدہ منصوبے کے ہر پہلو پر غور و فکر کے لئے اتنا ہی وقت درکار ہو سکتا ہے جتنا کہ اس کو عملی شکل دینے میں۔

پچھلے چند صفحات میں میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قومی احیاء و تعمیر کے بارے میں میرے افکار کا ایک مختصر سا خاکہ ہے اور اس موضوع پر جو کچھ میں کہوں گا اس کا یہ ابتدائیہ ہے۔ لیکن اس موضوع پر کہنے سے پہلے میں کچھ اور باتیں بھی بہت صاف اور کھلے الفاظ میں کہوں گا۔

بعض لوگوں کی اور خاص طور پر نامہ نگار حضرات کی نظر میرے افکار و نظریات اور اجتماعی فلاح سے متعلق خیالات جاننے کی بجائے میرے لباس کے رنگ اور دفتر کی آرائش و زیبائش پر رہتی ہے۔ اخباروں کے نمائندے اور نامہ نگار بارہا مجھ سے مل چکے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو میرے گہرے افکار کو سمجھنے کی توفیق نہیں ہوتی چنانچہ انہوں نے بڑے اطمینان سے میرے متعلق بہت سی بے بنیاد اور سطحی باتیں چھاپ دیں۔

چند وجوہات کی بنا پر امریکیوں کو اس قسم کی خبریں اڑانے اور چھاپنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ میں ایسی بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں کہ بڑے خوش پوش اونچے اونچے دعوے کرنے والے اور صورت و شکل سے بڑے سنجیدہ اور متفکر نظر آنے والے نامہ نگاروں نے بالکل سطحی اور بچکانہ خبریں چھاپی ہیں اور مجھے یہ شک ہونے لگتا ہے کہ شاید غیر ملکیوں سے خبریں حاصل کرنے کی ان کو تربیت نہیں دی گئی ہے۔ خوش قسمتی سے بعض نامہ نگار میرے اس نظریے سے مستثنیٰ بھی ہیں۔ کاش یہ اکثریت میں ہوتے تو دنیا میں باہمی تفاہم اور صلح کہیں زیادہ ہوتی۔ اس خرابی کی کچھ حد تک ذمّہ دار وہ امریکی پروپیگنڈا ایجنسیاں اور ٹیلویژن کمپنیاں ہیں جو وہاں کے عام بالغوں کے ساتھ ان کی دلچسپی کے خیال سے بچّوں کا سا سلوک کرتی ہیں۔ لیکن اسی بات کا ان فرض شناس اور سنجیدہ امریکیوں سے مقابلہ کیا جائے جو میرے ملک میں نکتہ چہار کے تحت کام کر رہے ہیں یا دوسرے اداروں سے وابستہ ہیں تو معلوم ہو گا کہ یہ تصوّر ہی غلط ہے۔ میں نے سنا ہے کہ امریکہ میں یہ رواج ہے کہ جن دو کانوں میں کھانے پینے کا سامان

فروخت ہوتا ہے وہاں بھی سستے داموں پر تاریخ، سائنس اور فلسفے پر بڑی عالمانہ کتابیں مل جاتی ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ امریکی ذہنی اعتبار سے اس قدر ناپختہ ہوں گے کہ وہ ان چند شاطروں اور نامہ نگاروں کی باتوں میں آجائیں جو گھڑی کی گھڑی دنیا کے اس حصے میں آتے ہیں اور خبریں اڑا کر لے جاتے ہیں۔

مشرقی درباروں کے پیچھے سینکڑوں سالہ روایات ہیں۔ اسی لئے ان کے متعلق بہت ہی دلچسپ حسن و جمال اور شان و شوکت کے قصے اور کہانیاں مشہور ہیں لیکن مجھے بحیثیت ایک انسان اور ایک ایسے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے جاننا ہو جو دنیا کے بہت ہی پُرآشوب حصے پر حکمرانی کر رہا ہے تو میرے نظریات اور خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں حقیقی معنوں میں اُس وقت خوش ہوتا ہوں جب ملک کے پیچیدہ اقتصادی اور دیگر مسائل کو حل کر دوں۔ ایک شاہنشاہ کی حیثیت سے مجھے اُس عام آدمی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جس کو اقتصادی ترقی زراعتی اصلاح اور تعلیم و تربیت سے گہری دلچسپی ہو۔

جس مقام و منزلت پر میں ہوں اس جگہ خواہ کوئی بھی شخص ہو وہ اقتدار اور طاقت حاصل کرنے کے خیال سے خود کو الگ نہیں کر سکتا لیکن خوش قسمتی سے میری نظر اس سے بہت بلند مقاصد پر ہے اور میرے نزدیک زندگی کا مفہوم و مطلب کچھ اور ہی ہے۔ میں کبھی زراعتی ترقیات کے پیچیدہ اور دشوار مسائل کو حل کرنے میں تھکن محسوس نہیں کرتا بلکہ ان کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں کیونکہ میں سوچتا ہوں کہ اس مسئلے کو حل کرنے میں خواہ کامیابی بہت ہی معمولی کیوں نہ ہو پھر بھی ملک کے ہزاروں افراد کی زندگی پر اس کا اچھا اثر پڑے گا۔

ایک انگریز نے اپنے متعلق کہا تھا کہ سوتے وقت میں اپنے بستر پر اقتصادی رسالے کو عورت پر ترجیح دوں گا۔ اپنے متعلق میں یہ بات تو نہیں کہہ سکتا البتہ اتنا ضرور ہے مجھے لذت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب مشکل مسائل سے زور آزمائی کرنی پڑے اور جب لوگ ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک کر مایوس ہو جائیں تو میں آگے بڑھوں اور ان دشواریوں پر قابو پا لوں۔

سچ پوچھئے تو میری آرزو اسی وقت بر آتی ہے جب میں ملک کی فلاح اور تعمیر و ترقی کے لئے سخت آزمائشوں سے دوچار ہو کر کسی کامیاب نتیجے پر پہنچوں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن ممالک نے ابھی ترقی کی راہ پر قدم رکھا ہے ان کے بارے میں اس قدر مبہم اور ناقابل فہم باتیں اقتصادیات کے متعلق لکھی گئی ہیں کہ پڑھنے والا اکتا کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی بھی قومی فلاح و ترقی کے کام کو ظاہری سجاوٹ اور رنگ روپ دے کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر آج کے دور میں کسی ملک کے انتظامی معاملات کے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ جائز اور مناسب طریقوں سے ٹیکس وصول کئے جائیں۔ بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے جس طرح ٹیکس وصول کرنے چاہئیں اُس طرح وصول نہیں کئے جاتے اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ شکایت جائز ہے کیونکہ دفتروں کی بے ترتیبی اور کام کرنے والوں کی نااہلی

اور فائلوں کو سنبھال کر رکھنے کی بجائے بے پروائی سے اِدھر اُدھر ڈال دینے کی وجہ سے ٹیکس ادا کرنے والوں کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حال ہی میں ہماری وزارت مالیات نے غیر ملکی ماہرین کی مدد سے ایک بہت دلچسپ کتابچہ ان دشواریوں کو دور کرنے کی غرض سے شائع کیا ہے۔ اس کتابچہ کی جلد چار رنگوں میں ہے اور پشتہ پلاسٹک سے بنایا گیا ہے۔ اس میں بہت سے چارٹ اور فوٹو اس طرح دیئے گئے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اس کتابچے میں زمین کے لگان کے بارے میں بھی چند اصول درج ہیں جن کی وجہ سے چالیس فیصدی تو دفتری کارروائی اور ساٹھ فیصدی کاغذی پلندوں کا کام کم ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتابچہ بہت ہی کارآمد اور مفید ثابت ہوا ہے۔ باوجود ان تمام کوششوں کے مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جن کو ٹیکس وصول کرنے کے طریقوں سے شکایت ہے اس کتابچے کو پڑھ کر بھی اپنے دماغ پر بوجھ اور تھکن محسوس کریں گے۔

کسی قوم کے تعمیری اور ترقیاتی پروگرام میں محض میٹھی اور لچھے دار باتیں کسی منظم اور متواتر کام کا نعم البدل نہیں بن سکتیں وہ ممالک جنہوں نے تھوڑے عرصے پہلے ہی تعمیری کام شروع کئے ہیں اور اس وقت ترقی کی راہ پر ہیں ان کے مسائل کو سمجھنے کے لئے دماغ پر زور دینے کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس دماغی ورزش سے سر درد اور پریشانی کی بجائے خوشی اور مسرت حاصل ہو گی۔

مجھے اپنے ملک کی ترقی سے گہری دلچسپی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ میں کس طرح لوگوں پر اس کی رفتار ظاہر کروں اور یہ بتاؤں کہ اس کے لئے میں نے کیا عملی اقدامات کئے ہیں۔ شاید اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ ہو گا کہ وہ اجتماعی اور اقتصادی ترقیات جو ایرانی کیلنڈر کے مطابق ۱۳۳۸ھ کے آخری چھ ماہ (یعنی ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۵۹ء کے دوران) میں ہوئی ہیں ان کی ایک مختصر فہرست یہاں پیش کی جائے چنانچہ ہر ماہ کے ترقیاتی پروگرام کا ذکر نیچے کیا جا رہا ہے۔

پہلے مہینے کا کام:

اندھوں کے واسطے ایک اسکول کا افتتاح کیا گیا۔ جنوبی ایران کے تین شہروں میں ٹیلیفون کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا۔ کم پونجی والے کسانوں کے درمیان میں نے اپنی ذاتی ملکیت میں سے ۴۳ گاؤں تقسیم کئے اور زمین کا قبضہ و قبالہ ان کے حوالے کیا۔

آذربائیجان کے صوبے میں چلتی پھرتی عدالتیں قائم کیں۔ تپ دق کے مریضوں کے لئے شہر رشت میں ایک ہسپتال کھولا۔ تہران کے جنوب میں ایک بہت گہرا کنواں بن کر تیار ہوا۔

بہت سے تعمیری منصوبوں پر عملاً کام شروع کیا گیا۔ ایران اور اٹلی کے درمیان ریڈیو ٹیلیفون رابطہ قائم ہوا۔ پہلا تیل کا کنواں بنانے کے لئے خلیج فارس میں سمندر کی تہہ میں سوراخ کیا گیا۔

آبادان میں سرکاری زمین ۵۸۲ سول ملازمین کے درمیان مکان بنانے کے لئے تقسیم کی گئی۔ صنعتی اور معدنی

ترقیاتی بنک کا سرکاری سطح پر افتتاح ہوا۔ یزد کے نواحی علاقے میں ایک نیا اسکول کھولا گیا۔ کرج میں ایک فیکٹری قائم کی گئی جہاں ریل کی پٹری کے نیچے کام آنے والے سیمنٹ کے سلیپر بنانے شروع کئے گئے۔

شہر مشہد، اصفہان اور بابل میں تپ دق کے ہسپتالوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ شہر اصفہان میں کپڑے کی صنعت کے اسکول کا سرکاری طور پر افتتاح ہوا اور اس میں کام سیکھنے والوں کو داخلہ دیا گیا۔

دوسرے مہینے کا کام:

شہر تہران کے باہر میں نے ایک عمارت بنوائی جس میں دو ہزار بچوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ اس عمارت میں میں نے یتیم خانہ کھولا اور عمارت اسی یتیم خانے کے نام وقف کر دی۔ میری ایک بہن نے ایک کلینک اور کینٹین قائم کی۔

میرے یوم پیدائش کی مناسبت سے ۲۸ نئے اسکول ملک کے مختلف حصّوں میں کھولے گئے۔ پندرہ شہروں میں بجلی بنانے کے کارخانے جاری ہوئے۔ سات شہروں میں پختہ سڑکیں بنائی گئیں۔

جنوب مرکزی ایران کے بارہ اسٹیشنوں پر بجلی کے سگنل لگائے گئے۔ صوبہ کردستان میں کیمیاوی زراعتی مرکز کھولا گیا۔ جنوبی ایران میں جہاں تیل کے ذخیرے ہیں وہاں ایک جگہ سے شیراز تک گیس کے لئے پائپ لائن ڈالنے کا کام شروع ہوا۔ شیراز میں ایک کیمیاوی کھاد کا کارخانہ زیر تکمیل ہے۔ یہ گیس پورے شہر شیراز اور اس کارخانے کی ضروریات کو پورا کرے گی۔ صوبہ خراسان میں خام تیل کا ذخیرہ بن کر تیار ہو چکا ہے جہاں سے دوسری جگہوں پر ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کے لئے یہ تیل بھیجا جاتا ہے۔ ایک شہر میں ایک کلینک اور دوسرے شہر میں سِل کے مریضوں کے لئے سینی ٹوریم بن چکا ہے۔ میری لڑکی شہناز کے نام پر ایک باندھ کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔

تیسرے مہینے کا کام:

صوبہ کردستان کے ایک ہسپتال میں عورتوں کے علاج و معالجہ کا ایک شعبہ کھل گیا ہے اور ایک دانتوں کی کلینک بھی وہاں قائم ہو گئی ہے۔ بے تار کے ٹیلیفون سے پیغام رسانی کا انتظام فارس اور اصفہان کے درمیان ہو چکا ہے۔ پانچ شہروں میں تیل کے ذخیروں کی توسیع کی گئی ہے۔

آبیاری کے لئے ایک نہر تیار ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ پانچ ابتدائی اسکول اور نو ۹ دستکاری سکھانے کے مدرسے مختلف شہروں میں کھلے ہیں۔ پانچ دوسرے ابتدائی مدرسوں میں تعمیری کام ابھی ختم ہی ہوا ہے۔ آزمائش کے طور پر ایک جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ قند سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا گیا ہے جو اپنی نوعیت کا ایران میں پہلا کارخانہ ہے۔ حکومت کی طرف سے دیہاتوں میں دو سو پچاس نئے مکان تعمیر کئے گئے۔ ہمارا ۳۳ ہزار ٹن کا ایک تیل بردار جہاز یورپ سے ایران پہنچا اور پہلی مرتبہ اس

میں تیل لاد کر باہر بھیجا گیا۔ روغن زیتون اور تلوں سے تیل نکالنے کا کارخانہ قائم ہوا۔ تہران کے ایک ہسپتال میں توسیع کی گئی جس کا میں نے افتتاح کیا۔ جن علاقوں میں تیل کے ذخیرے ہیں وہاں ایک جگہ تین نئے کنویں کھودے گئے اور ان سے تیل نکالنے کا کام شروع کیا گیا جس کی وجہ سے اس علاقے میں تیل کی پیداوار پہلے سے دوگنی ہوگئی ہے۔ دوسری جگہ بھی ایک کنویں سے تیل نکالا جائے گا۔ تہران میں ایک ڈبل روٹی بنانے کا کارخانہ اور دو نئے ٹیلیفون ایکسچینج کے دفتر کھولے گئے۔ سفید رود (سفید دریا) باندھ کے پانی کے چڑھاؤ کو روکنے کے لئے ایک نئی نہر تیار کی گئی۔ دس آزمائشی پانی کے کنویں کاشت کاری کے لئے کھودے گئے۔ ملکہ فرح کے نام پر ایک نئے ہسپتال کا افتتاح ہوا۔

چوتھے مہینے کا کام:

صوبہ گیلان میں ڈاک اور تار کا دفتر قائم کیا گیا۔ جانوروں کے علاج کا ایک مرکز اصفہان میں قائم کیا گیا۔ ایک شہر میں ایک بجلی گھر، ایک ہسپتال، دو اسکول اور ایک مسجد کا افتتاح ہوا۔ دوسرے شہر میں ایک بجلی گھر، دو مدرسے اور دو دوسرے شہروں میں دو بجلی گھر جاری کئے گئے۔ کرمان میں ملکہ فرح کے نام سے نرسنگ اسکول کھولا گیا۔ اصفہان میں نیا ریڈیو ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا۔ دو شہروں میں پانی کے لئے پائپ لائن ڈالی گئی۔ آبادان میں ایک تجربہ گاہ قائم کی گئی۔ تہران کے ایک ہسپتال میں میں نے ایک نئے شعبے کا افتتاح کیا۔

پانچویں مہینے کا کام:

ایک کلینک اور ایک جانوروں کے علاج کے مرکز کی عمارت بن کر تیار ہوئی۔ ملکہ فرح نے ایک اور کلینک کا افتتاح کیا۔ تبریز یونیورسٹی کی نئی عمارت کا نقشہ بن کر تیار ہوا۔ کرمان میں کپڑے کا کارخانہ لگایا گیا۔ آذربائیجان میں آٹا پیسنے کا کارخانہ قائم ہوا۔ تہران کی سرکاری سیگرٹ کی فیکٹری میں گتا بنانے کا کارخانہ کھولا گیا۔ پانچ کسٹم کے دفتروں میں ریڈیو ٹرانسمیٹر رسیور نصب کئے گئے۔ میں نے اور ملکہ فرح نے ایک ہزار چھ سو سات کسانوں کے درمیان شاہی زمین کے قبالے تقسیم کئے۔

چھٹے مہینے کا کام:

تہران کے ایک کم آمدنی والے علاقے میں ہسپتال کھولا گیا جس میں دو سو پچاس بستروں کی گنجائش ہے۔ مختلف شہروں میں ریلوے ملازمین کی بستیوں میں کلینک کی پانچ عمارتیں بن کر تیار ہوئیں اور ایک ہسپتال جس میں سو بستروں کا انتظام ہے کھولا گیا۔ ایک سینی ٹوریم اور ایک کلینک کی عمارت بنانے کا کام شروع کیا گیا۔ دو یتیم خانوں کی عمارتیں بن کر تیار ہوئیں۔ شہر کرج میں چھوٹی صنعتوں کی تحقیقاتی تجربہ گاہ قائم کی گئی۔ تین مختلف شہروں میں تین بجلی گھروں نے بجلی بنانے کا کام شروع کیا۔

ایک شہر میں پانی کی پائپ لائن ڈالی گئی۔

براہ راست ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعے شہر زاہدان، مشہد، تہران اور شہر فسا میں رابطہ قائم کیا گیا۔ رَی نامی شہر میں پانی کی پائپ لائن کا کام مکمل ہوا۔ جن کسانوں کے درمیان سرکاری زمین تقسیم کی گئی تھی ان کو زمین کی دستاویزات دی گئیں۔ اہواز میں قند کا کارخانہ قائم ہوا۔ خرم شہر میں ایک پل کا اور آبادان میں ایک ٹیلیویژن اسٹیشن کا میں نے افتتاح کیا۔ ایران اور یورپ کے درمیان پہلی مسافروں کو لے جانے والی پانی کے جہاز کی کمپنی کا میں نے اجرا کیا۔

اوپر جن تعمیری کاموں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی اور بہت سے کام ہیں جو زیر تکمیل ہیں۔ ان ہی میں سے ایک صوبہ خوزستان کا ترقیاتی پروگرام ہے۔ اس صوبے کے لئے ترقیاتی نقشہ تیار کرنے کے لئے ہم نے امریکہ کی ایک کمپنی کو دعوت دی ہے۔ یہ کمپنی ڈیوڈ لیلین تھال اور گورڈن کلیپ[1] کی زیر نگرانی چل رہی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں آدمی ترقیاتی اور تعمیری منصوبے تیار کرنے کے لئے مشہور ہیں اور امریکہ کے ٹینسی وادی[2] پروجیکٹ کی نگرانی کر چکے ہیں۔ جو کام ایران میں ان کے سپرد کیا گیا ہے تقریباً وہی ہے جو انہوں نے امریکہ میں اب تک کیا ہے۔ یعنی وہ پورے خوزستان کے علاقے کے لئے ترقیاتی منصوبہ تیار کر رہے ہیں کیونکہ یہ علاقہ معدنی دولت سے مالا مال ہے۔

صوبہ خوزستان ایران کے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً امریکہ کی ریاست نارتھ کارولینا[3] کے برابر ہے۔ چند صدی پہلے یہ علاقہ بڑا زرخیز تھا۔ یہاں گنّے، گیہوں اور دوسرے اناجوں کی کاشت خوب ہوتی تھی جس سے ایران جیسی وسیع سلطنت کی ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن غیر ملکی حملہ آوروں کی غارت گری کی وجہ سے ایک دو جگہوں کو چھوڑ کر تمام آبپاشی کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے البتہ کچھ کھنڈر اب بھی باقی رہ گئے ہیں۔

دوسری طرف مٹی کے بہہ جانے اور زمین کے نیچے پانی میں جو نمک ہے اس کے سطح پر آجانے سے زمین ایسی خراب ہو گئی کہ وہاں بعض غلّے اور ترکاریاں نہیں اگ سکتے تھے اور پھر ایک دن وہ آیا کہ وہاں کی زمین بالکل بنجر ہو کر رہ گئی۔

خوزستان میں پہاڑ بھی ہیں، دریا بھی اور وسیع میدان بھی اور سب سے زیادہ یہ زمین تیل کے ذخیروں سے مالا مال ہے۔ آبادان کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ اور وہ کنویں جن سے تیل یہاں پہنچایا جاتا ہے سب اسی صوبے میں ہیں۔ اس کے دریاؤں کا پانی جس سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے بیکار جاتا ہے اور اسی طرح وہ قدرتی گیس جو کثیر مقدار میں تیل کے کنووں سے نکلتی ہے، ہوا میں تحلیل ہو کر ضایع ہو جاتی ہے۔ جہاں سے یہ گیس نکلتی ہے وہاں اس کے استعمال کرنے کا کوئی بندوبست اب تک نہ تھا۔ اس کو جمع کرنے یا کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کا بھی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ جس طرح امریکہ کے تیل کے میدانوں میں یہ گیس جلادی جاتی تھی یہاں بھی یہی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا اور اس طرح یہ قیمتی شئے بیکار جاتی تھی۔

خوزستان کی گیس اور دوسری معدنیات کو استعمال کرنے کے لئے ہم نے پانچ پلان تیار کئے ہیں۔ جن کی مدد سے اس خطّے کی بنیادی اقتصادی حالت سدھر جائے گی۔ پہلا پلان یہ ہے کہ اس قدرتی گیس کو پولی وینیل کلورائیڈ[4] یعنی پلاسٹک

1. DAVID LILIENTHAL AND GORDON CLAPP 2. TENNESSEE VALLEY AUTHORITY
3. NORTH CAROLINA 4. POLYVINYL CHLORIDE

بنانے کے لئے بطور خام مال کے استعمال کیا جائے کیونکہ پلاسٹک آج کل نہ صرف گھروں میں استعمال ہوتا ہے بلکہ بہت سے انجنوں اور دوسری صنعتوں میں بھی کام آتا ہے۔ جلدی ہی ایک پلاسٹک سازی کی فیکٹری قائم کی جائے گی جو نہ صرف ملک کی ضروریات کو پورا کرے گی بلکہ ایرانی اور غیر ملکی سرمایہ داروں کو خوزستان کی ترقی میں سرمایہ لگانے کے لئے اپنی طرف متوجہ کرے گی۔

دوسرے پلان میں بھی یہ قدرتی گیس بنیادی خام مال کے طور پر استعمال ہوگی کیونکہ اس صوبے میں زراعتی ترقی کے لئے کیمیاوی کھاد کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ یہاں کس قسم کی کھاد درکار ہوگی۔ ہم نے اس علاقے کے تین سو گاؤں میں کیمیاوی کھاد کے استعمال کے تجربے شروع کر دئیے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہم اس صوبے میں کیمیاوی کھاد کے کارخانے قائم کرنے کے جگہ جگہ نقشے اور منصوبے بنا رہے ہیں۔

تیسرا پلان یہ ہے کہ اس علاقے میں گنے کی کاشت کو ترقی دی جائے اور قند سازی کی صنعت کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے شہر شوش کے نزدیک جو کئی صدی پہلے ایرانی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ پچیس ہزار ایکڑ زمین لی ہے جہاں گنے کی کاشت پر تجربے کئے جا رہے ہیں۔ اس پلان کی وسعت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اس علاقے میں آب رسانی کے لئے ایک ڈچ کمپنی نے نہر تیار کی ہے۔ یہ نہر اتنی بڑی ہے کہ اس میں نہری کشتیاں آسانی سے آجا سکتی ہیں یہیں پر گنا بیلنے اور راب صاف کرنے کے کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔ یہ کارخانے جلد ہی کام شروع کر دیں گے اور ہر سال تقریباً تیس ہزار ٹن صاف و شفاف قند یہاں تیار ہوا کرے گی۔

چوتھے پلان کے لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آبادان کے تیل صاف کرنے کے کارخانے میں جو بجلی تیار کی جاتی ہے اس کا کچھ حصہ اس علاقے کی ترقی کے لئے استعمال کریں گے۔ چنانچہ آبادان سے اہواز تک بڑی طاقتور بجلی منتقل کرنے والی لائن ڈال دی گئی ہے جو ایران کی جدید ترین بجلی کی لائن شمار کی جاتی ہے۔ چنانچہ اب خوزستان کے مرکز میں بجلی کافی مقدار میں پہنچنے لگی ہے۔

پانچواں پلان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس پلان کے تحت دریائے دز پر (شہر اندیمشک کے نزدیک دایران ریلوے کے راستے پر) دنیا کا سب سے بڑا باندھ بنانے کا ارادہ ہے۔ یہ باندھ چھ سو فٹ سے زیادہ اونچا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بلندی پیرس کے ایفل ٹاور سے دو تہائی ہوگی۔ یہ باندھ ایک درّے میں تعمیر کیا جائے گا جو ہر حیثیت سے بہت ہی مناسب ہے اور اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

اس درّے کے پہاڑ دونوں طرف سے اتنے اونچے، سیدھے، متوازی اور اس قدر قریب واقع ہیں کہ ماہرین کی رائے ہے کہ گویا خداوند کریم کی بھی یہی مرضی ہے کہ انسان یہاں باندھ تیار کرے۔

اس باندھ کی تعمیر میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ پہاڑ کے دونوں طرف سنگلاخ چٹانوں میں سرنگیں بنائی جائیں۔ چنانچہ اس کام کے لئے چٹانوں کے اوپر بڑے مضبوط پشتے اور پاڑیں باندھی گئی ہیں تاکہ ان پر وہ بھاری ٹرک جس میں برمے چلانے

کے لئے بجلی کی بٹیریاں لگی ہوئی ہیں ان کی سطح تک پہنچ سکے۔ جس وقت یہ بہمے چٹانوں میں سوراخ کرتے ہیں تو اس قدر شور و غل ہوتا ہے کہ گویا ہوائی جہاز گرانے والی کئی توپیں بیک وقت چھوڑ دی گئی ہوں۔ اس منصوبے پر جو شخص چیف انجینیر کے فرائض انجام دے رہا ہے وہ سوئنڈ کا رہنے والا ہے جس کا موسموں سے جھلسا ہوا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ اس نے زمانے کے سرد و گرم کا بڑا تجربہ حاصل کیا ہے۔ جس وقت اس شخص سے پوچھا گیا کہ چٹانوں میں بہمے چلانے کے لئے اس نے آدمی کہاں سے اکٹھے کئے تو اس نے انگلی سے ان پُرسکون دیہاتوں کی طرف اشارہ کر دیا جو اس درّے میں کافی دور فاصلے پر آباد تھے اور جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ لوگ ان تمام پریشانیوں اور اس گونج و گرجدار آوازوں کے درمیان اپنے کام سے خوش ہیں تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ہاں ان کو یہ شور و غل کی آوازیں بہت پسند ہیں۔

اندازہ ہے کہ یہ باندھ سنہ ۱۹۶۲ء کے آخر تک بن کر تیار ہو جائے گا۔ جس وقت یہ باندھ تیار ہو جائے گا تو اس کی جھیل میں پانی اس طرح جمع ہوگا کہ گویا ہم کسی بہت ہی بڑے ٹب میں پانی ڈال رہے ہوں۔ اس باندھ کے نیچے زمین دوز بجلی گھر بھی بنایا جا رہا ہے۔ جس وقت جھیل کا پانی بجلی گھر کے پنکھوں[1] پر سے گر کر بہے گا تو پانچ سو بیس ہزار واٹ بجلی پیدا ہوگی۔ جو پانی اس باندھ کی جھیل میں جمع ہوگا اس سے تقریباً تین سو ساٹھ ہزار ایکڑ زمین کی سینچائی ہوگی۔ جب اس دریا کا پانی قابو میں آجائے گا تو سیلاب کی وجہ سے جو ہر سال دس لاکھ ڈالر کا نقصان ہوتا ہے وہ نہیں ہوا کرے گا۔

دریائے دز کا پانی آگے چل کر دریائے کارون میں جا کر مل جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دریائے دز کے باندھ کی تعمیر کے بعد دریائے کارون پر بھی باندھ بنائے جائیں کیونکہ اس دریا کے پانی سے اور اوپری سطح پر جہاں دوسرے معاون دریا اس سے ملتے ہیں وہاں بھی لاکھوں واٹ بجلی ضائع جاتی ہے۔ جہاں جہاں باندھ تعمیر کئے جانے کے امکانات ہیں ان جگہوں کا معائنہ ہوائی جہاز کے ذریعے بھی ہو چکا ہے اور خود ماہرین ان مقامات کو اچھی طرح دیکھ آئے ہیں اور کئی جگہ سے زمین کی اچھی طرح جانچ کر لی گئی ہے اور اب کسی ایسے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے جو ان باندھوں کی تعمیر میں رکاوٹ بنے۔

خوزستان کی زمین میں طاقت پیدا کرنے والی معدنیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ دنیا میں شاید ہی خوزستان جیسا کوئی اور علاقہ ہو جہاں ایک ہی وقت میں بجلی کی طاقت پیدا کرنے کا بھی انتظام ہو۔ اور تیل، گیس اور دوسری معدنیات کے ذخائر کے علاوہ زراعت کے اعتبار سے بھی زمین بہت زرخیز ہو۔ یہ بھی ایک طبعی امر ہے کہ ان سے پورے طور پر فائدہ اٹھانے اور ان پر قابو پانے کے لئے بھی ایک طویل مدت درکار ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تک یہ علاقہ پورے طور پر ترقی نہ کر لے۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں میری عمر اکتالیس[۴۱] سال ہو چکی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ دن آئے گا جب میں اس کو پھلتے پھولتے اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

یہاں مجھے اتفاق سے ایک بات یاد آگئی۔ سنا ہے کہ چرچل کی عمر جبکہ اسی[۸۰] سے تجاوز کر چکی تھی وہ ایک روز اپنی سالگرہ منا رہا تھا۔ ایک نوجوان فوٹو گرافر نے اس کا فوٹو کھینچا اور مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ خدا کرے آپ اور دس سال تک اسی طرح

1. TURBINE

اپنی سالگرہ کا جشن مناتے رہیں اور میں اسی طرح فوٹو کھینچتا رہوں۔ چرچل نے برجستہ اس فوٹو گرافر کو جواب دیا " ابھی تو تو جوان ہے اور صحت مند بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تیری یہ آرزو پوری نہ ہو۔"

ایران میں صرف خوزستان ہی ایسا علاقہ نہیں جہاں بجلی بھی پیدا ہو اور دوسری معدنیات بھی موجود ہوں بلکہ یہاں پہاڑی سلسلوں میں ایسی بہت سی جگہیں ہیں جہاں باندھ بنا کر پانی کو کہیں سیلاب کی تباہیوں سے روکا جا سکتا ہے، کہیں زراعت کے کام میں لایا جا سکتا ہے، کہیں بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور بعض جگہ تو ایک ہی باندھ سے سب ہی کام لئے جا سکتے ہیں۔ کئی جگہ ایسے پہاڑ موجود ہیں جو عمودی شکل میں سیدھے چلے گئے ہیں اور اتنے بلند ہیں کہ گویا آسمان سے باتیں کرتے ہوں اور درّوں کے دونوں طرف مضبوط دیوار کا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں اپنی ضرورت کے مطابق پانی ذخیرہ کرنے کے لئے جس قدر بلند باندھ بنانے منظور ہوں بنائے جا سکتے ہیں۔ کہیں کہیں تو قدرت نے ہی باندھ بنائے ہیں جن کے پیچھے پانی سے بھرے تالاب خود بخود بنتے چلے گئے ہیں۔ انسانوں کے لئے یہاں جو کام باقی رہ گیا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ادھورے کام کی تکمیل کر دیں۔

بحر خزر کے آس پاس کے علاقے اور آذربائیجان کو چھوڑ کر جہاں کثرت سے بارش کا پانی استعمال ہوتا ہے ایک سرسری نظر سے دیکھنے والے سیّاح کو ہمارے ملک کی پوری زمین بنجر اور نا قابل کاشت نظر آتی ہے۔ ہمارے باندھ تعمیر کرنے کے ذوق و شوق کو دیکھ کر ممکن ہے بہت سے غیر ملکی خیال کرتے ہوں کہ ہماری حالت اس شراب نوش کی سی ہے جس نے اپنے گھر میں میخانہ تو شاندار بنا رکھا ہو لیکن بوتلوں میں کچھ نہ ہو۔ چنانچہ امریکہ کے ایک رسالے نے جب ہمارے کرج باندھ پر کڑی نکتہ چینی کی تو میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ اس نے لکھا تھا کہ بجلی پیدا کرنے کے لئے کرج باندھ پر روپیہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا گیا ہے۔ اس کے بجائے اگر اسٹیم پلانٹ لگایا جاتا تو بجلی بہت ہی سستی پڑتی۔ بیچارہ نقّاد ہماری ضروریات اور مقاصد کی تہہ تک پہنچنے میں کوسوں دور رہا۔ اس کو شاید نہیں معلوم کہ ہمارے پایۂ تخت شہر تہران کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہم نے شہر سے ۳۵ میل کی دوری پر یہ باندھ اس لئے بنایا ہے تاکہ شہر کی ضرورت کے مطابق دریائے کرج کا پانی ہم کو مل سکے۔ اسی مضمون میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ گرمی کے موسم میں یہ دریا ایک باریک سی پانی کی لکیر بن کر رہ جاتا ہے جس کا نتیجہ مضمون نگار نے یہ نکالا کہ جس دریا میں اس قدر کم پانی ہو اس کے لئے اتنا بڑا باندھ بنانا روپے اور وقت کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میرا ایک دوست بڑا اچھا تیراک ہے۔ سال کے اس حصّے میں جبکہ دریا میں پانی بہت کم ہوتا ہے وہ دریا کے اس پار تیر کر جانا چاہتا تھا۔ پانی کی گہرائی اور بہاؤ اتنا زیادہ تھا کہ اس کو بہا کر لے گیا۔ کاش کہ یہ نقّاد اس وقت وہاں موجود ہوتا اور اپنی آنکھوں سے یہ سب تماشا دیکھتا۔ یہ پہاڑی دریا جس وقت تہران کے نزدیک پہنچتا ہے تو پانی سے بھرا رہتا ہے۔ اگر بالفرض اس میں پانی کم بھی ہوتا تو پھر بھی اس کی اہمیت کم نہ ہوتی کیونکہ ایران کے پہاڑوں میں اور یہاں تک کہ جنوب کے گرم علاقوں میں بھاری برف باری ہوتی ہے وہ سب پگھل پگھل کر دریاؤں میں آتی ہے اور بہار کے دنوں میں جبکہ برف تیزی سے پگھلتی ہے تو چند ہفتے تک دریاؤں میں طغیانی رہتی ہے جو اپنے ساتھ آدمیوں اور جانوروں کو بہا کر لے جاتی ہے۔ ایام بہار کے سیلاب کا پانی نہ صرف

ضائع جاتا ہے بلکہ اس سے مالی اور جانی نقصان بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایران کے میدانوں میں چونکہ خودرو پودے اور گھاس پھوس نہیں اُگتے اس لئے پانی کے بہاؤ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی جس کی وجہ سے زراعت کے قابل مٹی سب بہہ جاتی ہے۔ زراعت اور کاشت کاری کے لئے پانی کو ذخیرہ کر کے رکھنا ہمارے لئے بہت ہی ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے باندھ بنانے کے لئے قدم اٹھایا ہے تاکہ پہاڑوں پر جو برف پگھلتی ہے اس کا پانی جمع ہوتا رہے اور ہم اس کو سارے سال کاشتکاری کے لئے استعمال کرتے رہیں۔ اس سے ایک طرف تو ہم سیلاب کی مصیبت سے بچ جائیں گے اور دوسری طرف بجلی کی طاقت بھی ہم کو مل سکے گی۔

۱۹۵۸ء کے آخر میں کرج باندھ کی بنیادوں میں سیمنٹ کی روڑی بھرنے کا کام شروع ہوا۔ شگون کے طور پر میں نے بھی اس پہلی بالٹی میں جس میں سیمنٹ کی روڑی بھری جا رہی تھی چند سکّے ڈالے۔ امید ہے کہ یہ ساڑھے پانچ سو فٹ بلند باندھ ۱۹۶۱ء کے آخر تک مکمّل ہو جائے گا۔ اس باندھ کے ذریعے جو پانی جمع ہوگا اس کو شہر تہران کے لوگوں کے استعمال کے لئے دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ پانی شہر تک پہنچے بجلی بنانے والی مشینیں حرکت میں آ چکی ہوں گی جو بتدریج ایک سو بیس ہزار کیلوواٹ تک بجلی پیدا کیا کریں گی۔

شہر رشت کے نزدیک دریائے سفید پر بھی باندھ بنانے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اس باندھ کی بلندی تین سو فٹ سے زیادہ ہوگی۔ جب باندھ تیار ہو جائے گا اور اس میں سے نہریں نکلیں گی تو اس کے پانی سے تقریباً چار سو پچاس ہزار ایکڑ زمین کی سینچائی ہو سکے گی اور تقریباً چونسٹھ ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں چھوٹے چھوٹے باندھ تو کئی جگہ بن چکے ہیں۔ چنانچہ ایران شہر نامی شہر کے مغرب میں دریائے بمپور پر باندھ کی تعمیر ۱۹۵۷ء کے وسط میں مکمّل ہو چکی تھی جس سے آج کل تقریباً تین ہزار سات سو ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے۔ صوبہ سیستان میں پاکستان اور افغانستان کے نزدیک ہم نے دو باندھ تعمیر کئے ہیں جو تقریباً پچاس ہزار ایکڑ زمین کی سینچائی کرتے ہیں۔ صوبہ آذربائیجان کے شمال مشرقی علاقے میں باندھوں اور نہروں کا جال بچھایا گیا ہے جس سے تقریباً پینتالیس ہزار ایکڑ زمین کو پانی پہنچتا ہے۔ ایران کے مغربی مرکز میں گلپائیگان کے نزدیک ایک باندھ بنایا گیا ہے جو پانچ ہزار ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کئی چھوٹے بڑے باندھ بنانے کا ارادہ ہے چنانچہ مختلف جگہوں پر اس کام کے لئے زمین کی جانچ کی جا رہی ہے۔

ایران میں باندھ بنانے سے زیادہ اہم مسئلہ جدید ترین باربرداری کے ساز و سامان کا فراہم کرنا ہے۔ اس دشواری کا بھی ہم نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا ہے ہر طرف ریلوے لائن کا جال بچھا دیا ہے۔ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ میرے والد کے عہد سے پہلے ایران میں ریل کا وجود تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے انجنیئروں کی مدد سے اس دشوار مسئلے کو حل کیا اور پورے ملک میں اِس سرے سے اُس سرے تک ریل کی پٹری بچھا دی۔ اور اس کے بعد ہی ہر طرف ریلوے لائن کا جال بچھنا شروع ہوا۔ اس وقت تمام ترقی یافتہ ممالک میں ریل کی خاص اہمیت ہے کیونکہ اس کے ذریعے تمام بھاری ساز و سامان

اور مشینیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاسکتی ہیں۔

ایرانی ریلوے کی ترقی کی تاریخ میں ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء دو قابل یادگار سال ہیں۔ کیونکہ ان دو سالوں میں دو جگہ ریلوے لائنیں ڈالی گئیں۔ ان میں سے ایک تہران سے شمالی مغربی ایران میں تبریز تک جاتی ہے اور تقریباً چار سو میل لمبی ہے۔ دوسری ریلوے لائن تہران سے شمال مشرق کی طرف شہر مشہد تک پہنچتی ہے اور لگ بھگ پانچ سو ساٹھ میل طویل ہے۔

اپنے والد کی طرح مجھے بھی ریل کی ترقی سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ نئی دو لائنوں کی وجہ سے ایران کی اقتصادی اور ثقافتی زندگی پر بہت عمدہ اثر پڑا ہے اور پورے ملک میں اس قدر قربت اور یکجہتی پیدا ہوگئی ہے جو پہلے کبھی نہ تھی۔ اس موقع پر مجھے اپنے ایک سابق وزیر داخلہ کی بات یاد آگئی۔ اُس وقت جبکہ وہ وزارت کے منصب پر تھا اس نے لاکھ جتن کئے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتیں گر جائیں لیکن اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ابھی چند روز پہلے نئی ریلوے لائن بن جانے کے بعد جب وہ تہران کے بازار سے گذرا اور کھانے پینے کی چیزوں کے دام پوچھے تو معلوم ہوا کہ قیمتیں بہت زیادہ گر گئی ہیں۔ چنانچہ اس نے دوکاندار سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ قیمتیں تو گرنی ہی تھیں کیونکہ نئی ریلوے لائن بن گئی ہے۔ اس کی وجہ سے اب تہران میں دور دراز کے علاقوں سے سامان آسانی سے بہت جلد آسکتا ہے۔ اور سامان نہ صرف جلد پہنچتا ہے بلکہ اس پر کرایہ بھی بہت کم لگتا ہے۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایک عام آدمی بڑے آرام اور اطمینان سے کم خرچ پر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ریلوے کے محکمے نے یہ انتظام کیا ہے کہ تہران سے مشہد تک ایک ریل ایکسپریس اور ایک لوکل روزانہ آتی جاتی ہے لیکن سفر کرنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ یہ ٹرینیں ناکافی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ریلوں کی تعداد میں مزید اضافہ کیا گیا ہے اور یہ مسرت کی بات ہے کہ جو لوگ پہلے کبھی تہران نہیں آئے تھے اب سفر کی سہولت کی وجہ سے اپنے ملک کے عظیم الشان پایۂ تخت کو دیکھنے کے لئے آسکتے ہیں اور اسی طرح تہران کے لوگ صوبائی شہروں میں جو درحقیقت ہماری تہذیب و تمدن کے مراکز ہیں آسانی سے پہنچ کر اپنی تہذیب و تمدن کا زیادہ قریب سے مطالعہ کرسکتے ہیں۔

اصفہان ایران کا بہت ہی اہم صنعتی شہر ہے لیکن ابھی تک اس کو ملک کے دوسرے شہروں کے ساتھ ریل کے ذریعے نہیں ملایا جاسکا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس شہر کا تہران سے ریل کے ذریعے رابطہ قائم کردیا جائے۔ تہران سے اصفہان تک جو ریلوے لائن ڈالی جائے گی وہ یہیں پر ختم نہ ہوگی بلکہ اس کو جنوب کی طرف شیراز تک پہنچایا جائے گا اور اس کا اقتصادی اعتبار سے ملک پر بہت ہی اچھا اثر پڑے گا اور ثقافتی اعتبار سے بھی یہ ریلوے لائن بہت زیادہ اہم ہوگی۔ ان دونوں شہروں میں چونکہ بہت سی تاریخی عمارتیں عظمت رفتہ کی یادگار ہیں اس لئے یہ ریلوے لائن ان شہروں کو پورے ملک سے لوہے کی زنجیروں سے جوڑ دے گی۔

ریلوے کی ترقی کے پیش نظر ہم نے حال ہی میں آٹھ لاکھ پچاس ہزار سیمنٹ کے سلیپر لائنوں کے نیچے بچھانے کے لئے

خریدے ہیں۔ چار سو مال گاڑی کے ڈبّے اس وقت کام میں آ رہے ہیں۔ مزید ایک ہزار زیرِ تکمیل ہیں۔ جب تیار ہو جائیں گے تو ان کو بھی مختلف لائنوں پر استعمال کیا جائے گا۔ ڈاک کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے ہم نے ریلوے پوسٹ آفس کے لئے پندرہ ڈبّوں کا انتظام کیا ہے۔ سفر کو زیادہ محفوظ اور تیز رفتار بنانے کے لئے ہم نے پورے ملک میں جہاں جہاں ریلوے کا جال پھیلا ہوا ہے سگنل دینے کے لئے جدید ترین طریقے اپنا لئے ہیں۔

پورے مشرقِ وسطیٰ میں ایران ہی پہلا ملک ہے جس نے بھاپ سے چلنے والے انجنوں کو ہٹا کر ان کی جگہ ڈیزل انجنوں کا استعمال شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے آمد و رفت میں تیزی اور وقت کی بچت ہو گئی ہے۔

بھاپ سے چلنے والے ان انجنوں سے جنہوں نے اونچے نیچے پہاڑوں پر سالوں تک سینکڑوں ریل گاڑیوں کو کھینچا ہے مجھے دلی لگاؤ ہے لیکن اب اُن کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ اونچی سے اونچی بولی پر نیلام کر دیا جائے۔ بھاپ کے انجنوں کی طرح ڈیزل انجن بھی ہمارے لئے امریکہ میں ہی تیار ہوئے ہیں۔ حال ہی میں مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ میں جو ڈیزل انجن امریکیوں نے ایران میں استعمال کئے تھے ان میں سے کچھ اب بھی امریکہ کی ریاست آلاسکا میں چل رہے ہیں اور ان پر جو فارسی کے رسم الخط میں نشانات بنے ہوئے تھے وہ آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ایرانی ریلوے کو بین الاقوامی سطح پر پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں تبریز سے روسی سرحد کے قریب شہر جلفا تک دوبارہ ریلوے لائن ڈالنے کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے یہاں روسی ساخت کی چوڑی ریلوے لائن جلفا سے تبریز تک بچھی ہوئی تھی جس کو روسیوں نے ہی بنایا تھا لیکن اب ہم نے اس کا عرض کم کر کے چار فٹ ساڑے آٹھ انچ کر دیا ہے کیونکہ عام طور پر دنیا میں ریلیں اتنی ہی چوڑی پٹریوں پر چلتی ہیں۔ اب روس کے راستے سے جو ایرانی مال یورپ بھیجا جاتا ہے وہ جلفا میں روسی ویگنوں میں لاد دیا جاتا ہے اور جب یہ مال روس سے ہوتا ہوا مغربی یورپ پہنچتا ہے تو اس کو دوبارہ دوسرے ویگنوں میں بھر دیا جاتا ہے۔ تجارتی مال کے علاوہ اس راستے سے مسافر بھی یورپ کا سفر کرتے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر ریلوے لائن کو پھیلانے کے لئے دو اور منصوبے زیرِ غور ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ استنبول اور لندن کے درمیان کئی سال سے اورینٹ ایکسپریس ریلوے سروس جاری ہے اور مسافر استنبول سے لندن کے وکٹوریہ ریلوے اسٹیشن تک براہِ راست سفر کر سکتے ہیں۔ ایرانی ریلوے لائن اور ترکی کی ریلوے لائن کے درمیان صرف دو سو دس میل کا فاصلہ ہے۔ ہم اور ہمارے ترک دوست اس فکر میں ہیں کہ اس فاصلے کو بھی ریل کے ذریعے جلد از جلد ختم کر دیں تاکہ مسافر تہران کے اس شاندار ریلوے اسٹیشن سے جس کو میرے والد نے تعمیر کرایا تھا سیدھے اس ایکسپریس کے ذریعے پیرس یا لندن پہنچ سکیں۔ اس طریقے سے نہ صرف مسافروں کو سہولت مہیا ہوگی بلکہ سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں بھی بہت آسانی ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ یورپ سے جو سامان ایرانی یا نئی کے جہاز کے ذریعے بھیجا جاتا ہے وہ نہر سوئز کو پار کر کے جزیرہ نما عرب سے گذرتا ہوا خلیج فارس کو عبور کر کے جنوبی بندرگاہوں میں پہنچنے کی بجائے سیدھا ہمارے ملک میں آیا کرے گا۔

دوسری طرف ہمارا یہ منصوبہ ہے کہ ایرانی ریلوے کو بڑھا کر برصغیر ہندوستان کی ریلوے سے ملا دیا جائے۔ اس وقت ایران کے شمال مشرقی شہر زاہدان میں صرف ایک ریلوے لائن ہے جو پاکستان سے ملی ہوئی ہے۔ اگلے چند سالوں میں زاہدان سے تہران تک ایک اور ریلوے لائن پر کام مکمل ہو جائے گا۔ جس وقت یہ لائن بن کر تیار ہو جائے گی تو کلکتے سے کراچی۔ تہران۔ استنبول۔ پیرس بلکہ لندن تک سفر بالکل آسان ہو جائے گا اور ہر طرح کا سامان بھی اس لائن پر اور اس سے نکلنے والی دوسری لائنوں پر آسانی سے لے جایا جا سکے گا۔

ایران کے ہوائی جہازوں کی پرواز اور سفر میں جو ترقی و توسیع ہوئی ہے اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ میں چونکہ خود ہوائی جہاز چلانا جانتا ہوں اور فضانوردی سے مجھے خاص لگاؤ ہے اس لئے اگر ایران کی فضائی سروس کی ترقی و توسیع سے مجھے خوشی ہو تو یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں۔

غیر ملکی فضائی ماہرین جو میرے مشیر ہیں انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آج کل ایرانی ہوائی جہاز جتنا راستہ طے کرتے ہیں اگلے پانچ سال میں وہ اس سے تین گنی مسافت طے کیا کریں گے اور عملہ اب سے دوگنا ہو جائے گا۔" تہران کا ہوائی اڈہ دنیا کے خوبصورت ترین ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔" یہ بات مجھ سے اتنی بار کہی جا چکی ہے کہ اب مجھے اس کا یقین ہی کرنا پڑتا ہے اور میں خود بھی اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ایران سے باہر جہاں کہیں بھی میں نے ہوائی سفر کیا ہے کہیں بھی اتنا خوبصورت ہوائی اڈہ نہیں دیکھا۔ ۱۹۵۸ء میں جس وقت یہ ہوائی اڈہ بن کر تیار ہوا تھا اس وقت اس پر چار بین الاقوامی ایرلائنوں کے جہازوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی لیکن آج ان ایرلائنز کی تعداد بیس تک پہنچ گئی ہے۔ اگرچہ تہران کا ہوائی اڈہ جٹ جہازوں کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن ہم آیندہ کے لئے اس سے بھی زیادہ بڑے جہاز اتارنے کے لئے اس کی مزید توسیع کر رہے ہیں۔

آبادان کے ہوائی اڈے کو بھی جو پچھلے کئی سال سے بین الاقوامی فضائی سروس کے لئے استعمال ہو رہا ہے پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا گیا ہے۔ شیراز، اصفہان، یزد اور کرمانشاہ کے ہوائی اڈوں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے ہوائی اڈوں کی توسیع کر دی گئی ہے۔

ایک طرف تو روز بروز ایران کی اقتصادی بہبودی کی وجہ سے اور دوسری طرف تاریخی اور ثقافتی اہمیت کی بنا پر باہر سے آنے والے تاجروں، دانشوروں اور سیاحوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ فضائی سروس کی ترقی و توسیع سے غیر ملکی مہمانوں کے علاوہ ہمارے ہم وطنوں کو بھی ہر جگہ سفر کرنے میں سہولت اور آسانی رہے گی۔ اگرچہ ہمارے ملک میں ہزاروں گاؤں اور قصبے ہیں لیکن سب ایک دوسرے سے دُور بلکہ کافی فاصلے پر آباد ہیں اس لئے ہر گاؤں یا قصبے میں ہوائی اڈہ بنانا اقتصادی اعتبار سے زیادہ مفید نہ ہوگا۔ ان علاقوں کے لئے بہتر ہوگا ایسے ہوائی جہاز استعمال کئے جائیں جو فضا میں سیدھے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔

اس قسم کے ہوائی جہازوں کو جو ہیلی کوپٹر کی طرح فضا میں عمودی شکل میں اوپر جاتے ہیں اور عام جہازوں کی طرح پرواز کرتے ہیں آسانی سے کام میں لایا جا سکتا ہے کیونکہ ان کو کسی باقاعدہ ہوائی اڈے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہوائی اڈوں کی تعمیر و ترقی کے لئے ہم جس جوش و خروش سے کام کر رہے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم نے اپنی بندرگاہوں کو فراموش کر دیا ہے۔ خلیج فارس کی بندرگاہ خرم شہر، بندرگاہ شاپور، بندرگاہ بوشہر اور بندرگاہ عباس کے علاوہ بحر خزر کی بندرگاہ پہلوی کی توسیع و ترقی کا بھی منصوبہ ہمارے سامنے ہے۔

ایران کی تاریخ جب سے شروع ہوئی ہے تقریباً اسی وقت سے ایرانیوں کو جہاز رانی کا شوق ہے لیکن پچھلے چند سالوں میں ہم نے سمندری تجارت کی طرف سے کافی غفلت برتی ہے۔ اگرچہ تمام ملکوں کے جہاز ہمارے ساحل سے گذرتے ہیں اور ہمارے ملک میں درآمد و برآمد بھی انہیں کے ذریعے ہوتی ہے لیکن اب ہم نہیں چاہتے کہ سمندر کے راستے سامان لانے اور لے جانے اور تجارت کرنے کے لئے دوسروں کے دست نگر رہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر میں نے ۱۹۵۴ء میں جہاز رانی کی قومی کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی نے اب تک دو تیل بردار جہاز جن میں سے ہر ایک میں بتیس ہزار ٹن تیل بھرنے کی گنجائش ہے اور دو قدرے چھوٹے مسافر بردار جہاز ہالینڈ کی جہاز ساز کمپنی سے حاصل کئے ہیں۔ کچھ ایرانی جوانوں کو بھی تربیت کے لئے ہالینڈ بھیجا گیا ہے تاکہ وہ جہاز رانی کے جدید ترین طریقے سیکھ سکیں اور واپس آکر جہاز رانی کے عملے کے فرائض انجام دے سکیں۔

دنیا میں جو بھی بڑے سے بڑے تیل بردار ٹرک اور ڈیزل آئل لے جانے والی گاڑیاں ہو سکتی ہیں وہ سب ایران کی شاہراہوں پر دوڑتی ہوئی نظر آئیں گی جن کو بڑے جفاکش، مضبوط اور دیو ہیکل ڈرائیور کوہ و صحرا سے گذار کر ملک کے کونے کونے میں لے جاتے ہیں۔ جیسے ہی ایران کی ریلوے سروس میں ترقی ہوگی تو ان ٹرکوں اور لاریوں کو دوسری نئی تعمیر شدہ سڑکوں پر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک کی سڑکوں کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار میل ہے جن پر ایک لاکھ موٹریں اور دوسری تیز رفتار گاڑیاں ہر وقت دوڑتی پھرتی ہیں۔ لیکن اتنے بڑے ملک کے لئے یہ سڑکیں قطعی ناکافی ہیں۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے چونکہ زمین سخت اور ناہموار ہے اس لئے یہاں سڑکیں بنانے کا کام آہستہ ہو رہا ہے اور خرچ بھی بہت زیادہ آرہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کے لئے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئی طرز کی مشینیں استعمال کر رہے ہیں۔

نقل و حمل کے ذرائع آسان بنانے کے لئے ریلوں اور شاہراہوں کی ترقی کے علاوہ ہم تیل کے لئے پائپ لائن بھی ڈال رہے ہیں۔ چنانچہ اہواز سے تہران تک تقریباً چھ سو میل لمبی پائپ لائن کا کام حال ہی میں مکمل ہو چکا ہے۔ اگرچہ پوری پائپ لائن زمین دوز بنائی گئی ہے لیکن دور دراز پہاڑوں اور صحراؤں میں جگہ جگہ تیل بھرنے کے اسٹیشن، کنٹرول کرنے کے مراکز اور ریڈیو کے ذریعے پیغام رسانی کے مینار زمین کی سطح پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ بستی اور آبادی سے دور انسانی ہاتھوں کے بنائے اس ساز و سامان کو دیکھ کر ابن سن کردسو کی وہ کہانی یاد آجاتی ہے جس میں اس نے ریت پر انسانی پیروں کے نشانات کا ذکر کیا ہے۔ اس پائپ لائن کے ذریعے ہر سال تقریباً بیس لاکھ ٹن تیل بھیجا جاتا ہے۔ اگر یہ پائپ لائن نہ بچھائی گئی ہوتی تو تیل برداری کے لئے سینکڑوں ٹرکوں اور ویگنوں کی ضرورت ہوتی۔ اس بڑی پائپ لائن میں سے بہت سی شاخیں بھی نکالی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے صنعتی شہر اصفہان کی طرف جاتی ہے۔ شہر مشہد اور رشت کے لئے پائپ لائن کا کام زیر تعمیر

دوسرے ممالک کو تیل کی سہولتیں دینے کے لئے ہم نے ترکی سے ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے ہم تہران کے دو جنوبی علاقوں یعنی قُم اور سراجہ سے ترکی تک یعنی بحر روم کے ساحل کی کسی بھی بندرگاہ پر پائپ لائن ڈالیں گے۔ اس پائپ لائن کی تعمیر کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان دونوں ذخیروں سے تیل اتنا برآمد ہو جائے کہ تجارتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس پائپ لائن کی لمبائی تیرہ سو میل ہوگی اور خرچ تقریباً پچاس لاکھ ڈالر آئے گا۔ اس وقت جن جہازوں میں تیل بھر کر یورپ بھیجا جاتا ہے وہ اس قدر بڑے ہیں کہ نہر سوئز سے نہیں گذر سکتے چنانچہ ان کو شمالی امریکہ یا یورپ پہنچنے کے لئے پورے براعظم افریقہ کا چکر لگانا پڑتا ہے۔ جس وقت یہ پائپ لائن بن جائے گی تو بڑے تیل بردار جہاز بہیں آسانی سے تیل بھر سکیں گے۔ اس کے علاوہ جب یہ لائن مکمل ہو جائے گی تو ایران سے بحر روم تک جو رقم باربرداری پر خرچ ہوتی ہے وہ بچ جائے گی۔

ایران کی طرح جن ممالک نے شاہراہِ ترقی پر حال ہی میں قدم رکھا ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ظاہری اور ثقافتی ماحول میں جس قدر جلد ہو سکے تبدیلی پیدا کرلیں۔ ان مقاصد کے لئے پیغام رسانی کے تیز رفتار آلات کی خاص اہمیت ہے۔ ۱۹۵۷ء میں پورے ملک میں صرف پچاس ہزار ٹیلیفون تھے لیکن یہ عوام کی ضرورت کے لئے ناکافی تھے اس لئے حال ہی میں ایک لاکھ اسی ہزار مزید ٹیلیفون خریدے گئے ہیں جن کو بڑی تیزی سے جگہ جگہ لگایا جا رہا ہے۔ ریڈیو ٹیلیفون کی ترقی اور پھیلاؤ کے بارے میں پہلے بھی ذکر آچکا ہے۔ جلد ہی وہ دن آئے گا جبکہ سارے ملک میں اس کا جال پھیل چکا ہوگا اور ہزاروں میل لمبی ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کی لائنیں پورے ملک میں نظر آئیں گی۔ ہمارے ملک میں اس وقت بہت سی ٹیلی پرنٹر مشینیں بھی ہیں جن کو ایرانی لڑکیاں ہی چلاتی ہیں۔

اس وقت ریڈیو، ٹیلیفون اور ریڈیو ٹیلیگراف کے ذریعے ہمارا رابطہ پاکستان، یورپ اور یورپ کی راہ سے امریکہ تک قائم ہے۔ جو ممالک ہمارے ساتھ سینٹو معاہدے میں شریک ہیں ان کی مدد سے ہم بین الاقوامی سطح پر ریڈیائی لہروں کے ذریعے پیغام رسانی کا ادارہ قائم کر رہے ہیں۔ جب یہ کام مکمل ہو جائے گا تو بیک وقت ایک سو بیس پیغامات انقرہ، تہران اور کراچی کے اسٹیشنوں پر بھیجے جا سکیں گے۔ چند سال پہلے ہم نے ٹیلی فوٹو سروس بھی جاری کی ہے اور اب ہم بڑی آسانی سے جاپان اور انگلستان سے تصاویر اور دستاویزات حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک میں نشری پروگراموں کے لئے تہران اور دوسرے کئی صوبوں میں ٹرانسمیٹر بھی نصب کئے جا چکے ہیں۔

۱۹۵۸ء میں میں نے بین الاقوامی نشریات کے لئے ایک بڑے طاقتور ٹرانسمیٹر کا افتتاح کیا تھا جس کی وجہ سے اب ہمارے ملک کا شارٹ ویو[1] نشریاتی پروگرام بھی دوسرے ممالک میں سنا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم جلد ہی ان کے لئے ایک اور میڈیم ویو[2] کے لئے چار نئے ٹرانسمیٹر نصب کرنے والے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں ہی میں نے ایران کے پہلے ٹیلیویژن اسٹیشن کا اجرا کیا جو سرِدست تہران اور اس کے گرد و نواح میں اپنا پروگرام نشر کرتا ہے۔ اس وقت آبادان میں ایک اور شہر تہران میں دو ٹیلیویژن کے مراکز ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ تمام قصبات اور دیہات میں ٹیلیویژن سیٹ پہنچ جائیں گے اور ہر گاؤں میں کم از کم

1. SHORT WAVE 2. MEDIUM WAVE

ایک پنچایتی ٹیلیویژن ہوگا۔

زراعت اور کاشت کاری میں جس قدر تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں اس کا ذکر میں اگلی فصل میں کروں گا۔ یہاں صرف صنعتی اور تجارتی ترقی کا حال بیان کیا جائے گا۔ ان دونوں میدانوں میں ہم بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پچھلی فصل میں یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ حکومت کے تعاون سے میرے والد نے ایرانی صنعت کو کس قدر فروغ دیا تھا۔ اُن کے عہد میں چونکہ صنعتی ماہرین اور صنعتی اداروں کی نگرانی کرنے والے لوگوں کی کمی تھی اور ایرانی سرمایہ دار نئے صنعتی کاموں میں سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے اس لئے حکومت کو ہی ہر کام میں پیش قدمی کرنی پڑی۔ بعض معاملات میں آج بھی اس قسم کی مشکلات اور دشواریاں موجود ہیں۔ چنانچہ فولاد سازی کے کارخانے کو ہی لے لیجئے۔ یہاں بھی حکومت کو ہی یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ ملک میں جو بہت سے صنعتی مراکز مشغولِ کار ہیں وہ سب حکومت کے ہی قائم کردہ ہیں اور اب ان کو حکومت ہی چلا رہی ہیں۔ یہاں میں صرف چند اہم کارخانوں کا ہی ذکر کروں گا۔

مثال کے طور پر آج کل قومی ترقیاتی منصوبوں کے لئے سیمنٹ خاص اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ حکومت نے سیمنٹ سازی کے دو کارخانے حال ہی میں قائم کئے ہیں۔ جہاں ہر سال تقریباً تین لاکھ ٹن سیمنٹ تیار کی جاتی ہے۔ سیمنٹ کی یہ مقدار اس سے چارگنا زیادہ ہے جو ہم کو ۱۹۵۴ء تک حاصل ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ پرائیویٹ کارخانوں میں بھی سیمنٹ پہلے سے زیادہ مقدار میں بن رہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے اور کارخانے بھی قائم کئے ہیں جن میں چونے کی اینٹیں اور بھٹّے میں استعمال ہونے والی راکھ تیار کی جاتی ہے۔ جن کو پبلک اور پرائیویٹ کارخانے والے دوسری صنعتوں میں استعمال کرتے ہیں۔

ایران میں سالانہ کپڑے کی کھپت تقریباً تیس کروڑ پچاس لاکھ گز ہے یا دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ہر سال بیس ہزار میل کپڑا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں سے آدھا کپڑا باہر سے آتا ہے۔ اس وقت سوتی اور اونی کپڑوں کے کئی کارخانے حکومت چلا رہی ہے۔ جلدی ہی اور بھی کئی نئے کارخانے کھولے جائیں گے۔ کارخانے کے مالکان کو قرضے بھی دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے کارخانوں کو ترقی دے سکیں اور نئے کارخانے کھول سکیں۔ اس ترقیاتی منصوبے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ۱۹۶۱ء تک ہمارے کارخانے مزید ایک تہائی کپڑا تیار کرنے لگیں گے۔ کسانوں کی مدد اور زیادہ کپڑا حاصل کرنے کی غرض سے حکومت نے اکثر جگہ روئی صاف کرنے کی مشینیں لگوادی ہیں اور مزید مشینیں لگوانے کا انتظام بھی کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے ریشمی کپڑے بُننے، جوٹ کی بوریاں بنانے اور رسّیاں بٹنے کے کارخانے بھی قائم کئے ہیں (جلدی ہی ہمارے ریشم کے کارخانے سائنٹفک طریقوں سے مصنوعی ریشم تیار کرنے لگیں گے)

حکومت ایک کارخانہ تانبہ صاف کرنے کا اور کچھ کارخانے نمک کا تیزاب اور بھاری صنعتوں کے لئے کیمیاوی مواد تیار کرنے بھی چلا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں ایک کارخانہ بناسپتی گھی بنانے کا بھی ہے جہاں گھی کے علاوہ صابن اور کھلی بھی تیار کی جاتی ہے جو جانوروں کے لئے نہایت غذائیت بخش خوراک ثابت ہوئی ہے۔ ہمارے کارخانوں کا بنایا ہوا صابن ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں بکتا ہوا نظر آئے گا۔

زرعتی مراکز میں بھی حکومت نے کچھ کارخانے قائم کئے ہیں جہاں ٹین کے ڈبوں میں گوشت، مچھلی، میوے اور دوسری اشیاء بند کی جاتی ہیں۔ دو کارخانے خشک میووں کو صاف کرنے کے لئے بھی کھولے گئے ہیں جن کو صاف کرنے کے بعد پیکٹ بنا کر ملک کے اندر اور باہر استعمال کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ گیلان اور مازندران میں دو درجن سے زیادہ کارخانے چائے کے ہیں جو پچھلے پانچ سالوں میں قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کارخانے حکومت کے ہیں اور کچھ حکومت کی نگرانی میں چل رہے ہیں۔ حکومت چائے کی پتیوں کو کاشت کاروں سے خرید لیتی ہے۔ چائے کی مختلف قسموں کو بہتر بنانے کے لئے باغوں کے مالکوں کو اقتصادی اور تکنیکی مدد بھی حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی چائے کی مانگ غیر ممالک میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔

اس وقت ایک درجن سے زیادہ قند سازی کے سرکاری کارخانے ملک کے مختلف حصّوں میں چل رہے ہیں۔ ایران میں قند زیادہ تر چقندر سے تیار کی جاتی ہے۔ حکومت چقندر کے بیج کسانوں میں مفت تقسیم کرتی ہے اور کیڑوں کو مارنے والی دوائیاں بھی اپنے ہی پاس سے دیتی ہے۔ جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو اس کو سرکاری پیسے سے خرید کر کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

ایران میں ایک فیکٹری تمباکو کی بھی سرکاری خرچ سے چل رہی ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک اور پلانٹ کا اضافہ کر کے اس کی مزید توسیع کی گئی۔ اس وقت یہاں مال کی برآمد پہلے سے دوگنی ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہر روز تقریباً بارہ ۱۲ ٹن پائپ میں بھرنے والا تمباکو، تین کروڑ سگرٹ اور دیگر سگرٹ نوشی کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ ہماری فیکٹریوں کے تیار کردہ سگرٹ ایران کے گاؤں گاؤں میں پہنچ گئے ہیں۔ عوام و کسان اس کو بڑی خوشی سے استعمال کرتے ہیں۔ حال ہی میں ہم نے فلٹر والے سگرٹ جو مغربی ممالک میں عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں تیار کرنا شروع کر دیئے ہیں جن کو مضبوط موٹے کاغذ کی ڈبیوں میں بند کر کے بازار میں بھیج دیا جاتا ہے۔ بیرونی ممالک میں بھی ایرانی سگرٹ کی مانگ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ حال ہی میں ہم نے ایک اور منڈی حاصل کی ہے سگرٹ کی ڈبیوں پر عرب ممالک کے خوبصورت مناظر چھاپ کر ہم بھاری تعداد میں سگرٹ ان ریاستوں اور جزیروں میں بھیج رہے ہیں جہاں عرب شیخ حکمران ہیں۔

مغربی ممالک کے رہنے والوں کی طرح ایرانی بھی خوراک میں زیادہ تر گیہوں اور اس کے بعد دوسرے غلّے استعمال کرتے ہیں۔ مختلف اناجوں کو جمع کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں۔ چنانچہ تہران، اہواز، اصفہان، کرمانشاہ، مشہد، شیراز اور تبریز کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی سائنٹفک طریقوں پر برج نما ذخیرے تیار کئے گئے ہیں جو ہر سال تعداد میں برابر بڑھ رہے ہیں۔

سرکاری ریلوے کے تحت بھی ایک کارخانہ چل رہا ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں ریل کی پٹریوں کے لئے لکڑی کے سلیپر تیار کئے جاتے ہیں۔ پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ حکومت اقدامات کر رہی ہے کہ لکڑی کے سلیپروں کی بجائے سیمنٹ کے سلیپر استعمال کئے جائیں۔ یہ بات بھی پہلے بتائی جا چکی ہے کہ میرے والد اس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ ہماری مسلح فوجیں غیر ملکوں سے منگائے ہوئے ہتھیاروں پر سو فیصدی تکیہ کریں۔ میری حکومت بھی انہی کے فیصلے پر کاربند ہے۔ چنانچہ بندوقیں، ہلکی مشین گنیں اور دیگر ہتھیار بھی اب ایرانی کارخانوں میں تیار کئے جانے لگے ہیں۔

تہران سے چند میل دور مغرب کی جانب یونیورسٹی طرز کی ایک نہایت شاندار اور خوبصورت عمارت ہے۔ جس کا نام رازی انسٹی ٹیوٹ ہے۔ یہ ادارہ ایران کے جلیل القدر اور نامور حکیم ابوبکر محمد ذکریا رازی (متوفی ۱۲۰۹ء عیسوی) کے نام پر قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے میں انسانوں اور جانوروں کو بیماری سے نجات دلانے کے لئے بڑی کثیر تعداد میں ٹیکے لگانے والی دوائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں حیاتیات کے موضوع پر تمام سال تحقیقی کام اور تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ ایران کا سب سے بڑا طبی اور حفظانِ صحت سے متعلق کتب خانہ یہیں پر ہے۔ بطور مجموعی اس جگہ تقریباً طرح طرح کے چار کروڑ ٹیکے مختلف بیماریوں کی روک تھام کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ پاسچر انسٹی ٹیوٹ جو حکومت سے ہی وابستہ ہے میرے والد کے عہد میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ بھی وہی کام انجام دے رہا ہے جو رازی انسٹی ٹیوٹ کا ہے۔ ان دونوں اداروں نے علمی تحقیقات اور اعلیٰ تعلیمی معیار کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت پائی ہے اور اب ان دونوں اداروں کی وجہ سے ایران کو طبی میدان میں کسی بیرونی ملک کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔

تیل کی صنعت کے سلسلے میں جو میری حکومت نے سائنٹفک اور تکنیکی اقدامات کئے ہیں اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس کے علاوہ ایران میں جو علمی اور صنعتی ترقی و توسیع کے لئے کام کئے گئے ہیں ان میں سے ایک قومی اسٹینڈرڈ بیورو کا قیام ہے جس کا افتتاح میں نے ۱۹۵۹ء میں کیا تھا۔ اس ادارے کا فرض ہے کہ جو سامان ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے اس کو ہر طرح روز بروز بہتر بنائے۔ مال کی جانچ پڑتال کرے اور یہ دیکھے کہ سب چیزیں ہر اعتبار سے ایک جیسی ہیں۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایران کے کچھ کوتاہ اندیش سوداگروں نے بیرونی ممالک میں گھٹیا مال اور کچے رنگ کے قالین بھیج کر، خشک میووں کو مٹی اور ریت میں ملا کر اور وزن بڑھانے کی خاطر روئی میں اینٹیں رکھ کر ہمارے مال کی ساکھ خراب کر دی ہے۔ ہم ان سب گراوٹ کی باتوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ جس وقت ایران کا مال غیر ملکی خریدار کے ہاتھوں میں پہنچے تو اس کے ماتھے پر غصے سے بل پڑنے کے بجائے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار نمایاں ہوں۔

حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ ملک کے اندر اور باہر بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ اس وقت ایرانی حکومت بہت سے کارخانے اور تحقیقی ادارے چلا رہی ہے۔ جو لوگ مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کی بنیادی فکر و نظر اور سیاسی حالت و کیفیت کے متعلق واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ہماری صنعتی اور تکنیکی ترقی کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سرکاری کارخانوں کے علاوہ بہت سے ایسے پرائیویٹ کارخانے بھی چل رہے ہیں جن کے متعلق ابھی تک میرے ہم وطنوں اور غیر ملکیوں کو علم نہیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس وقت کتنی پرائیویٹ کمپنیاں ایران کی کانوں سے کتنا خام مال برآمد کر رہی ہیں۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ساٹھ فیصدی ایرانی صنعت غیر سرکاری یعنی پرائیویٹ کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگرچہ صحیح اعداد و شمار تو ابھی حاصل نہیں ہوئے ہیں لیکن جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی پرائیویٹ کمپنیوں

اور اداروں نے ایرانی صنعت کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ چنانچہ جو خام مال اس وقت یہ کمپنیاں اور ادارے کانوں سے نکال رہے ہیں ان کی تفصیل نیچے درج ہے۔

اینٹی مون (سُرمے کا پتھر) آرسینک۔ بوکسیٹ (المونیم کی خام دھات) کرومیٹ (تیزابی نمک) پتھر کا کوئلہ۔ تانبہ۔ گرافیٹ (سیاہ سیسہ) آئرن اوکسائڈ۔ کاؤلین۔ سیسہ۔ مگنیشیم۔ منگانیز (شیشے کی خام دھات) کوارٹز۔ نمک۔ سلیکا۔ گندھک۔ قلعی۔ ٹنگسٹن۔ فیروزہ اور جست وغیرہ۔

ہمارے پرائیویٹ اور لوگوں کے ذاتی کارخانوں میں تقریباً پچاس قسم کا سامان تیار ہوتا ہے جن میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

الکحل و شراب وغیرہ۔ سوڈا واٹر اور اس کی مختلف قسمیں۔ جانوروں کا چارہ۔ بند ڈبوں میں کھانے پینے کا سامان۔ گیہوں کا آٹا۔ پسا ہوا چاول۔ قند و چینی۔ چائے۔ بناسپتی گھی۔ بغیر سلا کپڑا۔ سلا ہوا کپڑا۔ نکل پالش۔ دھات کے برتن۔ لوہے کا فرنیچر۔ لکڑی کا فرنیچر۔ دفتروں میں کام آنے والا سامان۔ لوہے کے صندوق۔ روشنی کے لئے نیون گیس۔ کمرہ گرم کرنے کے چولہے۔ اسٹوو۔ بیٹریاں۔ اینٹیں۔ سیمنٹ۔ کیمیاوی مسالے۔ خشک میوے۔ دوائیاں۔ رنگ۔ بجلی کی موٹریں۔ گتا۔ شیشہ۔ سریش۔ برف۔ اسپرٹ۔ روشنائی۔ چمڑا۔ چینی کے ٹائل۔ دیاسلائی۔ کیلیں۔ ڈھبری و کابلا۔ آکسیجن گیس۔ رنگ و روغن۔ کاغذ۔ پلاسٹک کا سامان۔ پمپ۔ ربڑ کا سامان۔ تجوریاں۔ جوتوں کی پالش۔ صابن وغیرہ۔

یہاں مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ایرانی سرمایہ دار بھی ایرانی صنعت و حرفت کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ اس وقت دو ایرانی کمپنیاں ہیں جنہوں نے جدید طرز کی فائلیں رکھنے کی کیبنٹ، دفتروں میں کام آنے والے سامان اور فرنیچر تیار کرنے کے پلانٹ لگائے ہیں۔ کسی ملک کی اقتصادی ترقی میں نئی طرز کے دفتری سامان کی بہت اہمیت ہے۔ میری رائے میں کسی ملک کی ترقی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جو سامان اور فرنیچر اس ملک میں استعمال ہو رہا ہے وہ یہیں کا تیار کردہ ہے یا باہر سے منگایا گیا ہے اور یہی بات ہم پر بھی صادق آتی ہے۔ جن دو کارخانوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ان میں سے ایک کا مینیجنگ ڈائرکٹر چند سال پہلے ایک معمولی لوہار تھا لیکن میری نظر میں یہ معمولی لوہار ایران کے اس درمیانی طبقے کا ایک نمائندہ ہے جو تیزی سے ابھر رہا ہے اور یہی وہ طبقہ ہے جس پر ایران کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ اس مینیجنگ ڈائرکٹر کا کہنا ہے کہ اس کارخانے میں جو آہنی صندوق اور تجوریاں تیار کی گئی ہیں ان میں نقب لگانا تو درکنار کوئی کھول بھی نہیں سکا ہے۔ وہ تو ہنسی ہنسی میں یہاں تک کہہ گیا کہ ابھی ایرانی آہنی صندوق یا تجوریاں توڑنے میں اتنے ماہر نہیں ہوئے ہیں جتنے مغربی ممالک میں ہیں۔

اوپر جو دو فہرستیں دی گئی ہیں وہ پڑھنے والوں کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ میری رائے میں پرائیویٹ کمپنیاں اور کان کنی کے محکمے بہ نسبت ان کارخانوں کے جو سرکاری بل بوتے پر چل رہے ہیں زیادہ ترقی کریں گے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

پہلی تو یہ کہ ہمارا یہ منشا و مقصد ہے کہ جتنی بھی فیکٹریاں اور کارخانے حکومت کی نگرانی میں چل رہے ہیں ان کو آہستہ

آہستہ پرائیویٹ اداروں کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کی برآری کے لئے ہم نے ایک امریکی فرم کی مدد سے ایک مشاورتی بورڈ قائم کیا ہے جس کے ممبران کو کارخانوں اور فیکٹریوں کے نظم و نسق اور عمدہ طریقے سے چلانے کی خاص مہارت ہے۔ یہ بورڈ ہمارے کارخانوں کے کام اور رفتار کو دیکھ کر اپنی رپورٹ پیش کرے گا اور ہم کو یہ مشورہ دے گا کہ ہمارے کارخانوں میں حسن انتظام اور بہتر کارکردگی کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور ہم کو بتائے گا کہ کس طرح ان کارخانوں کو پرائیویٹ فرموں اور اداروں کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے ہم وطن اور غیر ملکی سرمایہ داروں کو اس بات کی طرف مائل کر رہے ہیں کہ وہ اپنے سرمائے کو نئی نئی صنعتوں اور تجارتی کاموں میں لگائیں۔

ایران کے بنیادی آئین اور اس کے جزئیاتی قوانین سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صنعتی ترقی کے بارے میں ہماری کیا پالیسی ہے۔ ہمارے آئین اور معدنیات کے قانون میں جس کی حال میں نظر ثانی کے بعد اصلاح کی گئی ہے عوام کے مفاد کے پیش نظر معدنیات کے نکالنے کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ معدنیات کے قانون کے مطابق ہماری معدنیات کی تقسیم بندی تین حصّوں میں ہوتی ہے۔ پہلے حصّے میں چونا۔ سنگ مرمر۔ عمارتی پتھر اور گچ وغیرہ شامل ہیں۔ اگر یہ معدنیات کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں پائی جاتی ہوں تو وہ شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ جس قدر مال کانوں سے نکالے اس کا پانچ فیصدی حصّہ حکومت کے خزانے میں جمع کرے۔

دوسرے حصّے میں دھاتیں۔ ٹھوس ایندھن۔ نمک اور قیمتی پتھروں کا شمار کیا جاتا ہے۔ ان معدنیات کو نکالنے یا یافت کرنے کے لئے ضروری ہے جس شخص کی ملکیت میں یہ کانیں ہوں وہ حکومت سے تحریری اجازت نامہ (لائسنس) حاصل کرے اور جس قدر مال کانوں سے نکالے اس کا چار فیصدی حکومت کو ادا کرے۔

تیسرے حصّے میں تیل اور ریڈیو ایکٹیو میں کام آنے والا مواد جیسے یورنیم وغیرہ شامل ہیں۔ ان معدنیات کے استخراج کا ان کے مالک کو کوئی حق نہیں ہے بلکہ حکومت کو اس بات کا مجاز ہے کہ وہ چاہے تو اس مال کو خود نکالے خواہ کسی کمپنی یا شخص کو ان کو نکالنے کے لئے پٹے پر وہ جگہ دیدے جہاں یہ معدنیات پائی جاتی ہیں۔

ایرانی کمپنیاں یا کچھ حصّے دار مل کر اگر چاہیں تو حکومت سے باقاعدہ اجازت لینے کے بعد کانوں سے معدنیات نکال سکتی ہیں۔ اگر غیر ملکی کمپنیاں چاہیں تو تیل اور دوسری چیزیں حاصل کر سکتی ہیں بشرطیکہ ایرانی پارلیمنٹ ان کو اس کام کی اجازت دیدے۔ ان کمپنیوں کو کیا مواقع اور مراعات حاصل ہو سکتے ہیں ان کو بہتر طریقے پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان معاہدوں کا مطالعہ کیا جائے جو ہم نے امریکی اور دوسرے ممالک کی تیل کمپنیوں سے کئے ہیں۔ اس کتاب میں بھی اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اسی طرح صنعت کے دوسرے شعبوں میں بھی اگرچہ حکومت نے کچھ پابندیاں لگا کر حدود مقرر کر دی ہیں لیکن پرائیویٹ کمپنیوں اور نجی سرمایہ لگانے والوں کے واسطے آگے بڑھنے کے لئے ابھی بہت بڑا میدان خالی ہے۔ اگرچہ کچھ بنیادی صنعتیں جیسے ریلوے۔ ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف سسٹم۔ ریڈیو براڈکاسٹنگ اور اسلحہ سازی وغیرہ خالص حکومت کی ملکیت ہیں لیکن پرائیویٹ کمپنیاں اگر

چاہیں تو تجارتی انجمنیں یا دوسرے صنعتی کارخانے چلا سکتی ہیں۔ چنانچہ تیل صاف کرنے کا کارخانہ اگرچہ کسی پرائیویٹ کمپنی کی ملکیت نہیں ہو سکتا لیکن بہت سی کمپنیاں اس کے انتظام اور چلانے میں حصّہ دار ہیں۔

آج ایرانی سڑکوں پر جتنے بھی ٹرک سامان ڈھوتے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں سے زیادہ تر عام لوگوں کے ہیں یا پرائیویٹ کمپنیوں کے تحت چل رہے ہیں۔ ایک پرائیویٹ ہوائی جہاز کمپنی اور ایک تقریباً نیم سرکاری ہوائی کمپنی جس کا نام ایرانین نیشنل ایرویز ہے اس وقت ایک ساتھ چل رہی ہیں اور روز بروز ترقی کر رہی ہیں۔ اسی طرح فلمی صنعت بھی پرائیویٹ ہاتھوں میں ہے۔

۱۹۵۵ء میں ہماری پارلیمنٹ نے ایک بِل پاس کیا جس پر میرے بھی دستخط ہیں۔ اس بِل کے ذریعے غیر ملکی سرمایہ داروں کو ایران میں سرمایہ لگانے کی ترغیب اور ان کے سرمائے کی حفاظت کی یقین دہانی کی گئی تھی۔ اس بل کی رو سے غیر ملکی سرمایہ دار ایران کی صنعتوں میں اپنا سرمایہ لگا کر مناسب و معقول حد تک نفع کما سکتے ہیں۔ اور اگر بعد میں چاہیں تو وہ اپنے سرمائے کو اپنے ملک کے سکّے کی شکل میں واپس بھی لے سکتے ہیں۔ اس بِل میں اس بات کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ اگر کسی صنعت کو حکومت قومی ملکیت قرار دے گی تو سرمایہ دار کو اس کے سرمائے کا معاوضہ دیا جائے گا۔

۱۹۵۷ء میں ایرانی اور امریکی حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ایرانی حکومت نے امریکہ کے پرائیویٹ سرمایہ داروں کے سرمائے کی حفاظت کی ضمانت اپنے ذمّے لی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اب امریکی سرمایہ دار اپنا سرمایہ بڑے ذوق و شوق سے ایران کی صنعتی ترقی میں لگا رہے ہیں۔ نہ صرف امریکی بلکہ دوسرے ممالک کے سرمایہ داروں نے بھی عملی طور پر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ ایران جو اس وقت ترقی کی راہ پر گامزن ہے اس کے صنعتی اور اقتصادی کاموں میں سرمایہ لگانا ہر لحاظ سے سودمند اور نفع بخش ہے۔

اس طرح ہمارے ملک کے سرمایہ دار بھی معدنیات کے نکالنے اور دوسرے صنعتی کاموں کے لئے سرمایہ لگانے میں پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہم نے صنعتی ترقی کے لئے لوگوں کو روپیہ قرض دینے کا بھی بندوبست کیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں سرمایہ لگانے کی لگن بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہاں میں یہ بات بڑے فخر اور جوش سے کہوں گا کہ ایران میں پرانے ڈھنگ کے سکّے کا چلن (یعنی جس قدر سونا ہو اتنے ہی سکّے جاری رکھنا) بہت قدیم عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ ہمارا سکّہ جس مقدار میں رائج ہوتا تھا اس سے زیادہ سونے کی مقدار ہمارے پاس شاہی خزانے میں محفوظ رہتی تھی (اس میں سونے اور دیگر مبادلے کی اشیاء کے علاوہ شاہی تاج اور اس کے جواہرات بھی شامل ہوتے تھے) ۱۹۵۷ء میں میں نے اقتصادی ترقی کے پیشِ نظر سونے کی مالیت کے مطابق سکّے کو رائج کرنے کے طریقے پر نظرِ ثانی کا فیصلہ کیا۔ ایرانی پارلیمنٹ نے بھی میرے اس نظریے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ جس وقت دوبارہ سونے کی مالیت کا اندازہ لگایا گیا اور سونے کے برابر سکّہ جاری کیا گیا تو سکّے کی مقدار میں دس کروڑ ڈالر کے برابر اضافہ ہو گیا۔ اس اضافہ شدہ رقم میں سے آدھی صنعتی ترقی کے لئے اور آدھی زراعتی فلاح کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ میرے بعض مشیروں نے

اس خوف کا بھی اظہار کیا کہ ایسا کرنے سے روپے کی قوتِ خرید گھٹ جائے گی لیکن میں نے ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر یہ روپیہ پیداواری کاموں کی بجائے دوسرے معاملات میں جیسے زمین وغیرہ کی خریداری میں صرف ہوتا تو یہ حادثہ پیش آ سکتا تھا لیکن ہم چونکہ اس روپے کو صرف زراعت اور ان صنعتوں میں لگا رہے ہیں جن کی پیداوار بہت جلدی اور تیزی سے ہوتی ہے جس سے پیداوار بڑھ کر روپے کے اضافے کے تناسب تک پہنچ سکتی ہے۔ اس لئے روپے کی قوتِ خرید گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۱۹۵۷ء کے اواخر میں صنعتی قرضے دینے کا کام شروع ہوا جس کے نتائج بہت ہی عمدہ برآمد ہوئے۔ جب ایرانی سرمایہ داروں کو اس طرح کی سہولتیں میسّر آئیں تو انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ اپنے سرمایہ کو معدنی اور صنعتی کاموں میں لگانا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ جنہوں نے اپنا سرمایہ غیر ممالک میں جمع کر رکھا تھا انہوں نے اس کو واپس منگا لیا اور اس کو ترقیاتی کاموں میں صرف کرنے لگے۔

اب سے قبل صنعتی کاموں کے لئے جو سرمایہ لگایا جاتا تھا اس پر سود ۲۴ فیصدی اور کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جب سے حکومت نے قرضے دینے شروع کئے ہیں تو سود کی شرح بہت زیادہ گر گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے غیر ملکی سرمایہ داروں کے دل میں بھی شوق اور رغبت کا جذبہ پیدا کیا ہے تاکہ وہ بھی اپنا سرمایہ لگا کر ایرانیوں کے ساتھ ہماری نئی صنعتی ترقی میں حصّہ لیں۔

ہمارے ملک میں وزارت صنعت و معدنیات اور ایرانی قومی بنک (بانک مِلّی ایران) مل کر لوگوں کو صنعتی قرضے دینے کا انتظام کرتی ہیں۔ جب کوئی صنعتی منصوبہ تیار کر کے وزارت صنعت و معدنیات کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس کا تکنیکی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتی ہے اور قومی بنک قرضے کی درخواست دینے والوں کے معاملات پر غور و فکر کرتا ہے۔ قرض مانگنے والوں کی ذاتی اور صنعتی اہلیتوں اور صلاحیتوں کے علاوہ اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کہ کونسے ایسے کام ہیں جن سے صنعتی پیداوار اور قومی آمدنی میں قابل قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کی جانچ اور ہر پہلو پر غور کرنے کے لئے اقتصادی کونسل کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ ادارہ پورے ملک میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جو اقتصادی ترقی میں توازن اور ہم آہنگی قائم رکھتا ہے۔ اقتصادی ترقی کی ہر درخواست پر یہاں نظرِ ثانی کر کے فیصلے کئے جاتے ہیں جو ہر اعتبار سے اٹل ہوتے ہیں۔

جو لوگ صنعتی قرضے کی درخواست کرتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ پورے منصوبے پر جو خرچ آتا ہو اس کا تیس فیصدی اپنے پاس سے لگائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے ان اقدامات میں سنجیدگی سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ کم از کم تیس فیصدی سرمایہ دیکھنے کے بعد وزارت صنعت و معدنیات پچاس فیصدی قرضہ پیشگی دے دیتی ہے اور باقی بیس فیصدی سرمایہ درخواست دینے والوں کو دوسرے ذرائع سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس اصول پر اب تک باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ جس کی مدد سے کوئی بھی شخص تھوڑا سرمایہ لگا کر کافی بڑا منصوبہ شروع کر سکتا ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سرمایہ لگانے والے کو ایک طرف یہ اطمینان ہوتا ہے کہ حکومت اس کے کام میں مداخلت نہیں کرے گی بلکہ سرمایہ

فراہم کرکے اس کو تقویت پہنچائے گی۔ جیسے ہی کوئی منصوبہ عملی اقدامات سے گذر کر ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے تو قرضہ قسط وار ادا کردیا جاتا ہے لیکن ہر قسط کے ساتھ ہی ساتھ حکومت کی طرف سے کام کی رفتار کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی جانچ اور معائنہ نہ صرف حکومت کے حق میں نفع بخش ہے بلکہ اس سے ان لوگوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے جو اپنا نجی سرمایہ لگاتے ہیں کیونکہ اس کا اثر کام کی رفتار پر بہت عمدہ پڑتا ہے۔ جب کوئی نیا کارخانہ قائم ہوتا ہے تو پانچ سال تک اس سے کسی قسم کا ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا اور اگر ان کارخانوں کا مال ملک سے باہر بھیجا جاتا ہو تو ان سے کسٹم کی رقم بھی نہیں لی جاتی۔

جو قرضے صنعتی ترقی کے لئے دیئے جاتے ہیں ان پر سالانہ سود چار سے چھ فیصدی تک لیا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اگر یہ قرضہ بڑی صنعتوں کے لئے لیا جائے جیسے کپڑے یا قند سازی کا کارخانہ لگانے کے لئے یا زمین سے معدنیات نکالنے کے لئے تو سود صرف دو فیصدی وصول کیا جائے گا۔ لیکن باقی دوسری صنعتوں کے لئے شرح سود چھ فیصدی مقرر ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سود کی رقم کو اتنا نہیں بڑھنے دوں گا کہ ملک کا اقتصادی ڈھانچہ مفلوج ہو کر رہ جائے اور سرمایہ داران لوگوں کی محنت کو جو دن رات لگ کر پیداوار کو بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں سود کی شکل میں اپنی تجوریوں میں بھرتے چلے جائیں۔

صنعتی قرضہ دینے کا کام شروع ہونے کے ایک سال بعد ہی تقریباً ایک سو پچاس کارخانے کپڑے، قند سازی، عمارتی سامان، کیمیاوی سامان، کھانے پینے کا سامان، پلاسٹک، کاغذ، گتے، گھریلو چیزوں اور معدنیات سے مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے حرکت میں آ گئے۔ صنعتی قرضوں کے پروگرام سے قبل جو کارخانے زیر تکمیل تھے اور ان کے مالکوں نے دوسرے ذرائع سے سرمایہ اور دوسرا ضروری سامان مہیا کر لیا تھا وہ اس اثنا میں ہر اعتبار سے مکمل ہو گئے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پہلے ہی سال میں پندرہ کارخانوں نے مال تیار کرنا بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ کارخانے جھینگا مچھلی، بناسپتی گھی، سوئی، ریشمی کپڑے، تاگے، پنسلیں، دوائیاں، ایلومینیم کا سامان، دیگ چون کے پائپ، سیمنٹ کے بلاک، برف، خام معدنیات وغیرہ بازار میں فروخت کے لئے برابر بھیج رہے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گذرے گا زیادہ سے زیادہ مصنوعات بازار میں آئیں گی اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔ ہمارے آگے بڑھتے ہوئے ایرانی کاریگروں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف مغربی طرز کے سامان میں اپنی ضروریات کے مطابق ردّ و بدل کر سکتے ہیں بلکہ خود بھی اچھی چیزیں بنا سکتے ہیں اور بڑی تیزی سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

صنعتی میدان میں ایران نے جو تیزی سے ترقی کی ہے اس کا مختصر سا ذکر میں نے اس فصل میں کیا ہے۔ غیر ملکی لوگ جو ہمارے ملک میں آتے ہیں وہ ہم سے زیادہ ان ترقیات کو محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ پورے حالات کا جائزہ لے کر غیر جانبدارانہ رائے قائم کرتے ہیں۔ بہت سے غیر ملکی جنہوں نے ہمارے ملک کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے وہ اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں میں ایران نے جو معنوی اور مادّی ترقی کی ہے اس کی نظیر بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ پانچ سال تو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ جو لوگ ہمارے ملک سے دو سال بھی دورہ کر کے واپس ایران آئے ہیں تو وہ ہماری ترقیات کو دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔ ان کی اس حیرت کو خوشامدانہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر میں بھی ملک سے باہر چلا جاؤں تو واپس آکر انہی کیفیات کا اظہار کروں گا۔

ایران جیسے ملک میں جس کی تاریخ اور تمدن اتنا قدیم ہو وہاں اگر تیزی سے ترقیاتی کام کئے جائیں اور سماج میں بنیادی واجتماعی تبدیلیاں لائی جائیں تو بعض دقتوں اور دشواریوں کا سامنے آنا ایک طبعی امر ہے۔ اس کے ذمّے دار بھی ہم خود ہیں کیونکہ ہم نے مغربی تمدّن اور جدید طرز زندگی کو اپنایا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہم اپنے بزرگوں کے بیش قیمت اور قدیم روایات کے ورثے کو بالکل ہی ترک کر دیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ مغربی تمدن کو اپنا کر ہم بزرگوں کے دیئے ہوئے علم و دانش اور تمدن کے ورثے میں کچھ اضافہ ہی کریں گے۔ مجھے یہ بھی پورا اعتماد ہے کہ اقتصادی ترقی کے سائے میں ہمارے مذہب، فلسفے، ادب، فنون لطیفہ اور سائنس کو بھی ترقی ہوگی۔

اس ملک کے عام باشندوں کو بھی زندگی کی تمام سہولتیں اور آسائشیں میسّر ہوں گی۔ اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ اپنے ہنر و ذوق کی نمائش کر سکیں گے۔ اب یہ ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ چند لوگ لاکھوں انسانوں کی بدولت عیش و عشرت کریں بلکہ وہ چند لوگ بھی عوامی فلاح و خوشی کی بدولت زندگی کی ہر نعمت سے بہرہ ور ہوں گے۔

جب ہم موجودہ تمدن اور ترقیات سے ہر وہ چیز جو ہمارے لئے مفید ہے بڑی ہوشیاری اور سمجھ داری سے حاصل کر لیں گے تو ہم اپنے مقصد یعنی حقیقی جمہوریت سے جس میں عوام کی فلاح و بہبود کا راز پنہاں ہے نزدیک تر ہوں گے اور اس سچی جمہوریت کی خاطر ہم ہر دُکھ اور تکلیف کو خوشی خوشی برداشت کر لیں گے۔

۸۔ جمہوریت کے متعلق میرے نظریات

کہتے ہیں کہ یورپ کے ایک شہر میں جس کو لوہے کی دیواروں کے پیچھے چھپا رکھا ہے یونی ورسٹی کے کچھ طالب علم ایک مشہور و معروف فزیکس کے استاد سے فضائی سفر کے امکانات کے متعلق لیکچر سُن رہے تھے۔ پروفیسر صاحب سمجھا رہے تھے کہ اگلے چند سالوں میں میزائل[1] چاند کی سطح پر اترنے لگیں گے اور اس کے بعد ہماری دنیا کے لوگ بڑی آزادی سے ان سیّاروں تک پہنچ سکیں گے جو زمین سے بہت دُور واقع ہیں۔ ایک لڑکے نے استاد کی بات کو کاٹا اور بیچ میں بول پڑا لیکن یہ تو بتائیے کہ ہم ویانا[2] کب پہنچ سکیں گے۔

یہ محض کوئی حادثہ یا اتفاق نہیں کہ ہر سال ہزاروں لوگ کمیونسٹوں کے مقبوضہ مشرقی جرمنی سے فرار ہو کر لوہے کی دیوار کو پھاندتے ہوئے آزاد مغربی جرمنی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان مہاجرین نے صحیح آزادی کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اسی لئے یہ لوگ اپنے جان و مال کی پروا کئے بغیر خود کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ جو لوگ مشرقی جرمنی سے فرار کر کے مغربی جرمنی آئے ہیں ان میں زیادہ تعداد دانشوروں، فنکاروں اور ایسے لوگوں کی ہے جن کو کوئی ہنر آتا ہے۔ اُن کے فرار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لئے آزادی سے محرومی بہت زیادہ تکلیف دہ تھی۔ وہ لوگ جو مغربی جرمنی میں ہیں اگر چاہتے تو فرار کر کے مشرقی جرمنی بھی جا سکتے تھے لیکن کسی نے ایسا کرنا پسند نہ کیا۔

یہ تو ایک مثال پیش کی گئی تھی۔ اس کتاب کے پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں اور بھی ایسے واقعات یورپ میں اکثر ہوتے رہتے ہوں گے جن کی وجہ سے لوگ اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال کر اور اس آہنی دیوار کو پار کر کے جس پر ہزاروں سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے دنیا کے اس حصے میں چلے آتے ہیں جہاں آزادی کا دَور دَورہ ہے۔ اسی طرح ہزاروں چینی، کمیونسٹ چین سے ہانگ کانگ کے راستے سے یا انگریزی کالونی مکاؤ[3] کے ساحل سے یا کسی اور راہ سے فرار کر کے آزاد دنیا میں پناہ لینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آیا جس نے آزاد دنیا سے فرار کر کے کمیونسٹ چین میں پناہ لی ہو۔

1. MISSILE
2. VIENNA 3. MACAO

بڑے سخت اور تلخ تجربوں کے بعد لوگ یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ صحیح معنوں میں انفرادی آزادی صرف وہیں حاصل ہو سکتی ہے جہاں جمہوری طرز کی حکومت ہو۔ یعنی اس طرح کی حکومت جس میں عوام کے ہاتھوں ہی میں تمام انتظامی اور اداری امور ہوں۔ اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے جمہوریت کے مفہوم و مطلب کو ہی بدل ڈالا ہے اور پرولتاریات ڈکٹیٹرشپ[1] (مزدور طبقے کی مطلق العنان حکومت) کو جمہوریت کے نام سے پیش کرتے ہیں۔

ڈکٹیٹرشپ کی آزمایش کے دو طریقے ہیں۔ اوّل یہ دیکھنا چاہیئے کہ مزدور طبقے اور حکّام کے درمیان کس طرح کے تعلقات ہیں؟ حکمران طبقے کے لوگ جو یہ ظاہر کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ عوام کے نمایندہ ہیں درحقیقت وہ مزدور طبقے کے نمائندے ہیں بھی یا نہیں؟ ان کی اپنی اغراض و مقاصد آیا وہی ہیں جو عوام کی ہیں یا دونوں میں تضاد ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جہاں بھی مزدور طبقے پر لوگ ڈکٹیٹر بنے ہوئے ہیں وہ چند لوگوں کی ایک منظم جماعت ہے جو عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں پر کوئی توجہ نہیں دیتی۔

دوسری بات یہ معلوم کرنی چاہیئے کہ جہاں کہیں اس طرح کی حکومتیں ہیں وہاں عوام اپنی بات حکمران طبقے تک پہنچا سکتے ہیں یا نہیں۔ میری رائے میں جہاں کہیں پرولتاریات ڈکٹیٹرشپ ہے وہاں لوگوں کی حکومت کے معاملات میں دخل دینا یا اس کے خلاف آواز اٹھانا تو بڑی بات ہے وہاں تو جان و مال بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔

کمیونسٹ ڈکٹیٹروں کو چونکہ انتخابات کرانے کا شوق ہے اس لئے اس معاملے میں وہ فاشسٹوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں اور یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ مزدور طبقے کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ ملک کی حکومت میں ان (مزدوروں) کا بھی حصّہ ہے اور حکومت کے ایوانوں میں ان کی بات گونج سکتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک پارٹی کے علاوہ کسی دوسری پارٹی کو اُبھرنے ہی نہیں دیتے اور اگر کوئی شخص چاہے کہ کوئی دوسری پارٹی قائم کرے یا حکمراں پارٹی کے خلاف آواز اٹھائے تو اس کو سختی سے کچل دیا جاتا ہے۔ انتخابات میں (اگر واقعی ان کو انتخابات کہا جا سکتا ہے) رائے دینے والوں کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے نمائندے کا خود انتخاب کر کے بھیجیں کیونکہ انتخابات کے امیدواروں کی فہرست میں صرف انہی لوگوں کے نام ہوتے ہیں جن کا تعلق حکمراں پارٹی سے ہوتا ہے۔ یہ انتخابات محض عوام کو دکھاوے کی غرض سے کئے جاتے ہیں اور عام شہریوں کو زبردستی ووٹ ڈالنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بعد حکمراں طبقے کے لوگ بڑی شان اور فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ گویا ننانوے فیصدی ووٹ حکمراں پارٹی کے حق میں پڑے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ کس طرح یہ لوگ اپنے ان ہتھکنڈوں سے عوام کے ذہین اور سمجھ دار طبقے کو فریب دینے میں کامیاب ہوتے ہوں گے۔

پچھلے زمانے میں آزاد دنیا کے لوگ جمہوریت کو محض ایک سیاسی چیز سمجھتے تھے۔ چنانچہ سترہویں صدی کے انفرادی آزادی کے نقیب اور علمبردار جان لاک[2] نے زیادہ تر کتابیں سیاسی حقوق پر ہی لکھی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے امریکی آزادی کے اعلان میں بھی عوام کے سیاسی حقوق پر ہی زور دیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں عام خیال یہ تھا کہ اگر افراد کو سیاسی آزادی مل جائے

1. DICTATORSHIP OF THE PROLETARIAT

2. JOHN LOCKE

اور مساوی حقوق حاصل ہوں۔ وہ (افراد) اپنی کوشش سے اپنی اقتصادی اور اجتماعی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں۔ یہ نظریات اور خیالات اس وقت زیادہ دلکش اور مقبول نظر آتے تھے جب اقتصادی اور تکنیکی تشکیلات میں پیچیدگی نہ تھی بلکہ بالکل سادہ اور ابتدائی مراحل میں تھے۔ کیونکہ ان دنوں ایک کنبہ پیداوار کا ایک یونٹ سمجھا جاتا تھا اور اس کے تمام افراد اپنی ضروریات کی بیشتر چیزیں خود ہی فراہم کرتے تھے۔

لیکن جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے زندگی کے راستے اور کام کے ڈھنگوں کو بالکل ہی بدل دیا ہے۔ آج ہر جگہ بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ زراعت کے میدان میں بھی کاشتکاری کی مشینیں اور دیگر سامان خریدنے کے لئے سرمایہ لگانا پڑتا ہے یا کوئی دوسری راہ اختیار کرنی ہوتی ہے جس سے پیداوار میں کافی اضافہ ہو سکے۔ ان حالات اور واقعات کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرد نے اقتصادی اختیارات کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے۔ اگر اقتصادی محرومی کے بعد فرد اپنے سیاسی اور اقتصادی حقوق کی حفاظت کے لئے آواز اٹھاتا ہے اور اس کے لئے پُرزور مطالبہ کرتا ہے تو میری رائے میں اس کا یہ فعل بالکل درست ہے۔

سائنس کی ترقی نے نہ صرف لوگوں کی طرز معاشرت، کام کرنے کے ڈھنگ اور پیداوار میں انقلاب پیدا کیا ہے بلکہ لوگوں کے درمیان خیالات و افکار پھیلانے کے طور طریقوں کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ ٹیلیگراف، ریلوے، اخبارات، ٹیلیفون، ریڈیو، بس، ہوائی ڈاک، ہوائی سفر اور سنیما جیسی سائنس کی ایجادات نے دور دراز کے براعظموں میں بسنے والے انسانوں کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ نزدیک کر دیا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ وہ پُرہیجان خیالات اور جذبات جن کو کروڑوں انسانوں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا تیز رفتار آلات کے ذریعے اب سُن سکتے ہیں۔

اِن ترقیات کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے جو مضبوط اور ہموار روابط قائم تھے ان کی جگہ اب اجتماعی کشیدگی نے لے لی۔ پچھلی کئی صدیوں سے امیر، غریب ساتھ رہتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے درمیان آپس میں نہ کوئی کشیدگی تھی اور نہ کسی قسم کا تناؤ۔ لیکن جب سے تیز رفتار خبر رسانی کے آلات وجود میں آئے ہیں اور لوگ یہ جاننے لگے ہیں کہ دنیا کے ایک سرے پر لوگوں کے پاس کھانے کی افراط ہے اور دوسری طرف لوگ قحط، مفلسی اور بے روزگاری سے دوچار ہیں تو دونوں کے درمیان کشیدگی اور گہری ناراضگی شروع ہو گئی۔

غریب ممالک میں بسنے والے اُن لوگوں کو جو اُن سے ہزاروں میل دور خوشحالی اور عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے ہیں بڑے رشک اور حسرت سے دیکھتے ہیں۔ اس حسرت اور حسد کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں افراد ان چیزوں کی آرزو اور تمنا کرنے لگتے ہیں جن کا ان کے ماحول سے کوئی فوری اور ضروری واسطہ یا رابطہ نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ عام انسانوں میں اس طرح کی کشیدگی اور ناراضگی بہت خطرناک تھی لیکن اپنی جگہ امید افزا بھی تھی۔ انسانیت کے بہی خواہ مفکّروں نے سوچنا شروع کیا کہ ان لوگوں کے لئے جو اقتصادی بحران سے دوچار ہیں سیاسی

آزادی بالکل بے معنی چیز ہو گی۔ جو لوگ دولت مند ممالک میں آباد ہیں انہوں نے بھی حالات کا رُخ دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ان کی بہتری اور انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ ان کے پاس جو نعمت و دولت ہے اس میں وہ اپنے غریب پڑوسیوں کو بھی شریک کرلیں۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ تحفے کے طور پر لباس اور کھانے پینے کا سامان بھیجنا وقتی طور پر تو ان کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے لیکن یہ مسئلے کا حل نہ ہو گا جب تک کہ ان قوموں کو جو اقتصادی اعتبار سے پست ہیں اس قابل نہ بنا دیا جائے کہ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو سکیں۔ مختصر یہ کہ وہ ممالک جو ترقی کی راہ پر ہیں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے وہ راز جاننا چاہتے ہیں جن سے ان کا معیارِ زندگی بلند ہو۔

جب پریزیڈنٹ ٹرومین نے پہلی بار ساری دنیا کو تکنیکی امداد دینے کا پروگرام پیش کیا (جو بعد میں نکتہ چہار کے نام سے مشہور ہوا) تو امریکی حکومت نے ان کے ساتھ تعاون کر کے بڑی دلیری اور دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ایران پہلا ملک تھا جس نے نکتہ چہار کے تحت امریکہ کی تکنیکی مدد سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اقوام متحدہ نے بھی بہت وسیع پیمانے پر ترقیاتی پروگرام شروع کئے۔ دولتِ مشترکہ برطانیہ نے کولمبو پلان کا آغاز کیا۔ چنانچہ نکتہ چہار کے تحت امریکی مدد، اقوام متحدہ کے تعاون اور دیگر ممالک کی اعانت سے جو ہم نے فائدہ اٹھایا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اس ضمن میں ہمیں کچھ تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ اقتصادی ترقی کے بعد سیاسی استحکام بھی ہو۔ مثال کے طور پر بحر الکاہل کے چند جزیروں کو ہی لے لیجئے جہاں زندگی میں بالکل ٹھہراؤ ہے اور اجتماعی زندگی غیر ترقی یافتہ ہے لیکن وہاں سیاسی استحکام و ثبات ان ملکوں سے زیادہ ہے جو تیزی سے اقتصادی ترقی کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو لے لیجئے جنہوں نے پچھلے چند سالوں میں غیر معمولی اقتصادی ترقی تو کی ہے لیکن سیاسی اعتبار سے ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے سیاسی پروگرام اور اقتصادی ترقیات کا آپس میں مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو سبق اس تجربے سے ہم نے حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی تنظیم اور اقتصادی توسیع و ترقی میں ہم آہنگی ہونا ضروری ہے اگر ایسا نہ ہوا تو وہ قومیں جو ترقی کی راہ پر ہیں بڑی دشواری اور مشکلات میں پھنس کر رہ جائیں گی۔

خوش قسمتی سے ایران میں جمہوریت بے بنیاد نہیں بلکہ اس کی جڑیں کافی گہری ہیں۔ ہم نے جمہوریت کے اُصولوں کی ترقی کے لئے جو پروگرام تیار کیا ہے وہ ایرانی قوم کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ کئی صدیوں سے بلکہ اب سے پچاس سال قبل تک ہمارے ملک میں استبدادی طرز کی حکومت چلی آ رہی تھی لیکن ہمارے عوام نے ہمیشہ افراد کے ساتھ رواداری اور احترام کا برتاؤ روا رکھا جو جمہوریت کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔

مثال کے طور پر جب کورش اعظم کسی ملک کو فتح کرتا تو وہ ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا کرتا تھا جو جنگ میں اُس سے مقابلے کے لئے آتے تھے۔ وہ اچھے سلوک کے علاوہ ان کو اُن ہی عہدوں پر بحال رکھتا جن پر وہ پہلے مامور تھے۔ یہاں تک

کہ انہی میں سے تجربے کار اور کارآزمودہ لوگوں کو جن میں انتظامی امور کی صلاحیت ہوتی اپنے ساتھ لے آتا۔ وہ ان لوگوں کو محض کٹھ پتلی کی طرح ہرگز استعمال نہ کرتا بلکہ مفتوحہ ملک کے انتظامی معاملات انہی کے ذمے سونپ دیتا۔ وہ مفتوحہ ممالک کے لوگوں کی ہمت افزائی کرتا اور یہ ذوق و شوق دلاتا کہ اپنی مذہبی روایات اور ثقافتی رسم و رواج کے پابند رہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں جمہوریت کا مفہوم ایران کے لوگوں پر واضح نہ تھا لیکن کورش اعظم کے افعال سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ عہدِ حاضر کی جمہوریت جن اصولوں پر مبنی ہے وہ ان کی پابندی کرتا تھا۔

پہلے بھی اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ ایران میں بہت سے جلیل القدر بادشاہ، بہادر سپاہی اور سیاستداں نچلے طبقے سے ابھرے ہیں۔ ہم نے کبھی ذات پات کی اونچ نیچ اور طبقاتی اختلاف کو اہمیت نہیں دی۔ ہماری سوسائٹی کے ذہنوں میں اتنی وسعت اور رواداری ہمیشہ سے رہی ہے کہ جو لوگ ادنیٰ اور گمنام خاندانوں سے ابھرے ہیں اُن کو اعلیٰ اور ذمے داری کے عہدوں پر پہنچنے کا موقع دیا۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ تعلیم و تربیت یا اقتصادی اعتبار سے ان کی راہ میں دشواریاں آئی ہوں لیکن ہمارا سیاسی اور اجتماعی ڈھانچہ اس طرح کا نہیں ہے کہ صاحبِ استعداد اور باصلاحیت لوگ ہمیشہ کے لئے گمنامی میں پڑے رہیں۔

ابتدائی جمہوریت تو ہر ایرانی کے مزاج اور خمیر میں ملے گی۔ اگرچہ اس جذبے کی وضاحت کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں لیکن یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم ایرانی انفرادی آزادی کے قائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی انفرادی آزادی کا بھی خیال اور پاس رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر گھروں میں ایک ایرانی ملازم خود کو خاندان کا ایک فرد سمجھتا ہے اور خاندان کے سب ہی لوگ اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کھیت اور زمین کی دیکھ بھال یا گھر کے اخراجات چلانے میں وہ اپنے مالک سے جھگڑا بھی کر لیتا ہے جس کی جلد ہی صلح و صفائی بھی ہو جاتی ہے۔ گھریلو معاملات میں وہ اپنی آزادانہ رائے کا بھی اظہار کرتا ہے اور یہ دستور صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے جو اوپر بیان کی گئی ہیں ایرانی قوم نے بیسویں صدی کے شروع میں سیاسی جمہوریت قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سنہ ۱۹۰۶ء کے انقلاب نے ایک بار پھر ایرانی شہنشاہیت کی قدیم روایات کو زوال پذیر ہونے سے بچا لیا لیکن آج ساری دنیا میں جو روش ہے اس سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے اس میں کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں بھی کی گئیں تاکہ صحیح معنوں میں عوام کی نمائندہ حکومت قائم کی جاسکے۔

اگرچہ انقلاب کے دوران زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے ذہن میں عوام کی نمائندہ حکومت کا تصور واضح نہیں تھا لیکن وہ لوگ چونکہ قاجاری حکومت سے تنگ آچکے تھے اس لئے خواہشمند تھے کہ کسی نہ کسی طرح کوئی دوسری حکومت اس کی جگہ آجائے۔ عوام کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ قاجاری بادشاہ اخلاقی طور پر بھی کسی ایسے چھوٹے سے

چھوٹے کام کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھے جس میں عوام کا فائدہ یا ملک کا بھلا ہو۔ ایرانی قوم کے مختلف طبقوں کو بخوبی علم تھا کہ قاجاری بادشاہ غیر ملکی طاقتوں اور خاص طور پر روسیوں کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور بہت سے بے گناہ ان کی خود غرضی، مطلق العنانی، فضول خرچی اور زیادتیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے ۱۹۰۶ء کے انقلاب کو اسی وجہ سے کامیاب بنایا تاکہ قاجاری بادشاہوں کے ظلم وستم کو کسی طرح روکا جا سکے۔

انقلاب کے رہنماؤں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور چونکہ ان کے پیش نظر اعلیٰ مقاصد تھے اس لئے وہ انقلاب کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے سیاسی نظام کو اتنی وسعت دیں کہ یورپ کی سطح پر آجائے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایران کی آزادی، اقتصادی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

اکثر انقلابی رہنما اس نظریئے کے حامی تھے کہ مغرب کے سیاسی افکار اور اسلامی اصول وعقائد میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ انقلابی تحریک کے پیشوا رہنماؤں میں سید جمال بھی شامل تھے۔ اُن کے خیالات اور نظریات کا عوام کے دلوں پر گہرا اثر تھا۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ اور اسلام دوست مسلمان تھے۔ وہ اس بات کی پُرزور تائید کرتے تھے کہ مغربی جمہوریت کے اصولوں کو اسلامی فلسفے اور عقائد کی حدود میں لایا جا سکتا ہے اور اس سے حکومت اور مذہب کے درمیان کسی قسم کا تصادم یا ٹکراؤ پیدا نہ ہوگا۔ آئینی حکومت کے طرفداروں میں روشن فکر اور دوراندیش علمائے اسلام بھی شامل تھے۔ ان زعماء میں مرحوم سیّد عبداللہ بہبہانی اور مرحوم سیّد محمد طباطبائی کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ حضرات منبر پر بیٹھ کر لوگوں پر جو ظلم وستم توڑے جا رہے تھے ان کی مذمت کرتے اور لوگوں کو صحیح راہ کی طرف ہدایت کرتے۔

اگرچہ آئینی حکومت کے سب ہی رہنما خواہش مند تھے لیکن جب کامیابی نصیب ہوئی اور یہ موقع ملا کہ آئینی حکومت کے بنیادی اصول مرتب کریں تو ان میں نظریاتی اختلافات پیدا ہوگئے۔ انقلابی حکومت سے پہلے کے ظلم وستم، فتنہ وفساد، سستی وکاہلی، بے ایمانی اور خیانت کاری کے مقابلے میں وطن دوستی، جمہوریت، رواداری، ہمدردی، قانون، امن وامان اور شخصی آزادی کے خیالات اُصولی طور پر تو بہت حسین اور دلفریب معلوم ہوتے تھے لیکن جب وہ وقت آیا کہ ان اصولوں کو آئینی شکل دے دی جائے تو علمائے اسلام بھڑک اٹھے اور انہوں نے یہ کہہ کر مخالفت شروع کر دی کہ یہ قوانین اسلامی شریعت کے مطابق اور ایران جیسی اسلامی حکومت کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

علماء کے طبقے کو چھوڑ کر روشن فکر تاجر، یونیورسٹی کے طلباء اور دوسرے طبقوں کے لوگ جو آئینی حکومت کے طرفدار تھے آگے بڑھے اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ چنانچہ قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس قاجاری بادشاہ مظفرالدین شاہ کی موجودگی میں منعقد ہوا۔ قومی نمائندوں کی طرف سے آئین ساز کمیٹی مقرر کی گئی جس نے ۱۹۰۶ء کا قانون مرتب کیا اور مظفرالدین شاہ نے اس پر دستخط کئے۔ ہماری سیاسی تاریخ میں یہیں سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اور ہم نے پہلی بار مغربی

طرز کی پارلیمانی جمہوریت کو ایرانی شہنشاہیت سے ہم آہنگ کر دیا۔

گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ کس طرح مظفر الدین شاہ قاجار کے لڑکے محمد علی شاہ نے روسیوں کی مدد سے آئینی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ آئینی حکومت نے جو اصلاحات شروع کی تھیں ان کی مخالفت بعض قدامت پسند ملاؤں نے شروع کر دی جو لوگ آئینی حکومت کے طرفدار تھے وہ بھی کئی مخالف گروہوں میں بٹ گئے۔ قاجاری بادشاہوں کی نااہلی، سستی و سہل انگاری، فضول خرچی، فرض ناشناسی اور غیر ملکی طاقتوں کے دباؤ میں آنے کی وجہ سے آئینی حکومت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔

ان حالات کی وجہ سے ملک کی حالت روز بروز گرتی چلی گئی۔ آخر کار اُن افسوسناک اور مایوس کن واقعات کو دیکھ کر میرے والد کو عملی قدم اٹھانا پڑا۔ چنانچہ اوپر بھی ذکر آچکا ہے پہلے وزیر اعظم اور اس کے بعد خاندان پہلوی کے بانی کی حیثیت سے انہوں نے پارلیمنٹ کا زور کم کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایران میں جمہوریت قائم کرنے کے لئے بہت سے نمایاں کام انجام دیئے۔ وہ پہلے انسان تھے جنہوں نے عصر جدید کی ضروریات کے پیش نظر مذہب اور حکومت کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ میرے والد نے علماء کے طبقے میں سے کسی کو اس کے مقام یا منصب سے محروم نہیں کیا بلکہ اُن کے دور میں بھی بنیادی آئین کے مطابق ملک میں اسلامی حکومت قائم رہی لیکن اسی آئین کی رو سے انہوں نے علماء کے طبقے سے عدالتی حقوق سلب کر کے حکومت کو سونپ دیئے اسی طرح لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بیشتر کام علماء سے لے کر حکومت کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے قدامت پسند ملاؤں کو مجبور کیا کہ وہ عورتوں کی آزادی کے بارے میں مخالفت سے باز رہیں اور سختی سے اس بات کی تاکید کی کہ اپنے دائرۂ عمل کو دینی امور تک ہی محدود رکھیں کیونکہ بنیادی طور پر وہ اسی کام کے لئے ہیں۔

رضا شاہ مرحوم نے اداری اصلاحات کے ذریعے بھی جمہوریت کے اصولوں کو تقویت بخشی۔ انقلاب سے قبل تمام اداری امور صدر اعظم کے ذریعے طے پاتے تھے۔ اور یہ شخص اپنا بیشتر وقت بادشاہ کی خدمت میں گذارتا تھا۔ صدر اعظم کا خوشامدی اور چاپلوس ہونا بھی بہت ضروری تھا۔ اگر بادشاہ اپنی فوجوں کے بارے میں صدر اعظم سے دریافت کرتا تو وہ بادشاہ کو بڑے اطمینان سے جواب دیتا کہ ہماری فوجیں اس قدر طاقتور اور مضبوط ہیں کہ اگر ساری دنیا کی فوجیں بھی مل کر مقابلے پر اُتر آئیں تو ہماری فوج اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دے گی۔ اس کے برعکس، حقیقت یہ تھی کہ فوج کے نام کی کوئی باقاعدہ اور منظم جماعت نہ تھی۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کا انتظام حکومت نے قبائلی لوگوں پر چھوڑ رکھا تھا۔ فوجیوں کو تنخواہ نہیں دی جاتی تھی تمام بڑے بڑے فوجی عہدے اعزازی ہوتے تھے اور نسل در نسل چلتے تھے۔ چنانچہ ایک نوزائیدہ بچے کو بھی میجر جنرل کا عہدہ سونپا جا سکتا تھا۔

صدر اعظم کے تحت کچھ وزیر ہوتے تھے جیسے وزیر مالیات اور وزیر خارجہ وغیرہ، معمولاً ہر وزیر کی تنخواہ مقرر تھی، لیکن

جس وقت عہدۂ وزارت اس کو دیا جاتا اور وہ خلعت فاخرہ پہنتا تو ایک سال کی تنخواہ سے زیادہ کی رقم اس کو شاہ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کرنا پڑتی۔ وزیر کی رہائش گاہ ہی بمنزلۂ وزارت خانہ ہوتی اور اس کا باورچی کسی بھی وقت اس کا چیف سکریٹری بن سکتا تھا۔ باقی عملے کا بھی یہی حال تھا وزیر جس کو چاہتا اپنے ہی نوکروں، ملازموں اور خوشامدیوں میں سے کسی عہدے کے لئے چُن لیتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے اِن ملازموں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ وزیر کو ہی اپنی جیب سے دینا پڑتی تھی۔ بیچارا وزیر محتاجوں اور ضرورت مندوں کو اپنے خرچ سے کھلانے پر مجبور ہوتا۔ چنانچہ ہر روز بیسیوں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں فقیر، فالگو، ملنے جلنے والے اور دوسرے حاشیہ نشین اس کے دسترخوان پر جمع رہتے جس کی وجہ سے ایک وزیر کے باورچی خانے کا خرچ بہت ہی زیادہ ہوتا تھا۔

صوبوں کے گورنروں اور حکّامِ شہر کو شاہ خود مقرر کرتا تھا۔ عام طور پر صوبے کا گورنر اور حاکمِ شہر کا عہدہ موروثی ہوتا تھا۔ دوسری صورت یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شخص بادشاہ کی خدمت میں کثیر رقم بطور نذرانہ پیش کردے تو یہ عہدہ اس کو مِل جایا کرتا تھا۔ دولت مند لوگ اونچی سے اونچی رقم دے کر یہ عہدے لینے کو ہر وقت تیار رہتے کیونکہ ان کو ایک مقررہ رقم بطور لگان شاہی خزانے میں داخل کرنا پڑتی اور اس کے بعد جو کچھ بچ رہتا وہ سب ان کی اپنی جیب میں جاتا۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اوّل تو یہ لوگ روپیہ خرچ ہی نہیں کرتے تھے اور اگر کبھی خرچ کرنا بھی پڑتا تو یہ رقم قطعی ناکافی ہوتی اور قاجاری عہد کے آخری دَور میں تو عوامی فلاح و بہبود کا سرے سے کوئی کام ہی نہیں ہوا۔ صوبوں کے گورنر اور حکّامِ شہر ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے کہ جس قدر زیادہ سے زیادہ ممکن ہو عوام سے لگان وصول کرلیں جس کو وہ خود اور اُن سے متعلقہ نوکر چاکر اپنے عیش و عشرت پر صرف کرتے۔ یہ لوگ اپنی جیب سے روپیہ خرچ کرکے صرف مسلّح سپاہی ملازم رکھتے تھے جو عوام کو ڈرا دھمکا کر اُن سے لگان کی رقم وصول کرتے تھے۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آتا کہ یہی افسر اور ملازمین خود ہی ان زمینوں کے مالک بن بیٹھتے جہاں ان کو لگان وصول کرنے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر سے نیچے تک ہر طرف بدعنوانی اور رشوت ستانی کا دَور دَورہ تھا۔ معمولی کسان سے لے کر تاجر بلکہ زمینوں کے مالک تک سب ہی جان و مال کی حفاظت کی خاطر اور شاہی خزانے میں لگان کی رقم کم سے کم جمع کرنے کی غرض سے تحصیلداروں اور قرق امینوں کو رشوتیں دیتے۔ اور اس طرح جو عملہ پہلے ہی فاسد تھا روز بروز بدتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

۱۹۰۶ء کے بنیادی آئین میں اداری اصلاحات کی طرف کم توجہ دی گئی تھی۔ لیکن جب قانون ساز اسمبلی قائم ہوئی تو اس نے تھوڑا سا اصلاحی کام کیا۔ کچھ فرانسیسی مشیروں نے جن کو ایرانی حکومت نے ملازم رکھا تھا ہر وزارت خانے کو الگ سرکاری عمارت میں قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا جس کو قومی اسمبلی اور قاجاری بادشاہ دونوں نے مان لیا۔ قاجاری بادشاہوں نے کافی بڑی رقم بطور قرض دوسرے ممالک سے لے رکھی تھی۔ جب وہ رقم وقت مقررہ پر واپس نہیں دی گئی تو غیرملکی طاقتوں کے ایما پر بلجیم کے افسروں نے لگان کی وہ رقم جو بیا تو ضایع چلی جاتی تھی اور یا لوگوں کی جیبوں میں پہنچتی تھی وصول کرنا

شروع کر دی۔ اسی طرح امریکی مشن نے جس کا سربراہ شوسٹر نامی شخص تھا ایران کے خستہ و برباد خزانے کی اصلاح و بہبود کا بیڑا اٹھایا۔

جب سے میرے والد نے ایران کی سیاست میں عملی طور پر دل چسپی لینا شروع کی تو انہوں نے سرکاری دفاتر کی حالت ایسی بدل دی اور ان میں وہ نظم و نسق پیدا کر دیا جس کی مثال ایران کی تاریخ میں کئی صدی پہلے تک نہیں ملتی۔ انہوں نے پورے ملک کے لئے ایک قانون وضع کیا۔ شہری حکام کے عہدے ختم کر دیئے۔ صوبائی گورنروں کی خودسرانہ حرکات پر پابندی لگا کر ان کے اختیارات محدود کر دیئے۔ ایک مرکز کے تحت لگان وصول کرنے کا ادارہ قائم کیا اور لگان لینے کا جو نمبردارانہ نظام رائج تھا اس کو قطعی ممنوع قرار دیا۔ انہوں نے تمام وزارت خانوں اور حکومت کے دفاتر کو از سرِ نو مرتب کیا۔ الگ الگ شعبوں کے لئے نئے وزارت خانے قائم کئے۔ جو افسر ناکارہ اور رشوت خور تھے ان کو ملازمت سے برطرف کرنے کے علاوہ سخت سزائیں بھی دیں اُن کی جگہ اہل اور باصلاحیت لوگوں کو مقرر کیا۔ ایماندار اور محنتی ملازمین کے علاوہ سیکڑوں طالب علموں کو غیر ممالک میں تربیت اور اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجا۔ سب سے زیادہ اہم کام جو انہوں نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ سرکاری ملازمین میں فرض شناسی، قومی تعمیر، اقتصادی اور اجتماعی ترقی کا جذبہ بیدار کر دیا۔

رضا شاہ کے دَور میں جو اقتصادی اور اجتماعی ترقی کے کام ہوئے ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہاں میں اتنا ہی کہوں گا کہ پچھلی کئی صدیوں سے جو ایرانی زندگی میں جمود چلا آرہا تھا انہوں نے اس کو بالکل ختم کر دیا، اور اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو اب تک ترقیاتی کام ہو چکے ہیں ان کی ابتدا انہی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔

جمہوریت کے بارے میں میری اپنی رائے یہ ہے کہ میرے والد کے جو نظریات تھے اُن میں مزید توسیع و ترقی ہونی چاہیئے۔ مثال کے طور پر اب چونکہ میرے ملک میں تعلیم بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ عوام کی نمائندہ حکومت قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ دوں۔ جدید علوم و فنون اور اُن سے نکلی ہوئی اختراعات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کروں کیونکہ نئے علوم و فنون نے نہ صرف لوگوں کی سہولت اور آرام کے لئے نئی راہیں کھولی ہیں بلکہ ان میں فائدہ اٹھانے کا جذبہ اور اشتیاق بھی پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر سائنس نے ہم کو صرف اتنا ہی بتایا کہ ملیریا کی روک تھام کی جا سکتی ہے لیکن جب فلموں اور ریڈیو کے علاوہ کلاس روم میں تصویریں اور نقشے بنا کر یہ سمجھایا گیا کہ کس طرح روک تھام کی جا سکتی ہے تو لوگوں کے دل میں اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو اس مرض سے بچانے کا شوق ہوا۔ جمہوریت کی توسیع و اشاعت سے میرا مقصد یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جدید علوم و فنون سے فائدہ اُٹھائیں۔

لوگوں کی آسانی کے لئے یہ بات بھی واضح کر دوں کہ جس نئی جمہوریت کی آج ایران میں ضرورت ہے اس کو تین بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل: سیاسی اور انتظامی امور کی جمہوریت

دُوم: اقتصادی جمہوریت

سوم: اجتماعی جمہوریت

اب میں ان کے تینوں حصوں کی الگ الگ تعریف کروں گا اور بتاؤں گا کہ درحقیقت ہر حصّے سے میری کیا مراد ہے:

ایران کی سیاسی جمہوریت کے بارے میں بتانے سے قبل میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہمارے ملک کا آئین بلجیم کے آئین کی طرز پر بنایا گیا ہے اور ایرانی شہنشاہیت کی روایات کی حدود میں اس کی تشکیل کی گئی ہے۔ ہمارا آئین ۱۹۰۶ء کی اصل دستاویزات اور چند ترمیمی بلوں پر مبنی ہے۔ آخری مرتبہ ہمارے آئین میں ترمیم ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی۔

آئین کی رو سے ہماری پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے جن میں سے ایک قومی اسمبلی یا دارالعوام اور دوسری مجلس قانون ساز یا سینٹ کہلاتی ہے۔ قومی اسمبلی کے ممبران کی تعداد دو سو ہے (ملک کی آبادی بڑھنے پر ان ممبران کی تعداد بڑھ سکتی ہے) عوام کے نمائندے چار سال تک قومی اسمبلی کے ممبر رہ سکتے ہیں۔ اقلیتی فرقوں میں سے ایک یہودی، ایک زرتشتی، ایک آسوری اور دو ارمنی نمائندے لئے جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ اقلیت کے نمائندوں کو آبادی کے تناسب سے زیادہ حقِ نمائندگی حاصل ہے اور اس کو میں ایرانی قوم کی رواداری کی دلیل سمجھتا ہوں۔ پورا ملک اٹھتّر انتخابی حلقوں میں بٹا ہوا ہے۔ قومی اسمبلی کے نمائندے انہی انتخابی حلقوں سے چُنے جاتے ہیں۔ ہر مرد جس کی عمر اکیس سال یا اس سے زیادہ ہے ووٹ دے سکتا ہے۔ شاہی خاندان کے افراد، فوجی ملازمین اور مجرم اس زُمرے میں نہیں آتے۔ اگرچہ بہت سے لوگ اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کرتے لیکن جیسے جیسے عوام میں تعلیم اور بیداری پھیلتی جارہی ہے ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

قانون ساز مجلس کے ممبران کی تعداد ساٹھ ہوتی ہے جن میں سے تیس ممبر شہر تہران سے چُنے جاتے ہیں اور باقی تیس دوسرے صوبوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ ہر گروہ (شہر تہران اور دیگر تمام صوبوں کے نمائندے) کے آدھے ممبر میں مقرر کرتا ہوں اور باقی پندرہ ممبروں کا دونوں طرف چناؤ کرایا جاتا ہے۔ قانون ساز مجلس کے ممبران عموماً چھ سال کے لئے چُنے جاتے ہیں لیکن پہلے تین سال گذرنے کے بعد قرعہ اندازی کے ذریعے آدھے ممبران علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ممبران انتخاب یا نامزدگی کے ذریعے لئے جاتے ہیں۔

پارلیمنٹ میں جو بھی بِل پیش ہو وہ اسی وقت پاس ہو سکتا ہے جبکہ دونوں ایوان اس کی منظوری دے دیں۔ اس میں بجٹ اور ٹیکس کے بِل شامل نہیں ہوتے کیونکہ ان کا پاس کرنا یا نہ کرنا صرف قومی اسمبلی کی ذمّہ داری ہے۔ اگر کوئی بِل نیا قانون بنانے کے لئے پاس کیا گیا ہو تو اس پر میرے دستخط ہونا بہت ضروری ہیں۔ آئین کی رو سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ کسی بھی مالی بِل کو نامنظور کر کے نظرثانی کے لئے واپس قومی اسمبلی میں بھیج دوں لیکن قومی اسمبلی کے ممبران اگر چاہیں تو میرے اس ویٹو (حقِ نامنظوری) کو تسلیم کرنے سے انکار بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ تین چوتھائی ممبران واپس شدہ بِل کے مسوّدے کو دوبارہ پاس کر دیں۔ ایسی صورت میں میرے لئے اِس بِل پر دستخط کر دینے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔ آئین کی رو سے مجھے

یہ حق بھی حاصل ہے کہ پارلیمنٹ کے کسی ایک ایوان کو یا دونوں کو برخاست کر دوں لیکن ایسا کرنے کے لئے مجھے معقول وجہ پیش کرنی پڑے گی (آئین کی رو سے پہلی وجہ کی بنا پر میں دوبارہ مجلس یا کسی ایوان کو برخاست نہیں کر سکتا) اور اس کے فوراً بعد ضروری ہے کہ میں نئے انتخابات کا اعلان کروں تاکہ پارلیمنٹ یا ایوان جس کو برخاست کیا گیا تھا تین ماہ میں دوبارہ تشکیل ہو سکے۔

وزیرِ اعظم اور اس کے دوسرے ساتھی وزیر کابینہ بناتے ہیں۔ ایران میں وزیر دربار کے علاوہ تمام وزیر کابینہ کے ممبر ہوتے ہیں۔ وزیروں کی کابینہ حکومت کے تمام شعبوں کی نگرانی کرتی ہے۔ ایران میں بھی دوسرے تمام ممالک کی طرح جہاں آئینی حکومت ہے وزراء کی کابینہ سے مراد حکومت ہی لی جاتی ہے۔ لیکن ہماری آئینی حکومت میں اور ان ممالک کی آئینی حکومتوں میں جو انگریزی زبان بولتے ہیں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہاں وزیرِ اعظم اور دوسرے تمام وزراء میں سے کوئی بھی پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہوتا۔ لیکن پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی ذمہ داری فرداً اور مجموعاً وزیرِ اعظم اور دیگر تمام وزراء پر ہی عائد ہوتی ہے اور پارلیمنٹ کا ہر ممبر اُن کو ایوان میں بلا کر کوئی بھی سوال کر سکتا ہے۔

وزراء کی کونسل اجرائی امور کے علاوہ اگر ضرورت ہو تو دیگر حکم نامے بھی جاری کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ احکام منظور شدہ قوانین کے خلاف نہ ہوں۔ یہ حکم نامے شکل و شباہت میں ایسے ہی ہیں جیسے امریکہ کے صدر یا برطانیہ کی پریوی کونسل کی طرف سے جاری کئے جاتے ہیں۔

ہماری حکومت مندرجہ ذیل وزارتوں پر مشتمل ہے:

وزیرِ اعظم کا دفتر اور اس کا عملہ۔ وزارتِ خارجہ۔ وزارتِ مالیات۔ وزارتِ داخلہ۔ وزارتِ زراعت وصنعت ومعدنیات وزارتِ تعلیم۔ وزارتِ جنگ۔ وزارتِ حفظانِ صحت۔ وزارتِ عدل وانصاف۔ وزارتِ کار۔ وزارتِ پوسٹ ٹیلیگراف۔ وزارتِ تجارت۔ وزارتِ راہ سازی۔ وزارتِ کسٹم واجارہ داری وغیرہ۔ بعض وزارتیں اپنی زیرِ نگرانی نیم آزاد ادارے بھی چلاتی ہیں۔ چنانچہ وزارتِ داخلہ آبادکاری کے ادارے کو اور وزارتِ کسٹم واجارہ داری تمباکو کی کمپنی چلا رہی ہیں۔ اسی طرح تہران یونی ورسٹی وزارتِ تعلیم کے تحت چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جو کسی وزارت کے تحت نہیں بلکہ اپنی جگہ بالکل مستقل ہیں۔ جیسے منصوبہ بندی کا محکمہ جو براہِ راست حکومت کی نگرانی میں اپنا کام کرتا ہے۔ صوبائی حکومتوں کے انتظامی امور زیادہ تر وزارتِ داخلہ اور گورنروں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ دوسری وزارتوں کے دفاتر بھی صوبائی مراکز میں ہیں۔

ایران کے عدالتی نظام کا بیشتر حصہ فرانس کے عدالتی نظام پر مبنی ہے۔ میرے والد کے عہد سے قبل ایران میں تمام عدالتی امور پر مذہبی علماء کا غلبہ تھا لیکن میرے والد نے پورے نظام کو ہی نہیں بلکہ عدل وانصاف کے مفہوم وتصور کو ہی بدل ڈالا۔ قانونی ماہرین کی رائے ہے کہ عدالتی امور میں یورپی طور طریقے اپنا کر ہم نے اس شعبے میں جس قدر ترقی کی

ہے اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں اس کی مثال دیگر شعبوں میں نہیں ملتی۔ عدالتی اختیارات جو مذہبی علماء کو حاصل تھے میرے والد نے وہ سب سلب کر لئے۔ انہوں نے دیوانی، فوجداری اور تجارتی امور کے لئے نئے قوانین جاری کئے اور دیوانی و فوجداری مقدموں کے طریق کار میں تبدیلی کی۔ عدالتوں کو مختلف درجوں اور طبقوں میں تقسیم کیا۔ آج سب سے نیچی عدالت ہر قصبے اور تحصیل میں ہے جو آپس کے تمام چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کا تصفیہ کرتی ہے۔ چھوٹے شہروں میں ضلعی عدالتیں ہیں۔ اس کے بعد اپیل کی عدالتوں کا درجہ ہے۔ یہ عدالتیں صرف بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ سب سے اوپر عدالتِ عالیہ یا سپریم کورٹ ہے جہاں صرف اپیلیں سُنی جاتی ہیں یا شاذ و نادر وزراء کی حق تلفی یا صوبے کے گورنروں کی زیادروی کے متعلق مقدموں کی سماعت ہوتی ہے۔ ان عدالتوں کے علاوہ اور بھی عدالتیں ہیں جن کا تعلق کاروباری جھگڑوں، دفتروں کی انتظامی خرابیوں اور فوجی نظم و نسق سے ہے۔

آئین نے وِٹو پاور اور پارلیمنٹ کو برخاست کرنے کے اختیارات کے علاوہ اور بھی حقوق ایران کے تاجدار کو دیئے ہیں۔ مثلاً اس ملک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وزیرِ اعظم کا انتخاب میں خود کرتا ہوں دوسرے وزیروں کا تقرر بھی میں ہی کرتا ہوں لیکن اس میں وزیرِ اعظم کا مشورہ شامل ہوتا ہے۔ صوبائی گورنروں، عدالتِ عالیہ کے ججوں، سفیروں، فوجی افسروں اور دوسرے اہم عہدے داروں کا تقرر میرے ہی دستخطوں سے ہوتا ہے۔ اعلانِ جنگ و صلح کے اختیارات کے ساتھ میں اپنی مسلّح فوجوں کا کمانڈر انچیف بھی ہوں۔ اس کے علاوہ ترقیاتی اور آبادکاری کے جتنے بھی منصوبے ہیں ان سب کی میں خود نگرانی کرتا ہوں اور لوگوں کو شوق دلاتا ہوں کہ وہ بھی ترقیات کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ اِس ملک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے میری سب سے بڑی ذمّہ داری یہ ہے کہ ملک کے اتحاد اور سالمیت کو برقرار رکھوں یہ فرض میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اب سے ڈھائی ہزار سال قبل کورش اعظم نے پہلی مرتبہ ایک متحد قوم اور ایک متحد حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور ایرانی حکومت نے آج تک اِسی سیاسی اور قومی وحدت کو برقرار رکھا ہے۔

اگرچہ ایران کے لوگوں کے لئے یہ چیز بالکل نئی ہوگی لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایک اہم سیاسی جماعت قائم کروں۔ اگرچہ سنہ ۱۹۰۶ء میں قومی اسمبلی قائم ہونے کے بعد کچھ سیاسی قسم کی جماعتیں اُبھریں لیکن اندرونی اختلافات اور پارٹی کے مقاصد کو چھوڑ کر لوگوں کی شخصیت کی طرف متوجہ ہونے کے سبب یہ جماعتیں کام نہ کر سکیں۔ میرے والد صاحب نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تجربے کے طور پر یہ کوشش کی کہ ایک ایسی سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے جو ملک کی اکثریت کی نمائندہ ہو۔ یہ جماعت بھی کچھ وجوہات کی بناء پر متحد نہ رہ سکی اُس کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کا سیاسی شعور اتنا بیدار نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک ہی جماعت کے تحت کام کر سکیں۔ بہرحال میرے والد نے تیزی سے تعلیمی نظام کو پھیلا کر آئندہ کے لئے سیاسی جماعتوں کی تشکیل کے لئے میدان ہموار کر دیا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب غیر ملکی طاقتوں نے ایران پر قبضہ کر لیا تو کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں جن

میں سب سے زیادہ منظم جماعت کمیونسٹوں کی تُوڈے پارٹی تھی۔ یہ جماعت ۱۹۴۱ء میں روسیوں کی مدد سے قائم ہوئی اور اِس کے ممبر زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو میرے والد کمیونسٹ ہونے کے شبہ میں گرفتار کر چکے تھے۔ غیر ملکیوں کے بَل بُوتے پر اِس جماعت کے کچھ فرد قومی اسمبلی کے لئے منتخب ہو کر آئے اور کچھ نے تجارتی انجمنوں اور مسلح فوجوں میں رخنہ اندازی اور تخریبی کارروائیاں شروع کیں۔ جن نمایندوں کو تُوڈے پارٹی نے قومی اسمبلی میں بھیجا تھا وہ تخریبی کاموں میں پیش پیش رہتے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ قومی اسمبلی کے کچھ ممبر اگرچہ کمیونسٹ نہیں تھے لیکن طبیعت چونکہ منفی پسندانہ پائی تھی اِس لئے کمیونسٹ ممبروں کے ساتھ مِل کر ہر مفید و تعمیری قانون کے پاس ہونے میں رُکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ اِن میں یہ بات بڑی ہی عجیب و غریب تھی کہ ایک طرف تو وہ یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کو جنوبی ایران سے تیل نکالنے کی جو مراعات حاصل ہیں وہ منسوخ کر دی جائیں اور دوسری طرف جب تیل کو قومی ملکیت قرار دینے کا مسئلہ اُٹھایا جاتا تو وہ اُس کی مخالفت کرتے۔ مصدق کے زوال تک تُوڈے پارٹی کا ایران میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔

۱۹۵۷ء میں جب دوبارہ ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہوا اور مصدق کے عہد میں جو اقتصادی جمود آ گیا تھا وہ ختم ہو کر قومی آمدنی بڑھی تو میں نے بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ ایران میں بھی دو پارٹی سسٹم شروع کر دیا جائے۔ یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ دو پارٹیوں والا سسٹم جو امریکہ، برطانیہ اور دوسرے آزاد ممالک میں بڑی کامیابی سے رائج ہے محض دو ہی پارٹیوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہاں دو بڑی پارٹیوں کے علاوہ کچھ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی ہوتی ہیں جو کوشش کرتی رہتی ہیں کہ اپنی کارگزاریوں سے بڑی پارٹی بن جائیں۔

جہاں دو پارٹیاں مدِمقابل ہوتی ہیں وہاں جو بھی پارٹی انتخابات میں زیادہ ووٹ حاصل کرتی ہے اپنی حکومت بناتی ہے اور دوسری پارٹی جو اقلیت میں رہ جاتی ہے وہ اکثریت کے خلاف پوری نیک نیتی سے اپنی آواز بلند کرتی ہے۔ اگر حکمران جماعت ایسے راستے پر جا رہی ہو جس میں عوام کا سراسر نقصان ہو تو اس کو تنبیہہ کرنے اور غلطیوں کو منظرِ عام پر لانے کے لئے اقلیتی فرقے کی نکتہ چینی بڑی اہم اور مفید ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھوٹی پارٹیاں اکثریت یا اقلیت کے ساتھ تعاون کر لیتی ہیں لیکن اس سے دو جماعتی نظام کے بنیادی اصولوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب ایران میں ایسے سازگار حالات پیدا ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے دو بڑی سیاسی جماعتیں اور دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتیں سرگرمی سے اپنے کام کر سکیں۔ اب کوئی بھی شخص اگر چاہے تو بغیر کسی خوف یا رکاوٹ کے ایک یا ایک سے زیادہ جماعتیں بنا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک ضروری شرط ہے اور وہ یہ کہ یہ جماعت یا جماعتیں غیر ملکی طاقتوں کی ملک میں آلۂ کار نہ ہوں۔ اس وقت ملک کی دو بڑی سرگرم جماعتوں میں ایک قومی جماعت ہے اور دوسری عوامی جماعت۔ خارجی معاملات میں یہ دونوں جماعتیں کسی غیر ملکی جماعت یا قوم کی طرفدار نہیں ہیں لیکن ملک کے اندرونی معاملات میں آپس میں اختلاف ہو سکتا ہے اور اکثر معاملات میں رہتا بھی ہے۔ جہاں بھی دو جماعتی نظام کارفرما ہے

وہاں اختلافات ہونا ایک لازمی امر ہے کیونکہ جمہوریت میں یہ خوبی ہے کہ لوگ اپنی قسمت کے فیصلوں میں خود مداخلت کرسکتے ہیں اور اپنے معاملات کو حل کرنے کے لئے بہترین طریقہ یہی ہے کہ بحث و مباحثے اور دلائل کے ذریعے کوئی راہ نکال لی جائے۔ مقامِ مسرت ہے کہ ایران میں سیاسی جماعتیں اُن قدیمی ذاتی اور شخصی اختلافات کی روایات کو آہستہ آہستہ ترک کر رہی ہیں اور اب لوگوں کی توجہ زیادہ تر پوری جماعت پر ہوتی ہے اور اختلاف کا سبب سیاسی نظریات ہوتے ہیں۔

بعض لوگ ہماری سیاسی جماعتوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں اور اُن کا یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ جماعتیں عوام کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ اِن کو حکام اعلیٰ نے عوام پر لاد دیا ہے۔ کچھ سر پھرے تو یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ جماعتیں عوام کی نہیں حکومت کی نمایندہ ہیں اور شاہ کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی ہیں۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکے ہیں کہ ایران جیسے ملک میں جو ترقی کی راہ پر ہے سیاسی جماعتیں بنانے کا اصل مقصد کیا ہے۔

میرے والد نے تعلیم کو عام کرنے کی جو کوششیں کیں اور میرے عہد میں جتنے بھی نئے مدرسے کھلے اس کے باوجود ہمارے ملک میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو بالکل اَن پڑھ ہیں۔ اِس کے علاوہ ہم لوگوں کے لئے سیاسی جماعتوں اور مغربی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کا تصوّر بالکل نیا ہے ایک ایسے ملک کے متعلق جہاں قدیم رسم و روایات کا اثر لوگوں کی زندگی پر بہت ہی گہرا ہو یہ سوچنا قطعی مذاق ہوگا کہ وہاں کے باشندے سیاسی جماعتیں بنائیں اور یہ جماعتیں ایک دم اوج پر پہنچ جائیں۔

ایران کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ سیاسی جماعتوں کی ہمّت افزائی کروں۔ اگر آئینی حکمران ہونے کی بجائے اس ملک کا ڈکٹیٹر بھی ہوتا تو میں بھی شاید ہٹلر یا کمیونسٹ ممالک کے سربراہوں کی طرح ایک حکمران پارٹی کو باقی رکھنے کی حمایت کرتا۔ میں چونکہ اپنے ملک میں قومی یکجہتی کا مظہر بھی ہوں اِس لئے میں اپنے آپ کو کسی بھی جماعت سے منسلک کئے بغیر دو یا دو سے زیادہ پارٹیوں کی آگے بڑھنے کے لئے حوصلہ افزائی کرسکتا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا نئی سیاسی جماعتیں کسی کے ہاتھ میں کھلونا یا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں یا یہ محض افواہ ہے؟ فرض کیجئے کچھ لوگ جن کے ملک کے تاجدار یا حکومت سے قریبی تعلقات ہیں ایک جماعت بناتے ہیں اور اُس کے ممبران کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہو جاتی ہے، جو ملک کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ نہیں ہے۔ اب یہ لوگ اپنی پارٹی کا منشور پڑھنے اور اپنے رہنماؤں کی تقاریر سُننے کے بعد ہی یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا اِس پارٹی کی رُکنیت قبول کریں یا نہ کریں۔ اگر لوگ اِس پارٹی سے مطمئن نہ ہوں گے تو بہت سے طریقے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرسکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پارٹی کے ممبر اپنے رہنماؤں کو مجبور کریں کہ وہ اپنا رویہ بدلیں اور اگر یہ نہیں ہوسکتا تو لوگوں کو حق حاصل ہے کہ پارٹی سے الگ ہو جائیں یا اُس کی سرگرمیوں میں عملی طور پر کوئی حصہ نہ لیں۔ اگر پارٹی کے ممبر اپنے رہنماؤں سے مطمئن نہ ہوں تو وہ اُن کو بدل بھی سکتے ہیں اور اُن کی جگہ ایسے نئے لیڈروں کا انتخاب ہوسکتا ہے جو اُن کی خواہشات

اور آرزوؤں کو پورا کریں۔

بعض سادہ لوح لوگ یہ سوچتے ہیں کہ بغیر اچھے رہنماؤں کے دس ہزار یا سو ہزار افراد کی سیاسی جماعت کا وجود میں آجانا اور پورے طور پر سرگرم عمل ہونا ایک معمولی بات ہے۔ لیکن یہ لوگ یہ نہ بتا سکیں گے کہ کس ملک میں ایسا ہوا ہے۔ اگر تھوڑی دیر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے تمام آزاد ممالک میں جماعتیں وہی لوگ بناتے ہیں جن کو عوام کی مدد اور حمایت حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ وہی پارٹی قیادت حاصل کر سکتی ہے جس کو مقامی لوگوں اور قصبات و دیہات کے رہنے والوں کا تعاون حاصل ہو۔ آزاد ممالک میں جو بھی سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی ہیں انہوں نے دن رات کام کیا ہے اور ملک کے کونے کونے میں لوگوں کے پاس جا کر اور اُن سے مل کر اپنی پارٹی کے مقاصد بتا کر اُن کا تعاون حاصل کیا ہے۔ ایران میں بھی ہماری بڑی بڑی سیاسی جماعتیں اپنی سرگرمیوں کو تیزی سے پھیلا کر مقامی لوگوں کا تعاون حاصل کر رہی ہیں۔ چنانچہ قومی سطح کے علاوہ صوبائی اور ضلعی پیمانے پر ان جماعتوں نے اپنا پروگرام شروع کر دیا اور چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبات میں مقامی دفاتر قائم ہوگئے۔ مقامِ مسرّت ہے کہ ایران میں جماعت کے تعاون سے کام کرنے کا جذبہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور پورے ملک میں عورتیں اور مرد جمہوریت کی ترقیاتی سرگرمیوں میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لے رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ طبقے میں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے ذہن میں آزاد جماعتوں کا مطلب واضح نہیں ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی نظر آئیں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی شخصیت سیاسی ہنگاموں سے بالاتر ہے۔ بعض اشخاص کسی خوف یا اپنی منفی پسندانہ طبیعت کی وجہ سے ایسے تعمیری کاموں میں حصّہ نہیں لیتے جن سے اُن کی اپنی زندگی اور پوری قوم کی ترقّی کا گہرا تعلق ہو۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں دیکھ رہا ہوں کہ وطن دوست اور قوم پرست ایرانی زیادہ سے زیادہ سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لے رہے ہیں جو قوم کی بقا اور جمہوریت کی ترقّی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

سیاسی جماعتیں بنانے کے علاوہ ہم ایران میں سیاسی جمہوریت کی ترقّی و فلاح کے لئے کچھ اقدامات کر رہے ہیں۔ کسی اچھّی حکومت سے ہم یہ سبق سیکھتے ہیں کہ اچھّا قانون وہی ہوتا ہے جس پر لوگ عمل بھی کریں۔ پچھلے دنوں میں ہماری پارلیمنٹ نے بہت سے عمدہ اور مفید قانون پاس کئے لیکن اُن پر چونکہ عمل درآمد نہیں ہو سکا اِس لئے اِن کی اہمیت ردّی کے فرسودہ کاغذوں سے زیادہ نہ رہی۔ اگرچہ رضا شاہ نے ہمارے انتظامی اور اداری امور کو اپنی کوششوں سے مغربی طرز پر چلا دیا لیکن اس کو زیادہ تیز رفتار اور بہتر بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رشوت خوری اور بدعنوانی کی عادتیں ابھی تک پورے طور پر ملازمین میں سے ختم نہیں ہوئی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں میری حکومت نے ہر وزارت خانے میں انتظامی امور کے لئے کچھ انڈر سکریٹری مقرر کئے ہیں۔ وزیر خواہ کوئی بھی شخص رہے یہ افسر اپنے محکموں میں مستقل طور پر کام کرتے رہتے ہیں تاکہ دفتری انتظام کو ہر طرح بہتر اور

زیادہ مفید بنا سکیں۔ اِن میں سے کچھ افسروں اور ان کے معاونوں نے غیر ممالک میں نئے ڈھنگ سے عوامی انتظامات کی تربیت بھی حاصل کی ہے۔ انتظامی امور کے سکرٹیریوں نے اعلیٰ پیمانے پر انتظامی امور کی کونسل بھی بنائی ہے جس کا کام حکومت کے تمام دفاتر میں انتظامی امور کو بہتر بنانا ہے۔

۱۹۵۸ء میں میری حکومت نے دو سال کی کوشش اور مطالعہ کے بعد انتظامی امور کو از سرِ نو منظّم کرنے کی جامع سفارشات پیش کیں۔ یہ سفارشات اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسی ہی تھیں جیسی امریکہ میں ہُوور گورنمنٹ کے از سرِ نو تنظیمی کمیشن نے تیار کی تھیں۔ یہ سفارشات ایک بل کی شکل میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی گئیں جن کو ۱۹۵۹ء میں پاس کر دیا گیا اور میں نے بھی اُن پر فوراً دستخط کر دیئے۔ چنانچہ بڑی بڑی وزارتوں اور حکومت کے اداروں کی بنیادی تنظیم اِسی بِل کی بِنا پر کی گئی ہے۔ آبادکاری اور اقتصادی ترقیات کے لئے منصوبہ بندی کے محکمے کی خاص اہمیت ہے۔ ماہرین کے ایک گروہ نے دقیق مطالعے کے بعد اس کی بھی اصلاح کی اور از سرِ نو مرتّب کیا۔ آج ہماری وزارتیں اور حکومت کے دفاتر انتظامی امور میں جدید اصولوں کے مطابق اسی روش پر چل رہے ہیں جو امریکہ میں رائج ہے اور منطقی طور پر ان میں باہمی رابطہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ضروریات کے مطابق نئے علوم کی روشنی میں اپنے دفاتر اور اداروں کی اصلاح کرتے رہیں گے۔

کسی بھی وزارت خانے کو خواہ کتنی ہی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے کیوں نہ منظّم کر لیا جائے لیکن جب تک اُس میں دقیانوسی خیالات کے آدمی بھرے رہیں گے کام میں روانی نہیں آ سکتی۔ اِس کے علاوہ اگر دقیانوسی عہد کے بڈّھے یونہی دفتروں میں قلم گھِستے رہے تو نوجوانوں کو خدمت کرنے اور اپنی قابلیت دکھانے کا موقع نہیں ملے گا جس کی وجہ سے اُن میں ہراس پھیل جائے گا۔ پچھلے چند سالوں میں بالکل یہی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں میں نے فیصلہ کیا کہ جن لوگوں کی عمر ساٹھ سال ہو چکی ہے یا جو لوگ تیس سال تک ملازمت کر چکے ہیں اُن کو ریٹائر کر دینا چاہیئے (کابینہ کے وزیر، سفیر اور انڈر سکرٹری درجے کے لوگ اِس کلیّے سے مستثنیٰ ہیں) چنانچہ ہزاروں سرکاری ملازموں کو اُن کی تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی پنشن دے کر سبکدوش کر دیا گیا۔ اِن میں سے اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو پرائیویٹ صنعتی اِداروں میں کام کر کے ملک کے ترقیّاتی کاموں میں حصّہ لے رہے ہیں اور اُن کی جگہ ہمارے ملک کی یا باہر کی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ نوجوان آ گئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ صوبوں اور چھوٹے شہروں کے افسرانِ بالا کو مقامی مسائل حل کرنے کا اختیار دے کر نہایت مفید قدم اُٹھایا گیا ہے۔ اگر صوبے یا صوبے کے کسی شہر کے لوگوں کو ہر معاملے میں مقامی دفتر کی معرفت تہران سے رجوع کرنا پڑتا تو اِس سے دو خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اوّل تو یہ کہ کام کی رفتار بہت ہی سُست ہو جاتی اور دوسرے یہ کہ اگر لوگوں کو یہ احساس ہو جاتا کہ اُن کو اپنے ہی معاملات میں کسی طرح کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے تو اُن کا جذبۂ شہریت بُری

طرح کچلا جاتا۔ اسی لئے ہم نے مقامی افسران کو کچھ زیادہ ہی اختیارات دے دیئے ہیں اور مقامی انجمنوں کو یہ ترغیب دِلا رہے ہیں کہ اسکولوں، ہسپتالوں، یتیم خانوں، عوام کی بھلائی کے کاموں اور شہروں کی میونسپل کمیٹیوں کی نگرانی وہ خود ہی کریں۔

اِس سلسلے میں میونسپل کمیٹیوں کی انجمن نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ اصفہان کی میونسپل کمیٹی کو تجربات کے لئے بطور نمونہ انتخاب کیا گیا جہاں شہر کی حفاظت اور دیکھ بھال کے بہت سے مفید نظریات کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اِس انجمن نے میونسپل کمیٹی کے جدید ترین طریقوں کو ایرانی ضروریات اور ماحول کے مطابق ڈھالنے کے لئے اہم تحقیقات بھی کیں اور صوبائی اور قومی سطح پر بہت سی کانفرنسیں بھی کیں تاکہ میونسپل کمیٹیوں کے حکّام بالا جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں۔

صوبوں اور چھوٹے شہروں کو اندرونی معاملات میں حقِ خود مختاری دینے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی جمہوری حکومتوں سے ہم نے یہ سبق سیکھا ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں چھوٹے شہروں اور قصبوں کے بل بُوتے پر ہی آگے بڑھتی ہیں کیونکہ مقامی لوگوں کو ہی قومی اور اجتماعی کاموں کے لئے اچھّی تربیت دی جا سکتی ہے اور مقامی لوگوں کے سیاسی حلقے ہی قومی سطح پر کسی جماعت کے لوگوں کو اُن کی مرضی اور خواہشات کے مطابق منظّم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بلا کسی مبالغہ کے میں یہ کہہ سکتا ہوں ایران میں وطن پرست اور طاقتور سیاسی جماعتیں بنانے کے لئے ضروری ہے کہ دیہاتوں اور چھوٹے شہروں سے لوگوں کو قومی کاموں کے لئے اُبھارا جائے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کسی سیاسی جماعت کی تنظیم سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ مقامی لوگوں کو اس طرح تیار کیا جائے کہ اُن کا سیاسی شعور پختہ ہو جائے کیونکہ مقامی لوگوں کی حمایت ہی سیاسی جماعتوں کو مضبوط بنا سکتی ہے اور یہی لوگ یہ بتا سکتے ہیں کہ عوام کونسی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس سے اجتماعی طور پر لوگوں کا بھلا ہو سکے۔

میں اس بات کے بھی حق میں ہوں کہ ایک اور قسم کی مرکزیت قائم کی جائے تاکہ ہمارے وہ ترقّیاتی منصوبے جو ابھی زیرِ تکمیل ہیں جلد از جلد پورے ہو جائیں۔ اس لئے ہم نے بہت سے ایسے کام جو وزارتوں سے وابستہ تھے اور جن کو وزارتیں بہت اچھے بلکہ زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتی تھیں منصوبہ بندی محکمے کے سپرد کر دیئے۔ اس کے علاوہ وزارتوں کے ملازمین کی ماہانہ تنخواہ اور منصوبہ بندی کے محکمے کے کام کرنے والوں کی تنخواہ میں نسبتاً فرق رکھا گیا ہے۔ اگرچہ منصوبہ بندی کے محکمے نے بہت عمدہ کام کئے ہیں لیکن مستقبل میں اس کے تمام شعبوں کی مرکزیت ختم کر دی جائے گی منصوبوں کو چلانے اور جہاں حکومت نے پیسہ لگایا ہے اُن سے روپیہ کمانے کے کام متعلقہ وزارتوں اور سرکاری محکموں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

سرکاری دفاتر سے بدعنوانی اور رشوت ستانی ختم کرنے کے لئے حکومت نے ۱۹۵۸ء و ۱۹۵۹ء میں بہت سخت

اِقدامات کئے ہیں۔اِس سلسلے میں ایرانی پارلیمنٹ نے دو قانون پاس کئے ہیں جن پر اب باقاعدہ عمل بھی کیا جانے لگا ہے۔ اِن قوانین کا مقابلہ امریکہ، انگلستان اور دیگر جمہوری ممالک کے "تصادمِ مفاد" کے قانون سے کیا جاسکتا ہے۔ پہلے قانون کی رو سے حکومت کا شہری اور فوجی عملہ کسی بھی سرکاری کاروبار میں یا سرکار سے متعلقہ کسی ایجنسی سے خرید و فروخت کا معاملہ نہیں کرسکتا (اِس قانون کے زُمرے میں فیکٹریوں کے مزدور اور اِن اداروں کے ملازمین بھی جو حکومت کی نگرانی میں چل رہے ہیں یا جن کا منافع سرکاری خزانے میں جاتا ہے شامل ہیں) یہاں تک کہ ممبرانِ پارلیمنٹ کو بھی پرائیویٹ طور پر وکالت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگرچہ اس قانون میں کہیں شاہی خاندان کے افراد کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے لیکن میں نے جُداگانہ اُن سے کہہ دیا ہے کہ اِس کا اطلاق اُن پر بھی ہوتا ہے۔ اِس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے دو سے چار سال تک کی سزا حبسِ مجرّد مقرّر ہے۔

دوسرے قانون کے تحت حکومت کے تمام ملازمین کو ہر سال یہ تفصیلات بتانی پڑتی ہیں کہ اُن کے پاس کتنا سرمایہ ہے اور اُن کا ذریعۂ آمدنی کیا ہے (اِس قانون کا اطلاق اُن کارخانوں اور دوسرے اِداروں کے ملازمین پر بھی ہوتا ہے جہاں حکومت کا سرمایہ لگا ہوا ہے) اگر ہر سال سرمائے کی آمدنی میں اس قدر اُتار چڑھاؤ ہو کہ شک و شبہات پیدا ہونے لگیں تو باقاعدہ جانچ پڑتال کرائی جاتی ہے۔ اگر کوئی سرکاری ملازم اپنی آمدنی کی تفصیل نہ بتائے یا غلط بیانی سے کام لے تو اُس کو ملازمت سے علیٰحدہ کردیا جاتا ہے اور وہ سرمایہ جو اُس نے چھُپایا ہے یا ظاہر نہیں کیا اُس پر حکومت اپنا قبضہ کرلیتی ہے۔ ہم نے اِس قانون کا نام "کہاں سے لایا گیا" رکھا ہے۔

۱۹۵۸ء میں میں نے اپنے دربار سے متعلقہ محکموں میں محکمۂ تفتیش کا بھی اضافہ کیا۔ جیسا کہ پہلی فصل میں بیان کرچکا ہوں کہ اپنی جوانی کے آغاز میں جبکہ میں سوئٹزرلینڈ میں طالب علم تھا اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب سلطنت کی ذمّہ داریاں سنبھالوں گا تو عوام کی شکایات اور تکالیف کو میں بڑے غور سے سُنا کروں گا اور اُن کے ساتھ ہمدردانہ رویّہ اختیار کروں گا۔ اِس محکمے کے قائم ہونے سے قبل جتنے خط مجھے لکھے جاتے تھے اُن کا متن یا خلاصہ میں خود پڑھا کرتا تھا اور متعلقہ افسروں کو ضروری کارروائی کے لئے بھیج دیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں مَیں نے محسوس کیا کہ اِس طریقۂ کار میں کافی نقص اور خامیاں ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ایک کسان یہ شکایت کرتا ہے کہ علاقے کے تھانے کے کسی افسر نے اُس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ میں شاید وزیرِ داخلہ سے ہی کہوں گا کہ وہ اِس معاملے کی تفتیش کرے اور اِس شخص کو سزا دے جس نے اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وزیرِ داخلہ معاملے کی نوعیت کو سمجھنے اور تفتیش کرنے کے لئے مقامی تھانے کے انچارج سے رپورٹ طلب کرے گا۔ تھانے کا انچارج اپنی اور اپنے ساتھی کے بچاؤ کی تدبیر سب سے پہلے کرے گا اور شکایت کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس کسان نے شکایت کی ہو اُس کو اور بھی زیادہ پریشان کیا جائے۔

اگرچہ تھانے کا عملہ اور حکومت کے دوسرے تمام محکمے اصول و ضابطے اور قانون کے پابند ہیں لیکن تجربے نے یہی سکھایا ہے کہ ایک علیٰحدہ تفتیش کے محکمے کی ابھی ضرورت ہے اور اسی لئے پچھلے سال شاہی محکمۂ تفتیش کا قیام عمل میں آیا۔ اِس محکمے کا عملہ پورے ملک میں ہر جگہ پہنچتا ہے اور بغیر کسی خوف، طرفداری یا لاپروائی کے ہر ظلم و زیادتی کی تفتیش و تحقیق کرتا ہے اور لوگ اپنی شکایات بڑے اطمینان سے اُن تک پہنچاتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کی شکایتیں میرے عملے کے ذریعے براہ راست مجھ تک پہنچتی ہیں۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک شاہی محکمۂ تفتیش اور بدعنوانیوں کے خلاف مہم جاری رکھنے والے عملے کی کوشش سے تقریباً چار سو شہری حکومت کے ملازموں (جن میں گورنر، شہردار اور اعلیٰ عہدیداران بھی شامل ہیں) اور دو سو فوجی افسروں (معہ پانچ جنرلوں) کو سزائیں بھی دی گئیں، گولی کا نشانہ بھی بنایا گیا اور اُن پر مقدمے بھی چلائے گئے۔

حکومت کے عملے نے انتظامی امور میں جو تبدیلی پیدا کی ہے اور جس کا اثر پورے ملک کی اجتماعی حالت پر پڑا ہے اُس کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے۔ تھوڑے عرصے پہلے دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی کسان اور دستکار حکومت کو لگان وصول کرنے والوں، پولیس کے افسروں اور فوجی سپاہیوں کے ذریعے ہی جانتے تھے۔ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح لوگوں سے ظلم اور زیادتی کر کے ٹیکس اور لگان وصول کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی تھانے کے عملے کے لوگ اور فوج کے سپاہی بھی نقدی یا اناج کی شکل میں رشوت وصول کیا کرتے تھے۔ اِن حالات کے پیشِ نظر اگر کسان حکومت کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

تھوڑے عرصے سے اچھے برتاؤ کی وجہ سے سرکاری حکّام کی طرف سے کسانوں کے نظریئے میں تبدیلی آنا شروع ہوئی ہے۔ کیونکہ اب ان حکّام کی مدد سے دیہاتوں میں اسکول کھولے جا رہے ہیں جہاں بچّوں کو تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ ملیریا کی روک تھام کے لئے ہر جگہ ڈی۔ ڈی۔ ٹی چھڑکی جاتی ہے۔ گہرے کنویں کھودے جا رہے ہیں تاکہ کسانوں کو صاف پانی مِل سکے۔ جگہ جگہ ہسپتال قائم کئے جا رہے ہیں جہاں بچّوں اور بڑوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ سرکاری ملازم کھیتوں میں جا کر کسانوں کے سامنے نئی قسم کے بیجوں کا استعمال اور کاشت کرنے کے نئے ڈھنگ سمجھاتے ہیں۔ اِس وقت پورے ملک میں ہر طرف اِس قسم کے رفاہی کام ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے کسان خود ہی یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اُن کے اور حکومت کے درمیان اچھے تعلقات جو پہلے کبھی نہ تھے پیدا ہو رہے ہیں۔ سرکاری ملازمین بھی عوام کے ساتھ اچھے رویّے اور حسنِ سلوک سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ براہِ راست جمہوریت کا مطلب و مفہوم خوب سمجھتے ہیں۔ سرکاری عہدوں پر نوجوانوں کے آجانے سے اور نئی نسلوں میں تعلیم پھیلنے کی وجہ سے ملک میں حقیقی جمہوریت جلد ہی آجائے گی (نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں مَیں اگلی فصل میں تفصیل سے ذکر کروں گا) اور مجھے اُمیّد ہے کہ سرکاری ملازمین اور عوام کے درمیان اچھے تعلقات پیدا ہونے کی وجہ سے پارلیمانی جمہوریت کا راستہ اور بھی ہموار ہو جائے گا۔

سیاسی جمہوریت ریفریجریٹر کی طرح کی کوئی چیز نہیں ہے کہ جس کو جب چاہا چلا دیا اور جب چاہا بند کر دیا۔ اچھی اور صحت مند جمہوریت کے لئے ذہانت کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ رائے دینے والوں کے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ وہ جس کو ووٹ دے رہے ہیں اُس کی علمیت اور قابلیت کتنی ہے اور کن مقاصد کے تحت وہ اِس کا انتخاب کر رہے ہیں اِس کام کے لئے ذہنی پختگی اور بُردباری دو اہم چیزیں ہیں۔ دولت مندوں کو چاہیئے کہ وہ غریب آدمی کے اِسی ایک ووٹ پر قناعت کریں جو اُس کو حاصل ہے اور وہ پارٹی جو خواہ چند ووٹوں سے ہی ہاری ہو اُس کو چاہیئے صبر سے کام لے اور آیندہ اچھے موقع کی منتظر رہے اور جب تک اُس کو اکثریت حاصل نہ ہو وہ تخریبی کام کرنے کی بجائے اکثریت پر صحت مندانہ تنقید اور مخالفت کو روا رکھے۔ سیاست دانوں اور عوام کی خدمت کرنے والوں کے لئے ایمانداری بہت ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ اپنی خواہشات پر قابو رکھیں اور لوگوں کو فریب دینے یا گمراہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ سیاسی جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی ہر طرف سے باخبر اور ہوشیار رہے۔ اگر کوئی شخص سیاسی یا انتظامی امور میں غفلت برتے یا بد دیانتی سے کام لے تو قوم پرست لوگوں کو چاہیئے اُس کی غلطی پکڑیں اور نڈر ہو کر اُس کو اُس کے کئے کی سزا دیں۔ اِس کے علاوہ مؤثر اور صحت مند سیاسی جمہوریت کے لئے لوگوں میں خدمت اور اعلیٰ مقصد کا جذبہ بھی ہونا چاہیئے اور پوری مہم کو چلانے کے لئے شدّت سے قوّتِ عمل کا احساس بیدار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہاں میری مُراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اِس نوعیت کی سیاسی جمہوریت قائم کرنا اور اُس کو پوری طرح برقرار رکھنا کوئی آسان کام ہے بلکہ میں تو پُرزور طریقے پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ایرانیوں کے لئے وہ انسانی قدریں جو سچّی سیاسی جمہوریت میں پنہاں ہیں اِس قدر اہم ہیں کہ ہم اس کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کو تیّار ہیں۔

اب میں ملک کی اقتصادی جمہوریت کی طرف متوجّہ ہوتا ہوں۔ میری رائے میں سیاسی جمہوریت کی طرح اقتصادی جمہوریت میں بھی ایران نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں تقریباً نیا ہے۔ یہاں میں لاف و گزاف سے بالکل کام نہیں لے رہا بلکہ ایک ایسی حقیقت بیان کر رہا ہوں جس کو ہر وہ شخص دیکھ سکتا ہے جس کو اس سے دلچسپی ہو۔ میرے لئے انتہائی مسرّت کا مقام ہوگا اگر ترقی کی اِس راہ کا جس کو ہم نے اختیار کیا ہے ان ممالک سے مقابلہ کیا جائے جو دنیا کے اِس حصّہ میں واقع ہیں۔

اقتصادی ترقّی کا جو وسیع پروگرام ہم نے مرتّب کیا ہے اُس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ یہاں میں صرف یہ بتاؤں گا کہ اِس کا جمہوریت سے کیا تعلق ہے۔ آج امریکہ مجموعی طور پر فی کس کے حساب سے جو سامان تیار کر رہا ہے اور لوگوں کی جو خدمت انجام دے رہا ہے اُس کا تناسب دنیا کے دوسرے تمام ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں اِس سے غرض نہیں کہ یہ جفاکش قوم کتنی مقدار میں سامان تیار کرتی ہے بلکہ جس چیز کی میری نظر میں خاص اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح یہ قوم جمہوریت کے اصولوں پر اپنے سامان کو تقسیم کرتی ہے۔ اگر امریکہ کے کسی بڑے

کارخانے کو دیکھنے کا اتفاق ہو تو جو چیز وہاں نمایاں نظر آئے گی وہ ہزاروں کی تعداد میں کاریں ہوں گی جو پورے کارخانے کے چاروں طرف کھڑی ہوں گی۔ اِن کاروں کے مالک کارخانے کے وہ معمولی مزدور ہیں جو خود ہی اُن کو چلاتے ہیں۔ یہ مزدور اچھا کھانا کھاتے ہیں اچھا لباس پہنتے ہیں اور جن گھروں میں رہتے ہیں اُن میں ضرورت کی وہ تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں جن میں زیادہ محنت اور وقت صرف کرنا نہیں پڑتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں بھی کچھ لوگوں کے پاس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دولت ہے لیکن سامان کی پیداوار اتنی زیادہ ہے کہ ہر شخص ضروریاتِ زندگی پوری کر کے کچھ بچا بھی لیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کو ترقی کے کاموں کے لئے روپیہ دینے کے بعد بھی اتنا سرمایہ ملک میں بچ رہتا ہے کہ پورے ملک پر کوئی اقتصادی دباؤ نہیں پڑتا۔

اقتصادی جمہوریت اور اشیاء کی پیداوار کا سبب محض امریکہ کی سرمایہ داری ہی نہیں ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک امریکہ میں خانہ جنگی ہوتی رہی۔ یہ وہ دَور تھا جبکہ ملک سے سرمایہ دارانہ نظام آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا اور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک اُس کو بالکل ترک کیا جا چکا تھا۔ اِس وقت امریکہ میں سیکڑوں کی تعداد میں پرائیویٹ صنعتی اور تجارتی ادارے اور ہزاروں قابلِ کاشت زمینوں کے قطعے ہیں۔ لیکن امریکہ کا اقتصادی ڈھانچہ اس طرح ملا جُلا کر بنایا گیا ہے جس میں دونوں عناصر یعنی سرمایہ دار اور سوشلسٹ شامل ہیں۔ حکومت اِن کارخانوں اور زمین کے مالکوں کو قرض دے کر، تکنیکی مدد کر کے اور دوسرے طریقوں سے رہنمائی کے ذریعے عوامی مفاد کے پیشِ نظر اُن کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتی ہے۔ کچھ اداروں کو حکومت خود چلاتی ہے جیسے ہسپتال، بجلی کے کارخانے، جنگی سامان کی فیکٹریاں اور بڑے بڑے چھاپے خانے وغیرہ۔ یہ بات سب سے زیادہ اہم ہے کہ امریکی مزدور جو بھی اپنی محنت سے پیدا کرتے ہیں وہ سب اِسی ملک میں لوگوں کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔

امریکہ کی طرح ایران میں بھی حکومت نہ صرف پرائیویٹ تجارتی اور صنعتی اداروں کی مدد کرتی ہے بلکہ عوام کے مفاد کی خاطر اُن کی دیکھ بھال اور نگرانی بھی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر قانونِ محنت کے تحت ہم کارخانوں میں کام کی حالت اور رفتار کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ بعض حالات میں ہم اشیاء کی قیمتیں بھی مقرر کرتے ہیں۔ جیسے تہران میں گوشت اور روٹی کی زیادہ سے زیادہ قیمت خوردہ فروشوں کی دوکانوں پر حکومت ہی مقرر کرتی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت نے بہت سی غیر ملکی دواؤں کی قیمتیں کم کر دیں۔ چنانچہ اس وقت بہت سی ادویات ایسی ہیں جن کی قیمتیں ایران میں نسبتاً اس ملک سے کم ہیں جہاں سے یہ تیار ہو کر آتی ہیں۔ حکومت نہ صرف عوامی فلاح و بہبود کے لئے پرائیویٹ تجارتی اور صنعتی اداروں کی دیکھ بھال کرتی ہے بلکہ ان میدانوں میں وہ خود بھی عملی اقدامات کرتی ہے بشرطیکہ اس میں عوام کا فائدہ ہو۔

ابھی اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہم صنعت، تجارت اور زراعت میں پرائیویٹ اداروں کو آگے بڑھنے کے بہت

سے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ میری رائے میں اقتصادی جمہوریت کی کامیابی اسی میں ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ تجارت اور صنعت میں گہری دلچسپی لیں اور زراعت میں اِسی اصول پر ذرا زیادہ جوش و خروش کے ساتھ سرگرمِ عمل ہوں۔ اِس کے متعلق تفصیل سے ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔ اِس وقت کمیونسٹ چین میں ہزاروں کسان اور کاشت کار جبر و تشدد کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ اپنے معاملات میں اس قدر مجبور ہیں کہ ازدواجی اور خانگی زندگی تک اُن کی اپنی نہیں ہے۔ ہم اپنے ملک میں اِس طرح کی سماجی زندگی کے حق میں نہیں ہیں۔ کاشت کاری کی اصطلاح میں اقتصادی جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ کاشت کے ذریعے آزاد انسانوں کے حقوق کی مرتّب اور منظّم طریقے سے خدمت کی جائے۔ زراعت کے میدان میں ہم نے ابھی تک پورے طور پر اقتصادی جمہوریت حاصل نہیں کی ہے۔ لیکن ہم بڑی تیزی سے اِس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض دوسرے ممالک کی طرح ہماری بھی منزل دُور نہیں ہے۔

اقتصادی ترقّی کے بارے میں میرا نظریہ دو بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ پہلا اصول یہ ہے کہ جیسے جیسے خوشحالی بڑھے اور آرام دہ چیزوں میں زیادتی ہو ویسے ہی یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم ہوتی چلی جائیں۔ دوسرا یہ کہ کسان، انجینیئر، منیجر، سائنس دان اور ہر وہ شخص جو پیداوار بڑھانے میں لگا ہو اُس کے انفرادی حقوق کی حفاظت کی جائے۔

میں ایسی سوسائٹی کو برداشت نہیں کر سکتا جس کے افراد جہل اور لاعلمی کی زندگی بسر کریں۔ مال و اناج کی پیداوار بھی کم کریں اور جہاں جس حالت میں ہیں اسی میں پڑے رہیں جبکہ ساری دنیا تیزی سے ترقّی کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے لیکن اِس سے بھی بدتر میری نظر میں وہ سوسائٹی ہے جو بہت سا سامان تو تیار کر سکتی ہے لیکن اُس کو بُری طرح دبا کر رکھا گیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ملک کی اکثریت میری اِس رائے سے اتفاق کرے گی۔ یہ تو ہم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ ہم کو اقتصادی طور پر آگے بڑھنا ہے لیکن چونکہ فردی آزادی کی روایت ہمارے ملک میں بہت پُرانی چلی آ رہی ہے اِس لئے ہم شخصی آزادی کو اقتصادی ترقّی پر ہرگز قربان نہ ہونے دیں گے اور کسی دباؤ کے تحت کام نہ کریں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح ہم اقتصادی ترقّی کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلا قدم ہمیں اِس راہ میں یہ اٹھانا ہے کہ ہم اچھّی طرح سوچ سمجھ کر اس کا خاکہ تیار کر لیں کیونکہ اس کے بغیر اقتصادی دنیا میں آگے بڑھنا بہت مشکل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی بہت سی افسوسناک مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے ملکوں نے بڑے بڑے کارخانے تو قائم کر لئے لیکن ان کو چلانے کے لئے بجلی کی طاقت اور خام مال کی طرف توجہ نہیں دی یا خام مال کو کارخانے تک پہنچانے اور تیار مال کو کارخانے سے باہر بھیجنے کے لئے سڑکوں اور ریلوں کے متعلق غور نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ملک وہ سامان تیار کرے جس کی بازار میں مانگ کم ہے اور باوجود کوشش کے وہ سامان نہ بنا سکے جس کی بہت زیادہ کھپت اور ضرورت ہے۔ کوئی بھی ملک بے اندازہ روپیہ صرف کر کے ایک بہت خوبصورت، جدید ترین قسم کی مشینیں لگا کر کارخانہ تو قائم کر سکتا ہے لیکن یہ کارخانہ تکنیکی ماہرین کے نہ ہونے کی وجہ سے بند بھی ہو سکتا ہے۔

میں ایک کم ترقی یافتہ ملک کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں جس نے دس لاکھ ڈالر سے زیادہ مالیت کی زمین صاف کرنے کی بھاری مشینیں تو خرید لیں لیکن اس کے لئے زائد پرزوں کے متعلق نہیں سوچا۔

کبھی کبھی مجھ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کسی کام کو شروع کرنے میں فردکی طاقت کو اور اتنے بڑے ترقی کے منصوبے کو کس طرح یکجا کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی پرائیویٹ کمپنی اصلی ریشم سے کپڑا بننے کا کارخانہ لگانا چاہتی ہے اور اُس نے اپنے پاس سے ہی سرمایہ لگانے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسی صورت میں میری حکومت کو اُس کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نقلی ریشم کے بازار میں آجانے سے اصلی ریشم کی مانگ کم ہو گئی ہے۔ کیونکہ اب اصلی ریشم کے کپڑے کا شمار تعیش کی چیزوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کو اصلی ریشم کے کپڑوں سے زیادہ قند اور دوسری اشیاء کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں اصلی ریشم کا کارخانہ چلانے کے لئے حکومت سے کوئی مدد چاہے بھی تو اُس کو ہمّت افزا جواب نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ ہم انہی کارخانوں کی مدد کرتے ہیں جن کے تیار کئے ہوئے مال کی بازار میں سب سے زیادہ اور فوری ضرورت ہوتی ہے۔ ہم پرائیویٹ سرمایہ داروں کی اسی وجہ سے مدد کر رہے ہیں تاکہ وہ ملک کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے فائدے کو بھی پیش نظر رکھ سکیں۔

میں پہلے سات سالہ ترقیاتی منصوبے کے شروع کرنے اور سیاسی حالات کی خرابی کی وجہ سے ناکام ہونے کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ اس بات کا بھی اوپر ذکر آچکا ہے کہ دوسرا سات سالہ منصوبہ کن حالات میں شروع ہوا اور کس کامیابی کے ساتھ اُس کی تکمیل ہوئی۔ پچھلی فصلوں میں جتنے بھی منصوبوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی تکمیل دوسرے سات سالہ منصوبے کے تحت ہوئی ہے۔ اگرچہ ہم نے بہت سے کام کر لئے ہیں لیکن میں اُن سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوں کیونکہ ہم کو ابھی اپنے کام کرنے کے طریقوں کی اور اصلاح کرنی ہے تاکہ کم وقت میں زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

اقتصادی ترقی کے نقشے اور خاکے تیار کرنے کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ زیادہ بہتر عملے کو کام پر لگائیں تاکہ باہمی تعاون سے منصوبوں پر اچھی طرح کام جاری ہو سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت میں نے ۱۹۵۵ء میں اعلیٰ اقتصادی کونسل قائم کی جس کا درجہ اس میدان میں سب سے بلند ہے اور اس کا فیصلہ قطعی ہوتا ہے۔ اس کونسل کا چیرمین وزیر اعظم ہے اور دوسرے وزراء جن کا تعلق براہِ راست اقتصادی ترقی سے ہے۔ وہ اور منصوبہ بندی کے محکمے کا افسر اعلیٰ اور قومی بنک کا گورنر اس کے ممبر ہیں۔ کونسل کا پورا عملہ انتظامیہ سکریٹری کے تحت کام کرتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اُس کا عہدہ بڑھا کر نائب وزیر اعظم کے برابر کر دیا گیا ہے۔ کونسل اکثر عملی اقدامات کے فیصلے میری موجودگی میں کرتی ہے۔ یہ کونسل اقتصادی منصوبوں پر نظر ثانی کر کے جن وزارتوں سے متعلقہ یہ منصوبے ہوتے ہیں اُن کو بھیج دیتی ہے اور یہ نگرانی کرتی رہتی ہے کہ آیا منصوبوں پر کام تسلی بخش طریقے سے ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس کونسل نے ترقی کے پروگراموں میں تیزی کے علاوہ منصوبوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے بھی بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کے ساتھ ہم نے دفترِ اقتصادیات بھی قائم کیا ہے۔ اس دفتر کے عملے میں ایرانی اور غیر ملکی ماہرین شامل ہیں۔ اِس عملے نے دوسرے سات سالہ منصوبے کو بہتر طریقے پر چلانے کے لئے اقتصادی پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کے علاوہ تیسرے منصوبے کی بھی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔

اگرچہ ہمارے دوسرے سات سالہ منصوبے کے بہت سے اچھے پہلو بھی ہیں لیکن ابھی اس میں ایک بنیادی نقص رہ گیا ہے جس کی اصلاح کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور وہ ہے کام کا وقتِ مقررہ پر پورا ہونا۔ پہلے منصوبے کی طرح دوسرے منصوبے کے لئے جو تخمینہ تیار کیا گیا تھا اُس میں پورے منصوبے کو سامنے رکھ کر بڑے بڑے اخراجات کا اندازہ لگا لیا گیا تھا اور اُس کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا (جیسے زراعت اور اس سے متعلقہ دوسرے کام، سامان کی نقل و حرکت، صنعت و کان کنی اور سوشل سروس وغیرہ) اس تخمینے کی تیاری میں یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ سات سال کی مدّت میں کس قدر رقم ہر شعبے پر خرچ ہوگی لیکن پہلے اور دوسرے منصوبے میں کہیں اِس بات کی صراحت نہیں کی گئی تھی کہ کوئی خاص منصوبہ یا مجموعی طور پر چند منصوبے کتنی مدّت میں ختم ہوں گے۔

ہم جبکہ ترقیاتی منصوبے کے نقشے اور خاکے تیار کر رہے تھے اس وقت اگر کام ختم کرنے کی مدّت متعیّن نہ کر سکے تو یہ غلطی قابلِ معافی ہے مگر اب چونکہ منصوبوں پر کام عملی طور پر شروع ہو چکا ہے اور تیزی سے آگے بھی بڑھ رہا ہے اِس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اِس منصوبے کے لئے اور آیندہ منصوبوں کے لئے بھی کام کے ختم ہونے کی مدّت مقرّر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اِس کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ جو لوگ جمہوری نظریات کے عادی ہیں اُن کو سمجھانے کے لئے لمبے چوڑے حساب پیش کرنے یا منصوبے کی تفصیلات بیان کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ وہ باندھ جو آبپاری کے لئے یا ڈیزل انجن نقل و حرکت کے لئے تیار کیا گیا ہے دکھا دیا جائے۔ دوسری یہ کہ اگر آپ ایک معمولی سمجھ بوجھ کے آدمی سے مبہم الفاظ میں یہ کہنے کی بجائے کہ فلاں فلاحی کام پر اس قدر روپیہ خرچ ہوگا اگر یہ کہیں کہ ہم اس منصوبے کی تکمیل کریں گے اور اِس کے لئے اِس قدر مدّت درکار ہوگی تو وہ آپ کی بات سے یقیناً متاثر ہوگا۔ کیونکہ جو روپیہ عوام کی فلاح کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے وہ چوری چھپے چند لوگوں کی جیب میں بھی جا سکتا ہے یا ایسے منصوبوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے خاکے اچھی طرح تیار نہ کئے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِس روپے کو ایسے کاموں پر صرف کر دیا جائے جس کا فائدہ بہت دیر میں نکلے اور یا یہ رقم بالکل ہی ضائع ہو جائے۔ ایک عقل مند آدمی یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اُس کی رقم کس طرح خرچ کی گئی ہے اور کس طرح وصول ہوگی۔ تیسری وجہ جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ اگر کسی منصوبے کی تکمیل کا وقت مقرّر کر دیا جائے تو پوری قوم کی توجہ اُس طرف دلا کر اُس سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے اگرچہ وقت کی پابندی ہمارے مزاج کا خاصہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اقتصادی اور اجتماعی ترقیاتی پروگرام کے لئے جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے ہم کو وقت کا پابند ہونا ہی پڑے گا۔

میں اُس دن کا آرزومند ہوں جبکہ تمام سیاسی جماعتیں، حکومت کے شعبے، تعلیمی ادارے اور عام شہری اپنی ساری

توجہ کو ترقی کے کاموں پر مرکوز کر دیں۔ سیاسی جماعتوں کے رہنما جب عوام میں جلسے کریں تو اپنی تقریروں میں ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی پر زور دیں، سرکاری افسر و دیگر ملازمین ملک کی اقتصادی اور اجتماعی بہبود کے کاموں کو جلد از جلد پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور اس مقابلے میں نئے ریکارڈ قائم کریں۔ پڑھنے والے بچے اور بچیاں خواہ وہ ابتدائی درجے کے ہی کیوں نہ ہوں اُن منصوبوں کے متعلق واقفیت پیدا کریں جن کا ذکر میں نے پچھلی فصل میں کیا ہے اور یہ سیکھیں کہ کس طرح وہ اپنی تعلیم و تربیت کو اپنے ملک کے ترقیاتی کاموں پر لگا سکتے ہیں اور عام شہریوں میں سے ہر شخص خواہ اُس کا پیشہ اور کام کچھ بھی ہو یہ سوچے کہ ملک کی اقتصادی تعمیر میں حصہ لینا اس کا فرض ہے۔

جن لوگوں کو میری یہ آرزوئیں اور تمنائیں محض باتیں معلوم ہوتی ہیں اُن کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پچھلے چند سالوں کے مقابلے میں اب ہمیں ترقی کا شعور کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح وقت کی پابندی کا بھی ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ جتنے عرصے میں ہمارے منصوبے پورے ہونے چاہئیں اگرچہ وقت اس سے زیادہ ہی صرف ہو رہا ہے لیکن بطور مجموعی ہماری ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ مغربی ممالک کے اقتصادی ماہرین اور انجینیئروں کو بھی تعجب ہے۔ تہران میں پوری سڑک کو صرف ایک رات میں پکا بنایا جا سکتا ہے۔ نقشوں کی تیاری اور ابتدائی مراحل سے گذرنے کے بعد ہمارے ملک کے سب سے بڑے یتیم خانے کا افتتاح گیارہ ماہ سے کم مدت میں ہو گیا تھا۔ اِس میں دو ہزار بچوں کے لئے کمروں کے علاوہ وہاں کام کرنے والے عملے کے لئے رہائشی مکان بھی تیار کئے گئے تھے۔ ایران کے پایۂ تخت کی آبادی کبھی پانچ لاکھ تھی جو پندرہ سال سے بھی کم مدت میں بڑھ کر پندرہ لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ آبادی اِس تیزی سے بڑھ رہی ہو تو کام بھی تیزی سے کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا اور خوش قسمتی سے ترقی کی یہی رفتار ملک کے دوسرے صوبوں اور شہروں میں بھی نظر آتی ہے۔

بعض اشتراکی ممالک میں یہ رواج ہے کہ وہاں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پیداوار بڑھانے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ ہم بھی اپنے ملک میں یہی کام کر سکتے ہیں لیکن اُس کا طریقہ دوسرا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جمہوریت کی حدود میں رہ کر مشکل مسائل کو ہم اپنی توجہ کا مرکز بنا کر یہ طے کر لیں کہ مقررہ وقت تک اِن مسائل کو حل کرنا ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ تقریروں، فلموں، ٹیلیویژن پروگراموں اور ریڈیو کے ذریعے لوگ اپنے ساتھیوں میں محنت اور جد و جہد کی روح پھونک دیں اور اس بات کے لئے تیار کریں کہ عوام اپنی ترقی کے لئے اسباب خود ہی پیدا کریں۔ میری خواہش ہے کہ ہم اپنی اُبھرتی ہوئی نسلوں کی طرف پوری توجہ دیں کیونکہ انہی سے ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں اور اِنہی پر ہم بحیثیت ایک قوم کے آیندہ فخر کر سکیں گے۔ ہم کو چاہیئے کہ اُن کے وطن پرستی، کھیل کود، ایک دوسرے سے مقابلے میں آگے بڑھ جانے اور مل جل کر کام کرنے کی لگن کے فطری جذبوں کو ایک مشترکہ مقصد کی طرف لگا دیں۔ ایسا کرنے سے ہم ان کو زیادہ اچھا شہری بنا سکیں گے اور جب وہ اچھے شہری بن جائیں گے تو اپنے وطن کو زیادہ بہتر اور خوشحال بنانے میں مدد دیں گے۔ اقتصادی ترقی اور

جمہوری ارتقار ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اِسی سچّی لگن اور جذبے کا نام اقتصادی جمہوریت ہے۔

اقتصادی جمہوریت کا ایک خاصّہ اور بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایرانی قوم میں فکر و نظر کے اعتبار سے اتنی پختگی آگئی ہے کہ وہ اس کو آسانی سے قبول کرلے۔ میری مُراد آزاد تجارتی یونینوں کے قیام سے ہے جن کا اشتراکی ممالک میں کوئی نام تک نہیں جانتا۔ یہ میرا یقین کامل ہے کہ اِس طرح کی یونینوں کا ہونا کسی بھی جمہوریت کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اِن یونینوں کا وجود اِس بات کا ضامن ہے کہ موجودہ صنعتی دنیا میں اقتصادی جمہوریت کی خوب نشوونما ہورہی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دَوران اور اُس کے بعد پورے ایران میں بہت سی یونینیں سستی ترکاری کی بیلوں کی طرح پھیل گئیں۔ لیکن کئی وجوہات کی بنا پر اُن کی سرگرمیاں ناقابلِ قبول تھیں کیونکہ ان میں سے اکثر یونینیں ایسی تھیں جن کی پشت پر تُوڈی پارٹی کا ہاتھ تھا۔ دوسری طرف ایرانی سرمایہ داران اور مالکان نے اِن پارٹیوں اور جمہوری رویّے کے ساتھ نہایت ہی رجعت پسندانہ سلوک کیا۔ انگلستان اور امریکہ میں جب تک مزدوروں کی یونینوں کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا اُن کے ساتھ نہایت ہی بُرا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ ایرانی سرمایہ داروں اور کارخانوں کے مالکوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر وہی رویّہ اختیار کیا۔ اِن مالکان نے مزدوروں کی درخواست پر ہمدردی سے غور و فکر کرنے، زیادہ اُجرت دینے اور دیگر سہولتیں مہیّا کرنے کی بجائے غنڈوں کو اپنے کارخانوں میں ملازم رکھ لیا تاکہ اُن کی وجہ سے مزدوروں پر اُن کا رعب رہے۔ اِن غنڈوں کو مزدوروں کی اُجرت سے زیادہ رقم دی جاتی تھی اور جو رقم مزدوروں کے جائز حقوق اور مانگوں پر خرچ کی جاسکتی تھی اُس کو اِن موذی اور خطرناک آدمیوں پر صرف کیا جاتا تھا۔

اُن دنوں ہمارے ملک کی مزدور یونینیں سیاسی جماعتوں جیسی تھیں۔ جن کی توجّہ اپنے اغراض و مقاصد کی بجائے لوگوں کی شخصیتوں پر رہتی تھی۔ کوئی بھی یونین کا لیڈر وقتی طور پر مقبولیت حاصل کرلیتا تھا اور ساری یونین اُسی کے گرد چکّر کاٹتی نظر آتی تھی۔ یہ لیڈر اگر بہت کمزور یا بہت زیادہ طاقتور ہوجاتا یا لوگ اس کی بے مقصد باتوں سے اُکتا جاتے تو اُس سے کنارہ کرنے لگتے اور کسی ایسے شخص کے پیچھے دوڑنے لگتے جس پر اُن کو پہلے شخص سے زیادہ اعتماد ہوتا۔ مضبوط اور ذمّہ دار یونینیں اِس طرح ہرگز نہیں پنپ سکتیں۔

ٹریڈ یونینوں کو بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے سیاسی جماعتوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ اُن کا صرف ایک ہی مقصد ہونا چاہیئے اور وہ یہ کہ کس طرح اپنے ساتھیوں کی اقتصادی حالت بہتر بنائیں۔ باقی کام سیاسی جماعتوں کے لئے چھوڑدیں کیونکہ سیاسی جماعتوں کا میدان کافی وسیع ہوتا ہے۔ اگر ٹریڈ یونین کے ممبر سیاسی جماعتوں میں حصّہ لیں گے تو ہوسکتا ہے کہ کچھ ممبر ایک جماعت میں دلچسپی لیں اور کچھ کسی دوسری جماعت میں اور نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاسی اختلاف کی بِنا پر یونین کمزور ہوکر رہ جائے گی۔

اِس میں شک نہیں کہ ایک ٹریڈ یونین اور سیاسی جماعت کے اندرونی انتظامی معاملات میں بہت سی چیزیں

میں، تہران میں کھیلوں کے کلب کا معاینہ کرتے ہوئے

اصفہانی کاریگر چاندی کے برتنوں پر نقش و نگار بنا رہے ہیں

تبریز میں قالین بافی
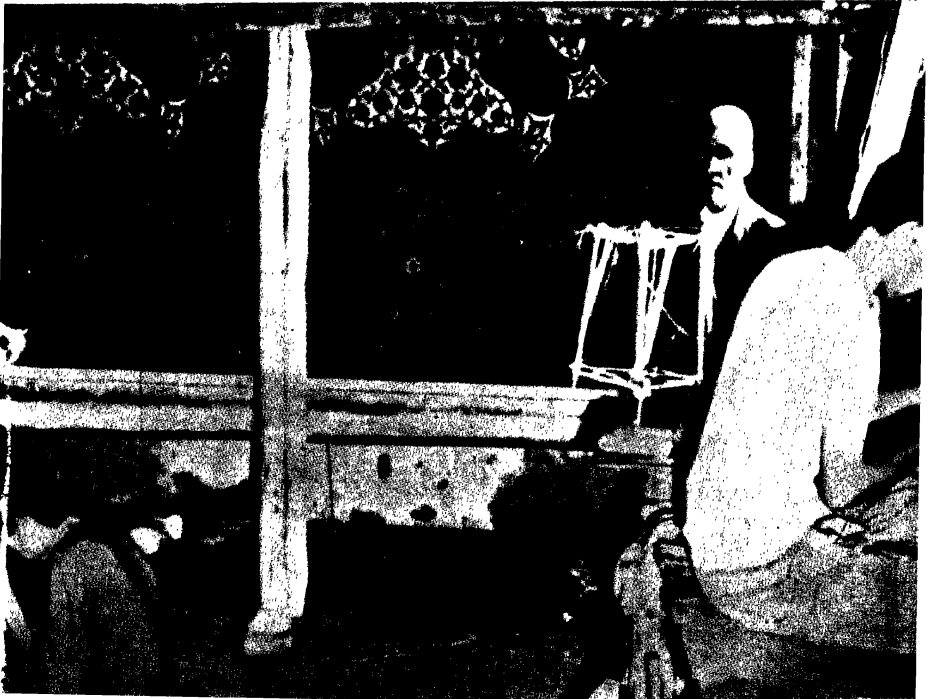
مشترک ہیں۔ دونوں کو چاہیئے کہ نہایت صاف اور واضح پروگرام بنائیں جس کو پارٹی کا ہر ممبر جانتا ہو۔ دونوں کے رہنما ایماندار اور قابلِ اطمینان ہوں اور اُن کا انتخاب جمہوریت کے اصولوں پر ہونا چاہیئے اور اپنے داخلی معاملات میں بھی پوری ذمّے داری سے انہی اصولوں پر کاربند رہیں۔

۱۹۵۸ء میں ہماری ایک جنوبی بندرگاہ پرگودی کے مزدوروں نے زیادہ اُجرت لینے کے لئے ہڑتال کردی جس میں اُن کو کامیابی ہوئی۔ لیکن ہڑتال کے دوران انہوں نے پورا پورا وطن پرستی کا ثبوت دیا اور کچھ بہت اہم فوجی سامان جو جہازوں میں لدا ہوا تھا بغیر کچھ طلب کئے اُتار دیا۔ اُن کی اُجرت کی شرح واقعی بہت کم تھی اور مجھے یہ کہتے ہوئے مسرّت ہوتی ہے کہ اُن کی اُجرت بڑھا دی گئی ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے متحد ہو کر ایک عملی قدم اُٹھایا تھا۔ اگرچہ ایران کی ٹریڈ یونین ابھی ابتدائی مراحل میں ہے لیکن جس واقعہ کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے آیندہ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

اب میں قارئین کی توجہ اجتماعی جمہوریت کی طرف مبذول کروں گا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب میں سوئٹزرلینڈ سے واپس اپنے وطن آیا تو یہاں غریبوں کی افسوسناک حالت دیکھ کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا باوجود ان تمام کوششوں کے جو میرے والد نے ملک کی ترقی کے لئے کی تھیں کچھ لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں تھا اور وہ واقعی بھوک سے مر رہے تھے۔ کچھ کی موت کا سبب یہ تھا کہ اُن کے سر پر چھت تک نہ تھی اور کچھ ایسے بھی بے نوا تھے جن کے پاس پہننے کو کپڑا نہ تھا۔

اِن دلخراش مناظر نے میری روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ملٹری کالج میں جو نصاب مجھے پڑھنا تھا اس میں اگرچہ فلاح عامّہ کا درس شامل نہ تھا۔ لیکن لوگوں کی افسوسناک حالت کی وجہ سے میں اکثر پریشان رہتا اور سوچا کرتا تھا کہ یہ پستی اور بدحالی انہی کے لئے مصیبت اور تباہی کا باعث نہیں بلکہ ملک کا مستقبل بھی اس سے تاریک ہے۔ جب میں یہ دیکھتا کہ کچھ خود غرض اور مفاد پرست لوگ اِس زبوں حالی پر رنجیدہ ہونے کی بجائے خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ حالت برقرار رہے تو مجھے اُن پر سخت غصّہ آنے لگتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تختِ سلطنت پر متمکن ہونے کے فوراً بعد میں نے جاڑے کے موسم میں شام کے وقت جبکہ سردی کافی پڑ رہی تھی پارلیمنٹ کے کچھ نمایندوں سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب وہ آگئے تو میں نے اُن سے نہایت صاف اور کھلے لفظوں میں کہا میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میں سے بعض لوگوں کی طرح چند آدمیوں کو دنیا بھر کے عیش و آرام میسّر ہوں، اُن کی دولت میں ہر روز اضافہ ہوتا رہے اور وہ خود کھا کھا کر پھولتے چلے جائیں اور اس کے مقابلے میں میری رعیّت میں سے ہزاروں لوگ دانے دانے کو ترسیں اور بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دیں۔ اگلے ہی دن سے انہی ممبران پارلیمنٹ میں سے چند نے یہ افواہ پھیلانی شروع کردی کہ میں کمیونسٹ ہو گیا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا اگر اسی کا نام کمیونزم ہے تو میں واقعی کمیونسٹ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو پارلیمنٹ کے نمایندے میرے کمیونسٹ ہونے کو ہوا دے رہے تھے وہ نہ صرف اپنے مفاد کے بارے میں بڑی دُور اندیشی سے کام لے رہے تھے بلکہ اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی اپنے

وطن کی فلاح و بہبود کا خیال تک نہ تھا۔

اب سے تقریباً پندرہ سال پہلے میں نے اجتماعی عدل وانصاف کے لئے پانچ نکاتی پروگرام پیش کیا تھا میرے نظریئے کے مطابق ہر ایرانی، مرد، عورت اور بچے کو کم از کم یہ پانچ چیزیں تو بہرحال ملنی ہی چاہئیں یعنی خوراک، پوشاک، مکان، تعلیم اور طبی سہولتیں۔ اگر کوئی شخص جائز طریقے پر اتنا کما لیتا ہے کہ اُس کی یہ پانچ بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کے بعد کچھ بچ رہتا ہے (ایسے بہت سے لوگ ہیں جو پس انداز کر لیتے ہیں) تو یہ اُس کا اپنا ہے اور کسی کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک آدمی کی آمدنی اتنی ہونی ہی چاہیئے کہ وہ اپنی اور اپنے کنبے کی یہ پانچوں ابتدائی ضرورتیں پوری کر سکے۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ ایسے بے کس اور بے نوا لوگ رہ جائیں جو یہ ضروریات نہ پوری کر سکیں تو حکومت یا خیراتی اداروں کو یا دونوں کو مل کر لوگوں کی مدد کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں۔

وہ لوگ جو ضرورت سے زیادہ مالدار اور خوشحال ہیں اور جن کے پاس عیش وعشرت کی ہر چیز فراواں ہے، جب مُنہ میں چاول لے کر یہ فرسودہ جملہ دہراتے ہیں کہ ایران کے لوگوں کی بدبختی اور فقر وفاقے کا سبب اُن کی اپنی سُستی اور کاہلی ہے تو مجھے سخت غصہ آتا ہے اُن کی یہ دلیل میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔ مثال کے طور پر کسی ایسے بچے کو لے لیجئے جو ایک ایسے گاؤں میں پیدا ہوا ہو اور پلا بڑھا ہو جہاں کوئی مدرسہ نہیں ہے اور بالکل میرے والد کی طرح اُس نے کسی نہ کسی طرح فارسی لکھنی اور پڑھنی سیکھ لی ہو اور اُس کے بعد وہ انگریزی بھی سیکھ گیا ہو، یہ اُس کی غیر معمولی قابلیت اور استعداد کی دلیل ہے جو شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ایران میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو بڑے محنتی اور جفاکش ہیں سُستی اور کاہلی کسی عام ایرانی کے گھر میں نہ ملے گی بلکہ ان دولتمندوں کے گھروں میں نظر آئے گی جو کبھی کچھ کام نہیں کرتے۔ میں اپنے ذاتی سرمائے کو خیراتی کاموں پر صرف کرنے کے لئے کبھی دریغ نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے ملک میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ اگر اُن کو تھوڑا سا بھی موقع دیا جائے تو ہمیشہ اپنی مدد خود کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

ایران کی آبادی کا بڑا حصہ گاؤں اور دیہاتوں میں آباد ہے۔ ہر اعتبار سے اچھے سے اچھے آدمی یہیں ملیں گے لیکن آمدنی کے اعتبار سے پورے ملک میں سب سے پیچھے یہیں کے لوگ ہیں۔ اگلی فصل میں میں تفصیل سے بیان کروں گا کہ اُن کی حالت بہتر بنانے کے لئے ہم نے کیا اقدامات کئے ہیں اور گیارہویں فصل میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس ملک کے لوگوں کے لئے خواہ وہ امیر ہوں یا غریب تعلیم دلانے کے لئے کیا انتظامات کئے گئے ہیں۔ یہاں میں صرف ان چند باتوں کا ذکر کروں گا جو ہم اجتماعی جمہوریت لانے کے لئے کر رہے ہیں۔

شاید کوئی یہ یقین نہ کرے گا کہ میرے والد کے عہد سے قبل ایران میں سوائے چند امیر آدمیوں کے چیچک وغیرہ کے ٹیکے کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ میرے والد پہلے شخص تھے جنہوں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ٹیکے لگوانے کا کام شروع کیا لیکن باوجود تمام کوششوں کے اُن کو لوگوں کی جانیں بچانے میں سو فی صدی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۵ء

سے ۱۹۵۸ء تک وزارتِ صحت نے تقریباً اسّی لاکھ لوگوں کے چیچک کے ٹیکے لگائے اور اسی مدّت میں اِسی وزارت نے ملیریا کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے ایک کروڑ سے زیادہ مکانوں میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ چھڑکی۔ افیون چونکہ خشخاش سے تیّار کی جاتی ہے اِس لئے خشخاش کی کاشت کو روکنے کے لئے ہم نے سخت اقدامات کئے اور جو لوگ افیون کے استعمال کے عادی تھے اُن کے علاج کے لئے مراکز قائم کئے۔ پچاس ہزار سے زیادہ ایسے مریضوں کا معائنہ کیا گیا جن کی آنکھوں میں رو ہے پڑ چکے تھے اور ان میں سے اُنّیس ہزار کا باقاعدہ علاج کیا گیا۔ تین لاکھ ستّر ہزار ایسے اشخاص کے جسم کی جانچ کی گئی جن کے متعلق شک تھا کہ وہ پوشیدہ امراض میں مبتلا ہیں اور تقریباً بیس ہزار آدمی علاج کے بعد صحت یاب ہوئے۔ کئی شہروں اور قصبوں میں نئے ہسپتال کھولے گئے اور کچھ نئے شفا خانوں، زچہ خانوں، یتیم خانوں اور دِق کے مریضوں کے واسطے سینی ٹوریم کی عمارتوں کی تعمیر کا کام آگے بڑھا۔

ایران میں بہت سی بیماریاں اس لئے بھی پیدا ہوتی ہیں کہ لوگوں کو پینے کا پانی صاف نہیں ملتا اس لئے آب رسانی کے نئے طریقوں کو اپنانا نہایت ضروری تھا۔ جن دیہاتوں میں لوگ ہزاروں سال سے پہاڑی ندی نالوں اور کم گہرے کنوؤں کا پانی استعمال کر رہے ہوں اور شہروں میں سڑک کے کنارے کھُلی نالیوں اور نہروں کے ذریعے گھر گھر پینے اور استعمال کرنے کا پانی پہنچایا جاتا ہو وہاں آب رسانی کے طریقے بدلنا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اب ہمارے سب ہی بڑے بڑے شہروں میں پانی نل کے ذریعے گھروں میں پہنچایا جاتا ہے اور چھوٹے شہروں میں بھی ہم جلدی ہی یہ طریقہ شروع کرنے والے ہیں۔

اِس وقت وزارتِ داخلہ کئی یتیم خانے اور خیراتی ادارے چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ یتیم خانوں اور غریب خاندانوں کو بھی مالی مدد دے رہی ہے۔ پولیس کا محکمہ جو اسی وزارت کے تحت ہے قیدیوں کی اصلاح کے لئے کئی تربیتی اسکول چلا رہا ہے۔ اِس محکمے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قیدیوں کو اور خاص طور پر اُن کو جن کی عمر ابھی کم ہے اچھا شہری بنا سکے۔ اِس محکمے نے آبادکاری اور ترقیاتی منصوبہ بھی مکمّل کیا ہے جس کا ذکر آیندہ فصل میں آئے گا۔ وزارتِ داخلہ نے تہران کے قریب کرج نامی قصبے میں ایک مرکز بھی قائم کیا ہے جہاں گداگروں اور فقیروں کو رکھا جاتا ہے اور اُن کو کوئی نہ کوئی ہنر سکھایا جاتا ہے جیسے بڑھئی کا کام، کپڑے کی بُنائی یا چاندی کے برتن اور زیورات بنانے کا کام وغیرہ، کام سکھانے کے دَوران اُن کو مزدوری بھی دی جاتی ہے اور جب کام سیکھ جاتے ہیں تو اُن کی مالی مدد بھی کی جاتی ہے تاکہ اپنی دوکان کھول سکیں۔ اِس مرکز میں کئی ایسے واقعات دیکھنے میں آئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن نکمّے اور بیکار خوشامدی ٹٹوؤں کو جن کو کچھ نہیں آتا مفید اور خوددار شہری بنایا جا سکتا ہے اور یہ لوگ اِس قابل بن سکتے ہیں کہ ملک کی ترقّی میں عملی طور پر حصّہ لیں۔ جن لوگوں کو اجتماعی زندگی سے دل چسپی ہے اُن کی تحقیق اور مطالعے کے لئے یہ جگہ نہایت مناسب رہے گی کیونکہ وہ لوگ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں انسانیت اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کے لئے کیا گر سکھائے جاتے ہیں۔

وزارتِ کار کارخانوں اور فیکٹریوں میں مزدوروں کی حالت اور کام کی شرائط کے قوانین کی سختی اور پابندی سے نگرانی کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اِس بات کا بھی خیال رکھتی ہے کہ عورتوں اور بچّوں کو خاص رعایتیں دی جائیں۔ یہی وزارت ٹریڈیونین بنانے میں مزدوروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے اور اُن کے لئے تفریحی مراکز قائم کرتی ہے۔ اِنہی مراکز میں سے ایک مرکز اصفہان میں ہے جس کی عمارت بے حد خوبصورت ہے۔ کھیل کود کے سامان کے علاوہ یہاں ایک بہت عمدہ لائبریری اور بہت بڑا ہال بھی ہے جہاں اکثر تقریریں ہوتی ہیں اور فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ وزارت کار نے اپنے محکمے میں ایک اجتماعی بیمے کی شاخ بھی کھول رکھی ہے اگر کسی مزدور کا ذریعۂ آمدنی بڑھاپے، صحت کی خرابی، فیکٹری میں کسی حادثے کی وجہ سے زخمی ہو جانے سے بند ہو جائے تو یہ بیمہ کمپنی مدد کرتی ہے اور اگر کوئی مزدور قبل از وقت مر جائے تو کمپنی کا فرض ہے کہ پس ماندگان کی مدد کرے۔ وزارتِ عدل و انصاف عورتوں اور بچّوں کی کئی طرح خدمت کرتی ہے۔ طلاق کے واقعات روکنے، اجتماعی انصاف برقرار رکھنے، ظلم وستم کے اسباب کو ختم کرنے اور بچّوں میں جرائم کی عادت پیدا نہ ہونے کا خاص خیال رکھتی ہے۔ وزارتِ تعلیم کے تعاون سے وزارتِ خوراک پورے ملک میں بچّوں کے لئے اِسکولوں میں دوپہر کا کھانا مہیّا کرتی ہے۔

اُوپر کی چند مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی معیار کو برقرار رکھنے کے لئے حکومت کیا اقدامات کرنا چاہتی ہے۔ مجھے اور میرے خاندان کے تمام افراد کو ان مسائل سے جن کا تعلق اجتماعی فلاح وبہبود سے ہے گہری دل چسپی ہے۔ اِس دل چسپی کے اظہار کے لئے ہم نے پانچ انجمنیں قائم کی ہیں جو براہِ راست تاج شاہی کی نگرانی میں چل رہی ہیں اور ان کے اخراجات پورے کرنے کے لئے حکومت اور عام شہریوں کے علاوہ شاہی خزانے سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ ان انجمنوں کے نام یہ ہیں: سُرخ شیر اور خورشید (یہ سوسائٹی دوسرے ممالک کے ریڈ کراس سوسائٹی کی طرح ہے) شاہی جماعتِ خدّامِ خلق۔ انجمن حمایتِ مادران و بچگان۔ بنیادِ پہلوی۔ خیراتی اداروں کی شاہی تعاونی کونسل۔ ایران کی ملکہ میری نمایندہ ہونے کی حیثیت سے ان تمام انجمنوں اور اداروں کی سرپرستی کرتی ہیں اور میری بہنیں شہزادی شمس اور شہزادی اشرف اپنا بہت سا وقت ان اجتماعی فلاح کے کاموں میں صرف کرتی ہیں۔

میں ان انجمنوں کی سرگرمیاں یہاں تفصیل سے بیان نہ کروں گا۔ کیونکہ ان کے بارے میں جو کچھ کہوں گا وہ خود ستائی ہوگی۔ میں نے اِن انجمنوں کو یہ ہدایت دے رکھی ہے کہ پوری لگن سے اپنے فرائض کو انجام دیں اور ہر طرح کی شہرت اور خود نمائی سے پرہیز کریں۔ سب ایرانی اچھّی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے قومی جھنڈے کا علامتی نشان سورج اور سنہری شیر ہے جس نے اپنے اگلے پنجے میں تلوار اٹھا رکھی ہے۔ لیکن یہی سورج اور شیر جس کو سُرخ رنگ دے دیا گیا ہے ہمارے ریڈ کراس سوسائٹی کے جھنڈے کا علامتی نشان بھی ہے اور ہماری ریڈ کراس سوسائٹی کا نام بھی یہی ہے (انجمنِ شیرِ سُرخ و خورشید) یہ انجمن شہزادی شمس پہلوی کی سرپرستی میں چل رہی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ایران میں کئی بار نہایت ہی تباہ کُن زلزلے آئے۔

جس نے ہزاروں گاؤں کو برباد کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ زلزلوں کی وجہ سے اُجڑنے والے مصیبت زدگان کی مدد میں ہماری انجمن شیر و خورشید سرخ نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں اور بڑا نام کمایا۔ اس انجمن کے علاوہ اندرون ملک اور بیرونی ممالک کی بھی خیراتی انجمنوں نے وہ بیش قیمت کام کئے ہیں جو شاید اب سے تیس سال قبل ممکن نہ تھے کیونکہ اس وقت ہمارے وسائل آمد و رفت بالکل ہی ناکارہ اور پُرانے ڈھنگ کے تھے اور فلاحی کاموں کے لئے کوئی ادارہ یا انجمن بھی نہ تھی۔ سیلاب آنے یا آگ لگ جانے پر امدادی کام کرنے کے علاوہ یہ انجمن نرسوں کو تربیت بھی دیتی ہے اور جگہ جگہ ہسپتالیں اور شفاخانے بھی چلاتی ہے۔ اس وقت اس انجمن کے تحت مختلف صوبوں میں سو سے زائد اور تہران میں تیرہ شفاخانے اور ایک ہسپتال چل رہا ہے۔ اِن میں سے ایک شفاخانہ تپِ دق کے مریضوں کے لئے ہے اور دوسرا کینسر کے علاج کے لئے۔

۱۹۵۸ء میں مَیں نے بنیادِ پہلوی نامی ایک غیر منفعی انجمن اس لئے قائم کی کہ وہ ان اجتماعی خدمت گذار جماعتوں سے تعاون کرے جن کے کاموں سے مجھے گہری دلچسپی تھی۔ درحقیقت یہ انجمن اس ادارے کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کا نام کبھی پہلوی اسٹیٹ تھا۔ اِس انجمن کی آمدنی کا ذریعہ وہ سرمایہ ہے جو کچھ ہوٹلوں (جن میں سے زیادہ تر میرے والد نے بنوائے تھے) سیمنٹ کی فیکٹریوں، قندسازی کے کارخانوں، ایرانی بیمہ کمپنیوں، بینکوں، تجارتی جہاز کمپنیوں، تجارتی اور صنعتی اداروں میں حصص کی صورت میں لگا ہوا ہے یا سُود کی شکل میں اِس کو ملتا ہے۔ اِس انجمن کے اجتماعی فلاح کے سب سے زیادہ نمایاں کاموں میں سے وہ پُل ہے جو حال ہی میں خرّم شہر اور آبادان کے درمیان تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کا افتتاح میں نے ۱۹۶۰ء میں کیا تھا۔ اگرچہ آبادان اور خرّم شہر دریائے کارون کے کناروں پر ایک دوسرے کے سامنے واقع ہیں لیکن ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لئے لاریوں اور موٹر کاروں کو ایک سو پچاس میل کا چکر کاٹ کر شہر اہواز کے قریب سے دریا کو پار کرنا پڑتا تھا۔ اِس پُل کی تعمیر کا خرچ اُس طریقے سے جو امریکہ میں معمول ہے یعنی پُل پر سے گذرنے والی لاریوں اور گاڑیوں سے ٹیکس لے کر پورا کیا جائے گا۔

اِن ذرائع سے بنیادِ پہلوی کو جو آمدنی ہوتی ہے وہ پوری کی پوری خیراتی کاموں پر خرچ کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ ایک خیراتی ادارے کو صنعتی اور تجارتی کاموں سے کیا نسبت۔ اور یہ سوال کرتے ہیں کہ بنیادِ پہلوی ہوٹلوں کو چلانے کی بجائے فروخت کیوں نہیں کر دیتی؟ کیوں تجارتی جہاز رانی کی کمپنیوں کو ترقی دے رہی ہے اور کس وجہ سے سیمنٹ اور قندسازی کے کارخانوں میں اپنا سرمایہ لگا رہی ہے؟

اِس طرح کے سوالوں کے دو جواب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ چونکہ اب میں اپنی زمینیں تیزی سے لوگوں میں تقسیم کر رہا ہوں اِس لئے اِس انجمن کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے نئے ذرائع چاہئیں۔ اگلی فصل میں میں تفصیل سے تقسیم اراضی کے بارے میں ذکر کروں گا۔ یہاں میں صرف اتنا ہی کہوں گا جیسے ہی ایک کسان کو شاہی زمین کا قطعہ ملتا ہے تو بنیادِ پہلوی کی کرائے کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ کسی مستحق کسان کو زمین دے کر جتنا سکون اور اطمینان مجھے نصیب ہوتا ہے اتنا کسی

اور چیز سے نہیں ملتا۔ اِس کے علاوہ میں نہیں چاہتا کہ روپے کی کمی کا اثر دوسرے فلاحی کاموں پر پڑے اور بہت سے یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبا تعلیم کو پورا کرنے سے محروم رہ جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ انجمن دوسرے ذرائع سے اپنی آمدنی بڑھائے اور اس قدر آگے بڑھے کہ امریکہ کی راک فیلر اور فورڈ فاؤنڈیشن اور انگلستان کی نافلیڈ فاؤنڈیشن کا مقابلہ کر سکے۔

دوسرے یہ کہ بنیاد پہلوی محض خیراتی کاموں کے لئے اپنی آمدنی بڑھانے کی خاطر اقتصادی اور صنعتی کاموں میں دخل نہیں دیتی بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ فلاحی اور ترقیاتی منصوبوں میں اپنا پیسہ لگا کر دوسرے سرمایہ داروں کو اس بات کی طرف راغب کرے کہ وہ بھی اپنا سرمایہ ایسے کاموں میں لگائیں، چنانچہ عصرِ حاضر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ بنیاد پہلوی کے تجارتی جہاز جن پر ایران کا پرچم لہراتا نظر آتا ہے سمندروں میں چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ پورے ملک میں سیمنٹ کے کتنے ہی کارخانے ہیں لیکن جو کارخانے اِس انجمن کے ہیں وہ اپنے حسنِ انتظام و کارکردگی کے علاوہ جدید ترین سازوسامان سے آراستہ ہونے کی وجہ سے دوسرے کارخانوں کے لئے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ انجمن ہوٹل محض اِس غرض سے چلا رہی ہے کہ دوسرے ممالک سے سیّاح زیادہ سے زیادہ ہمارے ملک میں سیر و تفریح کی غرض سے آئیں۔

تہران میں کم آمدنی والے لوگوں کی رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مکانوں کی نمائش کی گئی تھی۔ جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ کم آمدنی والے لوگوں کے لئے زیادہ تعداد میں مکان کس طرح بن سکتے ہیں۔ بنیاد پہلوی نے اس نمائش سے فائدہ اٹھایا اور شہر کے نواح میں نسو مکان اِن لوگوں کی سکونت کے لئے تعمیر کئے۔ شہر کے اُن حصّوں میں جہاں زیادہ تر غریب لوگ آباد ہیں اِس انجمن نے ایسے کئی ریسٹوران کھولے ہیں جہاں کھانے پینے کا سامان سستا ملتا ہے۔ جاڑے کے موسم میں جبکہ مزدوروں کو کام بہت کم ملتا ہے یہاں کم قیمت پر کھانا دیا جاتا ہے اور ایک آدمی ستّر پیسے میں اپنا پیٹ بھر سکتا ہے۔

ملکہ فرح کی خیراتی انجمن کئی یتیم خانے اور بچّوں کی پرورش گاہیں چلا رہی ہے۔ جو لوگ بے اولاد ہیں وہ اس انجمن سے یتیم بچّوں کو گود لے سکتے ہیں۔ یہ انجمن غریب اور نادار کنبوں کی بھی مالی مدد کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک اِس انجمن کے تحت پورے ملک میں چالیس یتیم خانے تھے جن میں سے کچھ پورے طور پر بن چکے تھے اور کچھ زیرِ تعمیر تھے۔ اِن یتیم خانوں میں سَو سے لے کر دو ہزار تک یتیموں کے لئے رہائش کا انتظام ہے۔ وہ عملہ جو اِن یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے ہے اُن کے رہائشی مکان اِس سے الگ ہیں۔ یہاں بچّوں کو کھانا، کپڑا، مکان، طبّی امداد اور تعلیم مُفت دی جاتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ یہاں بچّوں کے ساتھ نہایت شفقت اور مہربانی کا سلوک کیا جاتا ہے جو ایک بچّے کی ذہنی نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہے۔

میری رائے میں وہ شادابی اور تندرستی جو اِن بچّوں کے چہروں پر نظر آتی ہے اِس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کی تربیت اور پرورش اچھّی طرح کی جا رہی ہے۔ جس وقت یہ بچّے یتیم خانوں سے نکلتے ہیں تو پورے طور پر صحت مند ہونے کے علاوہ اُن کے ہاتھ میں صنعت یا تجارت کا ہُنر بھی ہوتا ہے۔ کچھ نقد روپیہ بھی بچا لیتے ہیں۔ شہریت کے

احساس کے ساتھ ہی اُن کے دلوں میں یہ حوصلہ بھی ہوتا ہے کہ دنیا کے نشیب و فراز کا مقابلہ کر سکیں۔ بعض خیر اندیش ایرانیوں نے بھی یتیم خانوں کی تعمیر اور ضروری سامان فراہم کرنے میں دل کھول کر حصّہ لیا ہے اور امیّد ہے آیندہ بھی مدد کرتے رہیں گے۔ بعض نیک دل عورتیں بھی بڑی فراخدلی سے رضا کارانہ طور پر ان پرورش گاہوں کی خدمت کر رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں ان کی تعداد اور زیادہ ہوگی۔ بعض ایرانی اور غیر ملکی خاندانوں نے یتیم بچّوں کو گود بھی لیا ہے۔ اِن بچّوں کی ذہنی اور جسمانی پرورش جس عمدہ طریقے سے ہو رہی ہے اس پر میں فخر کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ وہ لوگ خواہ ایرانی ہوں یا غیر ملکی جو یہ چاہتے ہیں کہ ان میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے سے کہیں زیادہ بیدار ہو اپنا تھوڑا سا وقت اِن اداروں اور انجمنوں میں صرف کریں اور ان لوگوں سے ملاقات کریں جنہوں نے اِن بچّوں کی پرورش کی ذمّہ داری بڑی خندہ روئی سے لے رکھی ہے۔

میری ہر دم یہ کوشش رہتی ہے کہ جدید ترین دوائیاں بھی لوگوں کو کم قیمت پر ملتی رہیں۔ چنانچہ اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے بنیاد پہلوی اور شاہی انجمن خدمتِ خلق کو اس بات کے لئے آمادہ کیا ہے کہ دونوں مل کر تہران کے باہر دواسازی کا کارخانہ قائم کریں جس پر چالیس لاکھ ڈالر رقم صرف ہوگی۔ چونکہ دواسازی ایک تکنیکی کام ہے جس کے لئے مہارت اور تجربہ دونوں ضروری ہیں اس لئے یہ قرار پایا ہے کہ غیر ملکی دواسازی کی فرم دس سال تک اس کی نگرانی کرے گی جو اِس دوران ایرانی ماہرین کو دوائیں بنانے اور اس کارخانے کو چلانے کی تربیت بھی دے گی۔

میرے فرمان کے مطابق ۱۹۵۱ء سے ہر سال ایرانی طبّی معالجین اور محققین کی نشست اس مقصد کے تحت ہوتی ہے کہ یہ لوگ آپس میں تبادلۂ خیالات کر سکیں اور بیماریوں سے مقابلہ کرنے اور خاص طور پر عوام کی صحت کو بحال رکھنے کے لئے اپنے آپ کو منظم کر سکیں۔ اطبّا اور محققین کا سب سے پہلا اجلاس ۱۹۵۲ء میں شہر رامسر میں ہوا تھا جس کا افتتاح ایران کی ملکہ نے کیا تھا اور اب ہر سال اِسی شہر میں تمام ملک کے اطبّا اور اس میدان میں تحقیق کرنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اِن اجلاس کی سفارشات حکومت کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور حکومت ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرتی ہے۔ چنانچہ ایک اجلاس میں ان اطبّا نے فیصلہ کیا کہ شادی سے پہلے شوہر اپنا طبّی معائنہ کرائے اور تندرستی کا سرٹیفکیٹ کسی معالج سے حاصل کرے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اسکول جانے والے بچے اور اُن کے استاد تپ دق کے مریض تو نہیں ہیں اُن کی ایکس رے کے ذریعے جانچ کرائی جاتی ہے۔ سرکاری ملازمین (جن میں پڑھانے والے اُستاد بھی شامل ہیں) میں سے اگر کوئی شخص تپ دق میں مبتلا ہو جائے تو علاج کے دوران اُس کو پوری تنخواہ دی جاتی ہے۔ بنیاد پہلوی نے معالجین کی کانگریس کے لئے ایک مستقل سکرٹریٹ قائم کیا ہے۔ اِس کے علاوہ اطبّا کے اجلاس میں طبّی موضوع پر جو تقاریر ہوتی ہیں اُن کو بنیاد پہلوی چھپوا کر معالجوں میں مفت تقسیم کرتی ہے۔

ثقافتی ترقّی اور بین الاقوامی سطح پر بہتر تعلقات قائم کرنے کی غرض سے بنیاد پہلوی نے اشاعتی ادارہ قائم

کیا ہے جہاں مغرب اور مشرق کے بہت سے ادبی شاہکار ترجمہ ہو کر چھپ چکے ہیں۔ ان کتابوں کی قیمت نسبتاً اس لئے کم رکھی گئی ہے کہ لوگ آسانی سے خرید سکیں۔ بنیاد پہلوی ہر سال بہترین تصنیفات و تخلیقات اور ادبی، تاریخی اور سائنس کے تراجم پر مناسب انعامات بھی تقسیم کرتی ہے۔ زیادہ تعداد میں اچھی فلمیں دکھانے کے لئے بنیاد پہلوی نے فلم سازوں کو فلمیں تیار کرنے اور نئے سینما گھر تعمیر کرنے کے لئے مالی مدد بھی دی ہے۔ اِس انجمن نے سینما کے ٹکٹ کم کرنے کے علاوہ کم نرخوں پر مزدوروں اور معلّموں کو خاص فلم شو دکھانے کے بھی خاص انتظامات کئے ہیں۔ میں نے حکم دیا ہے کہ اِس کتاب کی فروخت سے جو آمدنی ہو وہ سب کی سب دار الشاعت و ترجمہ کی مدد کے لئے وقف کر دی جائے۔

بنیاد پہلوی سے شہناز یوتھ کلب بھی وابستہ ہے۔ یہ کلب ہر سال لڑکیوں کے واسطے گرمی کی چھٹیوں میں کیمپ اور لڑکوں کے لئے بوائے اسکاوٹ کیمپ اور دوسرے تفریحی مشغلوں کا انتظام کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اس انجمن نے پہلی بار بین الاقوامی سطح پر اسٹوڈنٹ کیمپ بحر خزر کے کنارے شہر رامسر کے قریب لگایا۔ جس میں تیرہ مشرق وسطیٰ اور دوسرے ممالک کے یونیورسٹی طلباء کے علاوہ امریکہ کے طالب علم بھی شریک تھے۔ اس سے اگلے سال تہران یونیورسٹی کے طلباء کو کیمپ لگانے کی سہولتیں اس انجمن نے فراہم کی تھیں۔ بنیاد پہلوی نے ایرانی اور غیر ممالک کے سیّاحوں کے لئے ایک بیورو بھی قائم کیا ہے تاکہ ہمارے ملک کے لوگ اور باہر سے آنے والے ہمارے قدیم تمدّن کو زیادہ بہتر سمجھ سکیں۔ اسی کے ساتھ اس انجمن نے دیہاتیوں کی زندگی کو بہتر بنانے اور اُن کو زراعتی آسانیاں دینے کے بھی اقدامات کئے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

مجھے امید ہے کہ وہ دن جلدی ہی آئے گا جب کہ بنیاد پہلوی کا خیراتی ادارے کی حیثیت سے دنیا بھر کے بڑے بڑے خیراتی اداروں میں شمار ہوگا۔ اگرچہ اس کا سرمایہ یورپ اور امریکہ کے خیراتی اداروں کے سرمائے سے کم ہے لیکن اس کی اصلاحی سرگرمیاں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ پانچ بڑی خیراتی انجمنوں میں سے ترتیب کے اعتبار سے تیسرے درجے پر شاہی انجمن خدمتِ خلق ہے۔ اِس انجمن نے نہ صرف صحتِ عامّہ کی بہتری کے لئے نمایاں کام کئے ہیں بلکہ اس معاملے میں حکومت کا ہاتھ بھی بٹایا ہے اور ساٹھ سے زیادہ ہسپتال اور شفاخانے قائم کئے ہیں جو ملک کے ہر صوبے میں ہیں، جہاں سے غریب اور ضرورت مند لوگوں کو مفت دوائیاں اور طبّی مدد ملتی ہے۔

جنوبی ایران میں اہواز کے قریب وزفول نامی شہر میں اس انجمن نے آنکھوں کی بیماری کے خلاف اپنی مہم شروع کی ہے۔ آنکھوں کا ہسپتال جو اس شہر میں قائم کیا گیا تھا اس میں پونے چار سال کی مدّت میں تقریباً دس لاکھ مریضوں کا علاج کیا گیا۔ اس ہسپتال کے کھلنے سے پہلے صرف وزفول میں پچانوے فی صدی لوگ رو ہے کے مرض میں مبتلا تھے اور پچیس فی صدی لوگ اس مرض میں اپنی بینائی کھو چکے تھے۔ پہلے دو سال گذرنے کے بعد نوّے فی صدی

طالب علم اور پینتس فی صدی عام شہری اِس مرض سے نجات پا چکے ہیں اور اُس وقت سے برابر مریضوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔

اِس انجمن نے اندھوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی پیش قدمی کی ہے اور تہران میں ایک اسکول کھولا ہے جہاں نابینا طالب علم اپنی نصاب کی کتابیں بریل طریقے سے، جو اندھوں کو پڑھانے کے لئے مخصوص ہے، چھاپتے ہیں۔ ان اندھوں نے گانے بجانے کی ٹولی بھی بنا رکھی ہے اور ایک نابینا لڑکا ہی ساز بجانے میں اُن کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ لڑکے مغرب اور مشرق کی مشکل سے مشکل دُھنوں پر ساز بجا سکتے ہیں۔

اِس انجمن کے ریڈیولوجی ڈیپارٹمنٹ نے گنجے پن کا علاج بھی بجلی کے ذریعے کیا ہے اور اب تک پینتس ہزار مریض اِس مرض سے نجات پا چکے ہیں۔ انگلستان میں گنجے پن کے علاج کے لئے ایک گولی تیار کی گئی ہے جو مریضوں کو کھلائی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں اِس گولی کی مدد سے ایران میں بھی تجربات کئے گئے جس کے نتائج تسلّی بخش نکلے۔

یہ انجمن اِس بات کی بھی کوشش کر رہی ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوائیاں کم قیمت پر ملیں چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کئی سال سے خود ہی دوائیاں تیار کر رہی ہے جو ہسپتالوں، شفاخانوں اور سند یافتہ دوافروشوں کے ذریعے مُفت تقسیم کرتی ہے۔ یہ انجمن نسبتاً کم قیمت پر اپنی دوائیں بازار میں بھی فروخت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بھاری تعداد میں غیر ممالک سے دوائیں منگا کر مفت یا کم قیمت پر مریضوں کو دیتی ہے۔ اس انجمن کا صدر دفتر تہران میں ہے جہاں سارا سال جدید ترین قسم کی دوائیاں تیار کی جاتی ہیں اور ریل، ہوائی جہاز اور لاریوں کے ذریعے ملک کے دور دراز گوشوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ اِس کام کے مسلسل چلتے رہنے سے مجھے بڑی مسرّت ہوتی ہے۔ دواسازی کا نیا کارخانہ قائم کرنے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ جس وقت یہ کارخانہ اپنا کام شروع کر دے گا تو دوائیاں اس کثرت سے ہوں گی کہ غریب و نادار لوگ بھی ان کو باآسانی خرید سکیں گے۔

اِس انجمن کے جتنے ہسپتال ہیں ان کے پاس سواری کا معقول انتظام ہے۔ جو مریض آمد و رفت کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اُن کو انجمن کی لاریاں گھر سے ہسپتال یا شفاخانے تک مفت پہنچاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مریض اور اپاہج لوگوں کے رشتہ داروں کو انجمن مالی مدد بھی دیتی ہے۔ غریب اور بے سہارا مریضوں کے گھر جا کر انجمن کے ڈاکٹر بغیر معاوضہ لئے علاج کرتے ہیں۔ غریب بچّوں کو طبّی مدد دیتے ہیں۔ انجمن نے اپنا پہلا نرسنگ اسکول بھی کھولا ہے جہاں تین سال کی تربیت کے بعد سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔

جو بچّے قالین بافی یا کپڑا بُننے کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ انجمن اُن کے حقُوق اور مزدوری کی شرائط کی نگرانی کر کے حکومت کی مدد کرتی ہے۔ اس انجمن نے ایک دستکاری مدرسہ بھی قائم کیا ہے جہاں بالغ و نابالغ فقیروں اور اپاہج لوگوں کو لوہے، لکڑی، چمڑے اور بجلی کے کام کے علاوہ پانی کے نل جوڑنے اور مشینوں کی مرمّت کرنے کا کام بھی سکھایا جاتا ہے۔ یہ انجمن غریب لوگوں میں اجتماعی خدمت کے کام بھی انجام دیتی ہے۔ ماؤں کو

کھانا، کپڑا اور مکان دیتی ہے۔ غریب طالب علموں کو وظیفے مہیّا کرتی ہے۔

اِس انجمن نے تہران یونیورسٹی میں ایک خوابگاہ کا بھی انتظام کیا ہے جہاں دوسرے صوبوں کے کم حیثیت کے طالب علم اپنی پڑھائی کے دوران قیام کرتے ہیں۔ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کر کے دوبارہ شریفانہ زندگی بسر کرنے کی بھی ترغیب دیتی ہے۔ جو لوگ افیون یا شراب کے عادی ہیں اُن کے لئے دار الصحت قائم کیا ہے۔ یہ انجمن شراب اور افیون استعمال کرنے والوں کی ہی مدد نہیں کرتی بلکہ اور بھی ہزاروں لوگوں کی خواہ وہ سرکاری ملازم ہوں یا غیر سرکاری ہر طرح سے مدد اور رہنمائی کرتی ہے۔ اس طرح یہ انجمن ریڈیو، فلموں اور کھیلوں کے ذریعے لوگوں میں اجتماعی فلاح کے جذبے کو اُبھارتی ہے۔

شہزادی اشرف خیراتی تنظیم بھی انجمنِ خدمتِ خلق سے وابستہ ہے۔ یہ تنظیم ایک دودھ تقسیم کرنے کا مرکز، ایک بچّوں کا دستکاری اسکول، ایک پرائمری اسکول، ایک سیکنڈری اسکول، ایک آرٹس اسکول، ایک کپڑا تیار کرنے کا کارخانہ اور ایک شفاخانہ چلاتی ہے۔ یہ تنظیم غریب بچّوں اور اُن ماؤں کی جو اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ نہیں پال سکتیں خاص طور پر مدد کرتی ہے۔ اس تنظیم سے وابستہ ایک اور تنظیم بھی ہے جس کا نام ایرانی قومی کمیٹی ہے جو یونیسف (بچّوں کا بین الاقوامی فنڈ) کی طرف سے قائم کی گئی ہے۔ یہ بچّوں میں دودھ، اسکولوں میں دوپہر کا کھانا اور عام لوگوں کی صحت کا خیال رکھتی ہے۔

اِس کے علاوہ انجمن خدمتِ خلق اور بھی کئی اجتماعی فلاح کے کام کرنے والے شعبوں کی مالی اور اخلاقی مدد کرتی ہے۔ یہ گونگوں، بہروں اور یتیم بچّوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ دِق، خللِ دماغ اور پوشیدہ بیماریوں کے مریضوں کا علاج کراتی ہے۔ جانوروں کو انسانوں کے بیرحمانہ سلوک سے بچاتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ بلند نظر اور حوصلہ مند ایرانی افراد اور اجتماعی انجمنیں جن کو شہریت کا احساس ہے اپنا وقت اور پیسہ ان خیراتی امور اور خدمتِ خلق کے لئے صرف کر رہے ہیں۔ اِن لوگوں کی یہ خدمات تمام ملک کے لئے اور اُن بہت سے سرمایہ داروں کے لئے بھی جن کو ابھی تک شہریت کا احساس نہیں، عوام کی حالت سُدھارنے کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ میں نے مشعلِ راہ اس لئے کہا ہے کہ اِن سرمایہ داروں نے نہ صرف جمہوریت کے حقائق کو بلکہ اپنی زندگی کی سچّی مسرّتوں کو بھی نظرانداز کر دیا ہے کیونکہ یہ لوگ بھول رہے ہیں کہ زندگی کی خوشی اور دل کا سکون اسی میں ہے کہ اپنے ساتھیوں کی اور خاص طور پر اُن کی جو زیادہ زبوں اور پریشان حال ہیں مدد کی جائے۔ اگر یہ غریب آدمی زندگی سے لطف اٹھائیں گے تو ان کو بھی روحانی اور حقیقی مسرّت حاصل ہوگی۔

چوتھی اہم اجتماعی خدمات کی تنظیم جو تاج شاہی سے وابستہ ہے وہ ماؤں اور بچّوں کے تحفّظ کی تنظیم ہے یہ انجمن حاملہ عورتوں کے لئے زچگی کی تمام سہولتیں مہیّا کرتی ہے۔ لاوارث بچّوں کے لئے یتیم خانے چلاتی ہے اور جو لوگ بے اولاد ہیں اُن کو بچّے گود دیتی ہے۔

جو انجمنیں اجتماعی فلاح کے کام کر رہی ہیں اُن کو چاہیئے کہ وہ اپنے طور پر تجربات کرتی رہیں اور اگر مختلف

انجمنوں میں صحت مندانہ مقابلہ ہوتا رہے تو میری رائے میں یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مقابلہ صرف تجارتی امور میں ہونا چاہیئے سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں اس کی گنجائش نہیں، تو میں اُن کی اِس بات سے متفق نہیں ہوں۔ اگر وہ تمام ادارے جو تاجِ شاہی سے وابستہ ہیں بچّوں کی پرورش اور خدمت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں تو اِس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے لیکن یہ خیال رہے کہ اِس مقابلے میں کوئی انجمن غریبوں، بے کسوں اور محتاجوں کی مدد کرنے میں دوسری انجمن کے لئے رُکاوٹ نہ بنے کیونکہ ہمارا بنیادی مقصد اپنے ہم وطن غریبوں، نادار بچّوں اور اپاہجوں کی مدد کرنا ہے۔ اِس طرح کا امدادی کام جس قدر زیادہ ہوگا ہمارا مقصد اتنا ہی واضح اور صاف ہوتا چلا جائے گا۔ فرض کیجیئے کہ آپ کے سامنے ایک ماں ہے جس کے بچّے کو نگہداشت کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اس ماں کو کسی جگہ علاج اور نگرانی کی سہولت مل سکے تو اُس کے دل کو کافی تقویت پہنچے گی کیونکہ اگر ایک جگہ اس سے ہمدردی کا سلوک نہ کیا جائے گا تو وہ دوسری جگہ جا کر مدد حاصل کر سکتی ہے۔

اب چونکہ خیراتی اداروں کی تعداد کافی ہو گئی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر ایک پانچویں تنظیم قائم کی گئی ہے جو تمام خیراتی اداروں میں باہمی تعاون برقرار رکھتی ہے۔ اِس تنظیم کی نشستیں ہر دو ہفتے کے بعد وزیرِ دربار کی زیرِ صدارت ہوتی ہیں۔ یہ تنظیم نہ صرف تاج شاہی کے تحت چلنے والے تمام اجتماعی فلاح کے اداروں کے درمیان باہمی رابطہ قائم رکھتی ہے بلکہ حکومت کے علاوہ اُن ایرانی اور غیر ایرانی جماعتوں کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھتی ہے جو دل کھول کر ہمارے فلاحی کاموں میں مدد دیتی ہیں (اِس کا تفصیل سے ذکر آگے آئے گا) اِس کے ساتھ ہی یہ تنظیم شاہی تاج کے تحت جو رقم جمع ہوتی ہے اُس کو مفید کاموں پر خرچ کرنے کے فیصلے کرتی ہے اور نئے فلاحی امور کے شروع کرنے کے لئے ہمدردی سے غور و فکر کرتی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس تنظیم نے تہران اسکول آف سوشل ورک کے نام سے ایک ڈگری کالج بھی قائم کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مستقبل میں یہ تنظیم خیر اندیش لوگوں کی اور خاص طور پر نوعمر خواتین کی توجّہ فلاحی کاموں کے لئے اپنی طرف جلب کرے گی۔

اس فصل میں میں نے حقیقی جمہوریت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میری نظر میں حقیقی جمہوریت کا مطلب و مفہوم بہت وسیع ہے۔ جمہوریت صرف مسلسل سرگرمِ عمل رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا فلسفہ بھی ہے اور اس پر چلنا کسی فرد یا قوم کے لئے آسان نہیں ہے۔ باوجود تمام دشواریوں اور پریشانیوں کے یہ بہترین راہ ہے جو انسان نے اپنے لئے نکالی ہے۔ اب جبکہ ہم نے اِس راہ پر چلنے کے لئے قدم اُٹھا ہی لیا ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس نکتے کو اپنا نصب العین بنا لیں کہ اِس راہ میں جو بھی مشکل اور دشواری آئے گی اُس کو ہنس کر برداشت کر لیں گے۔ اِس راہ پر ہم نے کافی فاصلہ طے کر لیا ہے اور اسی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے

ہم وطنوں نے اب حقیقی جمہوریت کا مطلب و مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا۔
بحیثیت ایک قوم کے ہم ایرانیوں کو چاہیئے کہ اِس مقصد کی طرف تیزی سے آگے بڑھیں۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی جمہوریت حاصل کرنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ہی ذہنی ترقی بھی ضروری ہے۔ انفرادی خواہشات کو اجتماعی ضروریات کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ حقیقی جمہوریت تک پہنچنے کے لئے اخلاق، اقدار اور احساسِ وفاداری پیدا کرنا افراد اور اجتماع دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اِس کے علاوہ لوگوں کو چاہیئے کہ آپس میں باہمی تعاون کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔
آزادانہ ماحول میں افراد اور اقوام کے لئے ترقی کی رفتار کی حدود مقرر ہیں۔ اگر ہم ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کے لئے جلد بازی سے کام لیں گے یا بے صبری سے دیوانوں کی سی حرکتیں کریں گے تو ہم کو اپنے ارادوں میں شکست ہوگی۔ اِس کے مقابلے میں اگر ہم پورے ذوق و شوق کے ساتھ صبر و حوصلے سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو یقیناً ہم کو کامیابی نصیب ہوگی۔ ہم اس وقت سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہماری مسلسل کوشش ہم کو منزل پر پہنچا دے گی۔

۹ ۔ کسانوں کی نئی اُمیدیں

میں اِس فصل کے شروع میں پوری توجہ اِس بات پر دوں گا اور یہ بتاؤں گا کہ ہمارے لئے کاشتکاری کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔ ہمارے دیہاتوں کے حسین قدرتی مناظر اور دیہاتیوں کے رسم ورواج کے متعلق غیر ملکی سیّاحوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اِن کتابوں کو پڑھنے سے اگرچہ پڑھنے والے کو بہت لطف آتا ہے، لیکن اُس کی توجہ اصل مسائل کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔

زراعت کی طرف سے غفلت برتنے میں غیر ملکی سیّاحوں سے زیادہ ہم خود موردِ الزام ہیں۔ پچھلے سالوں میں ہم زندگی کے تاریک پہلوؤں پر تو غور کرتے تھے اور جلسوں و تقریروں میں کسانوں کی افسوسناک و زبوں حالی پر گریہ وزاری بھی کرتے تھے لیکن کوئی شخص اگر یہ سوال کرتا کہ آخر اِس مسئلے کا حل کیا ہے تو ہماری زبانوں پر تالے لگ جاتے اور کوئی جواب بن نہ پڑتا اور اگر جواب دیتے بھی تو اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں ملا دیتے، جس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایرانیوں نے بحیثیت ایک قوم کے زراعت کی ترقی کے لئے بہت کم کسی منصوبے کے تحت تعمیری اور مفید کام کیا ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آج ایرانی قوم میں کاشت کاروں کی حالت کو سُدھارنے کے لئے بڑا جوش وخروش پایا جاتا ہے اِس فصل میں میں اپنے وہ مشاہدات اور تجربات پیش کروں گا جو میری رائے میں زراعت کو بہتر بنانے میں مفید ثابت ہوں گے۔

چونکہ ہمارا ملک تیل کے خزانوں سے مالامال ہے اِس لئے ایک عام آدمی سوچتا ہے کہ ایران میں جو کچھ ہے وہ تیل ہی ہے۔ لیکن یہ محض خیالِ خام ہے کیونکہ ہزاروں سالوں سے ہمارے ملک میں زراعت ہوتی آئی ہے اور اب بھی ہوتی ہے۔ اور آج بھی زراعت سے جو محصول ہم کو ملتا ہے وہ تیل کی آمدنی سے چار گنا ہے، ملک کی تین چوتھائی

آبادی کا گذارہ آج بھی زراعت پر ہی ہے۔ ریگستانی زمین کو چھوڑ کر ملک کے ہر قصبے اور گاؤں میں کھیتی ہوتی ہے اور ہمارے کسانوں کے پاس بڑے بڑے کھیت ہیں، بہت سے غیر ملکیوں کو یہ جان کر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں چھوٹے بڑے تقریباً پچاس ہزار گاؤں ہیں جن کی آبادی بیس آدمیوں سے لے کر تین سو تک ہے۔

کاشتکاری سے ہم کو اناج، سبزیاں اور پھل ہی نہیں ملتے بلکہ یہ ہمیں زندگی کی راہ بھی دکھاتی ہے۔ تیل کے ذخیروں اور معدنیات کے باوجود ہمارے ملک کی سب سے بڑی دولت ہمارے ملک کے لوگوں اور خاص طور پر دیہات میں بسنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ایرانی قوم کو بلند ہمت اور حوصلہ مند لوگ اس ملک کے دیہاتوں نے ہی دیئے ہیں اور ان کی زراعت اور رسم و رواج نے ملک کو ایک امتیازی حیثیت بخشی ہے۔

ایران جیسے ہی صنعتی میدان میں آگے بڑھے گا اور زندگی کے جدید ترین رہن سہن کے طریقوں کو اپنائے گا اس کو اچھے سے اچھے کاریگروں کی ضرورت پڑے گی جو اس کو زیادہ تر دیہاتوں سے ہی ملیں گے اور جو لوگ دیہاتوں میں رہ جائیں گے وہ اپنی فصلوں سے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ غیر ممالک میں اپنی پیداوار پہلے سے کہیں زیادہ بھیجیں گے، اسی طرح فوجی خدمات کے لئے بھی ہماری آنکھیں ان دیہاتوں میں بسنے والوں پر لگی ہوئی ہیں کیونکہ یہ لوگ سمجھدار ہونے کے ساتھ ہی چست اور پھرتیلے ہوتے ہیں اور ان میں قوتِ برداشت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

اتنے بڑے ملک میں صرف دس فی صدی زمین ایسی ہے جو زیر کاشت ہے، اگرچہ اور زمین بھی زراعت کے لائق بن سکتی ہے، جس کے متعلق میں آگے بیان کروں گا، چالیس فی صدی زمین پر چراگاہیں ہیں تقریباً پندرہ فی صدی حصے پر جنگل پھیلا ہوا ہے باقی پینتیس فی صدی زمین بنجر اور ناقابلِ کاشت ہے۔

اس کتاب کی پہلی فصل میں میں نے بتایا تھا کہ ہمارے ملک میں مختلف قسم کا اناج پیدا ہوتا ہے۔ ان اناجوں میں گیہوں، مکئی، جَو اور باجرہ تقریباً ہر جگہ ہوتا ہے۔ مقدار کے اعتبار سے گیہوں کی فصل بہت ضروری ہے کیونکہ یہی ایک ایسا اناج ہے جو زیادہ تر روٹی کی شکل میں امیر اور غریب سب ہی استعمال کرتے ہیں اور ہماری غذا کا بہت بڑا جز سمجھا جاتا ہے۔ حکومت ہر سال تقریباً سارا گیہوں کسانوں سے خرید کر سستے داموں پر نانبائیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتی ہے تاکہ یہ لوگ روٹی کم قیمت پر فروخت کریں اور وہ لوگ جن کی آمدنی کم ہے پیٹ بھر کر دو وقت کا کھانا کھا سکیں۔ اس وقت جتنا گیہوں ملک میں پیدا ہوتا ہے وہ ہماری ضرورت کو پورا کر دیتا ہے ہم اگر چاہیں تو گیہوں کی قیمت بڑھا کر اس کی پیداوار کو زیادہ بھی کر سکتے ہیں جو ہمارے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے یقیناً کافی ہوگا۔

ملک سے باہر بھیجنے اور جانوروں کو کھلانے کے لئے اکثر جگہوں پر جَو کثرت سے بویا جاتا ہے۔ ملک کے ان حصوں میں جہاں کی آب و ہوا خشک ہے اس کی بڑی قدر و قیمت ہے کیونکہ اس کی جڑیں پانی حاصل کرنے کے

لئے زمین میں زیادہ گہرائی تک چلی جاتی ہیں۔ بحرِ خزر کے نزدیک جتنے صوبے ہیں وہاں کی آب و ہوا چونکہ مرطوب ہے اس لئے وہاں ہم اپنے استعمال اور باہر بھیجنے کے لئے چاول کی کاشت کرتے ہیں۔

اب چونکہ ایران کا معیارِ زندگی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اونچا ہوگیا ہے اس لئے یہاں قند کی کھپت بھی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، اگرچہ ہم چقندر سے تقریباً ایک لاکھ ٹن سالانہ چینی تیار کرتے ہیں لیکن یہ ہماری ایک تہائی ضرورت کو پورا کرتی ہے باقی مقدار ہم کو باہر سے منگانا پڑتی ہے اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ چینی کی پیداوار کو بڑھائیں اور خوزستان میں جہاں کئی صدی سے گنّے کی کاشت بند ہو چکی ہے دوبارہ شروع کریں خوزستان میں جب گنّے کی پیداوار ہونے لگے گی تو ہم کو باہر سے چینی منگانے کی ضرورت نہ پڑے گی کیونکہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس علاقے میں اتنا گنّا پیدا ہو سکتا ہے جس سے تقریباً دس لاکھ ٹن چینی سالانہ تیار ہو سکے گی۔

بحرِ خزر کے پورے ساحل پر چائے کے باغ ہیں۔ لیکن جتنی چائے ہم کو یہاں سے ملتی ہے وہ پورے سال کی ایک تہائی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔ چائے کی پیداوار بڑھانا زیادہ مشکل کام نہیں ہے اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ پہلے سے زیادہ مقدار میں چائے ہم کو ملے۔ ہمارے ملک میں تمباکو بھی کثرت سے ہوتا ہے، اس کی کاشت زیادہ تر آذربائیجان میں اور ان وادیوں میں جو بحرِ خزر کے نزدیک ہیں ہوتی ہے۔ ہم اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد عموماً سگریٹ کی شکل میں تمباکو باہر بھی بھیجتے ہیں، روئی تقریباً ملک کے ہر حصّے میں ہوتی ہے اور اپنی ضرورت کو پورا کر کے ہم برآمد بھی کرتے ہیں۔

خشک اور تر میوے پورے ملک میں ہر جگہ کثرت سے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر سال ضرورت سے زیادہ اترتے ہیں اس لئے بڑی بھاری مقدار میں باہر بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ہم زیادہ تر کشمش، بادام اور پستہ برآمد کرتے ہیں۔ خشک میوں کے علاوہ کتیرا بھی باہر بھیجتے ہیں جو مختلف دوائیاں بنانے کے کام آتا ہے۔

ایران کی اقتصادی زندگی میں مویشیوں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ چنانچہ اس وقت ہمارے ملک میں بھیڑیں پورے امریکہ کی بھیڑوں سے تعداد میں آدھی سے زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں بکریاں اور دوسرے مویشی بھی ہیں، ان جانوروں کا گوشت اور دودھ غذا کے کام آتا ہے۔ کھال اور اُون کو مختلف صنعتوں میں اور خاص طور پر قالین بافی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایران صرف اپنے قالین ہی دوسرے ممالک میں نہیں بھیجتا بلکہ یہاں سے کھالیں، جانوروں کی انتڑیاں، خام اون اور بھیڑ کے بچّوں کی کھالیں جس کی ساری دنیا میں شہرت ہے برآمد کی جاتی ہیں۔

اگرچہ اس وقت ایران میں ریل بھی ہے اور پکّی سڑکیں بھی جن پر آسانی سے موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بار برداری کے لئے گدھے کی اہمیت اپنی جگہ ہے، اس کام کے لئے گھوڑے اور خچر بھی استعمال

کئے جاتے ہیں، یوں تو اونٹ پورے ملک ہی میں نظر آتے ہیں لیکن خراسان اور بلوچستان میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے جہاں ان سے آج بھی بوجھ ڈھونے کا کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے خیمہ نشین قبائلی اس کے دودھ، گوشت اور کھال کو مختلف کاموں میں لاتے ہیں، اس کے بالوں سے کپڑا تیار کیا جاتا ہے جو بڑا قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کے جنگلوں کا رقبہ امریکہ کی ریاست مسوری کے برابر ہے۔ ہمارے ہاں گھنے جنگل کوہ البرز کے شمالی سلسلے پر بحرِ خزر کے کنارے کنارے اور دوسری طرف کوہ زاگروس کی ڈھلانوں پر پائے جاتے ہیں۔ خلیج فارس کے علاقے میں بھی چھوٹے چھوٹے جنگل ہیں جہاں منطقۂ حارہ میں اُگنے والے درخت پائے جاتے ہیں، اِس کے علاوہ سفیدے بید اور چنار کے درخت ایران کے ہر قصبے اور گاؤں میں کثرت سے نظر آتے ہیں چنار کے درخت کا تنا بہت زیادہ پھیلتا ہے۔ یہ درخت سڑکوں اور نہروں کے کناروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں اور باغوں میں بھی لگایا جاتا ہے۔ ان درختوں سے صرف سایہ ہی نہیں ملتا بلکہ ان کی لکڑی جلانے اور عمارتیں بنانے کے کام میں بھی لائی جاتی ہے۔ ہمارے جنگلوں میں مختلف قسم کے درخت جیسے شاہ بلوط، اخروٹ، آلش، شمشاد، سرو، اور کاج کثرت سے ملتے ہیں ان درختوں کی لکڑی ریل کے سلیپر، دیا سلائی کی تیلیاں، ستون، تھونیاں، کواڑ اور دروازے کی چوکھٹیں بنانے کے کام آتی ہے، اس کے علاوہ شاہ بلوط کی لکڑی کے پیپے اور اخروٹ کی لکڑی گھر کا سامان بنانے کے لئے باہر بھی بھیجی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی زیادہ تر لکڑی ایندھن کے ہی کام آتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی کئی صدیوں میں وہ جنگل جو ہمارے ملک کے بہت بڑے حصّے پر پھیلا ہوا تھا بری طرح تباہ و برباد ہوا۔ بغیر سوچے سمجھے اور انجام پر نظر ڈالے ہم نے ان جنگلات کو مختلف جانوروں اور خاص طور پر بکریوں کے ریوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ جنہوں نے ہزاروں پودوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اسی طرح جلانے کی لکڑی کے لئے بھی کسی ترتیب سے کام نہیں لیا گیا جس کی وجہ سے بڑی قیمتی عمارتی لکڑی برباد ہوتی اور جنگل کا رقبہ گھٹتا چلا گیا، ایک طرف تو ہمارے جنگل تباہ و برباد ہوئے اور دوسری طرف باربرداری کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے ان سے بالکل فائدہ نہ اٹھایا گیا۔

لیکن اب حالات بدل چکے ہیں اور جنگلات کی حفاظت کی طرف توجہ دی جا رہی ہے ہم نے غیر ملکی ماہرین کی مدد سے وزارتِ زراعت میں محکمہ جنگلات کی از سرِ نو تنظیم کی ہے۔ یہ محکمہ جلانے کی لکڑی اور دوسری مفید چیزوں کی پیداوار بڑھانے میں بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے کام کر رہا ہے۔ حکومت اور پرائیویٹ کارخانے کے مالکوں نے ایسے چولھے اور کمرہ گرم کرنے کے آتشدان سستے داموں پر بنانا شروع کر دیئے ہیں جن میں مٹی کا تیل جلایا جاتا ہے۔ اب یہ چولھے اور آتشدان اُن انگیٹھیوں کی جگہ لے رہے ہیں جن میں صدیوں سے کوئلہ یا لکڑی کا استعمال ہوتا تھا، اس کے علاوہ

تہران کے قریب ایک یتیم خانے میں بچوّں سے بات چیت کرتے ہوئے

محمد رضا شاہ نامی تیل بردار جہاز پانی میں اتر رہا ہے۔ یہ تصویر ۱۹۵۹ء میں آمسٹرڈم میں لی گئی تھی
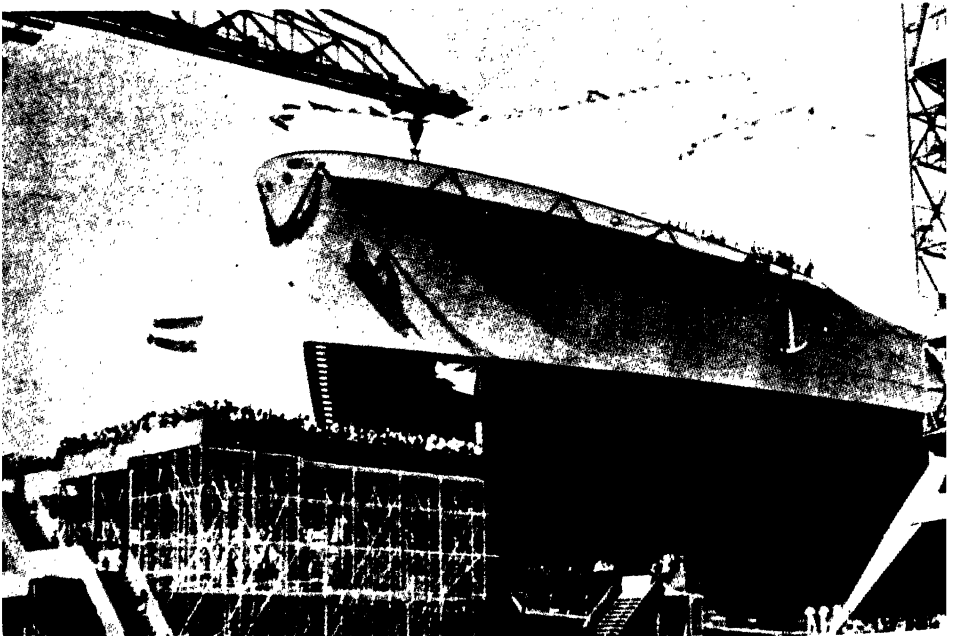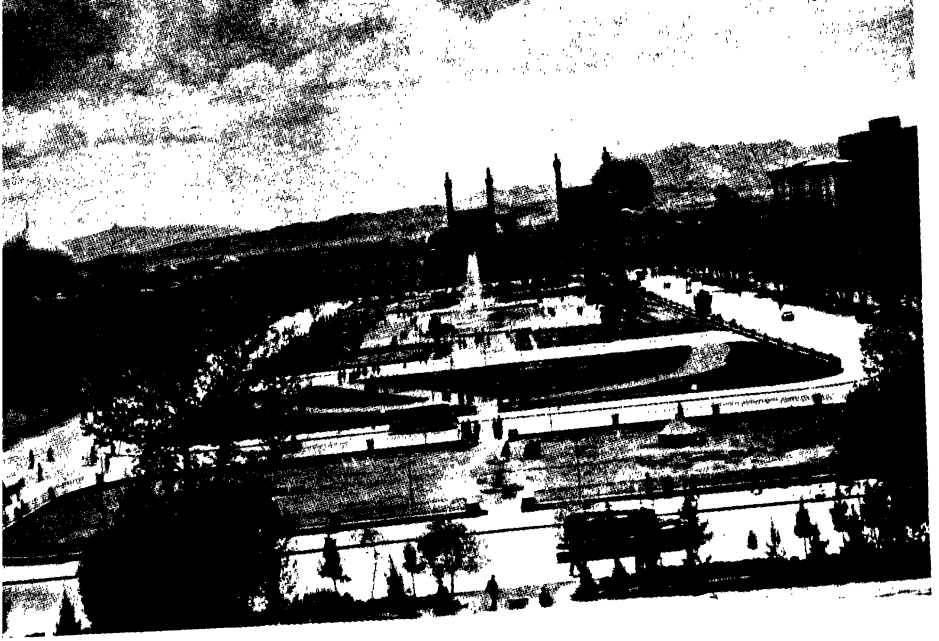
اصفہان کے ایک مشہور و معروف چوراہے کا حسین منظر

تبریز میں شاہ قلی کی جھیل
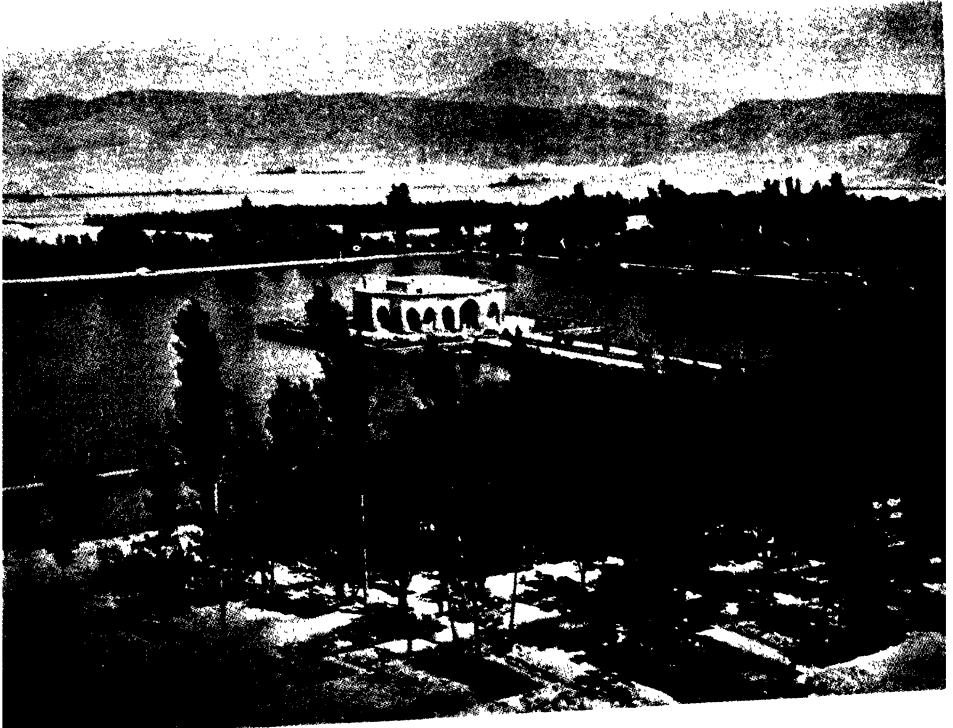
جنگلوں سے جو لکڑی ریلوے سلیپر یا دوسری چیزیں بنانے کے لئے لائی جاتی ہیں اس کو یا تو مشینوں کے ذریعہ دبا دیا جاتا ہے یا دوسری صورت میں اس کو کیمیاوی اجزا میں ڈبو دیا جاتا ہے تاکہ یہ زیادہ پائیدار ہو اور کافی عرصہ تک چل سکے۔ محکمۂ جنگلات اس بات کی بھی پابندی لگاتا ہے کہ ایسی لکڑی جنگلوں سے کاٹ کر باہر نہ بھیجی جائے جس سے اقتصادی طور پر نقصان ہوتا ہو، چونکہ ذرائع آمد و رفت پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں اس لئے لوگ ان جنگلوں کو چھوڑ کر جو ضرورت سے زیادہ استعمال ہو چکے ہیں اُن جنگلات کی لکڑی استعمال کر رہے ہیں جو ابھی تک انسانی دسترس سے باہر رہے ہیں۔

بحرِ خزر اور خلیج فارس کے ساحل بہت اہم اور ضروری سمندری معدنیات سے بھرے پڑے ہیں۔ تقریباً ۱۸۶۹ء میں ناصر الدین شاہ نے ایک روسی باشندے کو بحرِ خزر کی بڑی بڑی بندرگاہوں پر ماہی گیری کے اڈے قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد یہ منظوری ایک روس کی پرائیوٹ فرم کو دے دی گئی لیکن جب روسی حکومت نے اس کام کو خود اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو یہ کام بند ہو کر رہ گیا۔

کچھ عرصے بعد ایران اور روس کی مشترکہ ماہی گیری کی کمپنی قائم کرنے کا معاہدہ ہوا جس میں دونوں ملک ہر طرح سے برابر کے شریک تھے لیکن ہمیں اس معاہدے سے نقصان ہوا اس لئے ۱۹۵۲ء میں ہم نے اس کی مزید توسیع سے انکار کر دیا اور اسی سال ہم نے بحرِ خزر کی ماہی گیری کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دے دیا۔

مچھلی پکڑنے، فروخت کرنے اور برآمد کرنے کا کام اب قومی کمپنی کے اختیار میں ہے۔ اسٹرجن اور خاویار مچھلیاں ساری دنیا میں مشہور ہیں، ہماری قومی کمپنی نے ان مچھلیوں کی نسل کی افزائش اور برآمد پہلے سے کہیں زیادہ کر دی ہے۔

ان مچھلیوں کی بڑی تعداد باہر بھیجی جاتی ہے دو تہائی اسٹرجن اور آدھی خاویار تو صرف روس میں ہی جاتی ہے اور باقی امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں۔ بحرِ خزر سے اور بھی کئی قسم کی عمدہ مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک سفید کہلاتی ہے جس کو ایرانی خاویار سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح جو دریا بحرِ خزر میں آکر ملتے ہیں ان میں، سالمن اور ٹروٹ قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔

خلیج فارس اور بحرِ عمان کے گرم پانی میں بھی مچھلیاں اور دیگر سمندری معدنیات ملتی ہیں جن سے ہم نے حال ہی میں فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے۔ میرے والد کے عہد میں بندرگاہ عباس میں سارڈین مچھلی کو ٹین کے ڈبوں میں بند کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا تھا۔ ایک اور جدید ترین قسم کا کارخانہ ۱۹۵۹ء میں یہاں لگایا گیا ہے۔ حال ہی میں اسی بندرگاہ پر ایک کارخانہ مچھلیوں کو جمانے کا اور دوسرا برف تیار کرنے کا مچھلیوں کی حفاظت کے پیش نظر کھولا گیا ہے۔ ہمارا منصوبہ ہے کہ خلیج فارس کے ماہی گیری کے جہازوں میں مچھلیاں پکڑنے اور حفاظت سے رکھنے کا جدید ترین سامان مہیا کیا جائے، اس کے علاوہ اندرون ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نقل و حمل کے

ذرائع زیادہ بہتر بنائے جائیں تاکہ لوگوں کو تازہ مچھلی اور برف میں جمی ہوئی دوسری سمندری غذائیں مل سکیں۔ ہمارے ملک میں ریلوں کا جال جتنا زیادہ پھیلے گا ہم اتنے ہی زیادہ ریفریجریٹر لگے ہوئے ریل کے ڈبے اور لاریاں استعمال کر سکیں گے۔ جن علاقوں میں آبادی کثرت سے ہے وہاں چیزوں کو ٹھنڈا رکھنے کے پلانٹ بھی لگانا ضروری ہیں تاکہ سمندری غذا اور دوسری جلد خراب ہو جانے والی چیزیں سڑنے سے محفوظ رہیں۔

وہ دن دور نہیں جب ایران اپنے سمندروں سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا۔ سمندری چارہ جانوروں کو بڑی قوت دیتا ہے ہم جلد ہی اس کو نکالنا شروع کر دیں گے۔ سمندر کی تہہ سے مٹی کا تیل (اس کا ذکر تفصیل سے اگلی فصل میں آئے گا) موتی اور دوسری کارآمد اشیاء بھی نکالی جائیں گی۔ تھوڑے عرصے سے میں ایک اور سمندری غذا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ دراصل یہ ایک قسم کا آٹا ہوتا ہے جو مچھلیوں کو خشک کر کے تیار کیا جاتا ہے، اس میں پروٹین کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور اقوام متحدہ کے محکمۂ خوراک وزراعت اور یونیسکو نے اس کو بہت عمدہ غذا قرار دیا ہے۔ یہ آٹا سارا ڈین نسل کی ایک بہت چھوٹی اور کم قیمت مچھلی سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں مچھلی کی بو یا ذائقہ بالکل نہیں ہوتا اور اس کو دور دراز کے علاقوں میں آسانی سے لے جایا جا سکتا ہے اس کا آٹا کافی عرصے تک رہ بھی سکتا ہے اور غریب آدمی اس سے پوری پوری غذائیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہم اپنے سمندر اور جنگلات کے ذخیروں کو ترقی دے کر کام میں لا سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود زراعت کی اہمیت سرفہرست ہے اور اس کی توسیع و ترقی سے جتنی آمدنی ہو سکتی ہے وہ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔

اس وقت قابلِ کاشت زمین پانچ مختلف قسم کے مالکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کچھ زمین تو زمینداروں کی ہے کچھ مذہبی اوقاف کے تحت ہے۔ کچھ حکومت کے تصرف میں ہے کچھ میری ذاتی ملکیت ہے اور کچھ ان کسانوں کے پاس ہے جس پر وہ خود کاشتکاری کرتے ہیں، جتنی زمین پر کاشت ہوتی ہے اس سے نصف زمین پر زمینداروں کا قبضہ ہے۔ ایرانی زمینداروں کی زمینیں جس طرح رقبے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زمیندار خود بھی قومی فرائض اور شہریت کے احساس کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہیں، اور یہ بات بالکل مناسب نہ ہوگی کہ سب کے متعلق ایک ہی رائے قائم کر کے ان پر سخت نکتہ چینی کی جائے، بہرحال بڑے زمیندار جو چالیس یا پچاس سے زیادہ گاؤں کے مالک ہیں ان کی تعداد کم ہی ہے۔ ان زمینداروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بعض قبائل کے سردار ہیں۔

جتنی زمین بڑے بڑے جاگیرداروں کے قبضے میں ہے اس کی حالت سب سے بدتر ہے چونکہ یہ جاگیردار اور تعلقہ دار اپنے علاقے سے باہر رہتے ہیں اس لئے زمین کو زیادہ کارآمد بنانے یا ان کسانوں کی بہتری کے لئے کوئی کام نہیں کرتے جو ان کی زمینوں پر کاشت کرتے ہیں، یہ لوگ اپنی زمینوں کو اپنے کارندوں کے سپرد کر کے خود تہران

یا یورپ اور امریکہ کے کسی شہر میں عیش کرتے ہیں اور کارندے غریب کسانوں اور دیہاتیوں پر ہر طرح کے ظلم توڑتے ہیں اس میں شک نہیں کچھ بڑے جاگیر دار ایسے بھی ہیں جن کو اجتماعی فلاح کا بھی احساس ہے لیکن بطور مجموعی یہ پورا طبقہ عوام کی محنت پر پھل پھول رہا ہے اور اگلی چند سطروں میں میں بیان کروں گا کہ اب ان کے زوال کے دن قریب آ چکے ہیں۔

بڑے جاگیر داروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی ہیں۔ جن کے پاس ایک یا ایک سے زیادہ گاؤں ہیں یہ لوگ گاؤں میں ہی اپنی رعیت کے ساتھ رہتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کچھ بہت خود غرض اور خود خواہ واقع ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہی ملیں گے جو اپنی رعیت اور ان کے کنبے کے لئے فلاحی کاموں میں پورے جوش و خروش سے دلچسپی لیتے ہیں۔ مدرسوں ، شفاخانوں اور مسجدوں کے لئے مفت زمین دے دیتے ہیں، ایران میں جو آباد اور خوشحال گاؤں نظر آتے ہیں ان کے مالک یہی چھوٹے زمیندار ہیں۔

اگرچہ صحیح اعداد و شمار ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن اندازہ ہے کہ تقریباً بیس فیصدی کاشت کے قابل زمین خیراتی اور مذہبی امور کے لئے بطور دائمی وقف ہے۔ ان زمینوں کا انتظام دینی اداروں کے متولیوں کے ہاتھ میں ہے لیکن حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ ان لوگوں کی نگرانی کرتی رہے۔ موقوفہ زمینوں پر عام طور پر متولی اپنے کارندے مقرر کر دیتے ہیں جن میں سے بعض تو بہت نیک اور صلح پسند ہوتے ہیں لیکن بعض اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں اور رعیت کے ساتھ بدمزاجی سے پیش آتے ہیں۔ سرکاری اور شاہی قابلِ کاشت زمین تقریباً دس فی صدی ہے۔ سرکاری زمین میں وہ گاؤں اور علاقے شامل ہیں جن کو سرکار نے پچھلی کچھ صدیوں میں یا تو خود خریدا ہے یا فتح کیا ہے یا کسی باغی کا حصّہ ضبط کیا ہے یا اس کو کسی نے بطور تحفہ پیش کیا ہے اور یا وارث نہ ہونے کی صورت میں خود قبضہ کر لیا ہے، اس زمین کو کسان جوتتے ہیں اور سرکار ان سے زمیندار کی طرح پیش آتی ہے ان زمینوں کا انتظام بھی قابلِ اطمینان نہیں، اور ان پر کاشت کرنے والوں کی حالت بھی ویسی ہی ہے جیسے دوسرے زمینداروں اور جاگیر داروں کے کھیتوں پر کام کرنے والے کاشتکاروں کی، ان کاشتکاروں سے سرکار اپنے کارندوں کے ذریعے اتنا ہی لگان لیتی ہے جتنا دوسرے زمیندار وصول کرتے ہیں بعض صورتوں میں سرکار اپنی زمین کو ٹھیکے پر بھی دے دیتی ہے یہ پٹے دار لگان کی رقم کسانوں سے وصول کرتے ہیں لیکن یہ طریقہ کسانوں کے لئے بیحد نقصان دہ ہے کیونکہ پٹے داروں کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ اکٹھا کریں۔ حکومت اور کسانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی مفید صورت نہیں کہ وہ خود اپنی زمینوں کو چھوٹے مالکان میں تقسیم کر دے۔

شاہی زمین میں وہ گاؤں شامل ہیں جن کو میرے والد نے خود خریدا تھا اور یہ میری ذاتی ملکیت ہیں اب ان کا انتظام بنیاد پہلوی کے ہاتھ میں ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان زمینوں کی آمدنی صرف خیراتی اور

اجتماعی فلاح کے کاموں پر خرچ ہوتی ہے۔ جلد ہی شاہی زمینوں پر اصلاحی کام شروع ہونے والا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

پوری قابلِ کاشت زمین میں سے بیس فی صدی زمین ایسی ہے جس کے مالک کم پونجی والے کسان ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ پورے ایک گاؤں کے یا کچھ گاؤں کے اطراف کی زمین کے مالک یہی چھوٹے چھوٹے چند کسان ہیں۔ اور دوسری جگہوں پر ایک یا کچھ گاؤں ایک ہی شخص کی ملکیت ہیں جیسے ہی تقسیم اراضی کا پروگرام شروع ہوگا چھوٹے زمین کے مالکان کی تعداد بڑھنی شروع ہو جائے گی۔

پہلے بھی میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب میں سوئٹزرلینڈ میں پڑھتا تھا تو ایران کے کسانوں کی زبوں حالی دیکھ کر مجھے ان سے ہمدردی ہو گئی تھی جو برابر بڑھتی ہی رہی، اور جب میرے والد نے ترک وطن کیا تو میں نے اپنی تمام زمین کو سرکار کے حوالے کر دیا۔ یہ کام میں نے اس لئے کیا تھا کہ زمین کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ کسانوں کا بھی بھلا ہو اور لگان کی جو رقم وصول ہو اس کو کسانوں اور عام آدمیوں کی مدد کے لئے خرچ کیا جائے۔

لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ حکومت اس روپے کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے خرچ کر رہی ہے اور خیراتی اور اصلاحی کاموں کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں بچتا۔ چنانچہ بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ زمین میں حکومت سے واپس لے لوں اور کم قسطوں اور آسان شرائط پر ان کسانوں کے ہاتھ فروخت کر دوں جو اس پر کاشت کرتے ہیں۔

کسی کام کے متعلق نیک نیتی سے سوچنا ہی کافی نہیں ہوتا لہٰذا میں نے اندازہ لگایا کہ کسانوں میں محض زمین تقسیم کر دینے سے کام نہیں بنے گا بلکہ اس سے ان کی پریشانیاں اور زیادہ ہو جائیں گی، ان کے پاس زمینیں اس وقت تک نہیں رہ سکتیں جب تک ان کو تکنیکی مدد کے علاوہ روپیہ قرض نہ دیا جائے۔ ان حالات کے تحت میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی زمین کے قطعے کسانوں کے ہاتھ فروخت کر دوں اور اس طرح جو روپیہ جمع ہو اس سے ایک بنک قائم کر دیا جائے تاکہ یہ بنک ان نئے مالکوں کو قرض روپیہ اور دوسری سہولتیں دے سکے۔

۱۹۵۱ء میں میں نے ایک فرمان کے ذریعے یہ اعلان جاری کیا کہ میری ذاتی ملکیت میں جتنی بھی زمینیں ایسی ہیں جن میں دو ہزار سے زیادہ گاؤں ہیں ان کو بے زمین کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں میں نے دیہی ترقی و تعاون کا بنک قائم کیا جو عام طور پر ترقیاتی بنک کہلاتا ہے۔ چنانچہ اسی سال ورامین کے علاقے سے جو تہران کے نزدیک جنوب میں ایک قصبہ ہے۔ پہلوی خاندان کی زمینیں تقسیم کرنے کا کام شروع ہوا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے اس منصوبے میں چونکہ مصدق نے رخنہ اندازی کی تھی اسی لئے وقتی طور پر یہ کام رک گیا لیکن جب اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو میں نے دوبارہ اس کام کو شروع کیا اور سنہ ۱۹۶۱ء کے وسط تک پچیس ہزار

کاشتکاروں میں تقریباً پانچ لاکھ ایکڑ زراعتی زمین تقسیم ہو چکی ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے ملک کی تاریخ میں یہ سب سے پہلا موقع ہے کہ زمینوں کو کاشتکاروں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا جائے کہ اس سے جو روپیہ حاصل ہو اس کو پھر آبادکاری بنک میں جمع کر دیا جائے تاکہ نئے کاشتکار مالکوں کو اس روپے سے تقویت مل سکے۔ چونکہ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا نہیں گیا تھا اس لئے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ بنجر زمین کو اونچے داموں پر فروخت کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا گیا ہے کچھ کا خیال تھا کہ میں بنک کے ذریعے روپیہ کمانا چاہتا ہوں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو کسی کے اخلاق اور کردار میں سوائے برائیوں کے کچھ بھی نظر نہیں آتا، وہ کہتے تھے کہ اس کام کے پیچھے ضرور کوئی بھید ہے جس کا ان کو ابھی تک علم نہیں ہے۔

چونکہ تقسیم اراضی کا مسئلہ ایران میں بالکل نیا ہے اس لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس سلسلے میں میرا کیا ارادہ ہے سب سے پہلا کام تو یہی ہے کہ زمین کے اس طرح قطعے کئے جائیں کہ ایک قطعہ ایک کسان اور اس کے کنبے کے لئے معاشی اعتبار سے کافی ہو، اور ہر قطعے کی قیمت وہ لوگ مل کر مقرر کریں جو اس کام کے ماہر ہیں، اور اس بات کا خیال رکھیں کہ بازار کا جو بھاؤ ہو زمین کی قیمت اس سے کم ہو، اس کے بعد یہ قطعات انہی کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کئے جائیں جو خود ان پر کام کرتے ہیں۔ زمینداروں اور سٹے بازوں کے ہاتھ زمین ہرگز فروخت نہ کی جائے۔

یہ بات میں تاکید سے کہوں گا کہ تقسیم اراضی سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ اپنی جائیداد لوگوں کو مفت دوں، کیونکہ نفسیاتی اعتبار سے اس کا لوگوں پر غلط اثر پڑے گا اور اصل مقصد پورا نہ ہوگا۔

اس کی بجائے ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمین کے ٹکڑے کی قیمت کا جتنا تخمینہ لگایا جاتا ہے اس سے بیس فی صدی کم کسان سے قیمت وصول کرتے ہیں، اور کاشتکار کو یہ رعایت دی جاتی ہے کہ وہ پچیس سالانہ قسطوں میں زمین کی قیمت ادا کر دے۔ زمین کی رجسٹری اور دوسری دفتری کارروائیوں پر جو خرچ آتا ہے وہ پہلے پندرہ سالوں میں ایک فی صدی کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے اس وقت ایک کاشتکار کو زمین کا مالک ہونے کی حیثیت سے ہر ماہ اس رقم سے بھی آدھی ادا کرنی پڑتی ہے جو اس کو بٹائی کی صورت میں اپنے مالک کو دینا پڑتی تھی۔

یہ بنک نفع کمانے کی غرض سے قائم نہیں کیا گیا ہے۔ اس وقت اس کا سرمایہ تقریباً چار لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ یا تیرہ لاکھ ڈالر ہے جس میں سے نصف اس کو دیا جا چکا ہے، اگرچہ بنک کے سرمائے میں میرا بھی حصہ ہے اور دوسروں کا بھی لیکن ہم میں سے کوئی بھی شخص اس کا سود یا نفع نہیں لیتا۔

زمین کی قیمت اور ایک فی صدی بالائی اخراجات کی رقم جو بتدریج کسانوں سے وصول ہوتی ہے اس سے بنک کا سرمایہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس رقم کا استعمال نئے کاشتکار مالکان کے لئے کیا جا سکتا ہے، چونکہ آبادکاری

بنک اس غرض کے لئے قائم نہیں کیا گیا تھا کہ یہ دوسرے بنکوں کی طرح لین دین کے معاملات کرے بلکہ اس کو کھولنے کا مقصد صرف اجتماعی خدمت تھا اس لئے ابتدائی چند سالوں میں اس کے سرمائے کا نقصان ہونا ایک طبعی بات تھی۔ مالی خسارے کو پورا کرنے اور سرمایہ بڑھانے کے لئے ۱۹۵۶ء میں اس بنک نے تہران میں تجارتی سطح پر لین دین کا کاروبار شروع کر دیا۔ چنانچہ اب اس بنک نے سیونگ اور کرنٹ دونوں حساب کھول دیئے ہیں اور اب تجارتی اصولوں کے تحت یہ بنک لوگوں کو روپیہ قرض بھی دیتا ہے۔ یہ کاروبار بنک کے لئے اس قدر سودمند ثابت ہوا کہ اس نے کسانوں کو قرض دینے کے باوجود اپنے پچھلے تمام نقصان کو پورا کر لیا۔

۱۹۶۰ء کی درمیانی مدت تک پہلوی خاندان کی ایک تہائی قابل کاشت زمین چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم ہو چکی تھی، جو زمین ابھی باقی رہ گئی ہے اس میں سے آدھی تقریباً دو سال کے عرصے میں تقسیم ہو جائے گی اس کے علاوہ میری اور بھی ہزاروں ایکڑ زمین بیکار پڑی ہے جس کو قابلِ کاشت بنا کر بے زمین کسانوں کے حوالے کر دیا جائے گا تقسیم اراضی کے کام کو تیز کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اسی وقت مفید اور کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ آبادکاری بنک بھی روپیہ قرض دینے کی رفتار کو اسی مناسبت سے بڑھائے، اس بات کو میں پھر تاکید سے کہوں گا کہ تقسیم اراضی سے کاشتکار اسی وقت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جبکہ ان کو مالی مدد بھی فوراً دی جائے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان کی پریشانیاں کہیں زیادہ بڑھ جائیں گی۔

کاشتکاروں کو جو بھی مالی امداد دی جاتی ہے اس میں وہ قرض سب سے زیادہ اہم ہیں جو بنک اپنی نگرانی میں دیتا ہے۔ کم پونجی والے کسانوں کو اس بنک نے بہت سی چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض دی ہیں، اس کے علاوہ اس بنک نے اور بھی کئی طریقوں سے روپیہ قرض دیا ہے جس کا فائدہ بالواسطہ ان کسانوں کو ہی پہنچتا ہے مثال کے طور پر یہ بنک دیہی ترقیاتی انجمنوں کو روپیہ قرض دیتا ہے اور اس روپے سے یہ ترقیاتی انجمنیں نہ صرف مالی امداد دیتی ہیں بلکہ دوسری سہولتیں بھی کاشتکاروں کو فراہم کرتی ہیں۔

آبادکاری کے بنک نے بہت سے ٹریکٹر اور کمپائن خریدے ہیں، بہت سی جگہ گہرے گہرے کنوئیں بھی کھدوائے ہیں۔ ایک سو سے زیادہ نوجوان کسانوں کو مغربی جرمنی بھیجا ہے تاکہ وہاں رہ کر کاشتکاری کے نئے طریقے سیکھ سکیں، بنیاد پہلوی کی مالی امداد سے تہران سے کچھ دور جنوب مشرق میں ایک گاؤں شاہ آباد کے نام سے بسایا گیا ہے، یہ گاؤں ان کاشتکاروں اور ان کے کنبے کے افراد نے بسایا ہے جو وہاں کاشت کیا کرتے تھے اس گاؤں میں ہر کاشتکار کے کنبے کے رہنے کے لئے اپنا مکان ہے۔ آبادکاری بنک نے ایک سو بیس مکان اور بھی بنائے ہیں اور دوسرے کسانوں کو روپیہ قرض بھی دیا ہے۔

جو گاؤں کاشتکاروں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں ان میں تعلیم بالغان کے لئے اسکول بھی کھولے گئے ہیں۔

وزارتِ داخلہ کے محکمۂ آبادکاری نے ان دیہاتوں میں کچھ ایسے لوگوں کو بھیجا ہے جو گرام سدھار کے کاموں میں تربیت یافتہ ہیں۔ یہ لوگ گرام سیوک یا دہ یار کہلاتے ہیں۔ سڑکیں بنانے، اسکول اور شفاخانے قائم کرنے کے علاوہ یہ لوگ دیہاتیوں کو حفظانِ صحت کے اصول اور اچھی کاشت کے طریقے بھی سکھاتے ہیں۔

ہم نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ درحقیقت اصل مقصد کی ابتداء ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کے نتائج بہت اچھے نکلیں گے۔ کاشتکاروں کے بلند حوصلوں، کاشت کے بہتر اوزاروں اور نئے کاشتکار مالکوں کی جدید کاشت کے طریقوں سے واقفیت کی بنا پر ان زمینوں کی (جو کاشتکاروں میں تقسیم کی جا چکی ہیں) پیداوار میں بیس فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ جو تقسیم اراضی کے منصوبے کی کامیابی کی دلیل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب بالکل صاف اور واضح ہو گئی ہے کہ محض زمینوں کا تقسیم کر دینا اتنا مفید ثابت نہ ہوتا اور اس کا اتنا عمدہ نتیجہ نہ نکلتا جتنا اب نکلا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم ایران میں اپنے کسانوں کو زندگی کا نیا راستہ دکھا سکتے ہیں اور ان کے واسطے اطمینان اور ان کے کنبے کے لئے خوشحالی لا سکتے ہیں اور پوری قوم میں حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں۔

اصلاحاتِ اراضی کے سلسلے میں دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ قابلِ کاشت سرکاری زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کاشتکار مالکان کو قرضے دے کر مالی امداد دی جائے۔ اور دوسری سہولتیں بھی مہیا کی جائیں۔ کاشتکاروں میں زمینیں تقسیم کرنے کا قانون ۱۹۵۵ء میں ایرانی پارلیمنٹ نے پاس کیا تھا جس پر میرے بھی دستخط ہیں لیکن ان زمینوں کا باقاعدہ اور اچھی طرح جائزہ نہیں لیا گیا تھا اس لئے اس قانون پر عمل درآمد کرنے میں تاخیر ہو گئی۔

تقسیم اراضی کے کام میں تیزی پیدا کرنے کے لئے ۱۹۵۸ء میں میں نے فوج کو حکم دیا کہ زمینوں کا جائزہ لینے اور پیمائش کرنے میں مدد کرے چنانچہ سال کے آخر میں تقسیم کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔ سرکاری زمینوں پر بھی اسی قانون کا اِجرا ہو گا جو میری ذاتی زمین کے لئے تھا، یعنی کوئی جاگیردار، زمیندار یا سٹے باز سرکاری زمین نہیں خرید سکتا۔ ان زمینوں کی خریداری کا حق صرف چھوٹے کاشتکاروں کو ہی ہے، فروخت کی شرائط بھی نہایت سادہ اور آسان ہیں۔ پوری زمین کی قیمت پچیس سال میں ادا کی جا سکتی ہے۔ زراعتی بنک نئے کاشتکار مالکان کو روپیہ قرض دے کر اور دیہی تعاونی انجمنیں قائم کر کے ان کی مدد کرتا ہے، امید ہے کہ سرکاری زمینوں کی تقسیم سے تقریباً ایک لاکھ کاشتکاروں کے کنبوں کو فائدہ پہنچے گا۔

میں پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ چونکہ ہمارے ملک کی تقریباً نصف زمین جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے قبضے میں ہے اس وجہ سے ہمارے لئے اصلاحی کاموں کے بڑے مواقع ہیں۔

اب سے چند سال پہلے تک جب کبھی بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے سامنے کوئی شخص تقسیم اراضی

کی بات کرتا تھا تو یہ سن کر بہت غصّہ آتا تھا، لیکن ان میں سے اب بہت سے لوگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر کاشتکاروں کے ساتھ اجتماعی انصاف نہ کیا گیا تو ان کی جاگیریں اور زمینیں زیادہ دن تک ان کے قبضے میں نہیں رہ سکیں گی اس کے علاوہ ایران میں سرمایہ گذاری کے اتنے زیادہ مواقع نکل آئے ہیں کہ اب کوئی شخص پہلے کی طرح زمین رکھنا فائدے کا ذریعہ یا ذاتی وقار اور شان و شوکت کا سبب نہیں سمجھتا، چونکہ بڑی بڑی جاگیروں میں اب بھی اسی پرانے ڈھنگ سے کاشتکاری کی جاتی ہے اس کو بدل کر نئے طریقے اپنانے اور جدید ترین تکنیک استعمال کرنے کے لئے بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت پڑے گی اس لئے اب جاگیردار اور بڑے زمیندار یہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ اپنا روپیہ ایران کی بڑھتی ہوئی صنعت اور تجارت میں لگائیں تو ان کو اپنے روپے سے بہت جلد آمدنی ہوگی۔

تقسیم اراضی کا پروگرام شروع کرنے سے میرا مقصد یہی نہ تھا کہ ان کسانوں کو جو شاہی زمینوں پر کاشتکاری کر رہے ہیں فائدہ پہنچایا جائے بلکہ اس طریقے سے میں بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے لئے ایک مثال بھی قائم کرنا چاہتا تھا چنانچہ بعض جاگیرداروں نے اپنی زمینیں فروخت کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے لیکن میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں کہ سب ہی جاگیردار اور زمیندار میری اس مثال پر عمل کریں گے اس کے لئے تو مجھے کچھ سخت اقدامات کرنے پڑیں گے۔

جو زمینیں جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے قبضے میں ہیں اُن کی اصلاح کے لئے میں نے ایک قانون پر ۱۹۶۱ء میں دستخط کئے ہیں جس کی رو سے کسی فرد یا جماعت کو مقررہ حدود سے زیادہ قابل کاشت زمین رکھنے کا حق نہیں۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ایکڑ سینچائی کی زمین یا دو ہزار ایکڑ بغیر سینچائی کی زمین کوئی واحد شخص یا کچھ لوگ مل کر رکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ کاشتکاری جدید ترین طریقوں سے کی جائے یا تمام کھیتوں کو ایک یونٹ مان کر سب کی آب پاشی ایک ہی جگہ سے کی جائے۔ جو زمین مقررہ حدود سے زیادہ ہو اس کو ان قوانین کے تحت جو حکومت نے بنائے ہیں فروخت کر دیا جائے۔ ورنہ حکومت یہ زمین خود خریدے گی اور چھوٹے چھوٹے قطعے بنا کر ان کو کاشتکار مالکان کے ہاتھ آسان شرطوں پر فروخت کر دے گی۔

حکومت ان نئے مالکانِ زمین کو اسی مناسبت سے قرضے اور دوسری سہولتیں مہیا کرے گی جو اس نے اس سے قبل اُن کاشتکاروں کو دئے ہیں جن میں شاہی زمین تقسیم کی گئی ہے۔ جن زمینداروں کے پاس مقررہ حدود سے کم زمین ہے ان کے اور ان کاشتکاروں کے درمیان جو ان کی زمینوں پر کاشت کرتے ہیں اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لئے بھی حکومت نے قانون بنایا ہے، اگرچہ یہ قانون ابھی تک اپنی جگہ مکمل نہیں ہے اور تجربات کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ اس پر عملدرآمد کرنے کے لئے جزئی اصول و ضوابط مقرر کرنے پڑیں گے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آمریت اور جاگیرداری نظام کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے حکومت نے اقدامات کئے ہیں۔ ہمارا سن ۱۹۶۱ء کا اصلاح اراضی

کا قانون اس اعتبار سے بالکل نیا ہے کہ ایران کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس وقت ایران میں جو سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی ترقی ہو رہی ہے اس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا میرے ملک کے لوگ اب یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ مٹھی بھر جاگیردار اور زمیندار ہزاروں ایسے لوگوں کی زندگی اور قسمت سے کھیلتے ہیں جن میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو انتہائی غربت و پریشانی میں بسر کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شاہی اور سرکاری زمینوں کے علاوہ بڑے جاگیرداروں کی زمینوں کو بھی کاشتکاروں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان جاگیرداروں کو ہمیں معقول معاوضہ بھی ادا کرنا پڑے گا لیکن یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم ان بڑے زمینداروں کا زور توڑ کر ہی رہیں گے۔ اس وقت جتنے بھی بڑے بڑے جاگیردار ہیں اگرچہ ان کی تعداد بہت مختصر ہی سہی یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کو اکثریت کی خواہش اور مرضی کے آگے جھکنا پڑے گا۔

زراعتی ترقی اور دیہی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے تعلیم کو دیہاتوں میں پھیلانا ہماری دوسری بڑی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر تعلیم و تربیت کے بارے میں تو ذکر آگے آئے گا لیکن یہاں میں ان مسائل کو ضرور زیر بحث لاؤں گا جن کا تعلق خاص طور پر زراعت سے ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بہت اچھی ہے کہ ایرانی کاشتکار کو جاگیرداروں کے پنجے سے آزاد کرایا جائے، لیکن جب وہ ان کے چنگل سے آزاد ہو جائے گا تو اس کے لئے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ اپنے مسائل کو کس طرح حل کرے۔ جیسے جیسے وقت گذرے گا زراعت کے لئے جدید ترین آلات و مشینوں کا استعمال ہوگا اس کے لئے کاشتکار کو یہ جاننا ضروری ہوگا کہ کس طرح ان اوزاروں کو استعمال کرے اور کیونکر ان کی حفاظت کرے۔ مختصر یہ کہ ہمارے کسان کو کچھ حد تک تکنیکی اور انتظامی چیزوں کا جاننا ضروری ہوگا۔

دیہاتیوں کی تعلیم و تربیت پر اب اچھی خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ کرج ایگریکلچرل فیکلٹی میں جو تہران یونیورسٹی کی ایک شاخ ہے ایک چار سالہ زراعتی کورس شروع کیا گیا ہے۔ اس وقت تقریباً پانچ سو طالبعلم نئے زراعتی طریقوں کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، یہ سائنسی درسگاہ تہران سے تقریباً تیس۳۰ میل دور ایک بہت خوبصورت اور سرسبز حصے میں قائم کی گئی ہے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس کے عملے اور عمارت میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ پڑھنے والوں کی تعداد دوگنی ہو جائے اور ہر حیثیت سے ایک مکمل تحقیقی مرکز بن جائے۔ کرج ایگریکلچرل فیکلٹی کے علاوہ شیراز یونیورسٹی میں ایک شعبہ زراعت کا بھی ہے جو اس وقت تیزی سے اپنے تعلیمی پروگرام کو پھیلا رہا ہے۔

اس وقت تقریباً بارہ سیکنڈری اور دو سو پرائمری اسکول ایسے ہیں جہاں لڑکوں کو پانچویں اور چھٹی کلاسوں میں زراعتی تعلیم دی جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ پرائمری اور سیکنڈری سطح پر زراعتی تعلیم کے پھیلاؤ کی ابھی بہت گنجائش ہے اسی کے ساتھ ہم زراعتی تجربات کے فارم اسکول بھی قائم کر سکتے ہیں تاکہ ہم وہاں کسانوں کو خواہ وہ کسی بھی سن و سال کے ہوں اور اس سے قبل وہ مدرسے میں پڑھے ہوں یا نہ پڑھے ہوں زراعت کے جدید ترین طریقے دکھا سکیں۔ ان

فارم اسکولوں کو چاہیئے کہ کسانوں کو کھیتوں کی دیکھ بھال اور انتظام کے ابتدائی اصول اور ٹکنالوجی کے بنیادی طریقے سکھائیں اس طرح نہ صرف پڑھے لکھے بلکہ ان پڑھ کسان بھی اپنے کاشتکاری کے طریقوں کو بہتر بنا سکیں گے۔ اس کے بعد ہم کاشتکاری کو بہتر بنانے کے لئے ٹیلی ویژن کا استعمال بھی کر سکتے ہیں۔

لیکن ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں، ہمارے کسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ آپس میں مل کر کام کرنا سیکھیں اور آبادکاری کے منصوبے جیسے دیہی عوام کے لئے رفاہی کام اور دیہی تعاونی انجمنیں قائم کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اس کام کے لئے اچھے رہنماؤں کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ عوامی فلاحی کام کسی اچھے رہنما کی نگرانی میں بحسن وخوبی انجام پا سکتے ہیں۔ ان کاموں کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کی بھی ضرورت ہے دیہاتیوں کو چاہیئے عوام کے فائدے کی خاطر کسی حد تک اپنی انفرادیت کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

تعاونی انجمنیں قائم کرنے اور اپنی مدد آپ کرنے کے پروگرام کی توسیع کے لئے بھی اس بات کی بہت زیادہ گنجائش ہے کہ لوگوں کو تکنیکی تربیت کے ساتھ شہریت کے فرائض کی تعلیم بھی دی جائے۔ ۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا تھا جس کی رو سے گاؤں کی پنچایتوں کے وجود کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کو کچھ اختیارات بھی دیئے گئے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ہر زمیندار کے لگان کا پانچ فی صدی روپیہ پنچایت کے کاموں پر خرچ کیا جائے، بدقسمتی سے بعض بڑے جاگیرداروں نے خود کو اس قانون سے بچانے کی کوشش بھی کی ہے اور جس طرح وہ انکم ٹیکس کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے چلے آئے ہیں اسی طرح چاہتے ہیں کہ اس رقم کو بھی صاف بچا جائیں۔ چند جاگیرداروں کو چھوڑ کر باقی سب نے اس قانون کی اور پنچایت کے خرچ کے مد کی پابندی کی ہے جو زمیندار اپنے گاؤں میں ہی رہتے ہیں انہوں نے تو سب سے زیادہ اس قانون کو اور اس کے ذریعے جو ترقی کے کام ہوں گے ان کو سراہا ہے۔

اس قانون پر عمل درآمد کرانے کی ساری ذمہ داری ہمارے محکمۂ آبادکاری کے کندھوں پر ہے چنانچہ اس محکمے نے اس وقت تک تقریباً بیس ہزار دیہاتوں میں پنچائتیں قائم کی ہیں، کئی سو دیہاتیوں کو پنچایت کے انتظام اور کاشتکاری کے نئے طریقوں کی تربیت دی ہے کئی ہزار دیہاتوں میں مقامی سطح پر ترقیاتی منصوبے شروع کئے ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں دیہی تعاونی انجمنیں قائم کی ہیں۔

لیکن آبادکاری کے محکمے کی تمام کوششوں اور ہر طرف دوڑ دھوپ کے باوجود ہمیں اس میدان میں ابھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ میری نظر میں ہمارے ملک کے مستقبل کے لئے اس سے بہتر اور کوئی سودمند راہ نہیں ہے کہ اس محکمے کے موجودہ بجٹ کو بڑھا کر تین گنا یا چار گنا کر دیا جاتے۔ ہمارا کوئی بھی گاؤں ایسا نہیں

جس میں جفاکش اور محنتی لوگ نہ بستے ہوں اور ان میں شاید کوئی بھی شخص ایسا نہ ہوگا جس کی جمہوریت کے اصولوں کے مطابق رہنمائی کی جائے اور وہ اس کو دل وجان سے قبول نہ کرے۔ ایران کے ہزاروں دیہاتوں میں ایسے قابل لوگ بہت ملیں گے جو مقامی سطح پر لوگوں کی رہنمائی کر سکیں لیکن یہ ان کی بدبختی ہے کہ ان کو اس کام کی ابھی تک تربیت نہیں دی گئی ہے۔ ان کی صلاحیتوں کے ابھرنے کا انحصار اس امر پر ہے کہ بہت ہی وسیع پیمانے پر رہنمائی کی تربیت کا پروگرام شروع کیا جائے۔

مقامی سطح پر ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ دیہات میں بسنے والوں کو تکنیکی تعلیم اور اس سے متعلق مشورے دیئے جائیں یہ مشورے ان کو حکومت بھی دے سکتی ہے اور مقامی افسر بھی۔ دیہاتیوں کو ضروری سامان خریدنے کے لئے نقد روپے کی ضرورت پڑتی ہے اگرچہ سردست روپیہ بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن جتنا بھی ہے وہ گرام پنچایت قانون کے تحت لے سکتے ہیں، تجربے نے ثابت کیا ہے کہ اگر دیہاتیوں کی نقد روپے سے مدد کی جائے تو وہ بہت سے تعمیری کام کر سکتے ہیں، سڑکیں، پل، حمام، مدرسے، شفاخانے، مسجدیں، کنویں، باندھ وغیرہ سب ہی کچھ بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو کارخانے بھی قائم کر سکتے ہیں، اور یہ کام وہ اس وقت زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں جب ان کو کھیتی کے کام سے فرصت ہوتی ہے اور خالی وقت زیادہ ہوتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں ہم نے پانچ سو دیہی تعاونی انجمنیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن اب ہم اس سے آگے بڑھ چکے ہیں اس وقت ہر انجمن کے ممبران کی تعداد دو سو سے چھ سو تک ہے۔ ان میں سے زیادہ تر انجمنیں اپنے ممبران کو قرضے ہی دیتی ہیں لیکن بعض انجمنیں ایسی بھی ہیں جو اپنے ممبران کا سیونگ حساب بھی رکھتی ہیں۔ کھاد اور زراعت کا دوسرا سامان بھی مہیا کرتی ہیں اور ان کے مال کو منڈیوں میں بھیجنے میں بھی کافی مدد دیتی ہے۔ کچھ انجمنیں تو بہت اچھی طرح چل رہی ہیں اور اپنے ممبران کو کافی فائدہ پہنچا رہی ہیں، بعض کی حالت درمیانی ہے اور بعض بہت بُری حالت میں ہیں ہر انجمن کی کیفیت کا اندازہ اس کے افسروں اور کارپردازوں کی استعداد اور صلاحیت سے لگایا جا سکتا ہے اور اسی لئے تکنیکی اور انتظامی معاملات کی تربیت کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔

یہ محض میرا خیال ہی نہیں بلکہ محکم دلائل کی بنا پر یقین کامل ہے کہ ہندوستان اور دوسرے جمہوری ممالک کی طرح اگر ایران کے کسانوں میں بھی اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ ابھار دیا جائے تو ان کی زندگی میں انقلاب آجائے، کیونکہ یہ جذبہ ان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ان پر بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو انہیں پورا کرنا ہے اور اس سے ان کا مستقبل سنور سکتا ہے اور ان کی معاشی حالت ان کے سامنے ہی بہتر ہو سکتی ہے اس میں شک نہیں کہ بڑے بڑے باندھ، ریلیں، بندرگاہیں اور دوسرے ترقیاتی کام کسانوں کی زندگی پر براہ راست نہ سہی لیکن دوسرے طریقوں سے ضرور اثر ڈالتے ہیں اور اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بڑے بڑے منصوبوں کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ

مسلّم ہے لیکن چھوٹے چھوٹے ترقیاتی پروگرام اگر قصبات اور دیہات میں شروع کئے جائیں تو ان کا فائدہ صحیح حقداروں کو جلد ہی پہنچ سکے گا۔

ہماری زراعتی ترقی کے لئے تیسری بڑی اہم ضرورت یہ ہے کہ کسانوں کو آسان اور معقول شرائط پر مزید قرضے دیئے جائیں۔ اب سے پہلے تک یہ دستور چلا آرہا تھا کہ کسان اکثر زمینداروں کے دست نگر رہتے تھے اور ان سے روپیہ قرض لے کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ اور فصل اٹھ جانے کے بعد یہ قرض ادا کر دیا جاتا تھا جو عموماً جنس کی شکل میں ہوتا تھا کسان جو روپیہ زمینداروں سے لیتے تھے اس کی سالانہ سود کی شرح بہت زیادہ ہوتی تھی جو کبھی کبھی تو پچاس فی صدی تک پہنچتی تھی، اور چونکہ کسانوں کے پاس کبھی بھی اتنا روپیہ نہ ہوتا تھا کہ اس قرض کو چکا دیں اس لئے وہ ہمیشہ اس بوجھ کے تلے دبے رہتے تھے، اگر اتفاق سے کسی کے پاس کوئی زمین کا ٹکڑا یا کوئی ڈھور ڈانگر ہوتا تھا تو یہ قرض خواہ زبردستی اس کو اپنے قبضے میں کر لیا کرتے تھے۔

آبادکاری اور زراعتی بنکوں نے کافی حد تک ان حالات کو بدل دیا ہے۔ آبادکاری بنک نے ان کسانوں کو جنھیں شاہی زمینیں تقسیم کی گئی ہیں تکنیکی مدد کے ساتھ ہی معمولی سود پر قرض دے کر کئی عمدہ مثالیں قائم کی ہیں اگر یہ قرضہ براہ راست بنک سے لیا جائے تو چھ فی صدی سالانہ سود ادا کرنا پڑتا ہے اور اگر یہی قرضہ دیہی تعاونی انجمنوں کے ذریعے حاصل کیا جائے تو سود کی سالانہ شرح نو فی صد ہوتی ہے۔

زراعتی بنک نے پورے ملک میں کئی جگہ اپنی شاخیں کھولی ہیں اور ان کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ بغیر کسی عذر کے کسانوں کو چھوٹے چھوٹے قرضے دے دیئے جائیں جس کے لئے تہران سے مراسلت کرنے کی بھی ضرورت نہیں چنانچہ اس بنا پر اب تک بہت سا روپیہ کسانوں کو قرض دیا جا چکا ہے۔

اس کے علاوہ آبادکاری اور زراعتی بنکوں نے کاشتکاری کے لئے روپیہ قرض دینے کا ایک اور حل نکالا ہے جس نے زراعتی قرضوں کے پورے نظام کو متاثر کیا ہے۔ کسانوں اور زمینداروں کو یہ اطلاعات ملنی شروع ہو گئی ہیں کہ یہ دونوں بنک نہایت آسان اور سادہ شرائط پر کاشتکاری کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں، گویا ساہوکاروں اور بنکوں میں ایک طرح کی رسہ کشی شروع ہو گئی ہے جس کی وجہ سے قرض دینے کے پرانے طریقے میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے کسانوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو سکیں لیکن جس قدر ان کو روپے کی ضرورت ہے اس کے مقابلے میں ہم ان کو بہت ہی قلیل رقم دے سکے ہیں۔ میری ذاتی زمینیں جیسے جیسے چھوٹے کسانوں میں تقسیم ہوں گی، آبادکاری کا بنک اسی رفتار سے قرض دینا شروع کر دے گا جو کاشتکار مالکان کی ضرورتوں کے لئے اشد ضروری ہے، اسی طرح زراعتی بنک کو چاہیئے کہ جوں جوں سرکاری اور غیر سرکاری

کسانوں میں تقسیم ہوں وہ اپنی سرگرمیوں کو زیادہ تیز اور وسیع کردے، اگر تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس بنک نے بہت زیادہ قرضے دیئے ہیں، اور گذشتہ سالوں میں بڑی بڑی رقمیں ان بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کی جیبوں میں چلی گئی ہیں جن کو در حقیقت سرکاری قرض یا مدد کی بالکل ضرورت نہ تھی اور یہ رقم انھوں نے ایسے کاموں میں خرچ کی ہے جس کا کاشتکاری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایران میں پرائیویٹ بنکوں کی تعداد بڑھنے سے روپے کے لین دین میں خاطر خواہ فائدہ ہوا ہے۔ میری رائے میں کوئی ایسی وجہ نہیں کہ یہ بنک امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے بنکوں کی طرح کاشتکاری کے میدان میں روپیہ قرض دینے کے معاملے میں کسی طرح پیچھے رہیں، لیکن چھوٹے چھوٹے زراعتی قرضوں کے لئے حکومت کو ہی پیشقدمی کرنی چاہیئے، اگر ان قرضوں سے اجتماعی فائدہ ہو تو اس خیال کو دماغ سے نکال دینا چاہیئے کہ تاخیر اور عدم ادائیگی کی صورت میں یہ بنک بند ہو جائیں گے۔ چھوٹے قرض دینے میں بھی تقریباً اتنا ہی وقت اور روپیہ صرف ہوتا ہے جتنا کسی بڑی رقم کے دینے میں۔ اگر کم شرح پر حکومت ہزاروں کسانوں کو روپیہ قرض دے تو اس سے نفع یا فائدے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا البتہ چھوٹے موٹے نقصانات کا امکان ہو سکتا ہے، یہاں یہ کہنے سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگ روپیہ لے کر واپس ہی نہ کریں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر تمام قرضے کی رقمیں وقت مقررہ پر واپس آبھی جائیں تو حکومت کو چاہیئے کہ اپنے پاس سے تلافی کرنے کے لئے تیار رہے تاکہ اجتماعی ترقی کے کاموں میں عدم ادائیگی رکاوٹ نہ بن سکے، چنانچہ امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں یہی طریقہ رائج ہے۔

ہماری زراعت کی چوتھی بڑی ضرورت پانی ہے چونکہ ایران کا شمار تقریباً خشک ممالک میں ہوتا ہے اس لئے پانی کی قلت کا مسئلہ ہمیشہ ہمارے سامنے رہتا ہے، ہمارے پانی کا سب سے بڑا منبع کوہستانی برف ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں پانی کی مقدار ضرورت سے زیادہ ہے۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر اور میدانوں میں جو برف گرتی ہے اور بارش ہوتی ہے اس سے بھی ہمیں کافی پانی مل جاتا ہے، ہمارے دریاؤں میں پانی برف کے پگھلنے سے آتا ہے اور جن پہاڑوں پر برف پڑتی ہے وہ سب کے سب ہمارے ملک کی حدود میں ہیں جو اتفاق سے ایک عجیب سی بات ہے کیونکہ بہت سے ممالک میں یہ صورت نہیں ہے مثال کے طور پر مصر کو ہی لے لیجئے۔ اس کی تمام ضروریات دریائے نیل کا پانی پوری کرتا ہے لیکن دریائے نیل کا سرچشمہ ملک سے باہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں گویا مصر اپنے استعمال کا پانی نیل کے ذریعے درآمد کرتا ہے۔

ہمارے پانی کے ضائع ہو جانے کی دو وجہ ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی وجہ زمین کا پانی سے کٹاؤ ہے جس کی وجہ سے پانی بہہ کر نکل جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت پر پورا پانی نہیں مل پاتا، چونکہ ہمارے ملک کے پہاڑوں پر سبزیاں اور گھاس پھونس نہیں اگتیں اس لئے پانی تیزی سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور اپنے ساتھ پہاڑوں اور

میدانوں کی مٹی بہا کرلے جاتا ہے جس کی وجہ سے زمین روز بروز بنجر اور پتھریلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ چراگاہوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال اور درختوں کا حد سے زیادہ کاٹنا بھی اس خرابی میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ اور ان سب باتوں کا اثر مل کر آب رسانی پر ہی آ پڑتا ہے۔

دوسری وجہ پانی کا کھاری پن ہے۔ بارش کا وہ پانی جو ہماری زمینوں کی سنچائی کرتا ہے جب بہتا ہوا نکلتا ہے تو اس میں بہت سا نمک گھل جاتا ہے، اس کے علاوہ ہمارے کھیتوں کے نیچے کی زمین میں بھی کافی نمک پایا جاتا ہے اگر ان کھیتوں کو ضرورت سے زیادہ پانی دے دیا جائے یا پانی کے نکاس کے لئے نالیاں اچھی طرح نہ بنائی جائیں تو نمک گھل کر سطح پر آجاتا ہے (بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ زیادہ سنچائی کرنا اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا کم پانی دینا) جس کی وجہ سے زراعت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

ایران کے علاوہ امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں جہاں کہیں زمین کے نیچے کا کھار سطح پر آگیا ہے وہاں اچھے اچھے سرسبز کھیت بنجر ہو کر رہ گئے ہیں، ان زمینوں کو دوبارہ قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ مقررہ مقدار میں ایک طرف سے پانی اس طرح سے دیا جائے کہ اس میں نمک گھل جائے اور دوسری طرف یہ پانی بہہ کر نکل جائے، پانی دینے سے قبل ضروری ہے کہ زمین میں نالیاں بنالی جائیں یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ کھیتوں میں نالیاں بنانے پر ہی اتنا خرچ آجائے جتنا سینچائی پر آسکتا ہے لیکن یہ خرچ آخر میں مفید ثابت ہوگا، اتفاق سے ہمارے ملک کی مٹی اسی طرح کی ہے کہ اس میں سے پانی آسانی سے بہہ کر نکل سکتا ہے اگر پانی کھیتوں کو مناسب مقدار میں دیا جائے تو ہمیں کھیتوں میں نالیاں بنانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر سائنٹفک طریقوں پر سینچائی کی جائے تو نہ صرف فصلیں کھار سے بچی رہینگی بلکہ زمین میں پہلے سے جو کمی یا خرابی رہی ہوگی وہ بھی دور ہو جائے گی۔

ساری تفصیل بتانے سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں زراعت کے لئے پانی کی کمی نہیں ہے بلکہ اصل دشواری یہ ہے کہ صحیح قسم کا پانی مناسب وقت اور صحیح جگہ پر نہیں ملتا، ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے ہم نے کئی طریقوں پر غور کیا ہے اوّل یہ کہ درخت لگا کر اور سبزیاں اگا کر ہمیں زمین کے بنجر پن کو روکنا ہے اور اس بات کا پورا دھیان رکھنا ہے کہ آدمی اور جانور اس کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرکے اجاڑنے کی کوشش نہ کریں دوسرے یہ کہ دریاؤں پر باندھ بنا کر باڑھ کے پانی کو روکا جائے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف ہم سیلاب کی مصیبت سے بچ جائیں گے بلکہ پانی کا ذخیرہ کرکے کاشتکاری کے کام میں بھی لاسکیں گے اور پہاڑوں اور میدانوں کی مٹی بھی بہنے سے بچ جائے گی اور زمین کا پتھریلا پن کافی حد تک رک جائے گا، تیسرے ہم کو چاہیئے کہ زمین دوز نہروں کی صفائی اور مرمت کرا کر ان کو زیادہ بہتر بنائیں اور آب رسانی کے اس طریقے کو مزید توسیع و ترقی دیں۔ زمین دوز نہروں کے ذریعے آب رسانی کا طریقہ صرف ایران میں رائج ہے۔ پہاڑی سرچشموں اور منبعوں سے ان نہروں کو ملا دیا جاتا ہے اور کھیتوں کے نزدیک یہ پانی جمع ہوتا رہتا ہے تقریباً اسّی فیصدی کھیتوں کی آبیاری اسی طرح کی جاتی ہے۔ چوتھے یہ کہ ہم گہرے کنویں کھود سکتے ہیں اور ان میں بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن سے پانی کھینچ سکتے ہیں

پانچویں یہ کہ پانی کو بخارات بن کر اڑنے سے روکا جائے، نہریں اس طرح بنائی جائیں کہ پانی رِس رِس کر ضائع نہ ہو اور زیر کاشت زمینوں کو ضرورت سے زیادہ پانی نہ دیا جائے۔ چھٹے یہ کہ کھیتوں میں نالیاں اس طرح بنائی جائیں کہ نمک سطح پر آ کر جمع نہ ہو بلکہ پانی میں گھُل کر ان نالیوں کے ذریعے نکل جائے۔ ساتویں یہ کہ ہم ایسی فصلیں اُگائیں جو کھاری پانی اور نمکین زمین کو برداشت کر سکتی ہیں جیسے رزقہ، روئی، ایکھ، چقندر، پالک کا ساگ اور دوسری سبزیاں یا سروے کی مختلف قسمیں جو کھار کا آسانی سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔ آٹھویں یہ کہ ہم کھاری پانی کو عام استعمال اور کاشت کے لئے میٹھے پانی میں سائنٹفک طریقوں سے بدل سکتے ہیں۔ نویں بات یہ (جو میں نیچے بیان کروں گا) کہ کس طرح ہم فی ایکڑ پانی کی مقدار کو بڑھا سکتے ہیں جس سے بطور مجموعی ہماری کاشت کی پیداوار میں اضافہ پانی کے یونٹ کی نسبت سے ہو سکے گا۔

بہتر کاشت کے لئے اوپر جو نو مختلف طریقے بیان کئے گئے ہیں ان پر کم و بیش پورے ملک میں عمل ہو رہا ہے لیکن آیندہ کے لئے جو میرا اندازہ اور توقعات ہیں اس کے مطابق ابھی تک ان کو بروئے کار نہیں لایا گیا ہے۔

وزارت زراعت کے محکمۂ جنگلات نے جنگلوں کے تحفظ و نشو و نما کے لئے بڑے مناسب وقت پر اپنا کام شروع کیا ہے، جن زمینوں پر زراعت کے جدید قسم کے ساز و سامان اور مشینوں کا استعمال شروع ہو گیا ہے وہاں کسان قابلِ زراعت زمینوں کی اہمیت اور ان کی حفاظت اور نگرانی کے طریقے بڑی دلچسپی سے سیکھ رہے ہیں، اس کتاب کی ساتویں فصل میں میں نے آبیاری کے بڑے منصوبوں کا ذکر کیا ہے۔ آبادکاری کا بنک، زراعتی بنک اور محکمۂ منصوبہ بندی تینوں مل کر اس مقصد کے تحت روپیہ اکٹھا کر رہے ہیں کہ زمین دوز نہروں کی مرمت کرا سکیں اور کنویں کھدوا کر ان میں برمے لگائے جا سکیں، یہ دونوں بنک اور وزارت زراعت تکنیکی مدد کے ذریعے منصوبہ بندی کے محکمے کی مدد کر رہے ہیں۔

وزارتِ زراعت نئے آبیاری کے طریقوں کے ساتھ کسانوں کو کھیتوں میں نالیاں بنانا اور ایسی فصلیں اُگانا سکھا رہی ہے جو کھاری پانی کو برداشت کر سکیں۔ یہ وزارت اور کرج ایگریکلچر فیکلٹی ان موضوعات پر علمی اور تحقیقی کام بھی کر رہی ہے، کھاری پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کا مسئلہ بہت سے ممالک کے سامنے ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس تہران یونیورسٹی میں منعقد ہوئی تھی جس میں پانی کا مسئلہ اور خشک زمینوں کی مشکلات کا معاملہ زیر بحث تھا۔ نسبتاً کچھ بڑے شہروں میں جیسے کویت کے دارالخلافہ الکویت میں اور قطر کے پایۂ تخت دوحا میں خلیج فارس کے کھاری پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر کے استعمال کیا جاتا ہے، وکیوم فلاسک کے ذریعے کو ہر روز کروڑوں گیلن پانی بخارات بنا کر اس قدر صاف کر دیا جاتا ہے کہ اس میں طبیعی مزہ پیدا کرنے کے لئے مزید نمکیات کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

میری رائے میں کھاری پانی کو میٹھے پانی میں بدلنا ایک نہایت ہی ضروری کام ہے اور جلد ہی سائنٹفک طریقوں سے یہ کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کر دیا جائے گا، اور ایران جیسے دوسرے ممالک میں بھی یہ پانی لوگ زراعت کے لئے و گھریلو ضرورتوں کے لئے استعمال کیا کریں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسی کون سی واحد چیز ہو سکتی ہے جو ہمارے زراعتی پانی کے مسئلے کو بھی حل کردے اور اسی کے ساتھ ہی قومی سطح پر اناج کی پیداوار میں بھی مزید اضافہ کرے۔ میری دانست میں اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ ہمیں کاشتکاری کے جدید طریقوں کو اپنا لینا چاہیئے تاکہ زراعت کی پانچویں بڑی ضرورت پوری ہوسکے۔ اگر ہم اپنے زراعت کے قدیم طریقوں میں تھوڑی سی بھی تبدیلی پیدا کرلیں تو پیداوار میں بے اندازہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

اس وقت ہماری تمام زراعتی زمین سے ایک تہائی زمین سالانہ زیر کاشت رہتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ کیمیاوی اور گوبر کی کھاد کی کمی ہے کیونکہ ایران کی طرح بہت سے ایشیائی ممالک میں جانوروں کا گوبر ایندھن کے کام آتا ہے۔ زراعت کے اوزار جو لوہے یا لکڑی کے ہوتے ہیں کسان خود ہی گھڑ لیتے ہیں۔ ہل عموماً لکڑی کا ہوتا ہے جس کے آگے البتہ لوہے کا پھل لگا رہتا ہے۔ کہیں کہیں لوہے کے دستے میں لکڑی کا پھل بھی دیکھنے میں آیا ہے، ان ہلوں میں اکثر بیلوں کو جوتا جاتا ہے ساحلی علاقوں میں جہاں کی آب و ہوا مرطوب ہوتی ہے وہاں بھینسوں سے بھی کام لیا جاتا ہے بیج بونے اور فصل کاٹنے کا کام عام طور پر ہاتھوں سے ہی کیا جاتا ہے۔ فصل کاٹ کر زمین پر ڈھیر کی شکل میں لگادی جاتی ہے جس کو بھوسا الگ کرنے کے لئے مویشی ہی روندتے ہیں۔

کاشتکاری کے اس فرسودہ نظام کو بدلنے کے لئے بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ زراعت کے کن نئے طریقوں کو اپنایا جائے۔ اور کس طرح لاکھوں کسانوں کو جن میں زیادہ تر ان پڑھ ہیں یہ سمجھایا جائے کہ دادا اور پردادا کے وقت کی چیزوں سے چمٹے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ زراعت کے میدان میں تحقیقات کا کام پورے زور و شور سے وسیع پیمانے پر کیا جائے۔

مثال کے طور پر اس بات پر غور کیا جائے کہ آخر ہر سال دو تہائی قابل کاشت زمین کیوں بیکار پڑی رہتی ہے اور اس پر کاشت کیوں نہیں کی جاتی، اس کی دو وجہ ہیں ایک تو کچھ حد تک پانی کی کمی ہے اور دوسری جو بہت اہم ہے وہ نائٹروجن کا نہ ہونا ہے، کسان زمین کو جوت کر دو سال سے چار سال کی مدت تک (اوسطاً تین سال تک) یونہی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اس میں جو سبزیاں اور پودے اُگیں وہیں گل سڑ کر نائٹروجن میں تبدیل ہو جائیں۔ لیکن یہ طریقہ کسی طرح مفید اور سودمند نہیں ہے کیونکہ زمین کو جب بغیر کاشت کے چھوڑ دیا جاتا ہے تو کوئی اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا چنانچہ زمین میں جتنی بھی نمی ہوتی ہے وہ بخارات بن کر نکل جاتی ہے اور جو خودرو پودے وہاں اُگتے ہیں وہ بھی نمی اور نائٹروجن کو کھینچتے ہیں جس کی وجہ سے نائٹروجن کی کمی کبھی پوری نہیں ہو پاتی۔

زمین کی اس کمی کو دور کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ کھاد کا اور خاص طور پر کیمیاوی کھاد کا استعمال کیا جائے اور زمین کی اچھی طرح جتائی کی جائے۔ کیمیاوی کھاد نہ صرف نائٹروجن کی کمی کو دور کردے گی بلکہ دوسرے اجزا جن کی زمین کو ضرورت ہوتی ہے وہ اور خاص طور پر گندھک بھی اس سے مل جائے گی، اس سے پہلے ہمارے کہ اندا زہ کھا

کی اہمیت کو نہیں سمجھا تھا اور چونکہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ کیمیاوی کھاد یا مٹی کا تیل خرید سکیں اس لئے گوبر کو ہی جلانے کے کام میں لاتے تھے، اگر کیمیاوی کھاد کے استعمال کے ساتھ صحیح طریقے سے فصلوں کو لوٹ پھیر کرکے بویا جائے تو زمین کو بیکار چھوڑدینے کی ضرورت نہ رہے گی، اور اس طرح ہر ایکڑ زمین پر پانی اور اناج کی اوسطاً سالانہ پیداوار پہلے سے کہیں زیادہ ہوجائے گی، ایرانی آب وہوا اور دوسری کیفیات کے پیش نظر جو ابتدائی تجربات کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ اگر کیمیاوی کھاد کا ٹھیک استعمال کیا جائے تو فی ایکڑ زمین پر چاول کی کاشت ہی پچاس فی صدی سے زیادہ بڑھ سکتی ہے اب ہمارے ملک میں کیمیاوی کھاد تیار ہونے لگی ہے اور قیمت اس قدر کم رکھی گئی ہے کہ چھوٹے کاشتکار بھی نقد دام دے کر خرید سکتے ہیں، اور اگر نقد روپیہ نہ ہو تو مناسب شرائط پر اپنے گاؤں کی تعاونی انجمن سے روپیہ قرض لے کر یہ کھاد حاصل کرسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے کسان کیمیاوی کھاد کا استعمال جلد ہی سیکھ جائیں گے اور اس کو پسند کریں گے۔

اس کے علاوہ اگر زمین کو اچھی طرح تیار کیا جائے اور اس میں عمدہ بیج ڈالا جائے تب بھی پیداوار کہیں زیادہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر پرانے قسم کے ہل کی بجائے جدید ساخت کا زمین کو ہموار کرنے والا ہل جس کو چوپائے ہی کھینچتے ہیں استعمال کیا جائے تو خام فصلیں جیسے روئی یا قند سازی کا چقندر پچیس فی صدی زیادہ حاصل ہوسکتی ہیں اگر کھیت کو ہل چلانے کے بعد بیج ڈالنے کے لئے اچھی طرح تیار کرلیا جائے تب بھی پیداوار میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے اس کے علاوہ اگر کسی کھیت کو اچھی طرح تیار کرکے مشین سے بیج ڈالا جائے تو اس طریقے سے اس کھیت کی نسبت جس کو لاپروائی سے جوت کر ہاتھ سے بیج ڈالا جائے ایک تہائی بیج خرچ ہوگا، زراعت کے نئے اصولوں کے مطابق اگر بیج بویا جائے تو ہر سال تقریباً پچھتر ہزار ٹن جَو اور دو لاکھ ٹن گیہوں جو صرف بیج کے طور پر استعمال ہوتا ہے بچایا جاسکتا ہے۔ جاپانی ماہرین کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر دھان کے کھیت اچھی طرح تیار کرکے جدید طریقوں سے بیج بویا جائے اور مناسب مقدار میں کھاد دی جائے تو دھان کی پیداوار دوگنی ہوسکتی ہے۔

اگر سینچائی کے لئے کھیتوں کو اچھی طرح تیار کیا جائے تو آبپاشی کے لئے اس وقت جتنا بھی پانی ہے اس کو دو طریقوں سے بچایا جاسکتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ اگر کھیت اچھی طرح تیار کیا گیا ہو تو اس میں سے پانی بخارات بن کر کم اڑتا ہے اور فصل بھی بہت عمدہ ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کم پانی سے زیادہ فصل اگائی جاسکتی ہے اور بچا ہوا پانی ان کھیتوں میں استعمال ہوسکتا ہے جو پانی کی قلت کی وجہ سے بیکار پڑے ہیں، دوسرے یہ کہ مشینوں کے ذریعے کھیت تیار کرنے میں پانی کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس طریقے سے بھی پانی بچایا جاسکتا ہے، ہمارے کسان کئی ہزار سال سے خشک زراعت کے طریقوں سے واقف ہیں۔ لیکن مشینوں کے ذریعے خشک زراعت کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ ایران کے بہت سے حصّوں میں بڑی بڑی زمینوں پر مشینوں کے ذریعے خشک زراعت ان ہی اصولوں

پر ہو سکتی ہے جو عام طور پر امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے خشک علاقوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ہزاروں ایکڑ زمین ایسی ہے جس کے متعلق تھوڑے عرصے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ یہاں بغیر پانی کے کاشت ممکن ہی نہیں لیکن اب مشینوں کے ذریعے یہاں خشک زراعت ہو سکتی ہے۔

درحقیقت ہمارے کسان اب زیادہ سے زیادہ خشک اور تر کاشتکاری کے لئے مشینوں کا استعمال کر رہے ہیں، اس وقت ہمارے کھیتوں میں تقریباً پانچ ہزار ٹریکٹر چل رہے ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے ملک کے بڑے بڑے صوبوں میں جیسے آذربائیجان، بحر خزر کے ساحلی علاقے۔ خوزستان اور تہران کے سرسبز میدانوں میں جگہ جگہ ٹریکٹر، اناج صاف کرنے کی مشینیں اور دوسرے میکانیکی اوزار نظر آئیں گے، مشرقی ممالک میں لکڑی کے ہلوں کا جو تصور تھا وہ اب بدلتا جا رہا ہے، اب اگر کہیں کسانوں کے ہاتھوں میں لکڑی کے ہل نظر آتے ہیں تو آنکھوں کو بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ہاتھ کے بنے ہوئے اوزار اب بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن ہم بڑی تیزی سے ان کو ترک کر کے مشینوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

خودرو پودوں کے اگنے، کیڑا لگنے اور دیگر آفات کی وجہ سے ہر سال ہماری فصلیں بڑی بھاری مقدار میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر آذربائیجان کے صوبے کو ہی لے لیجئے یہاں کے کچھ حصوں میں خودرو پودے اور گھانس سال بھر تک اگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے تقریباً اسّی فی صدی فصل تباہ ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ ٹڈی دل، زہریلے کیڑے مکوڑے اور درختوں کی مختلف بیماریاں بھی ہمارے اناجوں، روئی، سبزیوں، پھلوں اور خشک میووں کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان سب دشواریوں کو روکنے کے انتظامات کئے تو گئے ہیں لیکن ابھی اور بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ایران میں فصلیں کم اگنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں بیج پر خاص توجہ نہیں دی جاتی، پچھلی فصل کے جو گھٹیا اور معمولی دانے کسانوں کے پاس ہوتے ہیں ان ہی کو وہ بو دیتے ہیں جس سے پیداوار نہیں بڑھ پاتی۔ بیج کو بہتر بنانے کے لئے تھوڑا سا کام کیا گیا ہے جس کے نتائج بہت ہی عمدہ برآمد ہوئے ہیں۔ ہمارے کسان اچھے اور مختلف قسم کے بیج حاصل کرنے میں اچھی خاصی دلچسپی لے رہے ہیں، کیونکہ جب ان کو پرانے اور گھٹیا بیج سے اُگے ہوئے کھیت اور نئے عمدہ قسم کے بیجوں کی فصلیں ایک ساتھ دکھائی جاتی ہیں تو پیداوار کا فرق وہ خود ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں نئے اور اچھے قسم کے بیجوں کی طرف ان کا مائل ہونا ایک قدرتی امر ہے، میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کھیتوں اور فصلوں کی نمائش اور زیادہ کی جائے۔

زراعت کی ترقی کے لئے جو چند اصول میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کو پھلوں اور خشک میووں کی کاشت کے لئے بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک کو میووں اور پھلوں کی وجہ سے کئی صدیوں سے شہرت حاصل رہی ہے لیکن ہم نے ابھی تک باغبانی کے نئے اصولوں سے کچھ نہیں سیکھا ہے۔ مثال کے طور پر پھلوں کی بہتر قسموں

کی طرف ہماری توجہ بہت کم ہے۔ میوہ دار درختوں کو ہم شاید ہی کبھی کھاد دیتے ہوں۔ کیڑے مکوڑوں کو مارنے والی دوائیاں نہ چھڑک کر ہم ہر سال ہزاروں ٹن پھل اور میوے تباہ کر دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں پھل اور میوے بہت زیادہ مقدار میں پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بازار میں غیر ملکی سیب اور دوسرے پھل بکتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے زعفران کشمیر میں لے جانا۔

ہمارے ملک کے مویشی اور چوپائے بھی عمدہ اور نسل کے اعتبار سے اصیل ہیں، مثلاً ہمارے دُنبوں کا گوشت اور اون دونوں ہی ہر اعتبار سے اچھے مانے جاتے ہیں اور خاص طور پر قیمتی اور نفیس قالینوں میں جو اون استعمال ہوتا ہے وہ ان ہی دُنبوں کا ہوتا ہے۔ ان جانوروں کو ایسی سختیاں برداشت کرنے کی عادت ہے کہ اگر دوسرے ممالک کے مویشیوں کو اس حالت میں رکھا جائے تو یقیناً مر جائیں، لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے ہم چاہیں تو دوسرے ممالک کے اچھی نسل کے مویشیوں اور پرندوں کی اپنے ملک میں پرورش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے ملک میں سوئٹزرلینڈ کی مشہور کتھئی رنگ کی گایوں کے گلے پالنے شروع کر دیئے ہیں، اسی طرح ہم امریکہ کی لال رنگ کی مرغیوں کی نسل بڑھا رہے ہیں کیونکہ اس کے انڈے ایران کی مرغیوں کے انڈے کے مقابلے میں کافی بڑے ہوتے ہیں اور لوگ خوش ہو کر ان کو کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے کسانوں کے لئے مرغیوں کی یہ نسل کافی نفع بخش بھی ہے، لیکن ابھی اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے مویشیوں اور پرندوں کو سائنس کے اصولوں کے مطابق غذا دی جائے، غیر ملکی کسانوں کی طرح ایرانی کسان بھی یہ جان گئے ہیں کہ جو رائی اور تیپتیا گھاس کی فصلوں کے کیا فائدے ہیں ان سے نہ صرف جانوروں کو عمدہ چارہ اور چوگا ملتا ہے بلکہ بارش کے تیز پانی سے مٹی بھی نہیں بہتی جس کی وجہ سے زمین کا بنجر پن رُک جاتا ہے ہم نے ایک جانوروں کا ہسپتال بھی قائم کیا ہے جو سارے ملک میں گشت کرتا ہے، لیکن ہم کو اس پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جانوروں کی بیماریوں کی روک تھام کے لئے مزید اقدامات بھی کرنے چاہئیں۔

وزارتِ زراعت، وزارتِ تعلیم، ایگریکلچر کالج، تہران یونیورسٹی کا جانوروں کے علاج کا شعبہ، بنیادِ پہلوی، آبادکاری کا بنک، زراعتی بنک، وزارتِ داخلہ، وزارتِ تجارت کا ناپ اور تول کے اوزان کا محکمہ وغیرہ سب ہی کاشتکاری کو بہتر بنانے کے لئے تحقیقی کاموں میں یا اس کو ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں، ہمارے ان مختلف اداروں کے ساتھ کچھ غیر ملکی شعبے بھی ہماری ترقی و فلاح کے کاموں میں مشغول ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ایران کی زراعت کی بہتری اور ترقی کے لئے جو بھی کام ہم نے کیا ہے اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کے کاشت کے طریقوں کو ایکدم نہیں بدلا جا سکتا، اگر ظلم و زیادتی سے کام نہ لیا جائے تو زراعت کے اس پرانے نظام کو بدلنے کے لئے کافی وقت لگے گا، اسی کام کے لئے ہم کو کافی تحقیقات کرنی پڑیں گی تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ ایران کے موجودہ حالات کے تحت کس طرح جدید ترین زراعت کے طریقوں کو اپنایا جا سکتا ہے، ہمارے ملک میں

ایک دو نہیں ہزاروں گاؤں ہیں ان سب میں بیک وقت جدید ترین تحقیقات کے نتائج کا استعمال کوئی آسان کام نہیں لیکن ان سب مشکلات کے باوجود جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے ہمارے زراعتی میدانوں میں ترقی و توسیع ہو رہی ہے۔

زراعتی پیداوار کو بڑھانے کے ساتھ ہم کو یہ بھی سوچنا ہے کہ کس طرح اناج کو بہتر طریقوں سے خاص طور پر دیہاتوں میں حفاظت سے رکھا جائے۔ اناج کی حفاظت ہماری زراعت کی چھٹی بڑی ضرورت ہے۔ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں اس کام کے لئے نئی طرز کے اناج کو ذخیرہ کرنے کے برج اور کھانے کی چیزوں کو ٹین کے ڈبوں میں بند کرنے کے لئے کارخانے قائم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کا ناپ تول کے پیمانوں کا محکمہ ہمارے ملک کی برآمد ہونے والی چیزوں کا معیار بڑھا رہا ہے لیکن اس میدان میں ہمیں ابھی اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ہماری زراعت کی ساتویں بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پچاس ہزار دیہاتوں اور باہر کی دنیا سے تعلقات برقرار رکھنے کے لئے بہتر نقل و حمل کے وسائل کو ترقی دی جائے۔ فرض کیجئے کہ کسی گاؤں کی پیداوار اس کی ضرورت سے تھوڑی ہی زیادہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جدید ترین زراعتی طریقوں سے پیداوار دوگنی کردی جائے لیکن اس طرح پیداوار کے بڑھانے سے کیا فائدہ جبکہ اناج منڈیوں میں نہ پہنچ سکے۔ کیا ہمارے کسان دن رات محنت کرکے جدید قسم کے زراعتی سامان کی مدد سے پیداوار اس لئے بڑھائیں کہ جب یہ پک کر تیار ہو جائے تو اچھے وسائل نقل و حمل نہ ہونے کی وجہ سے یہ گاؤں میں ہی سڑ گل کر رہ جائے؟ پچھلی فصل میں میں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ملک کے اندر اور باہر نقل و حمل کے وسائل کو بہتر بنانے کے لئے ہم نے کیا اقدامات کئے ہیں۔ اس فصل میں بھی مناسب مقامات پر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ لوگ راستوں اور آمد و رفت کے ذرائع کی اہمیت سے غافل نہ رہیں۔

اب میں زراعت کی آٹھویں بڑی ضرورت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ہمیں چاہیئے کہ دیہات کے بسنے والے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنائیں۔ ہمیں اس بات کو نظرانداز نہ کردینا چاہیئے کہ ہمارے دیہاتوں میں بہت سی حسین اور دلکش چیزیں ہیں، جب میں کسی ایرانی گاؤں کا تصوّر کرتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ تصویر ابھرتی ہے کہ ایک بڑی حسین اور پرسکون جگہ ہے جس کی گلیوں میں دونوں طرف دور تک درختوں کی قطاریں چلی گئی ہیں بیچ میں نہر جاری ہے۔ درختوں کے پتوں میں سے دھوپ چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی ہے، کسانوں کے گھروں میں رنگ برنگے قالین بچھے ہوئے ہیں، تانبے پیتل کے چمکدار برتن دیواروں پر ٹنگے ہوئے ہیں۔ باغوں میں انگور کی بیلیں میوے سے لدی ہوئی ہیں۔ دوسرے پھلوں کی ڈالیاں بھی بوجھ سے جھول رہی ہیں، بوڑھے نہر کے کنارے آرام کر رہے ہیں عورتیں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں اور بچے پاس ہی کھیل رہے ہیں۔

اگرچہ میں اپنے دیہاتیوں کی غربت، بیماری اور ان کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے فکرمند رہتا ہوں لیکن اس حقیقت کا بھی مجھے اعتراف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص کبھی بھوکا نہیں رہتا، ان کی سادگی ان کی زندگی کی سب سے

بڑی نعمت ہے۔ دیہاتی زندگی کی اپنی خصوصیات ہیں۔ جہاں اجتماعی زندگی کا مرکز کسان کا کنبہ ہی ہوتا ہے، شہر کے بسنے والوں کی نسبت یہ دیہاتی ایک دوسرے کے ساتھ بڑی سادگی اور خلوص سے ملتے ہیں، ہمارے دیہاتی تمام زندگی ایک ہی کام کرتے ہیں اور وہ ہے پیداوار، یہ پیداوار خواہ اناج کی ہو، خواہ مویشیوں کی یا اپنے ہی بچوں کی۔

بہت سے لوگوں کو ایران کے دیہاتوں کی زندگی بڑی دھیمی اور پرسکون نظر آئے گی جہاں کبھی کوئی بڑا حادثہ یا معرکہ نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے کسان سارے سال اپنے کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ سورج چھپنے کے بعد گھر لوٹتے ہیں کبھی اپنے گاؤں کے معمولی چائے خانے میں چائے پی لی تو پی لی ورنہ کھانا کھا کر سو رہتے ہیں۔ اور صبح کو مرغ کی بانگ کے ساتھ اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے، اس دن یا تو مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں یا دھوپ میں بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہیں، اور اگر دھوپ میں تیزی ہو تو درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام کرتے ہیں ان کی بات چیت زیادہ تر موسم، کاشت اور ذاتی پریشانیوں کے بارے میں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اُس دوست کی بات بھی چھڑ جاتی ہے جو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے گیا ہوا ہے۔ عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور اگر گھر پر رہتی ہیں تو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں کھانا پکاتی ہیں اور اگر وقت بچتا ہے تو قالین بننے بیٹھ جاتی ہیں، جاڑوں میں جبکہ کھیتوں پر کام نہیں رہتا تو زندگی کی رفتار کافی سُست ہو جاتی ہے، ان دنوں مرد تو باہر کسی قہوے یا چائے خانے میں دن گذارتے ہیں اور عورتیں گھر پر اپنے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔

ہمارے کسان جس طرح کی زندگی گذار رہے ہیں وہ ان کے اعلیٰ اور مضبوط کردار کی دلیل ہے۔ میری آرزو ہے کہ ان کی زندگی کو نہ صرف جسمانی سہولتیں ملیں بلکہ ذہنی تقویت و ترقی کے بھی سب اسباب میسّر ہوں کیونکہ ان سہولتوں اور آسائشوں کے بعد ہی وہ دورِ حاضر کے عمدہ کاشتکار ثابت ہو سکتے ہیں اور ایرانی جمہوریت کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں بجلی پہنچانے، سڑکیں بنانے، اسکول کھولنے اور کسانوں کی صحت و صفائی کے کاموں کے علاوہ دوسری عوامی ضرورتوں کے متعلق میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں، یہ اقدامات نہ صرف اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے اقتصادی اعتبار سے مفید ہوں گے بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی دیہاتیوں کی زندگی پر اچھا اثر ڈالیں گے، اگر ہم غیر ممالک کی مثالیں اور اپنے محدود تجربات کو سامنے رکھیں تو پتہ چلے گا کہ بجلی کی طاقت ہماری دیہی زندگی میں انقلاب لا سکتی ہے، سڑکوں کے بن جانے سے نہ صرف کسانوں کی فصلیں منڈیوں میں پہنچ سکیں گی بلکہ ان کی وجہ سے ہمارے اجتماعی تعلقات بھی بہتر ہوں گے اسکولوں کے کھلنے سے اناج کی پیداوار ہی زیادہ نہ ہوگی بلکہ ہمارے کسانوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی ملے گی، صحت و صفائی کی سہولتیں نہ صرف دیہاتیوں کی جسمانی طاقت کو بڑھائیں گی بلکہ اس سے انہیں اپنی حفاظت کے جذبے کو تقویت ملے گی اور ذہنی اعتبار سے وہ اپنے کو زیادہ بہتر محسوس کریں گے۔

ہمارے ملک میں زیادہ گاؤں ایسے ہیں جن میں کم از کم ایک پنچایتی ریڈیو سیٹ ہے بلکہ کہیں کہیں زیادہ بھی نظر

آتے ہیں، چونکہ میں خود ایک پائلٹ ہوں اس لئے میں نے اپنی آنکھوں سے ہوائی جہاز چلاتے وقت بہت سے ایریل اُن گاؤں کی چھتوں پر دیکھے ہیں جہاں جہاں سے میں گذرا ہوں، دیہاتوں میں جیسے جیسے بجلی پہنچے گی لوگ زیادہ سے زیادہ ریڈیو سیٹ خریدیں گے، اس کے علاوہ بجلی کسانوں اور ان کی عورتوں کی جفاکشی اور سخت مشقت کو کافی حد تک کم کردے گی۔ بجلی کی موٹروں سے آٹا پیسنے کی چکیاں، کولہو، روئی اور اُون کاتنے اور بننے کی مشینیں اور لکڑی کے کام کی خرادیں آسانی سے چل سکیں گی اور تھوڑے وقت میں زیادہ سامان تیار ہو سکے گا۔ بجلی چھوٹی صنعتوں میں بھی کسانوں کی مددگار ثابت ہوگی اور اس سے نہ صرف دیہاتیوں کے مال کی پیداوار بڑھے گی بلکہ اس سے ان کا معیار زندگی بھی اونچا ہوگا۔

میں چاہتا ہوں کہ جیسے جیسے دیہاتیوں میں تعلیم پھیلے اگر سب دیہاتوں میں ممکن نہ ہو تو کم از کم ان میں جہاں نسبتاً آبادی زیادہ ہے لوگوں کے لئے ریڈنگ روم کھولے جائیں تاکہ وہاں جا کر ہمارے دیہات کے رہنے والے علمی، ادبی رسائل اور کتابیں پڑھ سکیں۔ اسی کے ساتھ گشتی کتابخانے بھی قائم کئے جائیں جو پورے ملک میں جگہ جگہ جا کر لوگوں کو پڑھنے کے لئے کتابیں دیں، بڑے بڑے دیہاتوں میں مستقل طور پر سینما کھولے جائیں، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے لئے گشتی سینما گھر جیسے اب بھی کہیں کہیں جاتے ہیں ہر گاؤں میں اور قصبے میں باری باری مقررہ وقت پر پہنچیں زیادہ آبادی والے دیہاتوں میں بوائے اسکاؤٹ اور گرلز گائڈ کے علاوہ اور بھی دوسری طرح کے کلب قائم کئے جائیں مجھے اُس دن کا انتظار ہے جبکہ ہمارے دیہات کے لوگ، گاؤں کی پنچایتیں اور دوسرے آبادکاری کے کام کرنے والے مزدور ان پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں گے۔

ہمارے دیہات کے رہنے والوں میں لاکھوں لوگوں کی تعداد ایسی ہے جن میں بڑی خوبیاں اور صفات ہیں اور سب سے بڑا ان کا وصف جذبۂ وطن پرستی ہے، جن لوگوں نے ہمارے کسانوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کی عادات واطوار کا مطالعہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ فطرتاً ذہین، ذی ہوش ہوتے ہیں اور تکنیکی باریکیوں کو سمجھنے اور نئی معلومات سے واقفیت پیدا کرنے کی ان میں لگن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میری رائے میں اس سے بڑی قربانی اور وطن پرستی کی کوئی اور دلیل نہیں ہو سکتی کہ ہمارے شہروں میں بسنے والے لوگ جو بڑے مہذب سمجھے جاتے ہیں ہمت کریں اور دیہات کے رہنے والوں کو اپنی مدد آپ کرنے کا اصول سکھائیں۔

اس فصل میں میں نے ایران کی زراعت کی آٹھ بڑی ضرورتوں کا ذکر کیا ہے، یعنی حقِ مالکیت کی اصلاح، زراعت کے کاموں کی تعلیم وتربیت، مناسب سود پر کاشتکاری کے لئے قرض دینا، کاشت کی زمینوں کے لئے میٹھے پانی کی فراہمی، کاشت کے بہتر طریقے اور بہتر کاشت سے فائدہ اٹھانا، فصلوں کو اچھی طرح ذخیرہ کرنا، کسانوں کی آمدورفت کے طریقوں میں سہولت پیدا کرنا، اور ذہنی اور جسمانی تربیت کے لئے مراکز قائم کرنا۔ مجھے امید ہے کہ ان صفحات میں میں نے

یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ ایرانی زراعت کا مسئلہ کوئی مبہم اور پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے مجھے بے انتہا مسرت ہے کہ میرے ملک کے لوگوں میں کاشتکاری کو بہتر بنانے کے لئے بہت زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے، لیکن صرف یہ جوش و خروش ہی کافی نہیں بلکہ ہم کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے اور اس عمل کی بنیاد گہرے مطالعات، اور اچھی طرح سوچے سمجھے اصول و پروگرام کے تحت ہو۔

میری نظریں ایرانی کسانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور جب کبھی میں ان کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک نہایت ہی حسین اور دلفریب منظر آجاتا ہے۔

۱۰۔۔۔ ایرانی اجتماع میں عورت کا مقام

کچھ عرصے لنکا کے شہر کولمبو میں ایشیا افریقائی خواتین کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی ہم نے اپنے ملک سے ایک نہایت ہی حسین و جمیل اور بڑی دلفریب عورت کو اپنے ملک کا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا جب وہ عورت کانفرنس میں شرکت کر کے واپس آئی تو اس نے بتایا کہ کولمبو کے ایک اخبار نے اس کانفرنس کی تائید کرتے ہوئے اپنے اخبار کی پڑھنے والی عورتوں کو یہ نصیحت کی تھی۔

"اے عورتوں تم سب ایک ہو جاؤ اس ایکتا میں تمہارا کچھ نہیں جائے گا سوائے اس کے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے شوہر سے محروم ہو جائے گی" دوسرے اخبار کے ایڈیٹر نے یہ مقالہ اپنے اخبار میں سپرد قلم کیا تھا۔

"عورتیں ہر جگہ موجود ہیں، حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں، سرکاری دفاتر میں، ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیوز میں، اسکوٹروں پر، کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں یہ مخلوق نہ ہو سوائے اپنے گھر کے اور کوئی کام ایسا نہیں جو یہ نہ کر سکیں بجز شوہر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش کے۔"

عورت خدا کی وہ مخلوق ہے جس کو مختلف اضداد کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں یہ مسئلہ بحث کا موضوع اور لوگوں کی پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے کہ عورتوں کے لئے کیا کام مناسب ہو سکتے ہیں، یہی مسئلہ اب ہمارے ملک میں بھی ابھر رہا ہے جہاں عورتیں تیزی سے ہر میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں، اس فصل میں سب سے پہلے میں ان عورتوں کا ذکر کروں گا جو میری زندگی میں آئیں اس کے بعد ایرانی عورتوں اور ان کے فرائض کے متعلق لکھوں گا۔

اگر میں کہوں کہ ایک کسان کی طرح بادشاہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اپنی نجی زندگی میں پوری آزادی سے رہے تو شاید کسی کو میری اس بات پر اعتراض نہ ہوگا، اس کتاب کے پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ حکومتیں

ایسی بھی ہیں جو شوہر اور بیوی کی نجی زندگی کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتیں لیکن خوش قسمتی سے مہذب ممالک میں ازدواجی زندگی کے رشتوں کو احترام سے دیکھا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کی جاتی میں بھی اپنی ازدواجی زندگی میں اسی اصول کا قائل ہوں۔

جس وقت میں سوئٹزرلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا اس وقت کچھ لڑکیوں کے نزدیک آنے کا مجھے موقع ملا تھا، لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے سرپرست کو یہ گوارا نہ تھا کہ میں صنفِ نازک کے زیادہ قریب رہوں، یورپ سے واپس آنے کے بعد جب میں نے اپنی تعلیم ملٹری کالج میں ختم کرلی تو میرے والد نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے واسطے کوئی مناسب دلہن تلاش کریں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے پیچھے دو مقصد تھے اوّل تو یہ کہ اُن کی خواہش تھی کہ میری شریکِ حیات کسی اعلیٰ اور شریف شاہی خاندان سے ہو اور دوسرے یہ کہ اس شادی کے ذریعے کسی ہمسایہ ملک کے شاہی خاندان سے قریبی اور مضبوط تعلقات استوار ہو جائیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد نے مصر کی شہزادی فوزیہ کی کہیں تصویریں دیکھ لی تھیں۔ اور شاید دِلوں کی قربت سے زیادہ کسی انجینئرِی منصوبے کی تکمیل کے تحت انہوں نے اس حسین و جمیل شہزادی کے متعلق چھان بین شروع کردی، سب سے پہلے تو لڑکی کے شجرۂ حسب و نسب کی تحقیق کی، اس کے بعد قاہرہ میں مقیم ایرانی سفیر کو حکم دیا کہ وہ اس سلسلے میں مصری حکومت سے رابطہ قائم کرے۔ چنانچہ ایرانی سفیر نے افسرانِ بالا سے اس سلسلے میں بات چیت کی اور انہوں نے اس کا تذکرہ شاہی خاندان سے کیا، میرے والد نے سرکاری سطح پر اس بات کی تصدیق کرائی کہ کیا مصر کی شہزادی کی شادی ان کے لڑکے سے طے پانا عین ممکن ہے، جواب "ہاں" میں دیا گیا۔ لیکن ان تمام واقعات کا علم مجھے ۱۹۳۸ء میں اس وقت ہوا جب کہ میری منگنی کا اعلان کیا گیا۔

اس سے قبل میں نے اپنی ہونے والی شریکِ حیات کی صورت تک نہیں دیکھی تھی، چنانچہ یہ طے پایا کہ اس کو دیکھنے کے لئے میں خود قاہرہ جاؤں، وہاں مجھے دو ہفتے ٹھہرنا تھا تاکہ میں شہزادی فوزیہ کی عادات واطوار سے اچھی طرح واقف ہو جاؤں، اس سلسلے میں کچھ آئینی اور قانونی رکاوٹیں بھی راستے میں آئیں اور بالآخر ہماری شادی کی باقاعدہ رجسٹری تہران اور قاہرہ میں ہوگئی۔ چونکہ ایرانی آئین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ولی عہد کے والدین ایرانی النسل ہونے چاہئیں اس لئے میرے والد نے اس آئینی شرط کی طرف توجہ دی اور ایرانی پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کرایا جس کی رو سے شہزادی فوزیہ کو ایرانی قومیت حاصل ہوگئی۔

ہماری شادی کی رسم قاہرہ میں ادا ہوئی۔ اور وہاں کے بہت بڑے جیّد عالم نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ اس تقریب میں میرے خاندان کا کوئی فرد شریک نہ تھا البتہ دلہن کے خاندان کے سب رشتے دار اور ایرانی حکومت کے افسرانِ بالا جو تہران سے آئے تھے اس شادی میں شریک تھے، ان مراسم کے بعد میں دلہن کو اپنے ساتھ تہران لے آیا۔

یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اسلامی ممالک میں بنیادی طور پر شادی کے ابتدائی مراحل تقریباً وہی ہیں جو مغربی ممالک میں رائج ہیں، صرف وقت کا تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، چنانچہ ایران میں یہ رسم ہے کہ منگنی اور نکاح کے دوران وقت کا کافی فاصلہ رکھا جاتا ہے۔ منگنی کے بعد لڑکا اور لڑکی بہت کم ایک ساتھ رہتے ہیں۔ منگنی کئی ماہ تک قائم رہتی ہے اور کبھی کبھی جیسا کہ مغربی ممالک میں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ منگنی دو تین سال تک رہتی ہے اس کے بعد اسلامی اصولوں کے مطابق نکاح ہو جاتا ہے اور نکاح کے رجسٹر میں باقاعدہ اس کا اندراج ہوتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ تمام کاروائی ایک ہی دن میں ہو لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ نکاح کے وقت ہی سب خانہ پری کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد شادی کا جشن منایا جاتا ہے جس کی مراسم ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی مغربی ممالک میں رائج ہیں۔ عام طور پر نکاح اور شادی کی تقریبات کے درمیان تھوڑے دن کا فاصلہ رکھا جاتا ہے جو کچھ ہفتے بلکہ چند ماہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس عرصے میں دولہا اور دلہن کا ایک ساتھ رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آخر کار خدا خدا کرکے وہ دن آتا ہے جب شادی کی خوشیاں پوری دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں، خاص طور پر دیہاتوں میں تو اب تک یہ رواج ہے کہ شادی کی دعوتیں دس دس روز تک چلتی رہتی ہیں، اس موقع پر گویّے خوب دل کھول کر گاتے بجاتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان کثرت سے ہوتا ہے (ان میں کسی طرح کی شراب شامل نہیں ہوتی) دولہا اور دلہن کو تحفے تحائف دئے جاتے ہیں جن میں مرغیاں، بھیڑ کے بچے، چاول اور دوسری اشیا سب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دلہن اپنے سُسر کے گھر آجاتی ہے اور اگر شوہر کی مالی حالت اچھی ہو تو میاں بیوی الگ رہنے لگتے ہیں

درحقیقت ہماری شادی کا جشن تہران میں منایا گیا اگرچہ بظاہر تو اس جشن میں بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت تھی لیکن اصلی معنوں میں یہ جشن ان تقاریب سے زیادہ مختلف نہ تھا جو ان موقعوں پر ایران کے دیہاتوں میں منایا جاتا ہے بس فرق اتنا تھا کہ چونکہ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی زندگی بہت مصروف ہے اس لئے اس میں بہت عجلت سے کام لیا گیا۔ شادی کی دھوم دھام اور دیگر مراسم کے بعد میں کچھ عرصے تک مرمر محل میں رہا، یہ محل میرے والد نے اپنے لئے تعمیر کرایا تھا چونکہ اس میں یزد کا سبزی مائل سفید پتھر استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہ مرمر محل یا کاخ مرمر کہلاتا ہے۔ اس کے بعد میں تھوڑے عرصے کے لئے اس محل میں مقیم رہا جہاں میرے والد گرمی کے دنوں میں قیام کرتے تھے یہ محل تہران سے باہر سعد آباد نامی مقام پر ہے، اس عرصے میں وہ محل بھی مکمل ہو گیا جو خاص طور پر میرے لئے بنوایا گیا تھا۔

ابھی شادی کو کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے، اور شہر تہران اتحادی فوجوں کی چھاؤنی میں تبدیل ہو کر رہ گیا، میرے والد کو سلطنت سے دست بردار ہونے کے لئے مجبور کیا گیا اور حکومت کی پوری ذمہ داری میرے کندھوں پر آگئی۔ یہاں مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ

باقاعدہ اور عیش سے ازدواجی زندگی بسر کرتا۔ اس وقت تہران کی ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی یہ حالت تھی کہ کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند دن کے لئے سیر و تفریح کے لئے گھر سے باہر چلا جائے۔ باوجود اس کے کہ ان دنوں عوامی خدمت کا دائرہ انتہائی محدود تھا لیکن میری شریکِ حیات نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے کچھ کام اپنے ذمے لے لئے۔

اس شادی کے بعد سب سے زیادہ مسرت بخش لمحہ میرے لئے وہ تھا جب ۱۹۴۰ء میں میری پیاری بیٹی شہزادی شہناز کی ولادت باسعادت ہوئی، اور یہ بات بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ ۱۹۵۹ء میں شہناز کے بطن سے شہزادی مہناز پیدا ہوئی گویا میں اپنی اکلوتی نواسی کا نانا بھی ہوں۔

کچھ ایسی وجوہات کی بنا پر جس کا جواب ابھی تک طب کے پاس نہیں ہے ملکہ فوزیہ اس قابل نہ رہیں کہ دوسرے بچے کو جنم دے سکیں اور یہ ہماری بدبختی تھی کہ اولادِ نرینہ کی سعادت سے ہم محروم رہے۔ ایرانی آئین کے مطابق ایک بادشاہ کا جانشین اس کا لڑکا ہی ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میری لڑکی بلکہ میری تینوں بہنیں بھی حقِ سلطنت سے محروم قرار دی گئیں۔ ہمارے آئین میں اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ شاہی خاندان کی وہ اولاد نرینہ جو قاجاری خاندان کی بیگمات کے بطن سے ہو ایران کے تاج و تخت کی وارث نہیں بن سکتی چونکہ میرے والد کی دو بیویاں قاجاری خاندان سے تھیں اس لئے میرے دو سوتیلے بھائی بھی اس حق سے محروم ہیں۔ میرا ایک حقیقی بھائی بھی تھا جس کا قاجاری خون سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن افسوس ۱۹۵۴ء میں ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو کر وہ مجھے داغِ مفارقت دے گیا۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان آئینی اور قوانینی مجبوریوں کی وجہ سے میرے مشیر اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے ہوں کہ میری بیوی کے بطن سے اولاد نرینہ پیدا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بنیادی آئین میں تبدیلی کی جا سکتی تھی لیکن رائے عامہ اس وقت بھی اس کے حق میں نہ تھی اور اب بھی نہیں ہے کہ ولی عہد کے تقرر کے بارے میں کوئی تبدیلی کی جائے۔

آئینی مسائل کے علاوہ اس وقت میں بالکل جوان تھا اور چاہتا تھا کہ میرے سامنے بھی کئی کئی بچے کھیلتے نظر آئیں چنانچہ جب ملکہ فوزیہ طویل عرصے کے لئے مصر گئیں تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں۔

ملکہ فوزیہ کو طلاق دینے کے بعد میں دو سال تک تنہا رہا۔ ہر ملک و قوم میں کچھ لوگ اور خاص طور پر ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو شادی بیاہ کرانے کے معاملات میں بیحد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ میرے سامنے بھی بہت سی کنواری لڑکیوں کے نام لئے گئے لیکن میں برابر ٹالتا رہا، آخرکار ۱۹۵۰ء میں میں نے ثریا اسفندیاری کا نام سنا اس کی شخصیت نے مجھے بیحد متاثر کیا اور میں اس میں دلچسپی لینے لگا۔ ان دنوں ثریا اسفندیاری انگلستان میں تھی چنانچہ میں نے اپنی بہن شہزادی شمس کو اس سے ملنے کے لئے انگلستان بھیجا۔ کچھ عرصے بعد میری بہن نے اس کے اوصاف اور کردار

نی خوبیوں کی تعریف تفصیل سے لکھ کر بھیجی اور آخر کار اسی سال کے آخری دنوں میں میری اور آئندہ کی ایران کی ملکہ کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔

میری منگیتر کے والد بختیاری قبیلے کے سردار تھے اور والدہ نسل کے اعتبار سے جرمن تھیں۔ بختیاری قبیلہ ایران کا سب سے بڑا قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ کچھ قبائلی بہت زیادہ سرکش تھے اور لوگوں پر ہر طرح کے ظلم وستم کو روا سمجھتے تھے اس لئے میرے والد نے ان کے ہتھیار چھین لئے تھے اور ان کو زیر کر کے مرکزی حکومت کے تحت لے آئے تھے۔ ان قبائلی سرداروں کو اختیار اور اقتدار کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہت افسوس تھا جن میں سے بعض بغاوت پر آمادہ ہو گئے جس کی وجہ سے ان کو کچھ عرصے تک تہران جیل میں بھی رہنا پڑا۔ اس کے باوجود ان سرداروں کو اپنے قبیلے کے اندرونی معاملات میں پوری آزادی تھی۔ یہ کئی گاؤں کے مالک تھے اور بڑے بڑے مویشیوں کے گلے رکھتے تھے۔ بعض قبائلی سردار اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے (یہاں تک کہ بعض عورتیں بھی کافی پڑھی لکھی تھیں) اور اپنے بچوں کو ملک سے باہر پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے۔

ثریا کے والد جناب اسفندیاری صاحب آغازِ جوانی میں ہی اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی چلے گئے تھے، جہاں ان کی ملاقات ثریا کی والدہ سے ہوئی اور ان کے دامِ عشق میں گرفتار ہو کر شادی کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے سُسر (ثریا کے نانا) زارِ روس کے عہد میں کسی کارخانے کے منیجر تھے لیکن پہلی جنگِ عظیم سے قبل اپنے وطن واپس آ گئے تھے۔ اسفندیاری صاحب اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ایران آئے اور چونکہ شہر اصفہان صوبے کا پایۂ تخت بھی ہے اور بختیاری قبیلے کے لوگ اس کو اپنا وطنِ عزیز بھی سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس شہر میں مقیم ہو گئے۔

اسی شہر میں ۱۹۳۱ء میں ان کے ہاں سب سے پہلی لڑکی یعنی میری آئندہ ہونے والی شریکِ حیات کی ولادت ہوئی کچھ سال بعد ایک لڑکے کا تولد مسعود بھی ہوا۔ اگرچہ ثریا کو اصفہان کے ایک جرمن مدرسے میں داخل کیا گیا تھا لیکن چونکہ اس کے گھر پر جرمن اور فارسی دونوں ہی زبانیں بولی جاتی تھیں اس وجہ سے اس کی تربیت ایرانی ماحول میں ہوئی۔ ایران کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اصفہان ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں ایران کی قدیم تاریخ و تمدن کے آثار کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یہ لڑکی تہذیب و تمدن کے اس گہوارے اور صدیوں پرانے تاریخی شہر میں پروان چڑھ رہی تھی، کچھ عرصے کے بعد اس کے والدین نے اس کو ایک ایرانی مدرسے میں منتقل کر دیا جہاں اس نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے والدین اس کو کئی بار یورپ لے کر گئے لیکن اصفہان کی زندگی، ان دیہاتوں کے ماحول نے جو اس کے والد کی ملکیت تھے اور اس کے اپنے قبیلے کے خانہ بدوش لوگوں کے سفر نے اس کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔

بالکل اس طرح جیسے میرے والد نے مجھے پڑھنے کے لئے سوئٹزرلینڈ بھیجا تھا اس کے والدین نے بھی اس کو

اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے اسی ملک کا انتخاب کیا، دو سال تک وہ بڑی ہنسی خوشی کے ساتھ ایک اسکول میں زیرِ تعلیم رہی ثریا فارسی اور جرمن زبانوں کے علاوہ فرانسیسی بڑی روانی سے بول سکتی تھی، انگریزی میں بھی تھوڑی بہت استعداد پیدا کرلی تھی لیکن اس زبان کو وہ بہت اچھی طرح سیکھنا چاہتی تھی، چنانچہ طے یہ پایا کہ سن ۱۹۵۰ء کا گرمی کا موسم وہ انگلستان میں گذارے، انگلستان میں میری بہن سے ملاقات کے بعد ثریا واپس ایران آگئی جہاں ہماری منگنی کا اعلان کیا گیا۔

ہم شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن ایک افسوسناک واقعہ پیش آگیا اور میری حسین و جمیل نازنین منگیتر ٹائیفائیڈ کے بخار کا شکار ہو گئی، اور اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ اس دوران میں نے کئی ہفتے تک راتیں جاگ کر گذاریں۔ کچھ دن بعد ثریا کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی، لیکن بیماری نے اس کو بری طرح کمزور و نڈھال کر کے رکھ دیا تھا، اور اسی وجہ سے ہماری شادی میں اس قدر تاخیر ہوئی، چنانچہ اس کی اس کمزوری اور نقاہت کے دوران ہم نے ایک دن یہ فیصلہ کیا کہ دفتری کارروائی اور نکاح کی رسم بڑی سادگی سے ادا کرلی جائے۔ نکاح کے وقت تک اس قدر لاغر ہو چکی تھی کہ اس کے لئے شادی کا جوڑا بھی سنبھالنا مشکل تھا اور جس وقت ہمارے اعزاز میں دعوت دی جارہی تھی اس وقت وہ بیہوش ہوتے ہوتے بچی۔

موسم سرما کا میرا رہائشی محل تہران میں ہے جنوری سن ۱۹۵۱ء میں میں اپنی نئی دلہن کو اس محل میں لے آیا۔ مغربی دنیا میں جو ماہ عسل (ہنی مون) کا تصور ہے اس کا رواج ایران میں نہیں ہے، بلکہ ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ دلہن کے رشتے دار اس کو دولہا کے گھر چھوڑ کر خود واپس آجاتے ہیں۔ جہاں وہ آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں لیکن میں اور ثریا چونکہ مغربی آداب و رسوم سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کے لئے ہم شہر سے باہر جاکر ہنی مون منائیں گے، لیکن ہماری یہ تدبیر تقدیر کو سازگار نہ آئی اور ملک میں سیاسی کشیدگی کی بنا پر ہنی مون کے پروگرام کو ختم کرنا پڑا۔ اس کتاب کی پانچویں فصل میں میں اشارہ بھی کر چکا ہوں کہ ہماری شادی کے کچھ عرصے بعد وزیرِ اعظم رزم آرا کو قتل کر دیا گیا، مصدق برسرِ اقتدار آیا جس کی وجہ سے غیر ملکی طاقتوں نے ایران کے مستقبل کے لئے خطرہ پیدا کر دیا، حالات نے اس وقت اس طرح رخ بدلا کہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہنی مون کے سفر کی بجائے میں اپنی شریکِ حیات کو ساتھ لے کر ملک کے باہر چلا جاؤں چنانچہ بغداد سے ہوتا ہوا میں روم پہنچا، یہ مانا کہ یہ سفر میں نے ہنی مون منانے کی غرض سے نہیں کیا تھا بلکہ حالات کا تقاضا تھا۔ البتہ اس سفر کی وجہ سے مصدق اور اس کے ساتھی جو ملک ایران کی دلہن سے سیاسی ہنی مون منانا چاہتے تھے اس آرزو کو پورا ہوتا نہ دیکھ سکے کیونکہ ہمارے ملک کے وطن پرست لوگ جلدی ہی سمجھ گئے کہ مصدق اور اس کے ساتھی ملک کو تباہی کی طرف کھینچ رہے ہیں چنانچہ انہوں نے نہ صرف مصدق بلکہ اس کے ساتھ جتنے بھی اس سازش میں ہم بستر تھے سب کو ابدی نیند سلا دیا۔

یہ تمام واقعات میری دوسری شادی کے چھ ماہ بعد پیش آئے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیاسی

بحران کا یہ زمانہ نہ صرف میرے اور میری شریک حیات کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے سخت آزمائش اور اضطراب کا زمانہ تھا، شروع شروع میں تو ہمیں یہ امید تھی کہ مصدق سیاسی امور میں مثبت راہ اختیار کرے گا، لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور مجھے مصدق کی منفی پسندانہ روش کے نتائج کی خبریں ملنا شروع ہوئیں تو میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا، ملک کے اقتصادی اور اجتماعی ترقیاتی کام بالکل بند ہو گئے۔ لوگ پریشان اور خوفزدہ تھے۔ ملک دشمن عناصر ہمارے قومی کاموں میں رخنہ اندازی کر رہے تھے اور تقریباً ہمارے ملک پر پوری طرح چھا گئے تھے۔

میرے نقطۂ نظر سے میرے لئے سب سے زیادہ سخت اور صبر آزما وہ زمانہ تھا جبکہ میں اس وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ جوابی کاروائی کے لئے قدم اٹھایا جائے، جن مخدوش اور پریشان کن حالات سے اس وقت ہم گذر رہے تھے اس کی تفصیل سے خبریں برابر میرے پاس آ رہی تھیں، جو خوفناک اور خطرناک منصوبے ہم کو بحیثیت ایک قوم کے مٹانے کے لئے بنائے جا رہے تھے اس کی ایک ایک اطلاع مجھے مل رہی تھی۔ وقت کی رفتار پہچاننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی جو عمدہ حس قدرت نے میرے والد کو ودیعت کی تھی اس کا کچھ حصہ مجھے بھی ورثے میں ملا ہے میں یہ بخوبی جانتا تھا کہ اگر قبل از وقت کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کے نتائج بہت ہی زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔ اور وہ ملک جو تیزی سے تباہی کی طرف جا رہا ہے میری عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پسپا ہو کر نہ رہ جائے۔

میں بخوبی جانتا تھا کہ خود اکیلا یا چند ساتھیوں کی مدد سے کچھ نہیں کر سکتا۔ جو فتنہ و فساد میرے سامنے تھا اس پر قابو پانے کے لئے ضروری تھا کہ مجھے عوام کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔ لیکن عوام کو خطرے سے آگاہ کرنے اور یہ جاننے کے لئے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور اس کے سدباب کے لئے وہ کیا چاہتے ہیں وقت درکار تھا، لیکن جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا میں دیکھتا تھا کہ جو افکار اور خیالات ملک میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں یا ہماری یکجہتی میں رخنہ اندازی کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف لوگوں کے جذبات اور خیالات زیادہ قوی اور مضبوط ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ قدرت ایزدی کو ایران کی فلاح و بقا منظور ہے اگر ایک طرف ملک بڑی تیزی سے فنا و بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا تو دوسری طرف لوگ پہلے سے کہیں زیادہ میرے ساتھ وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے اور تخریب کار عناصر سے مقابلہ کرنے کے لئے آپس میں متحد ہو گئے تھے لوگوں میں یہ جوش و خروش دیکھ کر میرا حوصلہ پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوتا تھا، میں جانتا تھا کہ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مجھے بہتری کی راہ بھی نظر آ رہی تھی، اگرچہ ہم ابھی تباہی و بربادی کی انتہا کو نہیں پہنچے تھے لیکن فلاح و بہبود کی راہ نکل آئی تھی جب کبھی مجھے پریشان کن خیالات گھیرتے تو مجھے اپنی شریک حیات کا خیال آجاتا کہ کس طرح اس نے بلند ہمتی سے کام لیا اور ٹائیفائڈ کے بخار کی وجہ سے جو بحرانی کیفیت اس پر طاری ہوئی تھی اس سے وہ نکل آئی تھی، اس واقعے کو سوچ کر خدا پر میرا ایمان پہلے سے کہیں زیادہ قوی ہو جاتا اور مجھے فوراً خیال آتا کہ انسانی طاقت سے کہیں اوپر ایک اور بھی طاقت

ہے جو ہماری اور ہمارے ملک کی تقدیر کو بنا رہی ہے۔ میں سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچا کہ میری تقدیر بھی خالقِ دوجہاں کے دستِ قدرت میں ہے اور جو کچھ ہونا ہے وہ کاتب تقدیر لکھ چکا ہے، اور جو کچھ اس نے لکھ دیا اس کے حکم کو مجھے بجالانا ہے۔ لیکن کسی کام کو کر گذرنے کے لئے ضروری ہے کہ خیالات اور توہمات سے نکل کر عملی طور پر قدم اٹھایا جائے، کامیابی کے لئے فیصلہ کن قدم بڑھانا نہایت ضروری ہے کیونکہ عمل ہی سب کچھ ہے۔

اس دنیا میں بعض بادشاہ اور کچھ ملکوں کے سربراہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے تمام کاموں کو تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔ اور خود بڑے عیش و نوش کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن میرا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے، اور مجھے عیش و عشرت کی زندگی قطعی ناپسند ہے، کیونکہ مجھے خالی بیٹھے رہنے سے بدہضمی کی شکایت ہونے لگتی ہے اس کے علاوہ یہ میرا ایمان ہے کہ جب تک انسان پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کوشش نہ کرے اور پورے طور پر عملی قوتوں کو بروئے کار نہ لائے تو رحمت ایزدی کا سزاوار نہیں ہو سکتا، اور وہ شخص بھی خدا کی عنایات سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ دیکھتا رہے کہ دیکھئے آسمان سے کیا اترتا ہے۔ ایک آدمی کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ مشیّتِ الٰہی اور تقدیرِ یزدانی پر ایمان کامل رکھتا ہو بلکہ اس کو چاہیئے کہ مسلسل کوشش کرتا رہے اور خدا نے روزِ ازل جو اس کی قسمت میں لکھ دیا اس کو اپنے افعال و اعمال سے پورا کرے۔ چنانچہ میرا بھی یہ فرض ہے کہ سیاسی اقدامات، اقتصادی بحالی اور اجتماعی تبدیلی کے لئے جد و جہد کرتا رہوں۔

میری شریکِ حیات کو سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی وہ تو بس یہی چاہتی تھی کہ میرے دُکھ سُکھ میں شریک رہے، جس وقت ملک کے حالات سازگار ہو گئے تو میرے اور ثریّا کے لئے سفر کے کئی موقعے نکل آئے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے ۱۹۵۶ء میں ہم کو روس جانے کی دعوت دی گئی، خروشچیف اور دوسرے روسی رہنماؤں نے ہمارا بڑا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہمارے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے، اس کے علاوہ ہم نے امریکہ، ہندوستان، ترکی، اسپین، لبنان اور دیگر ممالک کا بھی دورہ کیا۔ اگرچہ ان دوروں اور دعوتوں کا مقصد دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا لیکن اس طرح سے ہم کو ذرا دیر سے ہنی مون منانے کا موقع بھی مِل گیا۔

ہر ملک اور ہر جگہ کی عورتوں کی طرح ثریّا کو بھی اپنے گھر کو سجانے اور سنوارنے کا خاص سلیقہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارا موسم سرما کا رہائشی محل آرائش و زیبائش کے اعتبار سے بڑی اچھی حالت میں ہے لیکن ثریّا چاہتی تھی کہ اس کے بعض حصّوں کو اپنے مذاق کے مطابق نئے ڈھنگ سے آراستہ کرے اس کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ آرائش کے قیمتی سامان پر روپیہ فضول خرچ کرے بلکہ وہ چاہتی تھی کہ ہر چیز اپنی جگہ پر صاف اور ستھری ہو اور دیکھنے میں اچھی و خوبصورت معلوم ہو اس نے اسی طرح ہمارے موسمِ گرما کے رہائشی محل میں بھی بعض تبدیلیاں کیں۔

ثریّا میرے ساتھ ازدواجی زندگی میں سات سال شریک رہی اس عرصے میں اس کی دلچسپیاں اجتماعی

خدمات کے کاموں میں روز بروز بڑھتی رہیں ہمارے ہاں کافی عرصے سے ایک یتیم خانہ چلا آرہا ہے، ایک روز ثریا اس کے معائنے کے لئے گئی۔ اس یتیم خانے کی بدانتظامی اور یتیموں کی زبوں و افسوسناک حالت نے اس کو بے حد متاثر کیا، میں یہ منظر فراموش نہیں کر سکتا کہ اس نے جس وقت یہ واقعہ مجھے سنایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور اس نے رو رو کر مجھ سے درخواست کی کہ ان یتیموں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے میں فوری اقدامات کروں۔ چنانچہ میں نے فوراً بنیاد پہلوی کے ذمہ دار افسران کو حکم دیا کہ اس یتیم خانے کو اپنی تحویل میں لے لیں اور اس کی عمارت از سرِ نو تعمیر کرائی جائے۔ ثریا خیراتی انجمن، بنیاد پہلوی کی ہی ایک شاخ ہے چنانچہ کچھ عرصے بعد یہ یتیم خانہ ثریا انجمن کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اس تبدیلی کے بعد جو خوشی و خرمی کی لہر ان یتیم بچوں میں پائی گئی وہ میں نے شاید پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اب آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حکومت کی ذمہ داریوں اور آئینی مجبوریوں کے تحت جب میں نے ثریا کو طلاق دی ہوگی تو اس وقت مجھ پر کیا بیتی ہوگی اور اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی، شادی کو کئی سال گذر گئے اور ہمارے ہاں اولاد نرینہ کی شکل نظر نہ آئی، جیسے جیسے وقت گذرتا تھا مجھ میں یہ احساس زیادہ قوی ہوتا جاتا تھا کہ ایرانی قوم کے اعلیٰ مفاد کے لئے ایک ولی عہد کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ میرے بعض نزدیکی لوگوں نے بطور ہمدردی اور از روئے محبت یہاں تک کہا کہ ایک آدمی کے لئے ازدواجی زندگی ہر چیز پر فوقیت و برتری رکھتی ہے لیکن میرے لئے حکومت کی ذمہ داریاں زیادہ مقدم تھیں چنانچہ میرے مشیروں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور مارچ ۱۹۵۸ء میں مجھے ثریا سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

اس واقعے کے بعد میں تہران میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا رہا، کچھ دن کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر نئی ملکہ کا انتخاب عمل میں نہ لایا جائے تو ثریا کو طلاق دینے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن اس وقت میری ذہنی کیفیت اس طرح کی تھی کہ میں اس معاملے میں عجلت نہیں کرنا چاہتا تھا، ایک بار پھر میرے سامنے بہت سی لڑکیوں کے نام پیش کئے گئے اور دنیا کے اخبارات نے میری شادی کے متعلق بہت ہی بے سرو پا خبریں شائع کرنا شروع کیں شادی کے لئے اب مجھے ایسی لڑکی کی جستجو تھی جو نہ صرف میرے بچوں کی ماں ہی ہو بلکہ اجتماعی بیداری کے کاموں میں بھی میری شریک اور مددگار ثابت ہو، وہ میرے ملک کے غریب اور بدحال لوگوں کے گہرے احساسات و جذبات اور دلی تمناؤں کو محسوس کر سکے اور ایک عورت ہونے کی حیثیت سے وہ غریب و بے نوا لوگوں کے مستقبل کو سدھارنے میں اَن تھک کوشش ہی نہیں بلکہ خود کو ان کے لئے وقف کر دے۔

ایک روز میری پیاری بیٹی شہزادی شہناز میرے پاس آئی اس وقت اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اور اس کے شوہر نے ایک ایسی لڑکی دیکھی ہے جس میں وہ تمام اوصاف ہیں جو ایک ملکہ میں

ہونے چاہئیں۔ جو ایرانی غیر ممالک میں زیر تعلیم ہیں ان کے مسائل سے میرے داماد کو کچھ عرصے تک کافی دلچسپی رہی ہے، قیاس ہے کہ جس لڑکی کی بات ہو رہی تھی وہ میرے داماد سے اس کے دفتر میں ملنے اس غرض سے آئی تھی کہ وہ اپنی تعلیم کو فرانس میں جاری رکھ سکے، میری بیٹی نے اس کا نام فرح دیبا بتایا اور عمر اکیس سال۔

اس لڑکی کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت اور شخصیت کے متعلق واقفیت پیدا کرنا میرے لئے ایک طبیعی بات تھی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ باپ کی طرف سے اس کا تعلق تبریز کے ایک اعلیٰ اور نامور خاندان سے ہے اور ماں کی طرف سے اس کا سلسلہ گیلان کے بہت ہی معزز علماء کے خاندان سے جاملتا ہے۔ (فارسی میں "دیبا" ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں)۔ فرح دیبا کے دادا نے زار روس کے عہد میں روس کے ایک فوجی مدرسے میں تعلیم پائی تھی اور قاجاری دور میں ایرانی فوج میں ایک افسر کے عہدے پر مامور رہے تھے، فرح کے والد کی کچھ تعلیم روس میں ہوئی تھی اس کے بعد وہ فرانس چلے گئے جہاں انہوں نے بی اے کے مساوی قانون کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد انہوں نے فوجی خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا اور اسی وجہ سے سینٹ سیر ملٹری کالج میں داخل ہو گئے۔

فرح کے والد جب ایران آئے تو ان کو فوج میں کمیشن مل گیا اور تہران میں فوج سے متعلقہ قانونی امور ان کے سپرد کر دیئے گئے، یہاں ان کی ملاقات اپنی مستقبل کی شریک حیات سے ہوئی جن کے والدین ترک وطن کر کے تہران میں ہی سکونت پذیر ہو گئے تھے

فرح دیبا کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اس کا ہم عمر ایک چچازاد بھائی بھی تھا اس کے والدین بھی فرح کے والد کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی بہنوں کی طرح ایک ساتھ پروان چڑھے۔ فرح کو بچپن سے ہی باپ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا ابھی وہ دس سال کی ہی تھی کہ ان کا کینسر کی وجہ سے انتقال ہو گیا، اس کی والدہ نے بیٹی سے اس حادثہ کو چھپانا چاہا اور یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ وہ علاج کے لئے پیرس گئے ہیں، لیکن رشتہ داروں کے ماتمی لباس کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ حقیقت کیا ہے، رہی سہی کسر ملازمین نے پوری کر دی اور اس کو اس کے باپ کی موت کی خبر سنا دی جس کا اس کو انتہائی رنج ہوا۔

فرح نے اپنی ابتدائی تعلیم تہران کے اطالوی اسکول سے شروع کی اور دس سال کی عمر تک وہیں پڑھتی رہی اس کے بعد اس کی والدہ نے تہران میں ہی جان ڈی آرک[1] نامی لڑکیوں کے اسکول میں اس کو منتقل کر دیا، جہاں وہ سولہ سال کی عمر تک زیر تعلیم رہی، اس مدرسے میں وہ باسکٹبال ٹیم کی کپتان تھی اس کی ٹیم نے بہت سے انٹر اسکول مقابلوں میں شرکت کر کے انعامات حاصل کئے۔

جان ڈی آرک اسکول میں جب فرح زیر تعلیم تھی تو اس کا زیادہ تر وقت نقاشی اور منظر کشی میں گذرتا تھا چنانچہ اس کی ایک استانی نے اس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ نقاشی اور خاص طور پر واٹر کلر پر اپنی زیادہ توجہ صرف کرے۔

1. JEANND D'ARC

اس کی استعداد اور قابلیت کے جوہر آہستہ آہستہ نمایاں ہونے لگے اور اپنی استانیوں کی مدد سے یہ شرمیلی اور سمٹی سمٹائی دوشیزہ ایک باوقار اور ممتاز شخصیت کی مالک بن گئی، اب وہ اسکول کی تجربہ گاہوں کی دیکھ بھال میں بھی اپنی استانیوں کی مدد کرنے لگی۔ اسکول سے جو پکنک جاتی اس میں بھی وہ شریک ہوتی اب اس کو دوسروں سے بات چیت کرنے اور اسکول کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے وقت جھجک محسوس نہ ہوتی، اسکول میں جو زبردست نظم و ضبط تھا اس کا اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اس کی عزت دوسروں کی نظر میں اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی کہ وہ ایمانداری، اعتماد اور وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھتی تھی۔

فرح نے ثانوی درجے تک تعلیم رازی مدرسے میں حاصل کی، یہ مدرسہ مخلوط تعلیمی ادارہ ہے۔ جہاں کے زیادہ تر پڑھانے والے فرانسیسی ہیں اور فارسی کے علاوہ دوسرے تمام مضامین کی پڑھائی فرانسیسی زبان میں ہوتی ہے، وہ اپنی جماعت کی بہترین طالبہ تھی اگرچہ وہ تمام مضامین میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی لیکن اس کی اپنی پسند اور دلچسپی کے مضامین، ریاضی اور علوم طبیعی تھے۔ جس وقت وہ رازی مدرسے میں زیر تعلیم تھی اس وقت ایک اور فرانسیسی اسکول کے بوائے اسکاوٹ دستے کی لیڈر تھی۔

فرح کو کھلی فضا بہت پسند تھی۔ پہاڑ، دیہات، دیہات کی زندگی اور سمندر سے اس کو خاص لگاؤ تھا، اور اس لگاؤ کی بنا پر ہی اس کو نقاشی اور خاکہ کشی کا شوق ہوا۔ نقاشی کے اس ذوق و شوق نے ہی اس کے چچا کی توجہ کو جو ماہر فنِ تعمیرات تھے اپنی طرف متوجہ کیا اور ان ہی کے شوق و رغبت دلانے پر اس نے نقاشی میں اس قدر ترقی کی، اگرچہ شروع شروع میں اس کی یہ خواہش تھی کہ طب یا جراثیم شناسی کی تعلیم حاصل کرے لیکن نقاشی کے ذوق و شوق کی وجہ سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور فنِ تعمیر کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ اس نے فرانس کے مدرسۂ فنِ تعمیر[1] میں داخلہ لے لیا اور دو سال تک وہاں زیر تعلیم رہی، پہلے سال کے نصاب میں کالی روشنائی سے نقشہ کشی خاکہ نگاری اور مناظرِ قدرت کی نقاشی شامل تھی، اسی کے ساتھ اس نے ریاضی اور عمارتی مسالوں کی تیاری اور ان کی پائیداری کی تعلیم بھی حاصل کی، دوسرے سال میں اس نے حسین مناظر کی نقشہ کشی، آب رنگی نقاشی، کلاسیکل اور جدید عمارتوں کے چربے تیار کرنا بھی سیکھا، اس نے کچھ عمارتوں کے نقشے بھی تیار کئے اور خاص طور پر چھوٹے گھروں کے نقشے بنانے میں اس کو کمال حاصل تھا۔

مدرسۂ فنِ تعمیر کے طالبعلموں کی تعداد ڈھائی سو تھی، جن میں سے بہت سے ہاسٹل میں رہا کرتے تھے۔ لیکن فرح کی رہائش نیر لانڈی[2] کالج میں تھی۔ مدرسۂ فنِ تعمیرات کے اصول و ضوابط بہت سخت تھے، اتوار کا دن اور جمعرات کی دوپہر کو چھوڑ کر فرح اور دوسرے تمام طالبعلموں کو صبح اور دوپہر کے کھانے کے وقت حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرنے پڑتے تھے۔ کوئی بھی طالبعلم پانچ بجے سے پہلے مدرسے سے باہر نہیں جاسکتا تھا، فرح البتہ چھ بجے کے بعد تک بلکہ اکثر سات بجے تک

1. ECOLE SPECIALE D' ARCHITECTURE
2. COLLEGE NEER LANDAIS

مدرسے میں رہتی، اس کی اپنی لگن اور استادوں کی حوصلہ افزائی اس کو روز بروز زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر ابھارتی۔

اصول و ضوابط کی سختیوں کے باوجود پورے مدرسے کا اور خاص طور پر نقاشی کی کلاسوں کا ماحول بڑا خوشگوار تھا، فرح اس ماحول سے بیحد خوش تھی اور چونکہ موسیقی سے دلچسپی تھی اور آٹھ سال تک اس نے تہران میں پیانو بجانے کا ریاض کیا تھا اس لئے وہ اکثر پیرس کی رقص و سرود کی محفلوں میں بھی شرکت کرتی تھی۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں گرمی کی چھٹیاں گذارنے کے لئے فرح تہران آئی، ان ہی دنوں اس کی ملاقات میری بیٹی اور داماد سے ہوئی، انہوں نے اس کو شام کے کھانے پر مدعو کیا، معلوم ہوا کہ شہزادی شہناز اور اس کے بہت سے دوست مشترک تھے اور دونوں کی بہت سی دلچسپیاں بھی ایک سی تھیں۔

فرح کو ایک بار پھر دعوت دی گئی، شہزادی شہناز نے انتظام میں اس بات کا التزام رکھا کہ میں بھی اس دعوت میں شریک رہوں، پیرس میں چند ماہ قبل جبکہ ایرانی طلباء نے مجھے دعوت دی تھی میں فرح سے مل چکا تھا لیکن اس وقت لوگ اتنے زیادہ تھے کہ میں اس کو یاد نہ رکھ سکا، میری اس فراموشی پر وہ اب بھی بہت ہنستی ہے لیکن تفصیل سے میری گفتگو اس وقت ہوئی جب میں اس سے اپنے داماد کے محل میں ملا اور کافی دیر تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ایک ہفتے بعد میں نے فرح سے شادی کی پیش کش کر دی، خبر نگاروں کو تو خبریں گھڑنے اور اڑانے میں مزہ آتا ہے چنانچہ بہت سے ممالک میں یہ خبریں شائع ہوئیں کہ جس وقت میں فرح کو سیر کرانے کے لئے ہوائی جہاز میں لے جا رہا تھا تو میں نے اس سے شادی کی پیش کش کی، اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ خبر نگار یہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں گے گویا مجھے ہوائی جہاز کی پرواز اور عورت سے برابر کی دلچسپی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شادی کی پیش کش میں نے اپنے داماد کے گھر پر کی تھی البتہ اس پیش کش کے بعد ہم ایک دوسرے سے کئی بار ملے تھے۔

فرح دیبا چاہتی تھی کہ وہ اپنی شادی کا جوڑا پیرس میں تیار کرائے، سرکاری رسوم اور مہمانداریوں سے بچنے کے لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ فرح خود غیر سرکاری حیثیت سے فرانس جائے اور جب تک وہاں سے واپس نہ آجائے منگنی کا اعلان نہ کیا جائے، چنانچہ اس دفعہ فرح اپنے چند رشتے داروں کے ساتھ فرانس گئی۔

فرح کے تہران واپس آنے کے دو روز بعد ہم نے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا اور اس کے تین ہفتے بعد ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو اسلامی عقائد کے مطابق ہماری شادی ہو گئی ایرانی رسوم کے مطابق جب نکاح کے وقت فرح سے دریافت کیا گیا، کیا وہ میری زوجیت قبول کرتی ہے تو دو مرتبہ وہ خاموش رہی اور جب تیسری بار یہی سوال کیا گیا تو اس نے صرف "ہاں" کہا۔ شام کو پوری مشرقی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ گلستان محل میں مجھے اور فرح کو استقبالیہ دیا گیا، امورِ سلطنت اور سرکاری کاموں کی وجہ سے مجھے چند روز کے لئے ہنی مون پر جانے کے لئے تاخیر کرنا پڑی۔ آخر کار بحر خزر کے کنارے کچھ روز عیش و آرام کے ساتھ گذارنے کا مجھے بھی موقع مل گیا۔

اس سے قبل کہ میں فرح دیبا سے شادی کی پیش کش کروں میں نے اس کو بتا دیا تھا کہ ملکہ ہونے کے بعد اس

پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوں گی وہ اس سے بالکل مختلف ہوں گی جو اس نے فنِ تعمیر کی طالبہ کی حیثیت سے سیکھی ہیں۔ شادی کے بعد اس نے بڑے خلوص اور خوشدلی سے شاہی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا، جب میں پوری لگن کے ساتھ اسے اجتماعی مسائل کو سلجھاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے دلی مسرت بھی ہوتی ہے اور حوصلہ افزائی بھی۔ اور اسی کے ساتھ اس نے ایک اچھی بیوی کے فرائض کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

ہماری شادی کے چند ماہ بعد فرح کے خصوصی ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ فرح امید سے ہیں، اس خبر سے سب طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اکتیس ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء کو جب مجھے علم ہوا کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے اولاد نرینہ سے سرافراز کیا ہے تو میری خوشی کی حد نہ رہی، یہ ہنستا کھیلتا نونہال ولادت کے وقت آٹھ پونڈ گیارہ اونس کا تھا۔ میں خدا تعالیٰ کا صدق دلی سے شکر بجالایا، کیونکہ زچہ بالکل خیریت سے تھی اور اس کی خوشی و مسرت کا ٹھکانا نہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ شادی کے تجربات اور عام مشاہدات سے میں نے عورتوں کے خیالات اور طرزِ رفتار کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایرانی عورتیں جو اپنی فہم و فراست کے اعتبار سے دنیا میں بے نظیر ہیں اب اجتماع میں اپنا مقام پانے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں، جس دن میرے والد ایران کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے تھے اس وقت سے آج تک پینتیس سال گذر چکے ہیں، اس وقت سے اب تک ایران کی اجتماعی زندگی میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں، صاحب فہم و نظر لوگ شاہد ہیں کہ ایرانی زندگی میں جو نمایاں تبدیلی آئی ہے وہ عورتوں کی آزادی اور ان کی اجتماعی فلاح و بہبود ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اگر یہ عورتیں چاہیں تو اپنے شوہر، اپنے بچوں اور اپنے ہموطنوں کی زندگی کو بہتر بنا سکتی ہیں، ان کو چاہیئے کہ اجتماعی ضروریات کو سمجھیں اور جو بھی اس وقت سہولتیں ان کو فراہم ہیں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

قدیم ایرانی روایت کے مطابق مرد اور عورت ایک پیڑ کے دو پھل ہیں جن کو قدرت نے ہر اعتبار سے برابر کا بنایا ہے، تخلیق کے بعد سب سے پہلا خیال جو ان کے ذہنوں میں آیا وہ یہ تھا کہ ہر ایک دوسرے کی خوشی اور مسرت کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ عورتیں جن پر ہمارے ملک کی آدھی آبادی مشتمل ہے مردوں پر گہرا اثر رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر بقول پلوتارک جب ماد قبیلے کے لوگ کوروش اعظم کی فوجوں سے شکست کھا کر بھاگے تو ایک شہر میں پناہ لینی چاہی، وہ شہر کے دروازوں میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں دروازوں پر عورتیں جمع ہیں اور چیخ چیخ کر غیرت دلا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اے بھگوڑو کہاں گھسے چلے آرہے ہو جاؤ تم جیسے بزدلوں کے لئے ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے، یہ سن کر ان بھاگے ہوئے سپاہیوں کو غیرت کی وجہ سے جوش آگیا چنانچہ اُلٹے پاؤں میدانِ جنگ کی طرف لوٹ آئے اور دشمن کو شکست دے کر ہی دم لیا، اس واقعہ سے کوروش اعظم اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے یہ دستور بنالیا کہ جب کبھی اس شہر سے گذرتا تھا تو ہر عورت کو ایک سونے کا سکہ دیتا تھا۔

عربوں کے ایران پر حملے سے کچھ عرصے پہلے دو ایرانی عورتوں نے ایران پر تھوڑی مدّت تک حکومت کی ہے، عربوں کی فتح اور ملک میں دینِ اسلام کی ترویج کے بعد بھی، ایرانی اجتماع میں عورتوں کی قدر و منزلت کسی طرح کم نہ ہوئی، ہر عورت کے اثر اور دبدبے کا انحصار اس کی اپنی شخصیت پر ہوتا تھا کیا زمانۂ قدیم میں اور کیا عہدِ حاضر میں عورتوں کا اثر و رسوخ پورے خاندان کی زندگی پر رہا ہے اور ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر میں اس کی مثالیں بھی دے سکتا ہوں، میرے والد سے زیادہ قوی ارادہ کسی اور مرد کا ہونا مشکل ہی تھا لیکن اس کے باوجود گھریلو معاملات میں میری والدہ کی ہی بات مانی جاتی تھی۔

دراصل ایرانی گھروں میں عورت ہی ایک طرح سے پورے خاندان پر حکمرانی کرتی ہے، لڑکے زیادہ تر اپنی ماؤں کے اشاروں پر ہی چلتے ہیں اور اپنے ذاتی معاملات میں بھی ماں سے ہی مشورہ کرتے ہیں۔ سن ۱۹۳۰ء کے آس پاس ایک انگریز خاتون نے ایرانی عورتوں کے بارے میں لکھا تھا "ایران میں سب ہی لڑکے نہایت سعادت مند اور خدمت گزار ہوتے ہیں اور اپنی ماؤں سے بیحد عقیدت رکھتے ہیں" اور بغیر کسی مبالغے کے حقیقت بھی یہی ہے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں بھی اپنی والدہ کے احسانات کا مرہونِ منّت ہوں بچپن میں میں جب کبھی بیمار ہوتا تو وہ بیچاری میری پٹی پکڑے رات رات بھر جاگتی رہتیں۔ اب بھی جب کبھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اب بھی قرآن شریف سر پر اٹھائے کھڑی ہیں اور خدا سے میری صحت اور تندرستی کی دعا مانگ رہی ہیں۔ یہ ان ہی کی ذاتِ بابرکات تھی جس نے میری زندگی میں کئی بار سیدھے راستے کی طرف میری راہنمائی کی اور پورے عزم و ارادے سے مجھے اس پر چلنا سکھایا۔

اپنی شخصیت کے اعتبار سے ہر ایرانی عورت کا اپنے خاندان پر گہرا اثر و رسوخ رہا ہے۔ اور کبھی کبھی ان کا یہ اثر و رسوخ خاندان کی تباہی کا باعث بھی ہوا ہے۔ میری رائے میں یہ بات بالکل ہی بے بنیاد ہے کہ ایرانی عورتیں اپنے حقوق سے محروم رکھی گئی ہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مغربی ممالک میں جو حقوق ان کی بہنوں کو حاصل ہیں اِن کو اُن سے کچھ زیادہ ہی ملے ہوئے تھے، مثال کے طور پر ایرانی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جائداد پر پورے طور پر قابض رہے اور بغیر کسی غیر کی مداخلت کے وہ جس طرح چاہے اس کو تصرف میں لائے اپنے شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ ایک ایرانی عورت کسی بھی مغربی عورت سے زیادہ اپنے دوسرے رشتے داروں کی نگہداشت اور پرورش کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اب ایران سے متعہ کی رسم ختم ہوتی جا رہی ہے لیکن متاعی عورتوں کے حقوق کی اور خاص طور پر ان کو مالی امداد کا پورا پورا یقین دلایا جاتا ہے، یہ سلوک مغربی ممالک میں داشتاؤں کے ساتھ شاید ہی روا رکھا جاتا ہو، اگرچہ یورپ میں ناجائز اولاد باپ کے ترکے سے محروم رکھی جاتی ہے لیکن ایران میں متاعی عورتوں کے بچوں کو وہی حقوق دیئے جاتے ہیں جو ایک منکوحہ بیوی کی اولاد کے ہوتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود ماضی میں ہماری عورتوں کی زندگی ایک مخصوص دائرے تک محدود تھی، اور یہ ایک عجیب تضاد تھا کہ جو عورت اپنے مقام و مرتبے کے اعتبار سے جتنی ہی بڑی ہوتی اس کی آزادی کم ہوتی چلی جاتی اور اس کو پرانے رسم و رواج کا سختی سے پابند ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک کی قبائلی اور دیہاتی عورتیں پردہ نہیں کرتیں (خاص طور پر ملک کے شمالی اور مغربی حصّوں میں) لیکن اب سے کچھ سال پہلے تک ایرانی شہروں میں شرفا کی عورتیں بغیر برقع اوڑھے گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھیں حتیٰ کہ گھر پر بھی ڈیوڑھی تک بغیر برقعے کے نہیں جا سکتی تھیں، بس زنانخانہ ہی ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں وہ بغیر برقع کے بیٹھ سکتی تھیں۔ البتہ دیہاتوں میں عورتیں اپنے نزدیکی رشتے داروں اور برادری کے لوگوں سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور قریبی رشتے دار ایک ساتھ ہی ایک گھر میں رہا کرتے تھے لیکن شہروں میں امیروں اور دولتمندوں کے مکانوں کے چاروں طرف پردے کی دیوار ہوتی تھی گھر کے اگلے حصّے کو مردانہ کہتے تھے اور پچھلے حصّے میں زنانخانہ ہوتا تھا جہاں صرف گھر کے مالک کی ہی پہنچ ممکن تھی۔ دیہاتی عورتیں گھر کے باہر بھی ایک جگہ جمع ہو سکتی تھیں اور گھر کے کام کاج کے سلسلے میں دوسروں کے گھر آجا بھی سکتی تھیں۔ لیکن شہروں میں امیروں کی بیویاں اور متاہی عورتیں رہتی تو بڑے عیش و عشرت سے تھیں لیکن ان کی زندگی حویلی کی چار دیواری تک محدود تھی جہاں ان کے لئے باتیں بنانے اور جوڑ توڑ کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ تھا اور سب سے بدتر یہ کہ ان حویلیوں اور محل سراؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ذہنی پرورش نہ ہو پاتی تھی کیونکہ وہ اپنے بچپن کا زمانہ اُسی گھُٹے ہوئے ماحول میں گذارتے تھے اگرچہ غیر ملکی سیاح جو ایران آئے ہیں انہوں نے ان بچّوں کی تمیز داری اور تربیت کی بہت تعریف کی ہے لیکن ان بچّوں کی پرورش اس قدر ناقص ہوتی تھی کہ وہ مشکل ہی سے اجتماعی زندگی میں کامیاب انسان بن پاتے تھے۔

شادی بیاہ کے معاملوں میں بھی مختلف طبقوں میں رسم و رواج الگ الگ تھے، اگرچہ شادی کی ذمّہ داری والدین کے سر ہوتی تھی اور وہی لڑکے کا انتخاب کرتے تھے لیکن دیہاتوں میں لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق پہلے سے بہت کچھ جانتی تھیں، مجھے ایک بہت ہی قدیم گاؤں کا ایک واقعہ یاد ہے جہاں ایک لڑکی شادی سے پانچ سال قبل اپنے ہونے والے شوہر سے واقف تھی۔ اور کبھی کبھی کاموں میں اس کا ہاتھ بھی بٹا دیا کرتی تھی اس کے مقابلے میں اعلیٰ طبقوں میں ہونے والے شوہر سے بات کرنا تو درکنار منگنی سے پہلے کوئی لڑکی اپنے منگیتر پر نظر بھی نہیں ڈال سکتی تھی، دونوں میں میل جول اور باہمی ارتباط شادی کے بعد ہی ممکن تھا، یہاں مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آگئی، اس کی بیوی اس کو اکثر چھیڑا کرتی ہے اور مذاق میں کہتی ہے کہ کیا اچھا ہوتا کہ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کو چپکے سے ہی دیکھ لیتے۔ میرا دوست ہنس کر جواب دیتا کہ شادی کے بعد جی بھر کر دیکھنے کے سوا ہے ہی کیا۔

جس وقت میرے والد تخت سلطنت پر متمکن ہوئے انہوں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایرانی عورتوں کو جو رسم و رواج کی بندشوں میں جکڑی ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے پوری قوم بدحالی میں مبتلا ہے آزاد کرا کر ہی دم

لیں گے ان کا مقصد تھا کہ ایرانی عورتوں کے خیالات میں روشنی آئے، اور اجتماع میں سمجھ دار ماؤں اور اچھے شہریوں کا اضافہ ہو، تاکہ وہ اپنے بچوں میں اخلاقی فضائل، اجتماعی تربیت پرورش کے ساتھ پیدا کر سکیں۔

جس وقت میرے والد نے زمامِ حکومت سنبھالی اس وقت چند ہی لڑکیاں اور عورتیں ایسی تھیں جن کو خواندہ کہا جا سکتا تھا اور آج کے تعلیم کے معیار پر تو ایک بھی پوری نہ اُترتی تھی، اِن لڑکیوں میں سے کچھ نے تو محلّے کے ملّاجی سے پڑھنا سیکھا تھا، کچھ کو تعلیم غیر ملکی مبلّغین نے دی تھی اور کچھ ایسی بھی تھیں جن کو گھر پر آکر آیائیں اور اتائیں پڑھایا کرتی تھیں، لیکن اِن پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد پورے ملک کی آبادی کے تناسب سے ایک فی صدی سے بھی کم تھی، میرے والد نے بڑی لگن اور کوشش سے کئی سرکاری مدرسے لڑکیوں کے واسطے کھولے۔ چونکہ ملک میں پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد بہت کم تھی اس لئے استانیوں کا ملنا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا چنانچہ اس مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے میرے والد نے ٹیچر ٹریننگ کالج قائم کئے۔

میرے والد نے چونکہ عورتوں کی بہتری اور ترقی کے ذرائع فراہم کئے تھے اس لئے ان کی مخالفت بھی کی گئی، لیکن انہوں نے اپنی فطری شجاعت و دوراندیشی سے کام لے کر جتنی بھی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں سب کو صاف کر کے راستہ بالکل ہموار بنا دیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۸ء میں جب میری والدہ حضرت معصومہ کی زیارت کے لئے شہر قم گئیں (یہ تہران سے نوّے میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مقدس شہر ہے)۔ اور مسجد میں داخل ہوئیں تو باوجود اس کے کہ انہوں نے اور اُن کے ساتھ جتنی خواتین تھیں سب نے اپنے جسموں کو برقعوں سے ڈھانپ رکھا تھا لیکن برقعے لبادے میں ذرا چھوٹے تھے اس لئے متعصب مُلّاؤں نے یہ کہہ کر کہ ستر پوشی اچھی طرح نہیں کی گئی ہے، سب کو آڑے ہاتھوں لیا اور نہایت ہی سخت سُست کہا، میرے والد کو جس وقت اس امر کی اطلاع تہران میں ملی تو وہ کئی ٹرک فوجی سپاہیوں کے لے کر قم پہنچ گئے۔ اور وہاں کے متولی کی اچھی طرح گوشمالی کی اور اس توہین کی معقول سزا دی۔ اس واقعہ کے بعد میرے والد نے پردے کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ سن ۱۹۳۱ء تک بہت سی اونچے گھرانے کی عورتوں نے ان کے شوق اور ترغیب دلانے پر گھروں پر شادی بیاہ کی تقریبوں میں اور مخلوط پارٹیوں میں یورپین خواتین کا لباس پہننا شروع کر دیا۔ اور کچھ دن بعد کچھ عورتیں سڑکوں پر بھی بے پردہ نظر آنے لگیں۔ ۱۹۳۵ء تک استانیوں اور اسکول میں پڑھنے والی بچیوں کے لئے برقعے کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا، اس کے علاوہ فوجی افسروں کو بھی پردہ پوش عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے پر پابندی لگا دی گئی، آٹھ جنوری ۱۹۳۶ء کو انہوں نے نہایت ہی فیصلہ کن جراءت مندانہ قدم اٹھایا اور میری والدہ اور دونوں بہنوں سے ایک بہت اہم سرکاری جشن میں بغیر برقعے کے شرکت کرنے کے لئے کہا، جس دن میرے والد نے میری والدہ اور بہنوں سے برقعہ اتار کر جشن میں چلنے کو کہا تھا اس دن تقسیم اَسناد کا جلسہ ہونے والا تھا اور جن استانیوں نے تعلیم و تربیت کا کورس مکمل کیا تھا ان کو ڈپلومہ دیا جانا تھا، میری رائے میں پردے کی رسم کو ترک کرنے کے لئے یہ دن نہایت

مناسب تھا، میرے والد صاحب لمبی تقریر کرنے کے عادی نہیں تھے اس دن جو انہوں نے مختصر تقریر کی تھی اس میں انہوں نے کہا تھا۔

"مجھے بیحد مسرت ہے کہ عورتوں نے علم کی روشنی میں اپنے مقام کو پہچان لیا ہے۔ اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اجتماع میں ان کے کیا حقوق و اختیارات ہیں۔۔۔ چونکہ اجتماع نے عورتوں کو اپنے سے خارج کر دیا تھا اس لئے ان کو اپنی استعداد و قابلیت دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان کو مادر وطن کی خدمت سے محروم رکھا گیا اور جو اپنے ہموطنوں کی خدمت وہ انجام دے سکتی تھیں اس کے لئے ان کو سامنے نہیں آنے دیا، لیکن اب حالات بدل گئے ہیں تم اس وقت ایک اچھی ماں ہی نہیں ہو بلکہ تم کو اس سے زیادہ حقوق و مراعات دئے گئے ہیں۔ اس بات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا چاہیئے کہ اس ملک کی آدھی آبادی کا ملک کی ترقی اور قوم کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں ہے۔"

جہاں تک مجھے علم ہے ایران کی عصر حاضر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عورتیں کسی سرکاری جلسے میں بغیر پردہ کئے شریک ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مہم کو کامیاب بنانے میں میرے والد پیش پیش تھے، لیکن میری والدہ اور بہنوں کی ہمت کی بھی آپ داد دیجئے کیونکہ انہوں نے صدیوں پرانی اس روایت کا مقابلہ کیا تھا جس کی پشت پر عوام اور علمائے دین کا طبقہ تھا۔ لیکن رضا شاہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک کے ترقی پسند اور بہی خواہ لوگ، علماء کا سمجھدار طبقہ اور وہ روشن خیال افراد جو غیر ممالک میں یا ان اسکولوں میں پڑھے ہیں جو غیر ممالک کے تحت تہران میں چل رہے ہیں اس نظریئے کی ضرور حمایت کریں گے، یہ تجربہ انتہائی کامیاب ثابت ہوا جس کے بعد میرے والد نے پردے کا استعمال قطعی طور پر ممنوع قرار دیا، اُن کا سختی سے یہ حکم تھا کہ کوئی عورت نقاب یا برقع نہ استعمال کرے اگر کوئی عورت سڑک پر برقع اوڑھے نظر بھی آتی تو جو بھی اس کے سب سے نزدیک پولیس کا سپاہی ہوتا اس سے یہ درخواست کرتا کہ اپنا برقع اتار دے اور اگر کوئی عورت برقع اتارنے سے انکار کرتی تو زبردستی اتروا دیا جاتا۔ جب تک میرے والد کی حکومت رہی پورے ملک میں کہیں بھی برقع نظر نہیں آتا تھا۔

ترکی پہلا اور ایران دوسرا اسلامی ملک تھا جس نے پردے کے استعمال پر سرکاری طور پر پابندی لگائی، اور ہر سال ماہ دی کی ۱۷ تاریخ کو (یہ مہینہ عیسوی جنتری کے حساب سے ماہ جنوری میں آتا ہے) ایرانی عورتیں ایک جشن مناتی ہیں۔ یہ جشن میرے والد کے ان بڑے کارناموں کی یاد میں منایا جاتا ہے جو انہوں نے ایرانی عورت کی آزادی اور فلاح کے لئے انجام دیئے۔ بلکہ خواتین کی ایک انجمن کا نام ہی انجمن ستره دی پڑ گیا ہے۔ یہ انجمن ایران میں وہی فرائض انجام دیتی ہے جو انگلستان اور امریکہ اور دوسرے ممالک میں ینگ وُمین کرسچین ایسوسی ایشن[1] کے ہیں۔

1. Y. W. C. A.

۱۹۳۵ء میں جب میرے والد نے تہران یونیورسٹی قائم کی تو اس میں یہ شرط بھی رکھی تھی کہ لڑکیوں کو بھی یہاں داخلے دیئے جائیں، میرے والد کی حوصلہ افزائی پر ہی سرکاری دفاتر، پرائیویٹ فرموں اور دوسری جگہوں پر لڑکیوں نے کلرکوں کے اور دوسرے عہدے قبول کرنا شروع کئے، ان لڑکیوں نے اجتماعی اور عوامی فلاح کے کاموں میں بھی گہری دلچسپی ظاہر کی، رضا شاہ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ ایرانی خواتین اور لڑکیاں اپنے ماضی کی روایات سے بالکل ہی قطع تعلق کرلیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں علم و ہنر کی تحصیل کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے تجربات حاصل کرنے کے بعد ازدواجی دنیا میں قدم رکھیں، اور اپنی تعلیم و تربیت اور علم و ہنر سے بچّوں کی پرورش اور دیکھ بھال اچھی طرح کریں ان کا یقین تھا کہ ہماری پڑھی لکھی لڑکیاں نہ صرف اچھی شریکِ حیات، سمجھدار مائیں بنیں گی بلکہ اجتماع کے لئے نہایت عمدہ اور فرض شناس شہری ثابت ہوں گی۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب غیر ملکی فوجوں نے ایران پر قبضہ کرلیا اور میرے والد کو وطن سے رخصت ہونا پڑا تو عورتوں کی ترقی و تعلیم کا وسیع پروگرام جو انہوں نے مرتّب کیا تھا اس کا رُک جانا ایک طبیعی امر تھا اس کے علاوہ ملک کے ترقی پسند طبقے میں بھی آہستہ آہستہ تبدیلی آئی، رضا شاہ نے عورتوں کے جن اصلاحی کاموں کو اپنی طاقت کے بل پر شروع کیا تھا اب اسی کو روشن خیال طبقہ جمہوریت کے اصولوں کی بنیاد پر آگے بڑھانا چاہتا تھا تاکہ اس کے نتائج زیادہ اچھے نکلیں۔

میرے والد نے جو بھی اصلاحی کام عورتوں کے لئے انجام دیئے ان میں سے ایک پردے کا مسئلہ تھا، لیکن جیسے ہی انہوں نے سرزمین ایران سے باہر قدم رکھا اور جنگ کی وجہ سے سب طرف ابتری اور بے چینی پھیلی تو بعض عورتیں پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آگئیں اور برقع اوڑھنا شروع کردیا۔ اگرچہ پردے پر قانونی طور پر پابندی لگادی گئی تھی لیکن میری حکومت نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو نظر انداز کردیا جائے اور زبردستی ٹھونسنے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ اس کو ذہنی ارتقاء پر چھوڑ دیا جائے، آج ایران کے شہروں اور قصبوں میں عورتیں برقعوں میں بھی نظر آتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ اس کا رواج ختم ہوتا جارہا ہے۔ بہت سے غیر ملکی سوچتے ہوں گے کہ آج ایران میں جو عورتیں برقع اوڑھتی ہیں وہ اپنے ملک کی پرانی روایات کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں لیکن معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے کیونکہ آج برقع محض اس لئے پہنا جاتا ہے کہ یہ آرام دہ لباس ہے اور کام کرنے میں اس سے کافی سہولت ملتی ہے۔ کیونکہ ایران میں اب بھی بہت سے ایسے غریب گھرانے ہیں جن کے پاس پہننے کے کپڑے بہت زیادہ نہیں ہوتے اور اگر دو چار جوڑے ہوتے بھی ہیں تو ان کو عورتیں خاص خاص موقعوں کے لئے لگا کر رکھتی ہیں۔ برقع محض اس لئے اوڑھا جاتا ہے کہ کپڑوں کے پیوند اس میں چھپ سکیں، اس کے علاوہ روزانہ کے استعمال کی چیزیں خریدنے کے لئے جب عورتیں باہر نکلتی ہیں تو وہ محسوس کرتی ہیں کہ برقع پہن کر نکلنے میں آسانی بھی ہے اور عملی طور پر مفید بھی۔

جمالیاتی نقطۂ نظر کے علاوہ دوسری وجوہات کی بنا پر بھی میں شخصاً پردے کے حق میں نہیں ہوں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ امریکہ کے بہت سے شہروں میں اور خاص طور پر شہر کے باہر کے بہت سے محلوں میں میں نے وہاں کی عورتوں کو لباس کے اعتبار سے ایران کی معمولی عورتوں سے بھی زیادہ زبوں اور خستہ حالت میں دیکھا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں نے لباس کے معاملے میں ہمیشہ ہنرمندی اور خوش ذوقی کا اظہار کیا ہے۔ اس لئے یہ امید کی جاتی ہے کہ ہمارے ملک سے برقعے اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے وہ بے ڈھنگے لباس جو عورتوں کی شخصیت کو اپنے اندر چھپا لیتے ہیں جلدی ہی ناپید ہو جائیں گے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے لئے یہ کریہہ منظر باقی نہ رہے گا، شاید ہر ملک کے مرد اس کو جلد از جلد ختم کرنے میں عورتوں کی مدد کریں گے۔

متعدد ازدواج کا رواج بھی ایران سے روز بروز ختم ہوتا جا رہا ہے، یہاں مجھے ان دنوں کا ایک واقعہ یاد آگیا جس وقت ایران میں تیل کا معاملہ بحرانی شکل اختیار کر چکا تھا، تیل کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک برطانوی مشن ایران آیا تھا، اس مشن کے ساتھ کچھ انگریز لڑکیاں بھی سکریٹری یا ٹائپسٹ کی حیثیت سے آئی تھیں۔ ان لڑکیوں کو ایران کے ایک سابق بادشاہ کے محل میں ٹھیرایا گیا تھا جو کمرے اِن لڑکیوں کو رہنے کے لئے دیئے گئے تھے ان میں اس بادشاہ کی بیگمات رہتی تھیں گویا کسی زمانے میں محل کا یہ حصّہ بادشاہ کا حرم تھا، اگلے روز صبح کے وقت جب ایرانی افسر لڑکیوں سے یہ معلوم کرنے کے لئے گیا کہ ان کو پچھلی رات کسی طرح کی تکلیف تو نہیں ہوئی تو سب نے یہی کہا کہ تمام رات ان کی پلک تک نہیں جھپکی کیونکہ تمام رات وہ یہی سوچتی رہیں کہ جیسے ہی ان کی آنکھ لگے گی سابق بادشاہ کا بھوت سامنے آجائے گا اور اپنے حرم کی عورتوں کو حاضر ہونے کا حکم دے گا۔

ہمارے موسمِ گرما کے رہائشی محل کے نزدیک ایک سرکاری ملازم کا مکان ہے جس کی دو بیویاں ہیں جن کی عمریں تقریباً برابر ہی ہیں وہ اکثر ٹہلنے کے لئے باہر نکلتا ہے دونوں بیویاں بھی دائیں اور بائیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں مجھے بتایا گیا ہے کہ دونوں عورتیں بڑے سلوک سے ایک ساتھ رہتی ہیں، اور دونوں کے اسی شوہر سے کئی بچے بھی ہیں اور جب کبھی ایک بیوی کسی رشتے دار کے گھر جاتی ہے یا سودا سلف خریدنے کے لئے نکلتی ہے تو دوسری اس کے بچوں کی نگہداشت کرتی ہے، شوہر پڑھا لکھا آدمی ہے اور اجتماعی خدمات کے کاموں سے گہری دلچسپی رکھتا ہے اور اس کی بیویاں بھی بڑے جوش و خروش سے ان کاموں میں اس کے ساتھ پیش پیش رہتی ہیں، میں نے سنا ہے کہ جس وقت نکتہ چہار کے تحت ایک امریکی افسر اپنی بیوی کے ساتھ ایران آیا تو اس کی بیوی نے اس خوشحال خاندان سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس امریکی عورت کو ایک طرف لے جا کر جب یہ بتایا گیا کہ جس کے گھر تم ملنے جا رہی ہو اس شخص کی دو بیویاں ہیں تو اس نے اِس بات کو بالکل اہمیت نہ دی بلکہ یہ کہا کہ اس کے دادا کی تو سات بیویاں تھیں۔ مزید دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ عورت امریکہ کی ریاست اڈاہو کی رہنے والی تھی۔

بہت سے مغربی دنیا کے لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام سے قبل لوگ بیویاں کثیر تعداد میں رکھتے تھے، انہوں نے جو یہ پابندی لگائی کہ ایک شخص چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا تو اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ازدواج کے اس وسیع دائرے کو محدود کردیں جو ان کے زمانے میں مروج تھا اس کے علاوہ آنحضرتؐ نے اس بات کی بھی سخت تاکید کی ہے کہ ایک شخص اسی صورت میں دوسری بیوی رکھ سکتا ہے جبکہ وہ اس قابل ہو کہ پورے طور پر دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرسکے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی آدمی خواہ کتنا ہی قوی ہمت اور توانا ہو، اس کے لئے اس اصول کی پابندی کرنا سخت مشکل اور دشوار مرحلہ ہوگا۔ درحقیقت پیغمبرِ اسلام نے تعداد زوجات پر پابندی لگا کر ایک شوہر کے لئے بیویوں کی تعداد کم سے کم کردی تھی۔

اب بھی کہیں کہیں ایسے لوگ نظر آجاتے ہیں جن کی کئی بیویاں ہیں اور اسی اعتبار سے ان کے بچوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے چنانچہ تہران کے بہت ہی معزز خاندان کے ایک فرد کو میں جانتا ہوں جس کی متعدد بیویوں سے چونتیس بچے ہیں اور تقریباً سب ہی نے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی ہے، لیکن اب اقتصادی وجوہات کے علاوہ اور دوسرے اسباب کی بنا پر بہت ہی کم ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے ایک سے زیادہ شادی کی ہو۔ اس وقت تہران کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے۔ اتنی بڑی آبادی میں ایک ماہ میں چھپّتر مردوں نے دوسری شادی کی تھی اور چھ مرد ایسے تھے جن کی پہلے ہی دو بیویاں موجود تھیں اور انہوں نے تیسری شادی رچائی تھی لیکن کسی میں بھی چوتھی شادی کرنے کی ہمت اور سکت نہ تھی، تہران کے مقابلے میں دوسرے صوبوں میں متعدد ازدواج کی مثالیں ممکن ہے زیادہ ملیں لیکن بطور کلی پورے ملک سے یہ رواج روز بروز بڑی تیزی سے کم ہوتا جارہا ہے۔

اسی طرح متعہ یا عارضی شادی کا رواج بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ فحاشی جو انسان کا سب سے قدیم پیشہ ہے، نبی کریم حضرت محمد صلعم کے زمانے میں بھی تھا جس سے وہ سخت نالاں تھے زیادہ سے زیادہ چار شادیوں اور داشتہ عورتوں سے عارضی نکاح کی اجازت شاید انہوں نے مردوں کو اس لئے دی تھی کہ اسلامی نظام میں فحاشی کا وجود باقی نہ رہے، اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ بہت سے مسلمان مرد جنگوں میں شہید ہوچکے تھے اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی اس لئے اس پیغمبرِ ربانی نے مسلمانوں کی فلاح اس امر میں دیکھی کہ زائد عورتوں کا عارضی نکاح مردوں سے کردیا جائے تاکہ یہ عورتیں ان کی حمایت اور پناہ میں آکر آوارگی اور فحاشی سے بچ جائیں۔

شریعتِ اسلام کے مطابق صدیوں سے متعہ اور عارضی نکاح کا اختیار مفتیان دین اور قضات کے ہاتھوں میں رہا ہے اس رسم کے متعلق مخصوص قوانین بھی بنائے گئے تھے، چنانچہ جب کبھی کسی شخص کو کسی عورت سے متعہ کرنا ہوتا تو سب سے پہلے اس کو مقامی مفتی یا ملّا کی منظوری حاصل کرنا ہوتی، کچھ عرصے بعد متعہ کی کارروائی ضابطۂ تحریر میں آنے لگی۔ چنانچہ قاضی یا مفتی وقت عارضی نکاح کا کاغذ لکھتا اور یہ تصدیق کرتا کہ اس کے سامنے طرفین کی رضامندی سے یہ

کام انجام پایا ہے، اس نکاح نامے میں نکاح کی مدت مہر کی رقم جو بہت ہی حقیر ہوتی درج ہوتی تھی۔

اگرچہ متعہ کی اجازت آج بھی مل سکتی ہے لیکن اب اس کی شکل بالکل عام شادی یا نکاح کی سی ہوگئی ہے۔ متعہ کے وقت باقاعدہ نکاح نامے پر طرفین کے دستخط ہوتے ہیں اور شادی کے دفتر میں تمام کارروائی کا اندراج ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی اس عارضی نکاح کو قانونی حیثیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں متاعی عورت کے بچّوں کو وراثت کے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو ایک منکوحہ بیوی کے بچّوں کو ملتے ہیں۔ ایسے بھی اکثر اتفّاقات ہوئے ہیں کہ جن مردوں نے عورتوں سے متعہ کیا ہے وہ اپنی متاعی بیویوں کے حسن سلوک سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے اس متعہ کو باقاعدہ اور مستقل شادی کی شکل دے دی۔

اگرچہ بظاہر یہ عارضی شادی کا دستور بہت ہی دلچسپ نظر آتا ہے لیکن یہ عیبوں اور برائیوں سے بھی خالی نہیں اور مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ اب ان کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ چنانچہ شہر تہران میں حالیہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ماہ میں ان عارضی شادیوں کی تعداد چودہ سے تجاوز نہیں کر سکی ہے۔ اور ان شادیوں میں سے کسی کی بھی مدت ایک سال سے کم نہ تھی اور بعض بعض شادیاں تو اٹھارہ سال تک کے لئے ہوئی ہیں، اور ابھی اس بات کا امکان ہے کہ ان عارضی شادیوں کی مقررہ مدت میں توسیع کر دی جائے۔ متعدد زوجات کی طرح ممکن ہے کہ دوسرے صوبوں میں تہران کی بہ نسبت عارضی نکاح کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہو۔ بہرحال ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لوگ اس طرح کی شادیوں سے ناآشنا نہیں ہیں جو مغربی ممالک میں "کامن" کے تحت ہوتی ہیں۔

ملک میں جمہوری نظام آنے کی وجہ سے جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کی وجہ سے عورتوں کے بھی خیالات اور افکار کا ارتقاء ہوا ہے۔ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں لڑکیوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے، اس وقت دو ہزار سے زیادہ لڑکیاں تہران یونیورسٹی میں اور کئی سو کی تعداد میں دوسرے صوبوں کی یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ہماری تمام یونیورسٹیوں میں تعلیم مخلوط ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک کے لڑکے اور لڑکیاں دوش بدوش تعلیم کے میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ تہران یونیورسٹی نے ایک مرد اور ایک خاتون کا طلباء کے سرپرست کی حیثیت سے تقرّر کیا ہے تاکہ ان دونوں کی سرپرستی اور رہنمائی میں لڑکے اور لڑکیاں اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول رہیں۔ ایران میں گرلز گائیڈ بھی ہر طرف سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ہر سال اسکول اور کالجوں کی لڑکیوں کے لئے گرمیوں کی چھٹیوں میں موسم گرما کے کیمپ کا انتظام کیا جاتا ہے۔

نرسنگ، معلمی اور دفتری کاموں میں لڑکیوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے، اس کے علاوہ ایران میں عورتیں ڈاکٹر، وکیل، نثر نگار، شاعر اور موسیقار بھی ملیں گی۔ جیساکہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے ہمارے ملک کی عورتیں اجتماعی فلاح کے کاموں میں بھی پیش پیش رہتی ہیں۔ تہران کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے شہروں میں عورتوں کے کلب

قائم کئے گئے ہیں ۱۹۵۹ء میں میری ہمشیرہ شہزادی اشرف نے شورائے عالی خواتین کا افتتاح کیا تھا جس کا مقصد ملک بھر میں جتنی بھی خواتین کی انجمنیں ہیں ان میں ہم آہنگی اور باہمی رابطہ قائم کرنا ہے۔

میری دلی خواہش ہے کہ عورتوں کو اجتماع میں اور بھی زیادہ ترقی اور سرگرمی کے مواقع ملیں اور میرے سامنے یہ مقصد ہے کہ ہماری عورتوں کو بھی مردوں کے برابر بنیادی حقوق میسر آئیں۔

جہاں تک عورتوں کے حق رائے کا سوال ہے اس کے لئے میں اتنا کہوں گا کہ ہم کو یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ۱۹۴۲ء تک فرانس میں بھی عورتیں انتخابات میں شرکت کرنے سے محروم تھیں، لیکن جو لوگ فرانسیسی عورتوں کے متعلق جانتے ہیں وہ ہرگز یہ نہ کہیں گے کہ انہوں نے ۱۹۴۲ء سے ہی سیاسی اور اجتماعی کاموں میں دلچسپی لینا شروع کی، سوئٹزرلینڈ کی عورتیں اب بھی انتخابات میں حصّہ نہیں لیتیں لیکن اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہاں کی عورتیں اجتماعی حقوق سے محروم کردی گئی ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ اور ایران کی عورتوں کے جو بنیادی مسائل اور اصل دشواریاں ہیں اس کا میں یہاں تفصیل سے ذکر کروں گا، ہمارے ہاں "عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق" و "آزادی" جیسی اصطلاحات کا مفہوم و مطلب بعض دفعہ اپنے صحیح اور حقیقی معنوں میں نہیں لیا جاتا بلکہ جس طرح ان کو استعمال کیا جاتا ہے اس سے عورتوں کے مفاد کو ہی نقصان پہنچتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عورتوں کی آزادی سے کیا مراد ہے؟۔ جو لوگ عورتوں کی آزادی کے حق میں ہیں جب ان کی باتوں کی طرف کوئی شخص توجہ دیتا ہے تو اس کے ذہن میں یہی تصوّر آتا ہے کہ گویا عورتیں شادی نہ کرنے، بچّے پیدا نہ کرنے اور اگر بچّے ہوں تو ان کی اچھی طرح پرورش نہ کرنے، اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کی ذمّہ داری اپنے کندھوں پر نہ لینے کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ اگر آزادی اسی کا نام ہے تو جو بھی ایرانی عورت چاہے اس طرح کی آزادی حاصل کرسکتی ہے اور کوئی قانون اور اصول و ضابطہ اس کو یہ آزادی حاصل کرنے سے نہیں روک سکتا لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کی روشن خیال عورتیں اس طرح کی آزادی پر لعنت بھیجتی ہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ان کی سرشت اور وجود میں بعض خصوصیات ہیں جس کی بنا پر انہیں مخصوص ذمّہ داریاں سنبھالنا پڑتی ہیں۔

اگر کوئی شخص لفظ "مساوات" کا ظاہری مطلب جنسی پہلو سے نکالے تو اہل نظر اور صاحب ذوق اس کو حماقت ہی کہیں گے، جو لوگ "مساوات" اور "مواقع کی مساوات" کے معنی سمجھنے میں اشتباہ کریں گے ان سے بڑھ کر خواتین کی ترقی کا دشمن اور کوئی شخص نہ ہوگا، مذہب اسلام اور دنیا کے دوسرے سب ہی مذاہب نے یہی درس دیا ہے کہ عورت اور مرد ہی ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے مساوات کے مسئلے کو سب نے ہی رد کیا ہے اور عقلِ سلیم بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرسکتی۔

بعض ماہرینِ نفسیات اور اجتماع شناس جو یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ ظاہراً شکل و ساخت کے اعتبار

سے عورتوں اور مردوں میں فرق ہے اس لئے ان کے فرائض اور کردار بھی اجتماع میں الگ الگ ہیں مجھے ان کے اس نظریئے سے کلی اختلاف نہیں کیونکہ میری رائے میں یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اگر کسی کو میری بات سے اتفاق نہیں تو اس کو زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ دو تین سال کی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے افعال وحرکات کا مطالعہ کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ ماہرین نفسیات اور اجتماع شناسوں کی دلائل بے بنیاد ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی لڑکی کو لے لیجئے خواہ وہ کسی دولتمند گھرانے کی ہو یا کسی غریب کی بچی اعلیٰ طبقے سے ہو یا نچلی ذات سے لیکن جیسے ہی وہ سن بلوغ کو پہنچے گی اس میں نسوانی کشش کا پیدا ہونا ایک طبیعی امر ہے۔

درحقیقت زندگی کے حسن کا نکھار اسی وجہ سے ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور فرانسیسی تو یہاں تک کہتے ہیں "اختلاف زندہ باد"[1] چنانچہ جو لوگ لغوی معنوں میں عورت اور مرد کو برابر کا سمجھتے ہیں ان کے ذہن میں "مساوات" کا مفہوم واضح نہیں ہے اور وہ عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔

عورتوں اور مردوں کے لئے مساوی مواقع کا مسئلہ بالکل جداگانہ بحث ہے، مثال کے طور پر ایک لڑکی علم طبیعات پڑھنا چاہتی ہے۔ تو اس کی جنس کو پیشِ نظر رکھتے بغیر علم طبیعات پڑھنے کے پورے مواقع فراہم ہونے چاہئیں، میں ایک بڑی حسین وجمیل ایرانی عورت کو جانتا ہوں جس نے علم طبیعات کی تحصیل امریکہ میں کی ہے جس وقت وہ وہاں زیرِ تعلیم تھی اس کی ملاقات ایک ایرانی صحافی سے ہوئی، دونوں نے ایران آکر شادی کی، اب یہ عورت اپنا پورا وقت گھریلو کام کاج میں صرف کرتی ہے اگرچہ اس نے علمِ طبیعات کو اپنا پیشہ نہیں بنایا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو یہ مضمون پڑھنے کا موقع ملا۔

ہمارا موجودہ قانونِ کار ۱۹۵۹ء میں منظور ہوا تھا، اس قانون کی رو سے دوسری تمام سہولتوں کے ساتھ کام اور تنخواہ کے مواقع عورتوں اور مردوں کے واسطے بالکل برابر ہیں، مراتب کے اعتبار سے برابر کے عہدے سرکاری دفتر میں روز بروز عورتوں اور مردوں کو مل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر تہران کے مرکزی ڈاک گھر میں ڈاک کے تمام ٹکٹ لڑکیاں ہی فروخت کرتی ہیں، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایران میں کلرکوں کی اسامی پر جتنی بھی لڑکیاں وزارتِ ڈاک وتار میں کام کر رہی ہیں ان کی تعداد تناسب کے اعتبار سے امریکہ کے ڈاکخانوں میں کام کرنے والی لڑکیوں سے زیادہ ہے۔ ہمارے ملک کے پرائیویٹ تاجر بھی اب زیادہ سے زیادہ لڑکیاں ملازم رکھ رہے ہیں۔

مردوں اور عورتوں کی جسمانی ساخت اور طاقت وتوانائی کو دیکھتے ہوئے مساوی مواقع کے اصولوں کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر بہت سے متمدن ممالک میں عورتوں کو تعمیر کے بھاری کاموں پر نہیں لگایا جاتا، ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اس کو عدم مساوات کہیں لیکن جو اشخاص صاحبِ فہم ونظر ہیں وہ اس کو اصلاحی ترمیم کہیں گے۔ چنانچہ ہمارے کارخانوں میں قانونِ کار کے تحت عورتوں اور بچوں کے کام محدود کر دیئے گئے

1. VIVE La DIFFERENCE

ہیں اور ان کو وہی کام دیئے جاتے ہیں جو وہ آسانی سے کر سکیں۔

گھروں پر "عورتوں کی آزادی" اور "عورتوں اور مردوں کی مساوات" کی اصطلاحات کی تشریح بہت ہی سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد ہونی چاہیئے، بہت سے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ازدواجی رشتوں میں امریکی عورت کو باقی تمام دنیا کی عورتوں سے زیادہ آزادی حاصل ہے، میں امریکی عورتوں کا بیحد احترام کرتا ہوں لیکن ان کے چہروں پر جو میں نے کشاکش اور اندرونی تناؤ کے آثار دیکھے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طلاق کی جتنی زیادہ واردات امریکہ میں ہوتی ہیں دنیا کی کسی اور بڑی سے بڑی قوم میں نہیں ہوتیں۔ چنانچہ وہاں اوسطاً ہر تین شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق ہوتا ہے اگرچہ ہم امریکہ سے بہت سے شعبوں میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں لیکن شادی کی کامیابی کے راز شاید ہم کو اس قوم سے نہ مل سکیں۔

دو مختلف جنسوں کے لوگ یعنی عورت اور مرد جب شادی کے رشتوں میں منسلک ہو جائیں تو ان پر مساوات کے اصول کا اطلاق کرنا بالکل بے معنی سی بات ہے کیونکہ زندگی کی تکمیل کے لئے مرد اور عورت ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور اگر شادی کامیاب ہو تو یہ تکمیل نہایت ہی حسین ہوتی ہے۔ زیادہ تر ملکوں میں مردوں کو ہی گھر کا سرپرست اور کنبے کے انتظامی معاملات کا ذمّہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اور میں اپنے تجربات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مغرب و مشرق میں جو لوگ ازدواجی زندگی خوش و خرمی سے گذار رہے ہیں وہ کنبے کی تنظیم میں اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایران کے لوگ شادی بیاہ، عورت کے فرائض اور گھریلو رہن سہن کے معاملات میں مغرب کی اندھی تقلید نہ کریں گے۔ میں اس کے حق میں ہوں کہ ہم لوگ مغرب سے سیکھیں اور وہاں کی اچھی چیزیں اپنائیں لیکن اس طرح اور اتنا زیادہ نہیں کہ یہاں کی خاندانی روایات کے مضبوط تانے بانے ڈھیلے ہو کر رہ جائیں۔

ہمارے ملک میں اور ملک کے باہر کچھ ایسی جاہل اور ناسمجھ عورتیں بھی ملیں گی جو اپنی خود غرضانہ مقاصد اور آرزوؤں کے پورا کرنے کو ہی آزادی سمجھتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کو جو بھی کوئی نیا حق ملتا ہے ان کی ذمّہ داری پہلے سے بڑھ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی لڑکی پر شادی سے پہلے یہ ذمّہ داری نہ آئے لیکن شادی کے بعد وہ ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

ماضی میں جبکہ ایران کی عورت زنانخانوں میں رہا کرتی تھی اس کی ذمّہ داریاں بہت ہی مختصر اور سادہ تھیں، کیونکہ شوہر اور نوکروں کی فوج کو اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رہتا تھا۔ اور تکلیف و پریشانیوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر نہیں آنے دیا جاتا تھا، لیکن آج کی پڑھی لکھی ایرانی عورت کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا ہے، سب سے پہلا تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لئے اچھی بیوی ثابت ہو۔ یہاں میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ بستر پر ہی اچھی رفیق ہو بلکہ خیالات اور نظریات کے اعتبار سے اس میں اور اس کے شوہر میں ہم آہنگی

ہو۔ دوسری اس کی ذمہ داری بچوں کی تربیت ہے اور خاص طور پر اُن دنوں میں جبکہ بچہ ذہنی نشوونما کی ابتدائی منزل پر ہو۔ کیونکہ ایک ماں ہی اپنے بچوں کو محبت، اخوت، حوصلہ مندی اور اخلاقیات کا درس دے سکتی ہے اور وہی ان نئے افکار وخیالات کو ان کے ذہنوں میں بھر سکتی ہے تاکہ یہ بچے تیزی سے بدلتی ہوئی ایرانی سوسائٹی میں اپنے لئے مقام پیدا کر سکیں اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایرانی عورتوں کو چاہیئے کہ ملک کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اصلاحی اور عوامی فلاح کے کاموں میں پیش پیش رہیں۔ اس ملک کے عوام اور خاص طور پر دیہاتوں میں بسنے والوں کی خدمت کرتے وقت ان کو یہ بھول جانا چاہیئے کہ سوسائٹی میں اُن کی کیا قدر و منزلت ہے اور کتنے اونچے خاندان کی وہ باعزت لڑکیاں ہیں۔

مجھے اپنے ملک کی عورتوں پر پورا پورا اعتماد ہے اور فخر بھی، ان میں سے زیادہ تر ایسی ہیں جن کا شمار دنیا کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اپنی عفت و نسوانیت کے اعتبار سے وہ ایسی ہی رہیں گی جیسی ایران کی عورتیں ماضی میں تھیں، لیکن بدلتی ہوئی سوسائٹی میں سربلندی اور افتخار بھی حاصل کریں گی۔

۱۱۔ مستقبل کے ایران میں تعلیم کا انتظام

روایت ہے کہ جب رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اعلانیہ لوگوں کو مکّے میں اسلام کی دعوت دی تو اہلِ مکہ میں سے ایک گروہ آپ کی مخالفت پر اُتر آیا اور آپ کی جان لینے کے خیال سے آپ کے گھر کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا تاکہ کہیں نکل کر جانے نہ پائیں۔ خدا کے پیارے نبی نے مکّہ سے مدینے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہاں لوگوں کو دینِ حق کی دعوت دے سکیں۔ چونکہ دشمنوں نے آپ کے گھر کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور آپ کے لئے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے ایک رات آپ کے ایک صحابی نے آپ کو اپنے کندھے پر اُٹھا لیا اور سر پر عبا ڈال کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جس وقت یہ صحابی آنحضرتؐ کو اٹھائے دشمنوں کے درمیان سے گذر رہے تھے تو ایک دشمن نے سامنے آکر سوال کر ہی ڈالا کہ کس کو کندھے پر اُٹھائے لئے جا رہے ہو، صحابی نے جواب دیا" ارے بھئی یہ تو محمدؐ ہیں" دشمنوں نے اس حقیقت اور سچائی کو مذاق سمجھا اور آپ کے سر پر سے عبا ہٹانے کی بھی زحمت گوارا نہ کی چنانچہ آنحضرتؐ صحیح و سلامت دشمنوں کے نرغے سے نکل آئے۔

اس روایت کو اس فصل کے شروع میں میں نے اس لئے جگہ دی ہے کہ اس میں ایک بہت بڑا حکمت کا راز پنہاں ہے اور جس وقت تعلیم و تربیت کے متعلق تفصیل سے بحث آئے گی اس وقت اس روایت کی اہمیت کا ذکر کیا جائے گا۔

پیغمبرِ اسلام کا ارشاد ہے کہ علم و دانش کا حاصل کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ جو شخص علم حاصل کرے وہ اس پر عمل بھی کرے، اور اپنے اعمال کو علم کے سانچے میں ڈھالے، دوسروں کو اس سے فیض پہنچائے اور جو شخص علم حاصل کرنے کے بعد دوسروں تک اس کو نہیں پہنچاتا اور اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کی حالت اس چوپائے کی سی ہے جس پر چند کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ آج کی دنیا میں یقیناً کسی کو یہ بات ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ غلط قسم کی تعلیم نے

فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچایا ہے۔ مثال کے طور پر ہٹلر ہی کو لے لیجئے، جس نے اپنے علم و دانش کی مدد سے اس قدر لوگوں کو گرفتار کیا کہ لگتا تھا اِدھر سے اُدھر تک قیدیوں کی بستیاں چلی گئی ہیں۔ اور اسی علم و دانش سے اس نے وہ کال کوٹھریاں تیار کرائیں جن میں کروڑوں بے گناہ عورتوں، مردوں اور بچوں کو بڑی بے دردی اور سفاکی سے قتل کیا گیا، اس کے علاوہ میں اور کوئی مثال نہیں دوں گا۔ لیکن اس بات پر زور دوں گا کہ تعلیم و تربیت ان بنیادوں پر ہونی چاہیئے جس سے عوام کا فائدہ ہو، صرف چند کتابیں پڑھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کو سچائی کا راستہ دکھائے۔

عہدِ قدیم میں پیشے کے اعتبار سے علمائے دین کا طبقہ ایران میں سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، دوسرا درجہ سپاہگری کا تھا، اگرچہ ایرانی قوم بڑی جنگجو اور جانباز تھی لیکن دینِ زرتشت اس کو برابر امن و آشتی کی طرف مائل کرتا رہا۔ فوجی تعلیم و تربیت کا بندوبست سپاہی خود ہی کر لیا کرتے تھے، چھوٹی عمر میں ہی لڑکوں کو اچھا سوچنے اچھا بولنے اور اچھے کام کرنے کی تلقین کی جاتی تھی، یہ لڑکے اگرچہ تیراندازی اور گھوڑ سواری بھی سیکھتے تھے لیکن راستگوئی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور بار بار یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ اچھائی اور برائی میں تمیز پیدا کریں۔

بدقسمتی سے زرتشتی علما نے تعلیم و تربیت کو اعلیٰ طبقے تک ہی محدود رکھا تھا۔ یہ لوگ مؤید کہلاتے تھے اور شہزادوں کے علاوہ جاگیرداروں، فوجی افسروں اور دیوانی حکام کے لڑکوں کو ہی پڑھاتے تھے، عام آدمیوں کو لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا جاتا تھا، تاجر طبقے کی معلومات بس اتنی ہی ہوتی تھی کہ ان کی ضرورت کو پورا کر سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانے میں ایرانی تجارت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور منڈی کو فریب اور ریا کا مرکز سمجھتے تھے اور یہ کوشش کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ منڈی کے آس پاس قائم نہ ہو، اسی طرح عورتیں خواہ وہ کسی بھی طبقے کی ہوں تعلیم سے بے بہرہ رہتی تھیں۔

اِس زمانے میں مؤبد بزرگ، (زرتشتی مذہب کے بڑے اور جیّد عالم) فوجی افسر اور دیوانی حکام اپنے سے بعد کی نسل کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دیتے تھے، اگرچہ اعلیٰ تعلیم عام طبقے میں نہیں تھی لیکن بعض مثالیں استثنائی بھی ملتی ہیں مثال کے طور پر نسطوری عیسائیوں نے اس جگہ جہاں آج شہر لبنان واقع ہے ایک طبّی مدرسہ اور بعد میں ایک طبّی یونیورسٹی بھی قائم کی تھی، مشرقی رومن سلاطین کی مخالفت اور ناجائز دباؤ کی وجہ سے ان کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی۔ ہجرت کر کے پہلے تو یہ عیسائی عالم ملک شام کی طرف گئے لیکن ۵۳۹ء میں ان کو ایران میں پناہ لینی پڑی۔ خسرو انوشیروان نے ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان کی کتابوں کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ آخرکار اس نے جنوب مغربی ایران میں گندیشاپور نامی مقام پر ایک طبّی کالج قائم کیا جہاں یہ عیسائی اطبا اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے، یہ کالج کئی صدی تک طبّی خدمات انجام دیتا رہا۔

جس طرح سے عیسائی عالموں کا ایران میں استقبال کیا گیا اور ان کی خاطر کالج قائم ہوا اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے پہلی تو یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں دوسرے مذاہب کے لئے کس قدر رواداری کا جذبہ ہے اور دوسری یہ کہ ہم تعلیم کو کس قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں۔ خسرو انوشیروان کے عہد میں یہی خصوصیت دوسری طرح بھی نمایاں ہوئی چنانچہ سنہ ۵۴۲ء میں اس نے ایک اجلاس طلب کیا اور اس مسئلے پر غور کیا کہ کس طرح اس کی حکومت میں علم طب کو فروغ دیا جائے، اس جلسے کی صدارت کے فرائض ایک عیسائی طبیب جبرائیل رستویہ نے انجام دیتے تھے، نوشیرواں نے طب کے موضوع پر کتابیں لکھنے کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کی اور گندیشاپور کالج کی مزید توسیع کی، اس نے مترجمین کو حکم دیا کہ یونانی فلاسفہ، افلاطون اور ارسطو کی کتب کے علاوہ ہندوستان کے مشہور و معروف علمار کی کتابیں بھی پہلوی میں ترجمہ کریں۔

ایران پر عربوں کا حملہ سنہ ۶۳۳ء میں ہوا، اس حملے کے بعد مذہبی رسوم کے علاوہ تعلیمی اور عدالتی انتظام بھی مسلمان علمار کے ہاتھ میں آگیا، ان علمار نے پورے ملک میں لڑکوں کی تعلیم کے لئے مکتب (پرائمری اسکول) قائم کئے۔ (لڑکیوں کی تعلیم کا باقاعدہ کوئی انتظام نہ تھا) جب لڑکا آٹھ سال کا ہوتا تو اس کو اس کی ماں اور بہنوں سے الگ کر دیا جاتا اور گھر کے مرد اس کی تعلیم و تربیت کو اپنے ذمہ لے لیتے، دولتمند گھرانوں میں لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے لئے استاد ملازم رکھ لئے جاتے تھے۔ جو والدین اپنے بچوں کی تعلیم کا معمولی خرچ برداشت کر سکتے تھے ان کو مکتب میں داخل کرا دیا جاتا، جہاں ان کو قرآن شریف حفظ کرایا جاتا، فارسی لکھنی پڑھنی سکھائی جاتی اور ابتدائی ریاضی کا بھی درس دیا جاتا تھا، کیونکہ قرآن شریف عربی زبان میں ہے، اس لئے بچے اس کے معنی و مطلب نہیں جانتے تھے اور چونکہ مکتب میں پڑھانے والے بھی زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے تھے اس لئے بچوں کو قرآن شریف کی تفسیر یا ترجمہ نہیں بتایا جاتا تھا۔ بچے اپنے استاد کے گرد آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور اپنے سر اور دھڑ کو آگے پیچھے ہلا ہلا کر قرآن شریف کی آیات کو، جن کا مطلب وہ تو کیا خود ان کے استاد بھی نہیں جانتے تھے، ازبر کر لیا کرتے تھے، کاہل اور کام چور لڑکوں کی اصلاح بید اور سنٹی سے کی جاتی تھی۔

مکتب کی پڑھائی کے ختم ہونے کے بعد لڑکے کو مدرسے (سکنڈری اسکول) میں بھیج دیا جاتا، جہاں اس کو حدیث، فقہ، قانون اور طب کی تعلیم دی جاتی۔ جب لڑکا اپنی تعلیم یہاں مکمل کر لیتا تو اس کو سند دے دی جاتی تھی۔

تقریباً ایک سو سال سے ہمارے نظامِ تعلیم میں تبدیلی آنی شروع ہوئی ہے اور اب ہم تعلیم و تربیت کے معاملے میں مغرب کے اثرات قبول کرتے جا رہے ہیں، سنہ ۱۸۳۶ء میں شمال مغربی ایران میں رضائیہ کے مقام پر امریکی پریس بیٹری مشنری[1] کے لوگوں نے پہلا مدرسہ قائم کیا، اس کے بعد اور بھی کئی اسکول پورے ملک میں کھولے گئے، ان اسکولوں کے علاوہ برٹش، جرمن، فرانسیسی اور روسی مدرسے بھی پورے ملک میں جگہ جگہ قائم

1. PRESBYTERIAN

ہوئے، اور ہزاروں ایرانی لڑکوں اور لڑکیوں نے ان اسکولوں میں ابتدائی، ثانوی اور کالج کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ان تمام اسکولوں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف تہران کا البرز کالج ہے جہاں سے آج کے بہت سے سرکاری افسر، تاجر اور عوامی رہنما فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں، اس کالج کے پرنسپل امریکی ماہر تعلیم ڈاکٹر سامویل جورڈن تھے۔ جو کئی برس تک اس اسکول کے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے، اس اسکول کے طالبعلموں نے ڈاکٹر جورڈن کی تعلیم و تربیت اور نظریات کا گہرا اثر قبول کیا۔ البرز کالج سے ہی ملحق سیج کالج[1] تھا جہاں صرف لڑکیوں کو ہی تعلیم دی جاتی تھی۔

۱۸۴۸ء میں یعنی ناصرالدین شاہ قاجار کی تخت نشینی کے پانچ سال بعد حکومت کی زیر سرپرستی پہلا کالج دارالفنون کے نام سے قائم ہوا۔ اس کالج کا بانی ناصرالدین شاہ کا دانشمند اور ترقی پسند وزیر اعظم، میرزا تقی خان امیر کبیر تھا، اس کالج کے قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری ملازمین، فوجی افسروں، ڈاکٹروں اور انجینیروں کو یہاں تربیت دی جا سکے۔ شروع شروع میں اس کالج کا تمام تعلیمی انتظام یورپین استادوں کے ہاتھوں میں تھا، سب سے پہلے یہاں اُن فرانسیسی افسروں نے پڑھانا شروع کیا جو ہماری فوجوں کی تنظیم کے لئے آئے تھے۔ ابتدا میں یہاں لاطینی، فرانسیسی زبانوں کے علاوہ ریاضی، علم کیمیا، دواسازی، طِب، معدنیات، اور فوجی باقاعدگی کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی بعد میں فارسی، عربی، فقہ اسلامی اور قانون کا بھی اضافہ کر دیا گیا، ۱۸۵۷ء میں یہاں طالبعلموں کی تعداد ایک سو ساٹھ تھی جن میں سے ایک سو دس کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔

ناصرالدین شاہ کے یورپ کے سیر و سفر کے بارے میں میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اس کی سیر و سیاحت نے ایرانیوں کی بیداری اور نظامِ تعلیم کے پرانے ڈھنگ کو بدل کر نئے طریقے اپنانے میں کافی مدد دی۔ اس نے کچھ ایرانی نوجوانوں کو تعلیم کی غرض سے یورپ بھی بھیجا، یہ نوجوان ۱۸۹۷ء میں فارغ التحصیل ہو کر واپس ایران آئے اور دوسرے ایرانیوں کے ساتھ مل کر سرکار کے پرائمری، سکنڈری اور کالجوں کے نظام تعلیم کو بدلنے کے لئے ایک انجمن کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۰۱ء میں تہران میں سیاسی علوم کا کالج قائم ہوا، ہمارے ۱۹۰۶ء کے آئین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کا انتظام حکومت کی ذمہ داری ہے چنانچہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں پارلیمنٹ نے وزارتِ تعلیم قائم کرنے اور باقاعدہ منظم طریقے پر تعلیم شروع کرنے کے بِل منظور کر دئے۔

۱۹۲۲ء میں جس وقت میرے والد نے فوجی انقلاب کے بعد زمامِ اختیار سنبھالی تو اس وقت پورے ملک میں ۲۴۰ پرائمری، ۴۶ سکنڈری سرکاری اسکول تھے اور ایک کالج، پرائمری اسکولوں میں طالبعلموں کی تعداد ۴۲٫۰۰۰ ہزار، سکنڈری اسکولوں میں ۹٫۳۰۰ تھی اور کالج میں صرف ۹۱ طالبعلم تھے۔ میرے والد چونکہ طالبعلموں کی اس تعداد کو ملک کی ضرورت کے مقابلے میں بہت ہی معمولی سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے سرکاری سطح پر

1. SAGE COLLEGE

پرائمری اور سکنڈری اسکول کھولنے کے لئے پوری جدوجہد شروع کردی۔ ۱۹۳۲ء میں سرکاری اسکولوں کی تعداد ۱۹۲۲ء کے مقابلہ میں تین گنا ہوچکی تھی اور ۱۹۴۲ء میں یہ تعداد چھ گنا تھی اور طالبعلموں کی تعداد میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے صرف تین سرکاری ادارے تھے لیکن ۱۹۴۲ء میں ان کی تعداد بارہ تک پہنچ چکی تھی، ان میں زراعتی کالج، ٹکنیکل اسکول، ملٹری اکاڈمی، ٹیچرز ٹریننگ اسکول (اساتذہ کا سب سے پہلا تربیتی اسکول بھی اس کا ایک حصہ تھا) اور تہران یونیورسٹی شامل تھے۔ رضا شاہ نے ملک کی ترقی کے لئے جو اہم کام کئے انمیں سے ایک ملٹری اکاڈمی کا قیام تھا، جہاں نوجوانوں کو نئے قواعد کی رو سے فوجی تعلیم دی جاتی ہے اور یہاں سے جو فوجی افسر تربیت پاکر نکلتے ہیں وہ اخلاقی بلندی اور وطن پرستی کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں۔ ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے جانے والے طالبعلموں کی تعداد میں بھی میرے والد نے کافی اضافہ کیا، وہ ہر سال حکومت کے خرچ پر ایک سو طالبعلموں کو یورپ اور امریکہ بھیجتے تھے تاکہ وہاں جاکر وہ علوم و فنون سیکھیں جس کی ملک کو سخت ضرورت ہے۔ جو طالبعلم اپنے خرچ سے باہر پڑھنے گئے ان کی تعداد اس سے الگ ہے۔

ایران میں تعلیم و تربیت کو عام کرنے کے لئے رضا شاہ نے اسکول کی عمارتیں بنانے، معلّموں کو تربیت دینے اور طالبعلموں کو ملک سے باہر بھیجنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے پورے نظامِ تعلیم اور علم و دانش کے فلسفے کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ تعلیم و تربیت کا پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ نوجوانوں کے دلوں میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہو۔ اور جب تک نئی نسلوں میں یہ جذبہ بیدار نہ ہوگا، اس وقت تک ملک کی ترقی اور مغربی طرز پر از سرِ نو تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا، وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ ملک میں فیکٹریاں قائم کرنے اور پکی تارکول کی سڑکیں بنانے کا نام ہی تعمیر و ترقی نہیں بلکہ اس سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت اور فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے، اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جبکہ ایرانیوں کے بنیادی تمدن اور نفسیات کو بدلا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ میرے والد اپنے ملک کی قدیم روایات اور تہذیب کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ موجودہ دور میں زندہ رہنے کے لئے اور بھی اعلیٰ مقاصد ہیں جن کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ ایک طرف وہ ہمارے ملک کی قدیم عہد کی عمارتوں کی حفاظت کے انتظامات کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ان کی اصلی حالت پر قائم رکھا جائے تو دوسری طرف وہ کوشاں تھے کہ ان کے ملک کے لوگوں کی فکر و نظر میں وسعت پیدا ہو اور انمیں جذبۂ عمل بیدار ہو تاکہ حال اور مستقبل کی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔

ان افکار اور نظریات کے تحت میرے والد نے ملک میں مختلف مضامین کے لئے جیسے شہریت، اصول حفظانِ صحت اور خانہ داری وغیرہ کے نصاب مقرر کئے جو اُس وقت تک ایرانیوں کے لئے بالکل نئے تھے، انہوں نے

بوائے اسکاؤٹ اور گرلز گائڈز کے خیال کو بڑی خوشی اور جوش وخروش سے قبول کیا، وہ ریڈیو اور دیگر خبر رسانی کے وسائل کے ذریعہ قوم کے بالغوں اور بچوں کو یہ پیغام پہنچایا کرتے تھے کہ کس طرح لوگ اپنے وطن کی خدمت کریں اور اپنی زندگی کو بہتر بنائیں۔ انہوں نے تعلیم بالغان کا بھی ایک وسیع اور مرتب پروگرام تیار کیا جس کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگوں میں بیداری اور کام کرنے کی لگن پیدا ہو۔

۱۹۴۱ء میں جب میرے دورِ حکومت کا آغاز ہوا تو میں نے بھی پورے طور پر وہی رویہ اختیار کیا جو اب سے قبل میرے والد کا رہا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا جس کی رو سے ہر ایرانی بچے کے لئے مفت تعلیم اجباری قرار دی گئی، لیکن یہ قانون کافی حد تک ہمارے ملک کے لئے قبل از وقت تھا کیونکہ اس وقت تک اسکولوں اور پڑھانے والوں کی تعداد بہت ہی قلیل تھی، لیکن اس قانون نے ہمارے لئے ایک مقصد متعین کر دیا تھا تاکہ جد وجہد کے بعد ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔

جس دن سے اجباری تعلیم کا بل منظور ہوا ہے ہماری تعلیمی سرگرمیوں میں روز بروز ترقی و توسیع ہو رہی ہے اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ملک کے سالانہ بجٹ کی کُل رقم کا پانچواں حصہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تعلیمی امور پر صرف ہو رہا ہے، میری رائے میں یہ اخراجات تقریباً اتنے ہی ہیں جتنے اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ممالک اپنے ہاں تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں ہمارے ملک میں سرکاری پرائمری اسکولوں کی تعداد آٹھ ہزار سے اوپر پہنچ چکی تھی جو ۱۹۲۲ء کے مقابلہ میں اٹھارہ گنا زیادہ تھی، اور سکنڈری اسکول تقریباً گیارہ سو تھے گویا ۱۹۲۲ء کی نسبت ۲۳ گنا زیادہ۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ روشن حقیقت ہے کہ ہم نے تعلیمی میدان میں یہ ترقی چالیس سال سے بھی کم مدت میں کی ہے، اس وقت حکومت کے پرائمری اسکولوں میں دس لاکھ سے زیادہ بچے زیرِ تعلیم ہیں۔ اور سکنڈری اسکولوں میں طالبعلموں کی تعداد ڈھائی لاکھ ہے، ان میں تکنیکی، زراعتی، موسیقی، نقاشی اور ٹیچرز ٹریننگ اسکولوں کے طلباء اور طالبات بھی شامل ہیں، ان بچوں کو پڑھانے کے لئے ہم نے تقریباً پینتالیس ہزار استادوں اور استانیوں کی خدمات حاصل کی ہیں، یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ ان اساتذہ میں ایک تہائی تعداد عورتوں کی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں بھی ہم کسی طرح پیچھے نہیں ہیں، اس وقت ان گیارہ ہزار طالبعلموں کے علاوہ جو تہران یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں، کئی ہزار طالبعلم ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہیں، سیکڑوں طلباء نے فوجی مدارس میں داخلہ لے لیا ہے جن کا نصاب یونیورسٹی معیار کے متوازی ہے تہران یونیورسٹی علوم طبیعی، ریاضی، انجینیرنگ، دواسازی، قانون، علومِ سیاسی، اقتصادیات، ادبیات، فنونِ لطیفہ، تعلیم وتربیت اور دینیات و فقہ اسلامی کے شعبوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ تبریز، مشہد، اصفہان، شیراز اور اہواز میں بھی یونیورسٹیاں ہیں جو

صوبائی یونیورسٹیاں کہلاتی ہیں، تہران یونیورسٹی میں جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اُن کے مقابلے میں صوبائی یونیورسٹیوں میں کم مضامین کا انتظام ہے مثال کے طور پر شیراز یونیورسٹی میں صرف دینیات، زراعت اور دواسازی پر ہی تعلیم دیجاتی ہے لیکن یہ یونیورسٹیاں بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں اور اپنے پروگراموں کو توسیع دے رہی ہیں اور ان میں سے کچھ تو پیشقدمی کے جذبے کے تحت کافی آگے نکل چکی ہیں۔

تہران یونیورسٹی سے ہی ملحق پبلک اینڈ بزنس ایڈمنسٹریشن انسٹی ٹیوٹ ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۵۴ء میں امریکی مدد سے قائم کیا گیا تھا، یہاں پر اداری اور انتظامی امُور کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے کوئی بھی ملک جو ایران کی طرح ترقی کی راہ پر ہو اس کے لئے اِس قسم کے ادارے کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس کے علاوہ تہران یونیورسٹی میں دوسرے ادارے اور مراکز بھی شامل ہیں جیسے مشرقِ وسطیٰ کا تحقیقی اور مطالعاتی مرکز، شعبۂ آثارِ قدیمہ، نفسیاتی تحقیق و آزمائش کا ادارہ، علومِ اجتماعی کا مرکز، ملیریا کی روک تھام کا دفتر اور اینٹی تحقیق کا مرکز وغیرہ۔

تہران یونیورسٹی سے علیحدہ بھی کئی اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہیں جو حکومت کی مالی مدد سے چل رہے ہیں جیسے تہران انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، یہاں کا نصاب چار سالہ ہے اور فارغ التحصیل طلباء کو ایم۔ اے کے درجے کے برابر ڈگری دی جاتی ہے۔ دوسرا ادارہ آبادان انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی ہے اس کو نیشنل ایرانین آئل کمپنی چلا رہی ہے، یہاں انجنیئری سے متعلق تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ تہران اسکول آف سوشل ورک، اجتماعی میدان میں تعلیم و تربیت دے رہا ہے اور وزارتِ صحت، نرسنگ اسکول چلا رہی ہے جہاں جوان لڑکیوں کو نرسنگ کی تربیت دیجاتی ہے اور یہ سکھایا جاتا ہے کہ بنی نوعِ انسان کی کس طرح خدمت کرنی چاہیئے۔ مندرجہ بالا تعلیمی اداروں کے علاوہ ہم نے فوج اور پولیس کے لوگوں کو پڑھانے اور لکھانے کے ساتھ ان کے پیشے سے متعلقہ تعلیم دینے کا بھی نہایت وسیع پیمانے پر پروگرام مرتّب کیا ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ ہماری خیراتی انجمنیں، آبادکاری، بینک اور حکومت کس طرح عوامی توسیع و ترقی اسکیم کے تحت لوگوں میں تعلیم پھیلا رہی ہیں، اسی کے ساتھ حکومت نے پورے ملک کے لئے بنیادی تعلیم، اور عام تعلیم و تربیت کے دوررس، اور وسیع و جامع منصوبے تیار کئے ہیں جن پر برابر عمل ہو رہا ہے۔

دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں جو لوگ اب تک علم کی سعادت سے محروم رہے ہیں ان کے لئے تعلیم بالغاں کے تحت انتظام کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں سے بڑھ کر اب لاکھوں تک پہنچ چکی ہے پڑھائی لکھائی سے واقفیت پیدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے اوزاروں کا حاصل کرلینا۔ اگر کوئی شخص اپنی تعلیم کو صحیح طریقوں پر استعمال نہ کرے تو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جب عوام میں تعلیم عام کرنے کا سوال ہمارے سامنے آیا تو یہ خدشات بھی سامنے آئے اور انہی کی وجہ سے ہماری نظر میں وسعت بھی آگئی۔ چنانچہ ہم نے ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا پروگرام اس طرح مرتّب کیا کہ اس کا براہِ راست اثر عوام کی فلاح و بہبود پر پڑے اور لوگ اپنی حالت خود سدھارنے کے قابل

ہو جائیں، چونکہ ہمارے عوام میں سیکھنے کی استعداد اور شوق بہت زیادہ ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ ان کے اس جذبہ سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

دیہاتوں میں بنیادی تعلیم و تربیت کے کاموں کو شروع کرنے کے لئے وزارتِ تعلیم نے بیسیوں کے حساب سے معلموں کو تربیت دے کر تیار کیا ہے (ان معلموں میں بہت سے شادی شدہ جوڑے بھی شامل ہیں) تاکہ یہ لوگ وہاں جا کر ان اسکولوں میں جو وہاں پہلے سے ہی موجود ہیں شام کے وقت بالغوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں، اور چونکہ ان استادوں اور استانیوں کو تعلیم بالغان سے دلچسپی ہے اس لئے ان کے رہائشی مکان دیہات کے لوگوں کے لئے اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے ہیں۔

معلم، بالغوں کو لکھنا، پڑھنا اور ابتدائی حساب سکھاتے ہیں۔ پڑھاتے وقت معلم اس بات کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں کہ جو بات بھی دیہاتیوں کو بتائیں اس کا براہ راست تعلق ان کی روزانہ زندگی اور ان کے مسائل سے ہو۔ یہاں میں اِن چند کتابوں کا ضرور ذکر کروں گا جن کو وزارتِ تعلیم نے دوسرے اداروں کی مدد سے تعلیم بالغان کے لئے تیار کیا ہے تاکہ میری بات پورے طور پر واضح اور روشن ہو جائے، ان میں سے پہلی کتاب کا نام ہے۔ 'ہم لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہیں'۔ دیگر کتب کے نام یہ ہیں، گھر اور صحت و صفائی، مرغیوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال، گاؤں کے لوگوں کی تندرستی، درخت و جنگل، اور 'ہم مل کر کام کرتے ہیں'، وغیرہ۔ ان دیہاتیوں کو کلاسوں میں تجربات کر کے بھی دکھائے جاتے ہیں مثال کے طور پر جب کسی کو، درختوں کی حفاظت کا سبق پڑھایا جاتا ہے تو اس کو عملی طور پر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کس طرح فضول شاخوں کی کاٹ چھانٹ کرتے رہنا چاہیئے اور کیڑوں سے درخت کو بچانے کے لئے کیونکر دوائیں چھڑکی جاتی ہیں، یا جس وقت وہ شہد کی مکھیوں کی پرورش کے بارے میں پڑھتا ہے تو اس کو سبق پڑھانے کے بعد یہ دکھا دیا جاتا ہے کہ کس طرح وہ شہد کی مکھیوں کو بہتر چھتہ بنانے میں مدد دے سکتا ہے، اسی طرح دیہاتی عورتوں کو نہ صرف صفائی کے فائدے، روٹی پکانے، پھل خشک کرنے اور بچوں کی آنکھوں کو چھوت کی بیماریوں سے بچانے کے ڈھنگ پڑھا کر بتاتے جاتے ہیں بلکہ ان کو عملی طریقوں سے سکھایا بھی جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی تعلیم کا اثر دیہاتیوں کی زندگی پر نہایت ہی سودمند ہوگا۔

جمہوری طرز کی تعلیم کے تیزی سے پھیلنے کے باوجود ۱۹۵۹ء تک پورے ملک میں مسلمانوں کے تقریباً دو سو دینی مکتب اور مدرسے تھے، اگرچہ اِن مدارس کو حکومت بھی مالی مدد دیتی ہے لیکن اندرونی معاملات اور طلباء کے درس و تدریس کا پورا انتظام علمائے دین کے ہی ہاتھوں میں ہے، یہاں سے جو طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں وہ زیادہ تر رسوم و فرائضِ دینی انجام دیتے ہیں، ان مدرسوں میں سب سے مشہور اور بڑا قم کا مدرسہ ہے۔ قم کا شمار متبرک مذہبی شہروں میں ہوتا ہے، یہ شہر کئی صدیوں سے معنوی فضائل کا سرچشمہ اور علومِ دینی کا گہوارہ چلا آ رہا ہے، اور آج تک

اس شہر نے اپنے آپ کو مادّی دنیا سے الگ رکھ کر اپنی اس خصوصیت کو برقرار رکھا ہے۔

دینی مدارس اور سرکاری اسکولوں کے علاوہ روز بروز پرائیوٹ اسکولوں کی تعداد بڑھ رہی ہے کسی بھی پرائیوٹ ادارے کو قائم کرنے کے لئے وزارتِ تعلیم سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ان ہی اداروں میں ایک بہت ہی اہم ادارہ نرسنگ اسکول ہے جو شیراز کے میڈیکل سینٹر سے وابستہ ہے جہاں ایک نہایت ہی عمدہ جدید ترین سامان سے آراستہ ہسپتال میں جوان لڑکیوں کو نرسنگ کی تربیت دی جاتی ہے، دوسرے پرائیوٹ اداروں میں کنڈرگارٹن اور پرائمری اسکول شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے چھوٹے چھوٹے اسکول ہیں جہاں دکانداری، غیر ملکی زبانیں، موسیقی اور دفتری کام سکھائے جاتے ہیں یہ اسکول بھی ملک میں تعلیم کو عام کرنے میں جس حد تک ممکن ہے مدد دے رہے ہیں۔

ایران کو غیر ملکی اثرات سے بچانے کے لئے میرے والد نے ۱۹۴۰ء میں یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام غیر ملکی اسکولوں کو جن میں ایرانی بچے زیرِ تعلیم ہیں حکومت اپنی نگرانی اور تحویل میں لے لے، لیکن دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہو جانے کی وجہ سے ان کے اس حکم پر عمل درآمد نہ ہو سکا، اور جن اسکولوں کو بند کر دیا گیا تھا وہ دوبارہ کھل گئے یا ان کی جگہ نئے اسکول کھول دیئے گئے، ان تمام اسکولوں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف کمیونٹی اسکول آف تہران ہے جس کو پرسبیٹری مشن کے امریکی مبلغین چلاتے ہیں، اِس اسکول میں زیادہ تعداد ایرانی بچّوں کی ہے۔ یہاں کا معیارِ تعلیم بہت بلند ہے اور بچّوں کو اس طرح پڑھا کر تیار کیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو امریکہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں، اس کے علاوہ آرمینیوں، عیسائیوں، یہودیوں اور دوسرے اقلیتی فرقوں کے بھی اپنے اسکول ہیں جن کا تعلیمی معیار اور انتظام انتہائی تسلّی بخش ہے۔

پچھلے چند سالوں سے میرے ملک کے نوجوان اور سن رسیدہ لوگوں میں انگریزی پڑھنے کا شوق تیزی سے بڑھ رہا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک میں سارا کام انگریزی میں ہوتا ہے اور لوگ اِس زبان میں بے تکان گفتگو کرتے ہیں اور ادب و فن پر جتنی کتابیں اس زبان میں لکھی گئی ہیں شاید دوسری زبانوں میں نہیں ملتیں، لیکن میری رائے میں ایرانیوں کا انگریزی سیکھنے کے سلسلے میں مطمحِ نظر اس سے بھی وسیع ہے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ اب انگریزی پوری دنیا کی زبان بن چکی ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کو مقبولیت حاصل ہے، یہاں تک کہ روسی بھی جب اپنے پروپیگنڈے کی کتابیں باہر بھیجتے ہیں تو وہ بھی انگریزی زبان میں ہی ہوتی ہیں، ایرانیوں کو غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا خاص ملکہ ہے اور خاص طور پر فرانسیسی تو بہت جلدی سیکھ لیتے ہیں، چنانچہ ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان تہران کے فرانکو ایرانین انسٹی ٹیوٹ میں اور اس کے علاوہ اسکولوں یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بڑے شوق سے باقاعدہ فرانسیسی زبان سیکھتے ہیں، لیکن انگریزی زبان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواہ کتنے ہی ادارے

اس زبان کے سکھانے کے لئے کھولدیئے جائیں لیکن وہ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مانگ کو پورا نہیں کرسکتے۔

آجکل حکومت زیادہ تر پرائمری اور تمام سکنڈری اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے، اور اسی طرح تمام یونیورسٹیوں میں انگریزی زبان اور ادب پڑھانے کا بڑے وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا ہے۔ انگریزی کی کلاسیں پرسپیڈی مشن کے تحت بھی لگتی ہیں جہاں سیکڑوں کی تعداد میں طلباء اور طالبات یہ زبان سیکھتے ہیں، برٹش کونسل نے بھی انگریزی پڑھانے کے مراکز تہران، تبریز، مشہد اور اصفہان میں قائم کئے ہیں یہاں پر بھی سیکڑوں کی تعداد میں لوگ انگریزی پڑھتے ہیں، جن لوگوں کا پیشہ معلمی ہے اور خاص طور پر وہ جو انگریزی پڑھاتے ہیں ان کو ان کلاسوں سے بہت فائدہ پہنچتا ہے برٹش کونسل کی طرح ایران امریکہ سوسائٹی نے بھی اپنے مراکز تہران، مشہد، کرمان شاہ، اصفہان اور شیراز میں کھولے ہیں اور یہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں ایرانی مرد اور عورتیں انگریزی زبان سیکھتے ہیں اس کے علاوہ کئی ہزار طالبعلم آبادان میں اور تیل کے ذخیروں کے میدانوں میں یہ زبان پڑھتے ہیں انگریزی کے سبق ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعے بھی نشر کئے جاتے ہیں، انگریزی پڑھانے کے کتنے ہی پرائیوٹ اسکول تہران اور دوسرے صوبائی شہروں میں کھل گئے ہیں، تہران اور دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں انگریزی کی کتابیں جگہ جگہ فروخت ہوتی نظر آتی ہیں اور لوگ مزید انگریزی کتابیں پڑھنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے کافی حد تک یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پچھلے چند سالوں میں ایران نے تعلیم و تربیت کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے۔ لیکن مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص یہ نہیں جانتا کہ ہمیں اس منزل کو سر کرنے کے لئے ابھی بڑا طویل راستہ طے کرنا ہے۔ ابھی تک میرے وطن کے بڑی عمر کے لوگ اور دور دراز و دشوار گذار دیہاتوں میں رہنے والے نوجوان لاکھوں کی تعداد میں علم و دانش کی روشنی سے محروم ہیں، ہمیں جہالت کا مقابلہ کرنا ہے اور یہ ایک ایسی جنگ ہے جس میں ہمیں ہرگز ہار تسلیم نہیں کرنی۔

چونکہ ہمارے ملک کی آبادی میں ہر سال تقریباً تین اعشاریہ پانچ فی صدی اضافہ ہو رہا ہے اس لئے اس بنا پر ہم نے حساب لگایا ہے کہ ہمارے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں طلباء و طالبات کی تعداد ہر سال بارہ فی صدی بڑھنے کی امید ہے اور آگے چل کر یہ بارہ فی صدی افزائش چونکہ مرکب ہوگی اس لئے اندازہ ہے کہ تعلیم کے اخراجات بھی بہت زیادہ بڑھ جائیں گے لیکن جو بھی سرمایہ اس راہ میں خرچ ہوگا اس کے نتائج صحت مند اور بہت زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

ہمارے سامنے جو اعلیٰ مقصد ہے اس تک پہنچنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ ہم تعلیم کے ذرائع اور سہولتیں تعداد میں بڑھاتے چلے جائیں، اسکولوں میں معلموں اور طلباء و طالبات کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ وسیع معنوں میں تعلیم کا مقصد کیا ہے اور یہی نکتہ میری توجہ کو اس روایت کی طرف مبذول کرتا ہے جو میں نے اس فصل کے شروع میں نقل کی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ان حقائق کو بہت صاف الفاظ میں واضح طور پر بیان کروں۔

غیر ملکی سیّاح جو حال ہی میں ایران آئے ہیں یا بہت پہلے انہوں نے اس ملک کی سیاحت کی ہے اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے ملک میں چند لوگ ایسے ہیں جو عادتاً جھوٹ بولتے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کیا وجوہات ہیں، یہ لوگ کیوں اپنے مفاد کو افضل سمجھتے ہیں اور جھوٹ سے گریز نہیں کرتے۔

اگرچہ میرے ملک کی پوری آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہی ہے لیکن ان میں سے چند لوگ ایسے بھی ہیں جو قرآن کریم کے اس فرمان کو بھول گئے ہیں کہ جھوٹ کا شمار گناہِ کبیرہ میں ہوتا ہے۔ جو مالک مکان کرایہ دار سے، دوکاندار گاہک سے، کسی ملک کے شہری ٹیکس کلکٹر یا کسٹم انسپکٹر سے جھوٹ بولتے ہیں وہ اس کتاب مقدّس میں پڑھ سکتے ہیں کہ کسی بھی دروغگو کا عذر قابلِ قبول نہیں، اور اس کو کسی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک دو جگہ نہیں بلکہ کئی آیات میں جھوٹ کی مذمت کی گئی ہے اور ایک سورۃ تو مستقل اس باب میں ہے چنانچہ سورۃ مطففین (پارہ ۲۹ سورۃ ۸۳) میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ جو لوگ چیزوں کی خرید کے وقت مقررہ اوزان سے زیادہ خریدتے یا ناپتے ہیں اور فروخت کے وقت کم تولتے یا پیمائش کرتے ہیں وہ خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے، دینِ مبین اسلام سے قبل بھی ایران میں اسی اصول پر عمل ہوتا تھا، چنانچہ داریوش کا فرمان ہے کہ "سچ بولو اور جھوٹ سے پرہیز کرو" قرآن شریف نے نہ صرف توریت اور انجیل کے احکام کو مانا ہے بلکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی نبوت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ توریت کی اس آیت کی قرآن شریف سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ "تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دے گا۔"

بعض دروغگو اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس معیوب اور ناپسندیدہ عادت کے جواز میں تاریخی اسباب کا سہارا لیں اور عذرِ لنگ پیش کریں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب منگولوں اور تاتاریوں نے ایران پر حملہ کیا تو جان بچانے کے لئے سوائے جھوٹ بولنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا، اور اس کے بعد یہ رویّہ لوگوں کی عادت بن گیا بہرحال یہ تاریخی واقعات جن کی وجہ سے جھوٹ بولنا ناگزیر امر بن گیا تھا آج کے زمانے کے لیے سازگار نہیں ہیں، اور جو لوگ اس دور میں جھوٹ بولنے کے لئے یہ جواز پیش کرتے ہیں ان کی دلائل بہت ہی کمزور اور ناپائیدار ہیں۔ بعض لوگ دروغگوئی کے لئے اس کے علاوہ بھی جواز اور بہانہ تراش لیتے ہیں وہ اس کو یورپین اقوام کی طرح سفید جھوٹ سے تعبیر کرتے ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سعدی شیرازی جو ہمارے ملک کا بہت مشہور اور محبوب شاعر ہے اس نے بھی اپنی کتاب گلستان میں سفید جھوٹ کے لئے مبالغے سے کام لیا ہے وہ کہتا ہے کہ "کسی مصلحت سے جھوٹ بولنا اس سچائی سے بہتر ہے جس سے کوئی فتنہ وفساد بپا ہو،

میری رائے میں شیخ سعدی کا یہ قول اخلاقی اصولوں اور زندگی کے حقائق کے مطابق نہیں ہے۔ دروغگو نہ صرف احکامِ دین کی خلاف ورزی ہے بلکہ عملی زندگی میں یہ بالکل لاحاصل چیز ہے۔ دروغگوئی اخلاقاً غلط اور عقل و

حکمت کی رُو سے سراسر حماقت ہے۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے کتنی ہی جھوٹی باتیں گھڑنا پڑتی ہیں اور آخر میں یہ جھوٹ دروغگو کے ہاتھ پیروں کو اپنی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں اور جھوٹا اپنے ہی بناتے ہوئے جال میں پھنس جاتا ہے۔

جیسا کہ اس فصل کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کی راست گوئی نے نہ صرف آپ کی جان بچائی بلکہ دشمن کی شکست کا موجب بنی۔ سچائی سے نہ صرف ہمارے ضمیر کو فرحت و آسودگی ملتی ہے بلکہ ہم بہت سی مصیبتوں سے بھی بچ جاتے ہیں، اس سے قوموں کا کردار بنتا ہے اور کام کرنے کی صلاحیت اور استعداد بڑھتی ہے کیونکہ اجتماعی زندگی کی بنیاد افراد کے اطمینان اور اعتماد پر ہی استوار ہوتی ہے۔

ایرانی کنبوں کی اپنی ہی خصوصیات ہیں۔ جن سیاحوں نے ایران کا سفر کیا ہے انہوں نے خاندان کے ڈھانچے کی مضبوط اور پائیدار تشکیل کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ہمارے ہاں خاندان کی شیرازہ بندی محض والدین اور بچوں سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں چچا، ماموں، چچیاں، پھوپھیاں، خالائیں اور بہوئیں اور داماد وغیرہ سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ ایرانی خاندان میں زندگی کا مرکز یا تو اپنا ہی گھر ہوتا ہے یا قریبی رشتے اور کنبے داروں کے مکان، لیکن باوجود ان تمام خصوصیات اور زندگی کی آسائشوں کے بچوں کی پرورش اور تربیت پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے لاڈ اور پیار سے مائیں اپنے لڑکوں کو اور باپ اپنی لڑکیوں کی عادات خراب کر دیتے ہیں، والدین اور بچوں کے درمیان جو روحانی اور اخلاقی رشتہ بچوں کی تربیت کے لئے ہونا چاہیئے اس کی کمی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ بہت سے ایرانی گھرانوں میں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس بچوں میں پیدا ہونے نہیں دیا جاتا۔ بچوں کو یہ بالکل سکھایا ہی نہیں جاتا کہ ان کو مستقبل میں کیا کرنا ہے، ان کو اس قسم کے مواقع فراہم نہیں کئے جاتے کہ وہ مشق کے ذریعے اپنی دماغی یا جسمانی صلاحیتوں کو جلا دیں، ان کو تفریحی مشاغل کی طرف راغب نہیں کیا جاتا اور یہ نہیں بتایا جاتا کہ قدرتی مناظر سے کس طرح لطف اندوز ہوا جاتا ہے، جب والدین اور بچوں کے درمیان اعتماد کا جذبہ نہیں رہتا تو بچہ ان میں اپنے آپ کو غیر مطمئن محسوس کرتا ہے اور غیر ارادی طور پر اس کے ذہن میں یہ خیال پرورش پاتا رہتا ہے کہ جب کوئی اس کی نگرانی اور دیکھ بھال نہیں کرتا تو وہ کیوں دوسروں کے لئے فکر کرے؟ جب کبھی کسی بچے کے ہاتھ سے کوئی چیز گر کر ٹوٹ جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ خود کو اس نقصان کا ذمہ دار قرار دے، جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ یہ بات بالکل عجیب ہے کہ ایک کسان کا بچہ چونکہ اس میں باپ کا ہاتھ بٹانے اور کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے احساسِ ذمہ داری پیدا ہو چکا ہے راست گوئی اور دستکاری میں ان بچوں سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے جن کی پرورش اقتصادی اور اجتماعی اعتبار سے اچھے گھرانوں میں ہوتی ہے۔

چونکہ مجھے ایرانی قوم سے عشق و علاقہ ہے اس لئے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں بہت صاف اور کھلے الفاظ

میں اس بات کا ذکر کروں کہ بڑھتی ہوئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لئے کن چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ اعلیٰ تربیت کی ذمہ داری سب سے پہلے والدین اور خاص طور پر ماں پر آتی ہے۔ ہر ایرانی بچے کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ اس کی ماں کی محبت اس کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اس کی گود اس کی حفاظت کے لئے ہمیشہ کھلی ہوئی ہے۔ اس کی چھوٹی سی دنیا میں اس کی ماں اور چند ہی لوگ ایسے ہیں جو اس کی ہمیشہ دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس کی فلاح و بہبود کے خواہشمند ہیں اس کو یہ پورا پورا یقین ہونا چاہیئے کہ ہر مصیبت اور پریشانی میں ماں سے مدد مل سکتی ہے اور وہ اس کی محبت اور شفقت سے محروم نہیں ہوا ہے۔ اگر بدبختی سے کوئی بھی بچہ ماں کی ممتا اور آغوش سے محروم ہو گیا ہو تو کسی اور کو چاہیئے کہ وہ اس کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے یتیم خانوں اور بچوں کی پرورشگاہوں پر اتنی زیادہ توجہ دی ہے۔ اس کا ذکر تفصیل سے آٹھویں فصل میں آچکا ہے۔

بچے میں احساس ذمہ داری اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ماں کی اندھی ممتا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اس کو شروع سے ہی اصول و ضوابط کا پابند بنایا جائے ہر ماں کو چاہیئے کہ وہ بہت چھوٹی عمر سے ہی اپنے بچے کو سچ بولنا سکھائے اور اس میں یہ عادت پیدا کرے کہ وہ اپنے ہر فعل اور عمل کی اپنے اوپر ذمہ داری لے۔ اکثر بچے ناپختہ بڑوں کے منہ سے یہ جملہ سن کر "اس میں میرا کوئی قصور نہیں" خود بھی یہی کہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ بچوں کی اس عادت کو چھڑانا چاہیئے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بچے بہت سی باتوں میں دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے ہیں، حالانکہ قصور انکا اپنا ہی ہوتا ہے۔ ماں کا فرض ہے کہ اس میں یہ جرأت پیدا کرے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرے، بچپن سے ہی بچے میں ایسی ہمت اور حوصلہ مندی بھر دینی چاہیئے کہ وہ اپنے تمام اعمال و افعال کے نتائج کا خود ہی مقابلہ کرے اور اپنی غفلت یا کاہلی سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے کیونکہ اوائل عمری میں ہی ایک ماں اپنے بچے کے ذہن میں انسانیت اور فرض شناسی کے بیج بو سکتی ہے اور اگر مائیں اس فرض سے عہدہ برآ نہ ہونگی تو بچے بالکل لاپروا اور غیر ذمہ دار ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں گی۔

ہر ماں کو چاہیئے کہ بہت شروع سے ہی اپنے بچوں کے لئے ایک منظم پروگرام مرتب کرے اس کو جو بھی کھلونے دے اس کا محض مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ بچہ ان سے بہلتا رہے بلکہ ان کے ذریعے وہ اپنی تخلیقی اور اختراعی قوتوں کو بھی جلا دے۔ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ بچوں کو کھلونے ضرور دینے چاہئیں اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہمارے بہت سے بچے کھلونے نہ ملنے کی وجہ سے اپنی جسمانی اور دماغی طاقت کی نشوونما نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب ہم بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں ایسے ہی سستے اور سادے کھلونے تیار کریں گے جو میں نے امریکہ اور یورپ میں دیکھے ہیں، اور مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ ہم نے کھلونے بنانے کے کارخانے شروع بھی کر دئے ہیں۔

جیسے ہی بچے کا دودھ چھڑایا جائے اس کو ایسے کھلونے دے دیتے جائیں جو بڑی سادگی سے مکینکی کاموں کے لئے بنائے گئے ہوں۔ میں یہ کبھی نہ بھولوں گا کہ ان کھلونوں سے میں نے اپنے بچپن میں کتنا لطف اور فائدہ اٹھایا ہے۔ مشرقی ممالک کی ایک بدبختی یہ بھی ہے کہ وہ دستکاری کو عیب سمجھتے ہیں اور ان کھلونوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں بچوں کے ذہنوں سے یہ خیال محو ہو جائے گا کہ ہاتھ سے کام کرنا عار یا ذلت کا باعث ہے اس سلسلے میں ہمیں امریکیوں سے سبق سیکھنا چاہیئے کیونکہ جس وقت ان میں سے کسی شخص کے ہاتھ کام کرنے کی وجہ سے میلے ہو جاتے ہیں تو وہ اس پر فخر کرتا ہے۔ آج کا سائنسدان اپنی تجربہ گاہ میں نہ صرف دماغی کام کرتا ہے بلکہ وہ اپنے ہاتھوں سے بھی کام لیتا ہے، اور عصر جدید کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ سائنسدانوں کی اس مثال کو اپنے لئے راہنما بنائیں۔

دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی چھوٹی چھوٹی بچیاں فطرتاً گڑیوں سے کھیلنا پسند کرتی ہیں اس طرح ان کو اپنی ماؤں کی تقلید کرنے کا موقع ملتا ہے اور تعلیم و تربیت کے نقطۂ نظر سے اس کی اپنی قدر و قیمت ہے، لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی ہمیں اپنے بچوں کو قدرت کے سربستہ راز سمجھانے کے لئے ابھی اور آگے بڑھنا ہے، مثال کے طور پر ایران کے باغ بہت مشہور ہیں ہم ان باغوں میں بچوں کو باغبانی سیکھا سکتے ہیں، مختلف قسم کی سبزیوں اور پودوں کی شناخت کرا سکتے ہیں۔ اور اپنے بچوں میں مچھلیاں، پرندے اور چوپائے پالنے کا شوق پیدا کر سکتے ہیں، جب ایک بچہ جانوروں کے ساتھ رحم کا سلوک کرنا سیکھ جاتا ہے تو اس میں خود ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ زیادہ نرمی، مہربانی، عدل و سخاوت کا احساس قوی ہو جاتا ہے۔

تفریحی مشاغل کے میدان میں ہمیں اور زیادہ ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک میں جگہ جگہ تاریخی عمارتیں ہیں اور معدنیات بھی ہر جگہ فراواں ہیں ہمیں چاہیئے کہ بچوں میں یہ جذبہ اور ذوق پیدا کریں کہ وہ ان معدنیات کے نمونے جمع کریں اور پہچانیں کہ ان میں کون سی دھاتیں ہیں اور کس کام آتی ہے۔ بچوں کو ہمیں کھیل کود میں بھی آگے بڑھانا چاہیئے اور خاص طور پر ایسے کھیلوں میں زیادہ بڑھاوا دینا چاہیئے جس میں کئی کئی بچے ایک ساتھ کھیلتے ہیں ایسا کرنے سے ہم ان کی سرکشی اور انفرادیت کو مل کر کام کرنے کے جذبے میں تبدیل کر سکیں گے۔ اسی طرح کھیل کود کے دوران بچوں کو یہ بھی سیکھانا چاہیئے کہ کھیل میں ہار جیت زیادہ اہم نہیں بلکہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ مقابلہ پوری طرح ڈٹ کر کرنا چاہیئے تاکہ ایک دوسرے کی مدد اور باہمی تعاون کا جذبہ پوری طرح نشو و نما پا سکے۔

ایسے بچوں کے لئے جن کی عمر اتنی نہیں ہے کہ ان کو اسکول میں داخل کرایا جا سکے سرکاری اور پرائیوٹ کنڈرگارٹن کھولے گئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ مل کر کام کرنا اور ایک ساتھ کھیلنا کردار کے بنانے اور دستکاری سیکھانے میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن باوجود ان تمام خوبیوں کے ایک کنڈرگارٹن میں کسی بھی بچے کو گھر کا سا آرام اور سہولتیں

میسّر نہیں آسکتیں۔

ایران کی پرائمری تعلیم میں جو اصلاح کی گنجائش ہے اس کا میں یہاں تفصیل سے ذکر کروں گا۔ گھروں کی طرح پرائمری اسکولوں میں بھی سب سے پہلے موجودہ نظریات کو بدلا جائے۔ ہمارے اسکولوں میں بہت سے ایسے معلّم ملیں گے جن کی صحیح اصولوں پر تعلیم و تربیت نہیں ہوئی ہے۔ ان کی معلومات بھی محدود و ناقص ہیں اور پڑھانے کا مناسب طریقہ بھی نہیں جانتے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ہم ایک معلّم سے کیا توقعات کر سکتے ہیں، ہمارے پرائمری اسکولوں میں بچّوں کو طوطے کی طرح سبق رٹوا دیا جاتا ہے۔ بچّے کو یہ موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ خود بھی اپنی عقل سے کام لے اور ذہن پر زور ڈال کر سمجھنے کی کوشش کرے یا یہ جانے کہ ذمّہ داری کس شے کا نام ہے اور ہمیشہ سچ بولے۔ ہمارے معلّم ایماندار بھی ہیں اور ان میں کام کرنے کی بھی لگن ہے لیکن چونکہ پڑھانے کے لئے جس سامان کی انھیں ضرورت پڑتی ہے وہ بہت حد تک فرسودہ اور ناقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کو اپنی بے چارگی کا احساس رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو جو تنخواہ ملتی ہے اس سے اخراجات پورے نہیں ہوتے اور اکثر مکان نہ ملنے کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ہم نے وزارتِ تعلیم کے محکمے میں ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا ہے، جس کا صرف یہی کام ہے کہ وہ پرائمری اسکولوں کے استادوں کی دشواریاں اور ان کے مسائل کی جانچ کرے۔ ہم نے ایک شعبہ امور خانہ داری و کفایت شعاری کا بھی کھولا ہے جس میں کام کرنے والی سب خواتین ہی ہیں جنہوں نے امورِ خاندان اور خانہ داری سے متعلق تعلیم کا ایک وسیع پروگرام لڑکوں اور لڑکیوں کے ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں شروع کیا ہے۔ ہم نے ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں زراعت کے اصول پڑھانے کا بھی بندوبست کیا ہے۔ کم ترقی یافتہ ممالک کی ایک بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ کسی منصوبے کو کامیابی سے چلانے کے لئے ان کے پاس صحیح اعداد و شمار نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہم نے یونسکو کی مدد سے ایک محکمہ تعلیمی اعداد و شمار کا قائم کیا ہے جس کی وجہ سے اب ہم کو اپنی تعلیم و تربیت کی نوعیت کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

جو ممالک ترقی کی راہ پر ہیں ان کی ایک بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ وہاں پڑھانے کے لئے اچھے ٹیچر نہیں ملتے۔ اس لئے ہمارے واسطے ضروری ہے کہ ہم استادوں اور استانیوں کی تربیت گاہوں کی نہ صرف توسیع کریں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی کئی نئے تربیتی مرکز خاص طور پر عورتوں کے لئے قائم کریں تاکہ ضرورت کے مطابق ہم کو آزمودہ استاد اور استانیاں مل سکیں۔

۱۹۵۹ء تک ہمارے ملک میں پچاس اسکول معلّموں کی تربیت کے لئے تھے۔ جن میں ستائیس معمولی قسم کے بارہ زراعت کے لئے مخصوص تھے۔ تین جسمانی تربیت کے اور آٹھ قبائلی علاقوں کے لئے تھے۔ جن استادوں کو قبائلی بچّوں کو پڑھانے کی تربیت دی جاتی تھی ان کو خاص طور پر یہ سکھایا جاتا تھا کہ جیسے ہی قبیلے ایک جگہ سے دوسری

جگہ ہجرت کریں تو وہ بھی اپنے اسکول کے خیمے لے کر ساتھ ساتھ جائیں ان ستائیس تربیتی اسکولوں میں سے صرف چھ استانیوں کے لئے مخصوص تھے اور زراعتی و ورزشی تربیت کے اسکولوں میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت ہی کم رہتی تھی، لیکن اب ہمارے ملک کی لڑکیوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ان کے لئے معلّمی نہایت مناسب پیشہ ہے۔ اگر ان کو داخلے کی سہولتیں دی جائیں تو مزید لڑکیاں اس میں آنا پسند کریں گی۔

میرے سامنے اس وقت یہی مقصد ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ابتدائی مدارج میں پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کی تعداد کے برابر ہو جائے، جس کے لئے مزید استانیوں کی خدمات درکار ہوں گی۔ میرے ملک میں اس بات کی پابندی نہیں ہے کہ اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کو استانیاں ہی پڑھائیں (کچھ حد تک سکنڈری اسکولوں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے) بلکہ اکثر جگہ تو پڑھائی کا انتظام مخلوط ہے جہاں مرد بھی پڑھاتے ہیں اور عورتیں بھی لیکن جیسے ہی ابتدائی مدارس میں پڑھنے والی بچیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اسی مناسبت سے استانیوں کی ضرورت بڑھے گی، اسی طرح میری رائے میں یہ اشد ضروری ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ ہم لڑکیوں کے ثانوی اسکولوں کی تعداد بڑھائیں تاکہ ان کی تعداد لڑکوں کے اسکولوں کے برابر آجائے۔

اسی کے ساتھ ہمیں لڑکے اور لڑکیوں کے مخلوط تربیتی اسکول بھی تجربے کے طور پر قائم کرنے چاہئیں اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ بہت سے لڑکے، لڑکیاں یہاں آپس میں شادی کرلیں گے اور شوہر و بیوی دونوں ملک کے دور دراز علاقوں میں جاکر لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم دیں گے اور چونکہ دونوں کے مقاصد اور دلچسپیاں مشترکہ ہوں گی اس لئے بڑے اطمینان اور خاطر جمعی سے ایک دوسرے کے کام میں مدد دیں گے۔

ہمارے سامنے ایک دشواری یہ بھی ہے کہ جن اسکولوں میں استادوں اور استانیوں کو پڑھانے کی تربیت دی جاتی ہے وہاں کیا معیار برقرار رکھا جائے۔ چونکہ پچھلے چند سالوں میں ہمارے تعلیمی پروگراموں میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے اس لئے ہمارے پرائمری اسکولوں میں ایسے بھی ٹیچر آگئے ہیں جن کی تعلیم اسکولوں میں بارہ سال سے زیادہ نہیں ہوئی اور بعض تو ایسے بھی ہیں کہ جو اسکولوں میں اس سے بھی کم مدت تک پڑھے ہیں، میری رائے میں ہر شخص اس بات سے اتفاق کرے گا کہ ایک ایسے معلّم سے جس کی تربیت اور معلومات میں نقص ہو بچوں کو پڑھوانا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ پڑھوایا ہی نہ جائے، لیکن ہمیں اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ اپنے استادوں کی سطح معلومات کو اونچا کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات اٹھائیں۔

پرائمری مدارج پر پڑھانے والے استادوں اور استانیوں کے فکر و نظر اور پڑھانے کے طریقے میں تبدیلی اس طرح بھی پیدا کی جا سکتی ہے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اور ان دنوں جبکہ اسکول کھلے ہوئے ہوں باقاعدہ کلاسیں لگیں جہاں وہ اپنی معلومات اور استعداد بڑھا سکیں، اگرچہ عملی طور پر ہم یہ کام شروع کر چکے ہیں لیکن ابھی

انگلستان میں ملکہ الزابتھ کے ہمراہ شاہی سواری سے اُترتے ہوئے

تہران میں صدر جمہوریۂ امریکہ آئزن ہاور کے ہمراہ

ہماری منگنی کے دن کی تصویر

ہماری شادی کی یادگاری تصویر

اس کو وسعت دینے کی گنجائش باقی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم ضرورت اس وقت ہمارے سامنے یہ ہے کہ پڑھنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ ہم کو اچھے تربیت یافتہ استاد اور استانیاں بھی ملتی رہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جبکہ ان اسکولوں میں جہاں استاد اور استانیاں تربیت حاصل کرتے ہیں تربیت دینے اور پڑھانے کے لئے اچھا اور قابل عملہ موجود ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھے استاد ہی آیندہ کے لئے اچھے معلّم تیار کر سکتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے تربیتی اسکولوں میں پڑھانے اور تربیت دینے والے استاد کافی تجربہ کار اور اپنے کام میں ماہر ہیں۔ لیکن ان میں سے چند ہی ایسے ہیں جن کے پاس کسی کالج یا یونیورسٹی کی کوئی ڈگری ہے۔ اس خامی کو دور کرنے کے لئے ہمیں چاہیئے کہ تہران یونیورسٹی میں جس قدر جلد ممکن ہو سکے نیشنل ٹیچرز کالج کو توسیع و ترقی دیں میری رائے میں ہم کو اس طرح کے اور بھی کئی کالج اپنی صوبائی یونیورسٹیوں میں قائم کر دینے چاہئیں، اس کے علاوہ بہت سے غیر ممالک میں جو تجربات کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ تربیتی اسکولوں میں پڑھانے والے اچھے معلّم کسی ٹیچر ٹرینگ کالج سے ہی نکلیں، اس کام کے لئے ہم اپنے ملک کے ان نوجوانوں کی خدمات بھی حاصل کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنے ہی ملک میں رہ کر یا باہر جاکر دوسرے مضامین کے ساتھ پڑھانے کے طور طریقوں کا بھی کچھ مطالعہ کیا ہو۔

ایران میں ابتدائی مدارج تک تعلیم کو بڑی تیزی سے عام کرنے کے لئے میری رائے میں یہ بہت ضروری ہے کہ کسی بھی محلے میں یا کہیں بھی پڑھنے والے بچے اور ان کے والدین مل کر اپنی مدد آپ والے اصول پر پیشقدمی کریں اور اس نیک کام کو آگے بڑھائیں۔ پچھلے سالوں میں پورے تعلیمی نظام کے لئے تہران کو ضرورت سے زیادہ مرکزیت دے دی گئی تھی اور تقریباً ہر چیز کی نگرانی یہیں سے کی جاتی تھی اور اسی وجہ سے مقامی سطح پر تعلیم کو عوام میں پھیلانے میں ہم ناکام رہے۔ لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ پورے ملک میں ہر طرف تعلیم کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھنے کے لئے لوگوں میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہو چکی ہے، اگر کسی کسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے بچے اسکول میں پڑھ سکتے ہیں تو وہ خوشی خوشی اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کو پڑھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے

لوگوں کا یہ تعاون پورے جوش و خروش کے ساتھ ہمیں کچھ دن پہلے ہی ملنا شروع ہوا ہے۔ چنانچہ بہت سی جگہوں پر بچوں کے سرپرستوں اور معلّموں کی انجمنیں بالکل اسی انداز پر قائم ہوئی ہیں جیسی امریکہ یا برطانیہ میں والدین و معلّمین کی انجمنیں ہیں، لیکن ایران جیسے ملک میں جو ترقی کے منازل طے کر رہا ہے ابھی اور کام کرنا باقی ہے۔ اس سے پہلے میں اسکولوں کی تعمیر اور دوسرے مقامی سطح پر عوامی فلاح کے کاموں کے لئے یہ مشورہ دے چکا ہوں کہ لوگ اپنی مدد آپ کریں۔ یہاں پھر اس بات کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ اسکولوں کی عمارات بناتے وقت

وزارتِ تعلیم کو چاہئے کہ ہر جگہ مقامی ضروریات اور موسمی کیفیات کا خاص خیال رکھے، اور اگر کسی جگہ اسکولوں کے لئے ضروری سامان نہ ملتا ہو تو اس کو مہیا کرنے کے علاوہ انجینئروں کو اس کی تعمیر اور نگرانی کے لئے مقرر کرے، گاؤں کے لوگ (اور اگر کسی کی جاگیر ہے تو جاگیردار) زمین، ضروری سامان اور مزدور تو دے ہی سکتے ہیں۔ چنانچہ اکثر جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں کہیں زمین بیکار پڑی تھی وہاں حکومت اور عوام کے تعاون سے مدرسے اس تیزی سے بننے شروع ہوئے ہیں کہ دیکھنے والے کو تعجب ہوتا ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دن دور نہیں جب کہ شہروں کے چند بڑے بڑے ابتدائی اسکولوں کو چھوڑ کر باقی سب جگہ اسکول اسی طرح بنائے جائیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اسکول بن جائیں گے تو اس کی ہر ایک عمارت اور میدان کی نگرانی اور دیکھ بھال کون کریگا میرا جواب صرف اتنا ہے "یہ کام بھی بچے خود ہی کریں گے"۔ اس کی میں ایک مثال بھی دیتا ہوں تہران کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بہت ہی خوبصورت اور حسین سرکاری پرائمری اسکول ہے جہاں بچے اور بچیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ اسکول بڑے سلیقے سے بنایا گیا ہے جہاں بہت سے کمرے ہیں۔ ایک کارخانہ بھی ہے جہاں لڑکے لڑکیاں کپڑا بُننا اور لکڑی کا سامان بنانا سیکھتے ہیں۔ والی بال کورٹ کے ساتھ ایک کھیل کا میدان بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پورے اسکول اور اس کے سامان کی نگرانی کے لئے ایک شخص ملازم رکھا گیا ہے لیکن اس اسکول کی عمارت اور میدان کی صفائی کا لڑکے خود ہی خیال رکھتے ہیں، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جیسے ہی کوئی شخص اسکول میں داخل ہوتا ہے تو فوراً اس کی نظر ان پھولوں پر پڑتی ہے جو پوری عمارت کے چاروں طرف بڑی خوبصورتی سے لگائے گئے ہیں اس کے پیچھے پھلوں اور ترکاریوں کی کیاریاں ہیں۔ یہ سب کام یہاں پڑھنے والے بچوں کا کیا ہوا ہے، میدان میں پڑھانے والوں کے بڑے سادے مگر دلکش مکان بھی بنے ہوئے ہیں اور اس طرح سے ان استادوں اور استانیوں کی رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے جو باہر سے یہاں بھیجے گئے ہیں۔

یہ تمام سلیقہ شعاری ہمارے ایک سابق وزیرِ تعلیم کی دلچسپی کا نتیجہ ہے جو اس گاؤں میں رہ چکا ہے اور یہ کام کہیں بھی کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کی محنت اور کوشش سے جو روپیہ بچے گا اس کو دوسری جگہوں پر اسکول بنانے کے کام میں لایا جا سکتا ہے تاکہ وہ بچے جو اب تک اس سعادت سے محروم ہیں فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ بچوں کا تعاون ہمارے تعلیمی تجربات میں ایک بہت ذی قیمت تجربے کا اضافہ کرے گا۔

اب میں ثانوی اسکولوں کے مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کروں گا، پچھلے چند سالوں میں جو ثانوی اسکولوں کی تعداد بڑھی ہے اور دستکاری و صنعتی اسکولوں کی تعداد میں تہران و دوسرے صوبوں میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ۱۹۵۹ء تک ہمارے دستکاری اسکولوں میں تقریباً پانچ ہزار لڑکے نل، بجلی، ڈھلائی اور بڑھئی کے کاموں کی تربیت پا رہے تھے، اسی کے ساتھ

ہی کئی سو لڑکیاں سلائی اور ٹائپ کرنا سیکھ رہی تھیں۔ زراعتی اسکولوں میں دو ہزار لڑکے جدید طریقوں پر کھیتوں کی دیکھ بھال کی تربیت حاصل کر رہے تھے، لیکن یہ سب ہمارے کام کی ابتدا ہے اور ہمیں اس میں کئی گنا اضافے کرنے ہیں۔

ایران جیسا ملک جو ترقی کی راہ پر ہے اس میں دستکاری اور صنعتی اسکولوں کی اہمیت پر جتنی بھی توجہ دی جائے کم ہے، غیر ملکی اور خود ایرانی بھی اس بات کے معترف ہیں کہ ہماری اس وقت سب سے بڑی ضرورت انجینئر، منیجر، اور اعلیٰ قسم کے تکنیکی ماہرین ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں دن بدن ایسے لوگوں کی مانگ بڑھ رہی ہے لیکن ہماری اصلی ضرورت کچھ اور رہی ہے، ایک طرف ملک میں اور ملک کے باہر ہم نے بہت سے تکنیکی ماہرین کو ٹریننگ دلوائی ہے ان میں سے کچھ کو بہت سے ترقیاتی پروگراموں یا ان غیر ملکی صنعتی ماہرین کے ساتھ مختلف کاموں پر لگا دیا گیا ہے جن کی خدمات ہماری حکومت نے حاصل کی ہیں، لیکن دوسری طرف ان مزدوروں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے جن کو کسی کام کی مہارت نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کم۔

اس وقت جس سب سے بڑی دشواری کا سامنا ہم کر رہے ہیں وہ مشّاق کاریگروں تجربے کار مزدوروں اور ایسے فنّی ماہرین کی کمی ہے جو اپنے کام کے ساتھ مزدوروں اور کاریگروں کی سرپرستی اور دیکھ بھال بھی کر سکیں۔ ان کی ہمیں، صنعتی پیداوار، تعمیرات اور زراعت کے علاوہ دوسرے کاموں کے لئے بھی سخت ضرورت ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ایک طرف ہم کو اعلیٰ درجے کے ہزاروں آدمیوں کی ضرورت ہے تو دوسری طرف متوسط درجے کے کاریگر اس سے کئی گنا زیادہ تعداد میں درکار ہیں۔ اگر ہماری ضرورت بہت ہی شدید ہو تو ہم اعلیٰ درجے کے ماہرین و متخصصین کو باہر سے بلا کر عارضی طور پر ملازم رکھ سکتے ہیں لیکن متوسط درجے کے کاریگروں اور تکنیکی ماہروں کو ایک محدود تعداد میں تو باہر سے بلا سکتے ہیں یا اپنے آدمیوں کو باہر ٹریننگ کے لئے بھیج سکتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ہی طالبعلموں کو اپنے ملک کے دستکاری اور زراعتی اسکولوں میں تربیت دے کر تیار کریں۔

ہمارے روز بروز تیزی سے پھیلتے ہوئے تعلیمی نظام میں استادوں اور تربیت دینے والوں کی کمی ایک بار پھر ہمیں دشواریوں اور پریشانیوں سے دوچار کرتی ہے۔ استادوں اور معلّموں کے بغیر اسکول نہیں چل سکتے اور اچھے اسکولوں کو اچھی طرح اچھے استاد ہی چلا سکتے ہیں، دستکاری اور زراعتی اسکولوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اچھے استاد نہ ملنے کی وجہ سے تعلیمی معیار برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ زیادہ تعداد میں بہتر استادوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم انہی لوگوں کو مزید تربیت دیں جو سر دست یہاں موجود ہیں، ہم کو تہران انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی فوراً توسیع کر دینی چاہیئے۔ تہران یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج اور آبادان انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے فارغ التحصیل طالبعلموں کو ثانوی اسکولوں میں پڑھانے کے لئے راضی کرنا چاہیئے، جو ایرانی طالبعلم دیگر ممالک میں انجینئری

اور تکنیکی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کو اس طرف راغب کریں۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اپنی صوبائی یونیورسٹیوں میں انجینئرنگ کے شعبے قائم کریں۔ اگر ضرورت ہو تو ان شعبوں کی استعداد بڑھانے کے لئے ہمیں غیر ممالک سے مزید ٹکنیکل ٹیچر وقتی طور پر بلا لینے چاہئیں۔

ان تمام مسائل میں اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ سیکنڈری اسکولوں کے ٹیچرز کو اور خاص طور پر انہیں جو تکنیکی مضامین سے تعلق رکھتے ہیں اچھی تنخواہیں دیں۔ اور جدید طرز کے سستے مکان مہیا کریں۔ زندگی کے نہایت خوشگوار اور لذت بخش تجربات میں سے ایک تجربہ نوجوانوں کے ساتھ رہ کر کام کرنا بھی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ معلم روٹی کپڑے اور مکان کی فکر سے آزاد ہوں اور روزمرّہ کی ضروریات ان کے ذہن کو پراگندہ نہ کریں۔

دستکاری اور زراعتی میدان میں سیکنڈری اسکولوں کی تعلیم کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ لعنت جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے جلد از جلد دور کر دینی چاہیئے۔ بحیثیت ایک قوم ہمیں دستکاری اور تخلیقی کاموں کو اپنے لئے عار نہ سمجھنا چاہیئے میں کتنے ہی بچّوں کو جانتا ہوں جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا باپ کُدال پھاوڑے سے کام کر رہا ہے تو وہ اپنے لئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ دفتر کی خاص یونی فورم پہن کر ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس لے کر چلنا ہی (خواہ اس میں کچھ ہی بھرا ہوا ہو) اپنے لئے زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور فخر سمجھتے ہیں وہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں خواہ کچھ بھی ہو دستکاری کر کے اپنے ہاتھوں کو میلا نہیں کریں گے وہ اس خیال میں مگن ہیں کہ کسی بھی سرکاری دفتر میں نوکری کر کے ہی شان اور عزّت پیدا کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات بچّوں میں بڑوں سے ہی سرایت کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر ان بڑوں اور بزرگوں سے جو مالی اعتبار سے خوشحال بھی ہیں۔ ان بزرگوں اور بڑی عمر کے لوگوں میں کچھ لوگ تو ایسے بھی ملیں گے جو اپنے بچّوں میں ایسے خیالات کو پرورش دیتے ہیں جو اس سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا میں بالکل بے معنی اور بے مقصد سمجھے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بچّہ ثانوی اسکول کے درجے تک پہنچتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیالات پختہ ہو چکے ہوتے ہیں کہ دماغی کام کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے کام کرنا اس کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے چنانچہ ملک ان صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا جو ترقی کے لئے لازمی ہیں۔

میری دانست میں امریکیوں نے سب سے بڑی چیز جو علم و دانش کو دی ہے وہ اخلاقی اصول ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی سکھایا ہے کہ ہاتھ کے ہنر اور دستکاری کو عزّت اور احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ امریکہ نے جو اس قدر ترقی کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں ہاتھ سے کام کرنے کو عیب نہیں سمجھا جاتا، مجھے بیحد مسرت ہے کہ جب نکتۂ چہار کے تحت امریکی مشیر ایران آئے تو انہوں نے نہ صرف اس خیال کو لوگوں میں پھیلایا بلکہ خود بھی اس پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو دیکھ کر ہمارے نوجوانوں میں بھی ہاتھ سے

کام کرنے کا شوق ابھرا چنانچہ اب وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے آپ کو عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق ڈھالیں۔

جن اسکولوں میں دفتری کاموں کی تربیت دی جاتی ہے ہمیں چاہئے کہ ان کی تعداد میں بھی اضافہ کریں۔ میری رائے میں بہت سے ممالک جو ترقی کی راہ پر ہیں ان میں ایسے باتجربہ اور تربیت یافتہ لوگوں کی سخت کمی ہے جو دفتروں میں کلرک یا سیکریٹری کا کام بخوبی انجام دے سکیں، یہی حال ایران کا بھی ہے، تہران میں وزارتِ تعلیم نے ایک کالج ڈیمونسٹریشن اسکول آف بزنس¹ کے نام سے قائم کیا ہے مجھے اس پر فخر ہے کہ یہاں پر تقریباً پانچسو لڑکے لڑکیاں روزانہ یا شبانہ کلاسوں میں حاضر ہوتے ہیں اور فارسی و انگریزی ٹائپ، شورٹ ہینڈ، کاروباری انگریزی، دفتری فائلیں ترتیب دینے، دفتروں میں کام آنے والی مشینوں کا استعمال، دفتری انتظام اور رپورٹ تیار کرنے کا کام سیکھتے ہیں۔ ان طالبعلموں میں سے بعض ایک مضمون اور بعض کئی مضمون ایک ساتھ پڑھتے ہیں، لیکن زیادہ تعداد ایسے طلباء کی ہے جو تین سالہ ڈگری کورس پورا کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر اسکولوں میں تجارتی مضامین اور سیکریٹری بننے کے اصول و قوائد سکھائیں گے اس کالج کے طلباء کے حوصلے بہت بلند ہیں یہ لوگ اپنے سب کام باہمی تعاون سے کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے ایک کوآپریٹیو ریسٹورانٹ قائم کیا ہے اور اسی طرح اپنے تفریحی پروگرام بھی ترتیب دیتے ہیں۔

ہمارے بڑے بڑے شہروں میں جتنے بھی ہائی اسکول ہیں ان میں تجارتی اور سیکریٹری کی تربیت کا بھی انتظام ہے اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ دوسرے شہروں میں بھی یہ مضامین جلد ہی شروع کر دیئے جائیں۔ منصوبہ بندی کے محکمے اور نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے بھی اپنے دفاتر میں سیکریٹری کی تربیت کے کورس جاری کئے ہیں۔ لیکن کام اس قدر زیادہ ہے کہ ہمارے پرائیوٹ اور پبلک سیکریٹریل اینڈ بزنس اسکول² مل کر بھی ہم کو ہماری ضرورت کے مطابق سیکریٹری نہیں دے سکتے اور خاص طور پر ایسی سیکریٹری لڑکیاں جو فارسی اور انگریزی بخوبی جانتی ہوں تاکہ سرکاری دفاتر اور پرائیوٹ تجارتی اداروں میں کام کی رفتار تیز ہو سکے۔ ہمارے ملک کی لڑکیوں کے لئے یہ کام نہایت ہی موزوں اور مناسب ہے، امریکہ کے غیر سرکاری ادارے اور دوسرے دفاتر ہماری اس کام میں بخوبی مدد کر سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خاص خاص مضامین کے یہ تربیتی ادارے ہماری سب سے بڑی اور اہم ضرورت کو پورا کر رہے ہیں لیکن ثانوی اسکولوں سے ہماری توقعات اور بھی زیادہ ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان اسکولوں میں پڑھنے والے ہر بچے کا اخلاقی کردار بہت بلند ہو۔ گھر اور پرائمری اسکول بچوں کی بنیاد تیار کریں لیکن یہاں آ کر ان کی استعداد اور قابلیت کی صلاحیتیں پختہ ہوں۔ اور ہر نوجوان فرض شناسی، انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری کے جذبے سے سرشار ہو۔

ہر طالبعلم کو چاہئے کہ وہ سچائی سے عشق کرنا، سچائی کی جستجو کرنا اور سچ بولنا سیکھے۔ ماضی میں جو ہمارے

1. DEMONSTRATION SCHOOL OF BUSINESS

2. SECRETARIAT LAND BUSINESS SCHOOL

یکنڈری اسکولوں کا تعلیمی نصاب تھا اس میں اخلاقی مسائل پر توجہ بہت کم دی جاتی تھی، طلباء کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اپنے سبق رٹ لیں۔ معلّم سے سوال کرنا یا علمی اور ادبی موضوعات پر بحث کرنا یا اس کے الفاظ کی تردید کرنا لڑکے کی حماقت یا بے ادبی سمجھی جاتی تھی، اور سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ فردوسی کے شاہنامے کو جو اس نے تقریباً ۹۹۹ء میں مکمل کیا تھا اور ہمارے اسکولوں میں پڑھایا جاتا تھا تاریخ کی مستند کتاب سمجھا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہنامے کا شمار دنیا کے چند ادبی شاہکاروں میں ہوتا ہے لیکن تاریخ کی کسوٹی پر یہ کتاب پوری نہیں اتر سکتی اور ہمارے طلباء کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ اس پوری داستان کو حقیقت پر مبنی سمجھیں۔

فارسی میں ایک لفظ ہے "داستان" جس کو ہم نہ من گھڑت قصہ کہہ سکتے ہیں اور نہ حقیقت پر مبنی کوئی سچا واقعہ بلکہ یہ دونوں کے درمیان کی ایک چیز ہے، ماضی میں ہمارے ملک میں تاریخ اور دوسرے مضامین داستان کی شکل میں ہی پڑھائے جاتے تھے اور طالبعلموں کا موجودہ طبیعی یا اجتماعی سائنس سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

اس روایتی انداز کو ختم کرنے کے لئے جو اصلاحی کام میرے والد کے ہاتھوں سے شروع ہوا تھا اسی پر ہم بھی تیزی سے عمل کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک کے دانشوروں کی ایک جماعت نے حال ہی میں شہریت کی تعلیم کے موضوع پر ایک مکمل نصاب تیار کیا ہے جس کو وزارتِ تعلیم نے پانچ جلدوں میں چھاپ کر پورے ملک کے ثانوی اسکولوں میں تقسیم کیا ہے، ہمارے ثانوی اسکولوں کا معیار ہر روز مغرب کے ترقی یافتہ ممالک اور امریکہ کے نصاب کے نزدیک ہوتا جا رہا ہے۔

لیکن ان سب اقدامات کے باوجود داستانی روایات اب تک حسب سابق باقی ہیں آج بھی بغیر کسی تنقید یا نکتہ چینی کے یاد کر لینا اچھا سمجھا جاتا ہے اور اس بات کو کم اہمیت دی جاتی ہے کہ طلباء میں مسائل کو سمجھنے کا جذبہ بیدار ہو، اگرچہ اس عیب کو دور کرنے کے مختلف طریقے ہیں لیکن ان میں سے میں صرف تین کا ذکر کروں گا۔

سب سے پہلے تو یہی کہ ہر اسکول کی اپنی لائبریری ہونی چاہیئے اور ہر بچے کو یہ بتایا جائے کہ وہ کتابوں کو کس طرح استعمال کرے، اگرچہ پرائمری مدارج کے لئے جدید طرز کی لائبریریاں ضروری ہیں لیکن سیکنڈری اسکولوں اور اس سے اوپر کی کلاسوں کے لئے ان کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ ان لائبریریوں کے ذریعہ ہی کوئی بھی طالبعلم آزادانہ طور پر ہر اس مضمون کے متعلق جس سے اس کو دلچسپی ہے اپنی معلومات بڑھا سکتا ہے، لیکن بہت کم ثانوی اسکول ہیں جہاں اچھی لائبریریاں ہیں اور اس سے بھی کہیں کم ایسے اسکول ہیں جہاں لائبریریوں میں کتابوں کی تلاش اور جستجو نصاب کا ضروری جزو ہو، چونکہ ہمارے ملک کے زیادہ تر اسکولوں میں انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانیں درس میں شامل ہیں اس لئے فارسی کتب و رسائل کے علاوہ انگریزی و دیگر زبانوں کے رسالے اور کتابیں بھی لائبریری میں ہونی چاہئیں۔ وہ تمام خیراتی ادارے جو ہمارے ملک میں ترقی

کے خواہاں ہیں ان کو چاہئے کہ اسکولوں میں چھوٹے کتابخانے قائم کریں کیونکہ قومی خدمت کے لئے یہ میدان ان کے لئے نہایت موزوں و مناسب ہے۔

ہمارے تعلیمی نظام میں دوسری تبدیلی یہ ہونی چاہئے کہ موجودہ امتحان کے طریقوں کی اصلاح کی جائے کسی بھی جگہ امتحان ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے ایک معلم کی علمی استعداد اور قابلیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور چونکہ ایران میں وزارتِ تعلیم تمام امتحانات کا انتظام کرتی ہے اس لئے یہ بات یہاں پورے طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اب ہم آہستہ آہستہ امتحانی نقطۂ نظر سے وزارتِ تعلیم کی مرکزیت ختم کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں امتحان کے طریقوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں کرنی چاہئیں یعنی امتحانوں کے لئے نصاب اس طرح تیار کئے جائیں کہ طلباء و طالبات کو زبانی رٹنے کا موقع کم ملے اور تجزیہ اور تنقید کا عنصر اس میں زیادہ ہو۔ جدید امتحانی طریقوں سے یقیناً معلموں کی حوصلہ افزائی ہوگی کیونکہ ان امتحانات کا پروگرام اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کی تخلیقی قوتیں اُجاگر ہوں اور وہ بحث و مباحثے میں حصہ لے سکیں۔

تیسری لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ معلموں کی تربیت کے لئے بہتر طریقے اختیار کئے جائیں یہ بات بالکل درست ہے کہ بہت سے سیکنڈری اسکول ٹیچرز کی علمی استعداد ثانوی درجے تک ہی ہے لیکن جس قدر یہ بات ہمیں مایوس کن نظر آتی ہے ہم کو اتنی سمجھنی نہیں چاہئے کیونکہ ہمارے بہت سے معلموں نے تجربے اور ذاتی طور پر مطالعہ کرکے اپنی معلومات کو کافی وسعت دی ہے۔ بہت سے اساتذہ نے ملازمت کے دوران تربیت حاصل کرکے یا گرمی کی چھٹیوں میں کچھ کورسوں یا کانفرنسوں میں شرکت کرکے اپنی استعداد کو بڑھایا بھی ہے، چنانچہ ۱۹۵۹ء کی گرمی کی تعطیلات کے دوران تقریباً ڈیڑھ ہزار اساتذہ نے ایک علمی کانفرنس میں شرکت کی جو تہران میں منعقد ہوئی تھی۔

اگرچہ ہمارے ثانوی اسکولوں کے ٹیچرز بطور مجموعی ملک کی بڑی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہمیں چاہئے کہ ایسے مؤثر اقدامات کریں جن سے ان کی علمی استعداد اور معلومات پہلے سے کہیں زیادہ ہو، اور اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ نیشنل ٹیچرز کالج کی توسیع کی جائے تاکہ نہ صرف نارمل اسکولوں کے لئے بلکہ عام ثانوی اسکولوں کے واسطے بھی بہتر استاد یہاں تیار کئے جاسکیں اس کے علاوہ ایک اور بھی ذریعہ ہے جس کو بہتر معلم حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے وہ سیکڑوں ایرانی طلباء اور طالبات جنہوں نے ایران میں رہ کر یا باہر جاکر اپنی یونیورسٹی کی تعلیم، ادب، آرٹ، سائنس اور سوشل سائنسز میں مکمل کرلی ہے ہم ان کو تربیت دے کر اسکولوں میں کام کرنے کی دعوت دیں، میں اس فصل کے شروع میں بھی اشارہ کرچکا ہوں کہ صوبائی یونیورسٹیوں میں بھی ہم معلموں کی تربیت کے شعبے قائم کرکے اپنے اسکولوں کے لئے ٹیچرز حاصل کرسکتے ہیں۔ ہمیں اس بات کی طرف خاص توجہ دینی چاہئے کہ پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں پڑھانے کے لئے لڑکیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں

اپنی مرضی سے آئیں۔

اگر ملک کے مختلف طبقات اور طلباء میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا ہوجائے تو ایران میں پرائمری اور ثانوی اسکولوں کی تعداد کافی بڑھ سکتی ہے۔ ثانوی اسکولوں کی تعداد نہ صرف ابتدائی اسکولوں سے زیادہ ہے بلکہ اس کے ڈھانچے میں کافی پیچیدگیاں بھی ہیں اور لوگوں کی رضا کارانہ محنت سے ہی ان کو قائم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مقامی لوگ اسکول کی عمارت کے جلد مکمل ہونے میں، زمین، عمارتی سامان، نقد روپیہ، استادوں کے لئے رہائشی مکان اور دوسری سہولتیں دے کر ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ اور جب اسکول کی عمارت بن کر تیار ہوجائے تو اس کی حفاظت اور نگرانی طالبعلموں کے سپرد کردی جائے، اس عمارت کی مرمت نگہداشت اور دوسرے مصارف کے لئے بھی طلباء وطالبات سے معمولی اور چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی وصول کی جاسکتی ہیں، اس طرح سے نہ صرف وزارت تعلیم کی رقم بچے گی بلکہ طلباء کو اجتماعی ذمہ داری قبول کرنے کا احساس بھی پرورش پائے گا۔

میری رائے میں یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ دستکاری کو صرف انہی طلباء تک محدود رکھا جائے جو دستکاری اور زراعتی اسکولوں میں پڑھتے ہیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ ہر بچے کے لئے ایسے مواقع فراہم کریں کہ وہ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھے۔ شاید لڑکیاں ڈرائنگ، نقاشی، یا مغربی ومشرقی موسیقی سیکھنا پسند کریں لیکن اسی کے ساتھ ان کو چاہیئے کہ امور خانہ داری کی بھی تربیت حاصل کریں۔ مغربی ممالک میں ہر لڑکی کچھ حد تک تو امور خانہ داری اسکول میں سیکھتی ہے لیکن زیادہ تر گھر پر اس کی ماں اس کو سکھاتی ہے۔ لیکن ایران جیسے ملک میں جو ابھی ترقی کی راہ پر ہے حالات بالکل مختلف ہیں یہاں بہت سے خاندان جن کی مالی حالت بھی اچھی ہے اور ان کو متمدن بھی سمجھا جاتا ہے ایسے ہیں جہاں لڑکیوں کو یہی نہیں معلوم کہ غذائیت اور حفظانِ صحت کے اصول کیا ہیں، اور شیر خوار بچوں کی کس طرح تربیت کرنی چاہیئے۔ جب تک ایرانی لڑکیوں کو اسکول میں امور خانہ داری نہ سکھائے جائیں تو وہ گھر داری کے معاملے میں نہایت ہی ناکام رہتی ہیں۔ اور اسی لئے امور خانہ داری کے مضامین ہمارے لئے محض وقت گذارنے اور عیش وعشرت کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔

میرے خیال میں وہ تمام لڑکے جو عام ثانوی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں، نہ صرف علوم طبیعی پڑھیں بلکہ کوئی نہ کوئی دستکاری اور ہنر بھی سیکھ لیں، اور جس قدر جلد ممکن ہوسکے ہمیں ان کے لئے کارخانے قائم کردینے چاہئیں تاکہ پڑھائی کے دوران مفید چیزیں اور ضروری سامان تیار کرسکیں۔ اس وقت ملک میں کھلونوں کی بہت کمی ہے اگر یہ لڑکے چاہیں تو ہمارے بچوں کے لئے بہت اچھے کھلونے تیار کرسکتے ہیں۔ امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی طرح ایران میں بھی لڑکوں کو یہ مواقع ملنے چاہئیں کہ وہ اپنے اسکولوں کا رسالہ یا اخبار شائع کریں۔

ثانوی اسکولوں کی بات ختم کرنے سے قبل ہی کچھ اور بھی مفید مشورے دوں گا۔ میری آرزو ہے کہ ہمارے ملک

میں پرائیوٹ بورڈنگ اسکولوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو۔ چونکہ میں خود ہوسٹل میں اپنا طالبعلمی کا زمانہ گذار چکا ہوں اس لئے اس بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہوسٹل کی مشترکہ زندگی میں لڑکے دوستی اور کھیل کود کی قدروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، اور اچھے استاد اُن کے کردار کو عمدہ طریقے پر ڈھال سکتے ہیں۔

جب میری توجہ اعلیٰ تعلیم کی طرف مبذول ہوتی ہے تو مجھے سب سے پہلے تہران یونیورسٹی کی حیرتناک ترقی اور تبدیلی کا خیال آتا ہے یہ یونیورسٹی علمی سرگرمیوں میں اس قدر آگے بڑھ چکی ہے کہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں اس کے مقابلے کی کوئی دوسری یونیورسٹی نہیں۔ غیر ملکی محقق اور دانشمند اس کی جدید خوبصورت عمارتوں اور کشادہ میدانوں اور بڑھتی ہوئی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے، یونیورسٹی کے پاس موجودہ احاطے کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے زمین کے قطعے ہیں اور بہت سے شعبے اس کی نگرانی میں چل رہے ہیں۔ چند سال پہلے طلبا کی رہائش کا انتظام بہت مختصر تھا لیکن حال ہی میں یونیورسٹی کی عمارت سے تھوڑے فاصلے پر شمال کی جانب ہم نے جدید طرز کے کئی ہوسٹل تیار کئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ یونیورسٹی میں اجتماعی اور ظاہری تبدیلیاں تیزی سے آرہی ہیں۔

جب میری نظر اس یونیورسٹی کی اجتماعی ترقی کی طرف جاتی ہے تو مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ نہ صرف ہمارے ملک کی حسین وخوش ادا لڑکیوں نے بلکہ بہت سی غیر ملکی خواتین نے بھی اس پر اپنا حق جانا شروع کر دیا ہے، کچھ سال پہلے اس ادارے میں کوئی لڑکی نظر نہیں آتی تھی لیکن اب جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں دو ہزار سے بھی زیادہ لڑکیاں یہاں پڑھتی ہیں۔ اب سے چند سال پہلے جو لڑکے اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں وہ بھی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کے زمانے میں یہاں لڑکی کی شکل نظر نہیں آتی تھی لیکن اب سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ حالات بالکل بدل چکے ہیں۔

علمی اور ادبی معیار کے اعتبار سے بھی تہران یونیورسٹی نے ترقی کی ہے۔ لیکن جس تیز رفتاری سے یہ دوسرے میدانوں میں آگے بڑھی ہے اسی سرعت سے علم و ادب کے میدان میں اس نے پیشرفت نہیں کی، میں اس کی تمام سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے چھ نکاتی پروگرام پیش کروں گا، جو نہ صرف اس یونیورسٹی کی ترقی کے لئے بلکہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کے لئے بھی معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے بعض پروفیسر آج بھی اپنے آپ کو کسی دیوتا سے کم نہیں سمجھتے اگر کوئی طالبعلم ان کی رائے اور نظریات سے اختلاف کرے تو اس کو وہ اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور بحث و مباحثے کو وقت کی تلفی۔ ایسے پروفیسر سیدھے کلاس میں پہنچتے ہیں اور لیکچر دے کر فوراً واپس آجاتے ہیں۔ جس موضوع پر پروفیسر صاحب نے لیکچر دیا ہے اگر اس سے متعلق کوئی طالبعلم مزید دلائل اور ثبوت حاصل کرنا چاہے یا ان کے موضوع کی کوئی اور توجیہ و تعبیر پیش کرے تو سمجھتے ہیں کہ طالبعلم ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آرہا ہے۔ بعض تو یہ زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کہ طلبا و طالبات کو یہ اطلاع پہنچا دیں کہ وہ فلاں روز کلاس میں نہ آئیں گے۔ اگر طلبا چاہیں

کہ ان سے مل کر اپنی دشواریاں اور مشکلات دور کرلیں تو یہ حضرات ان کو وقت تک نہیں دیتے اور سوائے ان اوقات کے جب ان کو درس دینا ہوتا ہے کالج میں نظر نہیں آتے۔ خوش قسمتی سے ایسے پروفیسروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے اور ان کے دوسرے ساتھی اس رویّے کو سخت ناپسند کرتے ہیں ہمیں یہ اطمینان رکھنا چاہیئے کہ جیسے ہی ہمارا علمی مرکز وسیع ہوگا پروفیسر صاحبان اس بات کا خیال رکھیں گے کہ ان کا بحیثیت استاد کے یہ بنیادی فرض ہے کہ طلباء کی تربیت اور رہنمائی کریں۔

دوسرا نکتہ علمی اور تحقیقی کام ہے۔ کسی بھی بڑے یونیورسٹی پروفیسر کے لئے یہ بات لازمی ہے کہ اس کا مزاج علمی و تحقیقی ہو۔ اس کی طبیعت کا یہ خاصہ ہو کہ فطرت، فلسفہ، سائنس، ادب، اور فنونِ لطیفہ کے حقائق و عجائبات کے سامنے عجز و نیاز سے اپنے سر کو خم کردے۔ اس کی زندگی انتہائی سادہ ہو اور علم کے چھپے ہوئے رازوں کو پانے کے لئے اس میں بچوں کی سی لگن۔ وہ تحقیق اور تجربات کے ذریعے ہر روز اپنی معلومات میں اضافہ کرے، جو مضمون وہ پڑھا رہا ہے اس کے لئے کسی مردہ لاش کی طرح نہ ہو۔ چاہیئے کہ ہر سال طوطے کی طرح شاگردوں کے سامنے رٹتا چلا جائے، بلکہ اس کے لئے یہ مضمون ایک جاندار چیز ہو جس میں وہ اپنی اور دوسروں کی تحقیق و مطالعے سے اضافہ کرے، اگر اس کے اپنے شاگرد بھی اس کو کوئی نئی بات بتائیں تو وہ اس کو شکریئے کے ساتھ قبول کرلے۔

لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض پروفیسر ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کی مرضی کے خلاف ذرا بھی کوئی بات ہوئی تو ان کو فوراً طیش آجاتا ہے اور وہ فوراً اپنی علمی فضیلت جتانے لگتے ہیں وہ لوگوں کو یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ کتنے اونچے اور اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا یہی غرور و نخوت ان کی کم علمی اور کم مائیگی کی دلیل ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جو خود کبھی کوئی علمی اور تحقیقی کام نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی کتابوں سے اپنے لیکچر تیار کرتے ہیں اور جن مصنفین کی کتابوں سے یہ اپنے نوٹ لیتے ہیں ان کا اپنے لیکچر میں کبھی کوئی حوالہ تو کیا ذکر تک نہیں کرتے۔ اگر کسی وقت وہ کچھ لکھ بھی لیتے ہیں تو سائنٹفک شواہد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تخلیق ناقص ہی رہتی ہے۔ سالہا سال گذر جاتے ہیں لیکن ان کے لیکچروں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اور وہ کبھی اس بات کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ نئی دریافت اور تحقیقات کی روشنی میں اپنے لیکچروں کو زیادہ مفید و کارآمد بنالیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی یونیورسٹی کا پروفیسر سائنٹفک طریقوں سے واقف نہیں ہے تو وہ کس طرح اپنے طلباء کو پڑھا سکتا ہے۔ یہاں مجھے اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ دو دانشور جن میں سے ایک ایرانی تھا اور دوسرا چینی بحث و مباحثے میں مشغول تھے، بحث کا موضوع یہ تھا کہ کس کا تمدن سائنس کے میدان میں آگے بڑھا ہوا تھا، چینی کہتا تھا کہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے ثابت کیا ہے کہ پرانے زمانے میں چینی تار کا استعمال جانتے تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹیلیفون چینیوں کی ایجاد ہے۔ اس پر ایرانی نے برجستہ کہا کہ ایران میں

جو جگہ جگہ کھدائیاں کی گئی ہیں وہاں کسی کو تار نہیں ملا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وائرلیس بہت قدیم زمانے میں ایرانیوں نے ایجاد کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی حماقت آمیز دلائل کو اس سائینس کے دور میں کوئی بھی شخص قبول نہیں کر سکتا لیکن یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ہمارے بعض پروفیسر اپنے طلباء کو شاید اس سے بہتر کچھ بتاتے ہوں۔ مثال کے طور پر علوم اجتماعی کے طلباء کو لے لیجئے، ان میں بہت سے ایسے مل جائیں گے جنہوں نے پورے کورس کو چاٹ رکھا ہوگا۔ لیکن شاید ہی کوئی ایک ایسا ہو جس نے اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھا ہو اور اپنے مقالے کی حمایت میں کتابوں کی فہرست درج کی ہو۔

لیکن اس کے برخلاف ہماری یونیورسٹیوں میں ایسے دانشمند بھی ملیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو علمی اور تحقیقی کاموں کے لئے وقف کر دیا ہے اور نئی چیزوں کی دریافت میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر نے ایک نامیاتی مرکّب تیار کر کے ایک مادّہ دریافت کیا ہے جب اس مادّے کی آزمائش جرمنی کی بہت مشہور تجربہ گاہ میں کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ مادّہ ہر اعتبار سے نیا اور بے مثال ہے۔ ہماری یونیورسٹی کے دیگر پروفیسروں نے بھی ملیریا شناسی، زراعت، فارسی زبان و ادب کے موضوعات پر علمی و تحقیقی کام کیا ہے۔ یونیورسٹی کی بہتر تنخواہ نے بھی لوگوں میں تحقیق کے جذبے کو ابھارا ہے۔ اس وقت تہران یونیورسٹی کے سامنے ایک مسئلہ ہے وہ اس بات پر غور کر رہی ہے کہ کچھ ایسے قوانین بنائے جائیں جس کے تحت ہر فیکلٹی کا ممبر یہ انتخاب کرے کہ آیا اس کو بحیثیت پارٹ ٹائم لیکچرار کے کام کرنا ہے یا فل ٹائم فیکلٹی کا ممبر بن کر رہے گا۔ دوسری شرط کے لئے ٹھوس تحقیقی کام کا ہونا لازمی ہے۔

تیسرا نکتہ لائبریریوں کی سہولتوں سے متعلق ہے کیونکہ ایک محقق کے لئے اچھی لائبریری کی حیثیت عمدہ اوزار کی سی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تہران یونیورسٹی کے علاوہ صوبائی مراکز میں اور دوسرے بڑے شہروں میں کئی علمی مراکز ایسے ہیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں نایاب قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ مختلف موضوعات پر جدید کتابیں اور رسائل اس سے علیحدہ ہیں۔ لیکن ان کتابخانوں کی ترتیب و تنظیم باقاعدہ نہیں کی گئی ہے اس لئے پروفیسر ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور لڑکوں کو تو اس سے بھی کم فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ یونیورسٹی کی ہر فیکلٹی کی اپنی لائبریری ہے لیکن ان میں سے بعض کا انتظام بالکل پرانے ڈھنگ پر ہے۔ مثال کے طور پر بعض کتابخانوں میں کتابیں حجم کے اعتبار سے رکھی گئی ہیں، کہیں کہیں ان تاریخوں کے حساب سے رکھی گئی ہیں جن میں وہ کتابخانے میں پہنچیں، اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ طلباء کو جن شرائط پر کتابیں دی جاتی ہیں وہ نہایت محدود ہیں، ہم تہران میں بڑی شدّت سے ایک مرکزی کتابخانے کی اور ایک ایسے مرکزی ادارے کی جو تمام کتابخانوں کی نگرانی کر سکے ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ جن ایرانی نوجوانوں نے کتابخانوں کی تنظیم اور کتابداری کے مضامین کا مطالعہ کیا ہے ان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس کام میں بھی

ہمارے خیراتی ادارے ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ طلباء و اساتذہ کے درمیان اچھے اور خوشگوار تعلقات ہونے چاہئیں۔ جو طلباء اور طالبات امریکہ یا برطانیہ کی کسی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور صحیح معنوں میں تعلیم اس وقت ہوئی جب انہوں نے اپنے پروفیسروں سے طالب علمی کے زمانے میں زیادہ قریب رہ کر بحث و مباحثے میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ان طلباء کی ناقابلِ فراموش وہ یادداشتیں ہوں گی جبکہ ان کے پروفیسروں نے ان کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی ہوگی اور یہ طلباء ان کے گھر جا کر ان کے خاندان کے افراد سے گھل مل گئے ہوں گے میری خواہش ہے کہ تہران یونیورسٹی میں اور دوسری ہماری تمام یونیورسٹیوں میں یہی ماحول پیدا ہو اور اساتذہ اور طلباء کے درمیان ایسے تعلقات قائم ہوں کہ انفرادی طور پر یا چھوٹے گروہوں میں مل کر طلباء اپنے استاد سے بحث و مباحثہ کر سکیں۔ اور استاد و شاگرد اتنے قریب ہو جائیں کہ استاد نہ صرف اپنے طالبعلموں کی علمی بلکہ ذاتی معاملات میں بھی مدد کرے۔ ہر استاد اپنے طلباء کو گھر پر بلائے اور اگر کوئی استاد طلباء کی خاطر یہ سب کرنے کے لئے تیار نہیں تو وہ استاد بننے کا اہل نہیں ہے۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ ہر یونیورسٹی میں ایک باقاعدہ اور منظم دفتر قائم ہو جو طلباء و طالبات کو ملازمت دلوانے میں ان کی مدد کرے، طلباء کے لئے ایسے مواقع فراہم ہونے چاہئیں کہ وہ اپنے استادوں سے تشویق و مدد حاصل کرنے کے علاوہ یونیورسٹی کے ماہرین سے ملیں اور ان کو اپنی ذاتی دشواریاں اور پریشانیاں بتا کر یہ مشورہ کریں کہ ان کے لئے پیشے کے اعتبار سے کون سا کام مفید رہے گا، چنانچہ اس فصل کے آغاز میں میں نے اشارہ بھی کیا ہے کہ ۱۹۵۸ء میں تہران یونیورسٹی نے اس سلسلے میں ابتدائی اقدامات کئے ہیں اور لڑکے اور لڑکیوں کے واسطے علیحدہ علیحدہ ایک مرد اور ایک عورت سرپرست[1] کا انتظام کیا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی یونیورسٹی کی ہر فیکلٹی میں ایسے ماہر اور تربیت یافتہ مشیر ہونے چاہئیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ بتا سکیں کہ مستقبل میں ان کے لئے کون سا کام زیادہ موزوں ہوگا۔ اس وقت چونکہ ملک میں اقتصادی اور اجتماعی ترقی کے کام شروع ہو چکے ہیں اور روزگار کے مواقع کافی ہیں اس لئے یونیورسٹی کے طلباء کو یہ بتانا کہ کس کو کیا کرنا چاہئے ملک اور قوم کی بہت اہم خدمت ہوگی۔

طلباء و طالبات کی صحیح اور دانشمندی سے رہنمائی کی جائے تو اس سے نہ صرف ان کو انفرادی طور پر بے حد فائدہ پہنچے گا بلکہ مجموعی طور پر اس کا پورے ملک پر بہت اچھا اثر پڑے گا، دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی یہ رجحان عام پایا جاتا ہے کہ طلباء کسی کام کو ذاتی شوق، آبائی پیشے، اتفاقی دور اندیشی، اونچے مرتبے کی خواہش یا ظاہری دلکشی کی بنا پر اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری وزارتِ کار نے ایک شعبہ قائم کیا ہے جو لوگوں کو یہ ہدایت دیتا ہے

1. DEAN

کہ کس کے لئے کون سا کام مناسب ہے۔ اگر طلباء کسی پیشے کو اختیار کرنے کا فیصلہ سائنٹیفک اطلاعات کی بنیاد پر کریں تو اس سے ملک کا بھی بھلا ہوگا اور خود ان کا بھی۔

یونیورسٹیوں کو چاہیئے کہ طلباء کو کام دلانے کے لئے ایک دفتر قائم کرے تاکہ طالبعلمی کے زمانے میں طلباء کو مالی مدد مل سکے اور وہ اچھی طرح تعلیم جاری رکھ سکیں۔ میں ایک ایرانی طالبعلم کو جانتا ہوں جس زمانے میں وہ امریکہ میں پڑھ رہا تھا تو گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ڈیٹروئیٹ کی ایک موٹر سازی کے کارخانے میں کام بھی کرتا تھا اور موٹروں کے نیچے دھواں خارج کرنے والے پائپ پیچوں سے کسا کرتا تھا۔ اس نے پڑھائی کے ساتھ کام کرکے جدید صنعت کے متعلق بہت کچھ سیکھ لیا۔ اس وقت وہ ہمارے منصوبہ بندی کے محکمے میں بہت اونچے عہدے پر فائز ہے، جب وہ امریکہ سے واپس ایران آیا اور لوگوں کو اس نے اپنی طالبعلمی کے واقعات اور تجربات سنائے تو اس کے دوستوں نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یہ باتیں کسی کو نہ بتائے اس سے لوگوں کی نظروں میں اس کا وقار گر جائے گا۔ لیکن اس پر اس کے دوستوں کی یہ نصیحتیں کارگر نہ ہوئیں اور وہ ہر ایک سے بڑے فخر سے یہ کہتا ہے کہ کس طرح اس نے ہاتھ سے کام کرکے اپنی مالی حالت کو وہاں بہتر بنایا۔

دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی بہت سے طلباء کھانے، رہنے اور دوسرے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مالی دشواریوں سے دوچار رہتے ہیں، یہ لڑکے اگر یونیورسٹی کے باہر کام کریں یا خود یونیورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران یا پڑھائی کے زمانے میں ان کو کوئی کام دے تو اس سے نہ صرف ان کے اخراجات پورے ہوں گے بلکہ بہت سے بیش قیمت تجربات بھی ان کو حاصل ہوں گے۔ امریکہ میں عام رواج ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں طالبعلمی کے دوران شادی کر لیتے ہیں اگر ایران میں بھی ایسا ہو تو میں اس خیال سے اتفاق کروں گا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایسے کام کرتے ہیں جو آمدنی کا ذریعہ نہیں اور جب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں تو بیوی تو کام کرتی رہتی ہے اور شوہر ایم اے کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔

بنیاد پہلوی ہر سال تہران یونیورسٹی اور دیگر صوبائی یونیورسٹیوں کے تیس بہترین طلباء کو اپنے پاس سے وظائف دیتی ہے۔ جو ایرانی عراق میں مقیم ہیں ان کے بچے ہر سال ہائی اسکول یا یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے لئے ایران آتے ہیں بنیاد پہلوی سو سے زائد وظیفے ان طلباء و طالبات کو دیتی ہے۔ اس کے علاوہ میں بھی اپنی جیب سے بہت سے ذہین اور مستحق بچوں کو مالی مدد دیتا ہوں تاکہ پڑھائی کے دوران یہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔ مجھے امید ہے کہ وظائف کی یہ تقسیم آیندہ کے لئے ایک اچھی مثال بنے گی اور زیادہ سے زیادہ طلباء کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔

چھٹا یعنی آخری نکتہ یہ ہے کہ طلباء و طالبات کے لئے تعلیمی نصاب سے علیحدہ بھی سرگرمیاں ہونی چاہئیں امریکہ کے دورے کے دوران میں وہاں کی کئی یونیورسٹیوں میں بھی گیا ہوں، وہاں کی جن چیزوں نے میری توجہ کو

اپنی طرف مبذول کیا وہ اسٹوڈنٹ یونین ودیگر مراکز ہیں۔ یہاں طلباء وطالبات ایک دوسرے سے دوستی کرنے، خالی وقت گذارنے، کتابیں اور رسائل پڑھنے، مختلف کھیل کھیلنے، موسیقی کے ساز سننے اور بجانے، مختلف موضوعات پر بحث کرنے کے لئے آتے ہیں۔ یہیں پر اُن مشیروں کے دفتر بھی نظر آئیں گے جو طلباء کو مستقبل کی راہ دکھاتے ہیں اور وہ دفاتر بھی جو طلباء کو مختلف قسم کے کام دلاتے ہیں۔ کچھ صحتمندانہ دلائل کی بنا پر طلباء لائبریری اور یونین کے دفتر کو آپس کے میل جول اور ذہنی ترقی کے لئے بہت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں، اگر ہمارے ملک کی ہر یونیورسٹی میں اس قسم کے مراکز طلباء کے لئے فراہم کئے جائیں تو میں اس کو بے حد پسند کروں گا۔

میری یہ بھی خواہش ہے کہ ایران کی یونیورسٹیوں میں دینی اور روحانی زندگی کو بھی تقویت ملے۔ چنانچہ کئی سال گذرے میں نے اس خیال کے پیشِ نظر اس بات کی پوری پوری حمایت کی کہ تہران یونیورسٹی کے وسط میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جائے۔ فنِ تعمیر کے اعتبار سے یہ مسجد بالکل جدید طرز کی ہے اس میں نماز پڑھنے کے دالانوں کو چھوڑ کر چاروں طرف نہایت شاندار باغ لگایا گیا ہے تاکہ طلباء اس پُر کیف روحانی فضا میں اپنے قلب کو منوّر کرسکیں۔

صوبائی یونیورسٹیوں کو قائم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے لیکن ان سے میری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ ان یونیورسٹیوں نے اُس وقت سے ہی جبکہ یہ تجربات اور آزمائش کے دور سے گذر رہی تھیں بڑے شاندار اور عمدہ نتائج پیش کئے ہیں۔ اس بات کو اکثر دہرایا گیا ہے کہ ایرانی پروفیسروں کے لئے وقار اور آبرومندی اسی امر میں ہے کہ وہ صوبائی یونیورسٹیوں میں پڑھانے کی بجائے تہران یونیورسٹی میں ہی درس وتدریس میں مشغول رہیں میں اس نظریئے کا سخت مخالف ہوں چونکہ ہماری صوبائی یونیورسٹیاں حال ہی میں قائم ہوئی ہیں اس لئے وہاں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع ان لوگوں کے لئے بہت زیادہ ہیں جو سردست تہران یونیورسٹی میں کام کررہے ہیں۔

اس کے علاوہ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ اعلیٰ تعلیم کے جتنے بھی مراکز ہیں ان کے درمیان آپس میں مقابلہ رہے، میری رائے میں لڑکوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے ان میں مقابلہ کرکے آگے بڑھنے کے جذبے کو ابھارنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ مقابلہ پڑھائی، تحقیق، ذاتی معاملات، امور دینی، غرض ہر میدان میں ہونا چاہئے۔ علمی میدان میں طلباء کے درمیان مقابلہ کے احساسات کو بیدار کرنے کے لئے کچھ عمدہ طریقے بھی ہیں جن کو ہم اپنے ملک میں استعمال کرسکتے ہیں۔ پورے نظامِ تعلیم میں مقابلے کی تحریک پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بالکل امریکی طرز کی ایک یونیورسٹی قائم کریں اور ابتداء میں امریکی اساتذہ کے عملے کو ہی خدمت کا موقع دیں میری رائے میں اس قسم کی یونیورسٹی کے لئے شیراز ایک بے مثال جگہ ہے۔ اب دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ شیراز کی

موجودہ یونیورسٹی کو ہی ترقی و توسیع دی جائے اور دوسری صورت یہ بھی ہے کہ ایک علیحدہ نیا ادارہ جو ہر حیثیت سے یونیورسٹی کے معیار کا ہو کھولا جائے۔

اگر ہمارے ملک میں امریکی طرز کی یونیورسٹی بن گئی تو ان ہزاروں طلباء کی ضرورت کو پورا کر دے گی جو ہر سال ملک کے باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے ہیں۔ سن ۱۹۶۰ء میں تقریباً چودہ ہزار ایرانی طلباء ملک کے باہر تعلیم پا رہے تھے۔ ان میں کنڈر گارٹن سے لے کر ایم، اے کے درجے تک کے طلباء شامل تھے لیکن زیادہ تعداد ایسے طلباء کی تھی جو کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ ان تمام طلباء میں سے چار ہزار امریکہ میں اور باقی جرمنی، برطانیہ، فرانس آسٹریا اور دوسرے یورپی ممالک میں تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔

اُس سال مشرق وسطیٰ کے ممالک کے جتنے بھی طلباء امریکہ میں زیر تعلیم تھے ان میں سے ایک تہائی ایرانی تھے اس میں شک نہیں کہ طلباء کی یہ کثیر تعداد اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن اس کے منفی اور مثبت دونوں ہی پہلو ہیں۔ یہ دیکھ کر واقعی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جو طلباء ملک کے باہر زیر تعلیم ہیں وہ اُن مضامین کا مطالعہ کر رہے ہیں جو ہمارے آبادکاری کے اور ترقی کے منصوبے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ امریکہ میں جتنے بھی ایرانی طلباء ہیں ان میں سے نصف سے زائد امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس، انجینئرنگ اور زراعتی سائنس پڑھ رہے ہیں باقی نے زراعت، تعلیم و تربیت، اصول تجارت جیسے مضامین لے رکھے ہیں جو بہرحال ہماری اجتماعی اور اقتصادی ترقی کی ضروریات کو پورا کریں گے یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ امریکہ میں ایک غیر منفعتی ادارہ ہے جو مشرق وسطیٰ کے امریکی دوست کے نام سے مشہور ہے، یہ ادارہ ایرانی نوجوانوں کی اس کام میں مدد کرتا ہے کہ کس طالبعلم کے لئے کون سا مضمون مناسب رہے گا اور کس کالج یا یونیورسٹی میں طلباء و طالبات کو داخلہ لینا چاہیئے۔ اس ادارے کا ایک دفتر تہران میں بھی ہے جہاں ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں اپنی دشواریاں لے کر جاتے ہیں اور وہاں کے قابل اور ذمّہ دار افسروں کے مشورے سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ ادارہ اور بھی بہت سی اہم خدمات انجام دیتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے والد اس بات کے زبردست حامی تھے کہ ہمارے طلباء اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جائیں، میری بھی اس وقت یہی پالیسی ہے اور آیندہ بھی رہے گی، لیکن بڑی دشواری یہ ہے کہ جو طلباء ملک سے باہر پڑھنے جاتے ہیں وہ واپس آ کر اپنے ماحول میں ہی خود کو اجنبی سا محسوس کرنے لگتے ہیں اور کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا، ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے وطن آتے ہی نہیں اور جو آتے بھی ہیں تو اس نیت اور غرض سے کہ دوبارہ واپس چلے جائیں گے، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے امریکی اور دیگر ترّقی یافتہ ممالک کے لوگ کم ترقی یافتہ ممالک میں ترقیاتی یا دوسرے کاموں کے لئے جاتے ہیں اور وہیں کے ہو

رہتے ہیں، اس سے ثقافتی روایات پر کافی بُرا اثر پڑتا ہے یہی المیہ ایران اور ایران جیسے دوسرے ممالک کے نوجوانوں کے ساتھ ہے کیونکہ جو طلباء کچھ عرصے کے بعد باہر سے پڑھ کر واپس آتے ہیں تو ان کے سر میں یہی دُھن سوار رہتی ہے کہ کسی طرح انہی ممالک میں پہنچ جائیں جہاں سے وہ فارغ التحصیل ہو کر آئے ہیں۔

چونکہ امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند اور ترقی یافتہ ملک ہے اس لئے جو ایرانی کچھ سال وہاں رہ لیتے ہیں وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس ماحول میں ڈھال لیتے ہیں ان میں سے بعض تو امریکی لڑکیوں سے شادی بھی کر لیتے ہیں جو ایران آنا پسند نہیں کرتیں۔ (لیکن یہ کوئی ضروری نہیں بہت سے ایرانی لڑکے، امریکی بیویوں کو ساتھ لے کر اپنے وطن واپس آئے ہیں، اور انہوں نے یہاں کے ماحول سے خود کو بالکل سازگار کر لیا ہے) ان طلباء کو امریکہ میں پڑھانے، تجارتی کام کرنے اور اسی قسم کے دوسرے اچھے کام مل جاتے ہیں۔ جس کا معاوضہ تنخواہ کی صورت میں ان کو اتنا عمدہ ملتا ہے جس کی توقع ان کو اپنے ملک میں نہیں ہو سکتی، ہمارے دفاتر کی بدنظمی اور سُست رفتاری کی وجہ سے اور دوسرے یہ کہ زندگی کی وہ تمام آسائشیں جو امریکہ میں میّسر ہیں وہ ابھی ان ممالک میں نہیں ہیں جو ترقی کی راہ پر ہیں اس لئے بھی امریکہ سے واپس آئے ہوئے طلباء جذباتی طور پر اپنے ماحول سے بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ امریکہ کے پرائیوٹ اور سرکاری دفاتر میں بھی باوجود تمام ترقیات کے بے ترتیبی اور بدنظمی پائی جاتی ہے۔ چور ڈاکوؤں کے جتھے وہاں بھی ہوتے ہیں، کالا دھن کمانے والے وہاں بھی پائے جاتے ہیں غرض وہاں بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جو اجتماعی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور لوٹ مار و دحشت پھیلاتے رہتے ہیں۔

میں ایک نوجوان کو جانتا ہوں، جو امریکہ اعلیٰ تعلیم کے لئے گیا تھا اور کئی سال تک وہاں مقیم رہا جب واپس تہران آیا تو اس قدر دل برداشتہ اور مایوس تھا کہ کئی مہینے گھر سے باہر نہیں نکلا، جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کا دارالخلافہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے لیکن یہاں کی ہر وہ چیز جس کو نہایت ہی جدید اور عمدہ کہا جاتا ہے بالکل فرسودہ اور پرانے ڈھنگ کی نظر آتی ہے، اس کے بعد اس نے خود کو مشغول رکھنے کی خاطر دوستوں کو ملک سے باہر خط لکھنے شروع کئے وہ ان خطوط کو سپردِ ڈاک خود ہی کرتا تھا، چنانچہ اس بہانے سے اس نے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا اور تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اس کو اپنے ملک کے تہذیب و تمدن سے دوبارہ اُنسیت پیدا ہونے لگی، اور آج وہ اجتماعی فلاح کے شعبے میں بہت اونچے اور ذمّہ داری کے سرکاری عہدے پر کام کر رہا ہے، جب ایرانی نوجوان ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے ہیں تو ان کو اپنے تہذیب و تمدن میں اور اس ملک کے رسم و رواج میں جہاں وہ جاتے ہیں ایک طرح کا ٹکراؤ نظر آتا ہے جس سے وہ پریشان ہو کر بوکھلا جاتے ہیں لیکن بعض ان پریشانیوں پر قابو بھی پا لیتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو تربیت یافتہ

شادی کے دن کی ایک اور تصویر

سرکاری چائے کے کارخانے میں نئے چائے کے پیکٹ کا معائنہ کرتے ہوئے

مَیں، اور ملکہ فرح بوائے اسکاؤٹ اد۔ان کے لیڈروں کے ہمراہ

نوجوان اپنے آپ کو اپنے ہی ماحول میں اجنبی محسوس کرتے ہیں ان کی صلاحیتوں کا ہم پورا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے اور ہر سال ہزاروں اہل لوگوں کی خدمات سے محروم رہتے ہیں۔

بعض وطن پرست اور ملک کے خیر خواہ لوگوں نے ان مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد ایک حل نکالا ہے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ ہمارے طلباء جرمنی، فرانس اور برطانیہ اعلیٰ تعلیم کے لئے جائیں کیونکہ یہ ممالک تعلیمی معیار اور سہولتوں کے اعتبار سے تو کسی طرح کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان ممالک میں دولت کی وہ فراوانی بھی نہیں ہے جس کو دیکھ کر ایرانی طلباء کی آنکھیں چکاچوند ہو جائیں۔ میری رائے میں یہ تجویز نہایت ہی معقول ہے کیونکہ جو ایرانی طلباء ان ممالک میں رہ کر واپس ایران آئے ہیں انہوں نے خود کو بڑی آسانی سے دوبارہ اپنے ماحول میں ڈھال لیا ہے اس کے علاوہ ان ممالک میں تعلیمی اخراجات بھی نسبتاً بہت کم ہیں۔

ہمارے نوجوان کا امریکہ کی پُرکشش زندگی کی طرف کھنچنا ایک طبعی امر ہے کیونکہ ان کو وہاں بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ایرانی طلباء امریکہ یا کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے واپس آ کر جس تمدنی تبدیلی کی وجہ سے پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں اس کو کم کرنے کے اقدامات کئے جائیں، ۱۹۵۹ء میں میں نے اپنے داماد (شہزادی شہناز کے شوہر) اردشیر زاہدی کو اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ اس مسئلے کا کوئی عمدہ حل نکالیں۔ اردشیر زاہدی ابھی جوان ہیں انہوں نے امریکہ میں زراعتی انجینئری کی تربیت حاصل کی ہے اور ہمارے طلباء میں جو تہذیبی اور تمدنی تبدیلی سے پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو کم کرنے کے لئے وہ بہت کوشاں ہیں، ان کے مشورے کے لئے ایک کمیٹی اُن ممبران پر مشتمل بنائی گئی ہے جو اُن ممالک میں رہ چکے ہیں جہاں زیادہ تر ہمارے طلباء جاتے ہیں۔ اردشیر امریکہ میں ایران کے سفیر بھی رہے ہیں اس لئے ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہمارے مایوس اور پریشان نوجوانوں میں زندگی کی نئی اور تر و تازہ روح پھونک دینے میں کامیاب ہوں گے۔

ہماری وزارتِ کار نے بھی ایک نہایت ہی مفید و کارآمد اسکیم تیار کی ہے جس کے تحت وہ ہمارے ان طلباء سے جو ملک کے باہر تعلیم حاصل کر رہے ہیں رابطہ قائم رکھتی ہے اور جب طلباء فارغ التحصیل ہو کر واپس اپنے وطن آتے ہیں تو ان کے لئے ذوق اور قابلیت کے مطابق کام پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے۔ کام کی فراہمی میں وزارتِ کار کی پوری مدد شامل ہوتی ہے، اس وزارت کا یہ نظریہ ہے اور جس سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ اس سے قبل ہمارے طلباء تمدنی تضاد کے شکار ہوں روک تھام کے اقدامات شروع کر دینے چاہئیں۔ فرض کیجئے کہ ایک طالبعلم ملک سے باہر زراعتی انجینئری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اگر اس کو یہ بتا دیا جائے کہ ایرانیوں نے قومی سطح پر ایک تعمیری منصوبہ تیار کیا ہے اور زراعتی انجینئری کے لئے اس کے ملک میں اس کے لئے اسامی خالی ہے تو یہ طالبعلم باوجود اس کے اس کو وہاں جیسا آرام اپنے ملک میں نہ ملے گا لیکن وہ پھر بھی اپنے ملک کو ہی دوسرے تمام ممالک پر ترجیح دے گا۔ اس کتاب

کی چھٹی فصل میں قوم پرستی کے مسئلے پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے ہم اپنے طلبا سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ وطن کے لئے اور مثبت قوم پرستی کی خاطر ہماری مدد کریں اور اس میدان میں پیشرو ثابت ہوں۔ ہم سر بلند کر کے فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ ہماری قوم کے اعلیٰ کارناموں سے بھری پڑی ہے، اور اگر ہم اپنے نوجوانوں کو موقع دیں اور ان کے لئے ذرائع فراہم کریں تو ہمارے نوجوان اچھے قوم پرست ثابت ہو سکتے ہیں اور ہم ان کی قوم پرستی کے جذبہ پر پورا پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔

تیسری تجویز جو اس سلسلے میں سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے شعبوں کو جس قدر جلد ممکن ہو اتنی توسیع و ترقی دیں کہ ہماری تمام تعلیمی ضروریات ملک میں ہی پوری ہو جائیں اور ہمارے طلباء کو اس سلسلے میں ملک سے باہر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے، انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک امریکہ میں بی اے تک تو ہر تعلیمی میدان میں اعلیٰ انتظامات تھے لیکن اگر کسی امریکی طالبعلم کو اس سے آگے پڑھنے کا شوق ہوتا جیسے نامیاتی کیمیا یا اس طرح کا کوئی دوسرا مضمون تو اس کو اس کی تکمیل کے لئے یورپ کا سفر کرنا پڑتا۔ لیکن کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ کمی پوری ہو گئی اور امریکہ میں ہی اعلیٰ تعلیمی شعبے قائم ہو گئے۔

ایران بھی اس وقت بڑی تیزی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے، اور ہمارے علمی ادارے غیر ملکی طلباء کے لئے پرکشش بنتے جا رہے ہیں چنانچہ ہر سال بہت سے غیر ملکی طلباء ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے آتے ہیں، اور وہ دن دور نہیں جبکہ باہر سے آنے والے طلباء کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ ایرانی طلباء جو ہر سال بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے تھے ان کی تعداد بھی دن بدن کم ہو رہی ہے اور اسی نسبت سے تمدنی تضاد کی شکایات بھی بتدریج کمتر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

میری خواہش ہے کہ نہ صرف ایرانی طلباء بلکہ ایرانی معلم بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر جائیں۔ لیکن اسی کے ساتھ میری تجویز یہ بھی ہے کہ یہ کام تبادلے کی صورت میں ہو یعنی ہمارے محقق دانشمند دوسرے ممالک کا رخ کریں اور وہاں جا کر خود بھی سیکھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں اور بالکل اسی طرح دوسرے ممالک کے اساتذہ ہمارے ہاں آ کر اپنی معلومات کے خزانے سے ہمارے ملک کو مالا مال کریں اور جاتے وقت ہم سے بھی علم و دانش کی دولت لے جائیں۔ امریکی طرز کی جس یونیورسٹی کا اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے وہ اس تحریک کو عملی شکل و صورت دینے میں مددگار ثابت ہوگی اور ہمارا پورا تعلیمی نظام اس سے متاثر ہوگا۔

علمی میدان میں اپنے ملک کو آگے لے جانے کا مجھ میں وہ جوش و ولولہ ہے کہ میں اس کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا اس میں شک نہیں کہ علمی ماحول میں بڑی تبدیلی آئی ہے اور ہم نے کافی ترقی کی ہے اور یہ توسیع و ترقی ہی میرے لئے مسرت کا باعث ہے، مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے نوجوان بلکہ اس ملک کے تمام لوگ کسی طرح بھی علم و ہنر کے میدان میں پیچھے نہ رہیں گے۔

۱۲— تیل کی صنعت میں ہماری پیشقدمی

تیل اور پٹرول کی صنعت کا شمار دُنیا کی جدید صنعتوں میں ہوتا ہے۔ جس کو پہلی بار امریکہ میں شروع کیا گیا۔ پورے مشرقِ وسطیٰ میں جہاں سب سے پہلے تیل نکالا گیا وہ ملک ایران ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ امریکہ میں زمین کے نیچے خام تیل کی مقدار تقریباً پینتس ہزار ملین پیپے ہے اور حسنِ اتفاق سے ایک تخمینے کے مطابق ایران میں بھی اتنا ہی خام تیل موجود ہے۔

آج تقریباً دنیا کے سب ہی لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ موجودہ دور میں تیل اور اس سے تیار کردہ اشیا کی زندگی میں کیا اہمیت ہے لیکن یہ بات چند ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ آزاد دنیا کا ستر فی صدی تیل مشرقِ وسطیٰ میں پایا جاتا ہے جس کا پانچواں حصہ ایران میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کینیڈا، وینیزولا اور آہنی پردے کے پیچھے جو ملک ہے اُس کے علاوہ دوسرے ممالک میں جتنے ذخائر موجود ہیں ان کے باوجود آزاد دنیا کا اسّی فی صدی تیل امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے ذخیروں میں ہے۔ ممکن ہے کہ آیندہ ان اعداد و شمار میں کوئی تبدیلی واقع ہو لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ تیل کی تلاش کرنے والے ماہرین عرصے سے تیل کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور جہاں کہیں انہوں نے تیل دریافت کیا ہے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ کہاں کتنا تیل موجود ہے۔

اگر آزاد دنیا مشرقِ وسطیٰ کے تیل سے محروم ہو جائے تو وہ ممالک جو تیل کو استعمال کرتے ہیں اور وہ جو تیل نکالتے ہیں دونوں بری طرح اقتصادی بحران کا شکار ہوں گے۔ اس بات کو دوسری طرح یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے جب قدرت نے ان ذخائر کو زمین کے سینے میں محفوظ کیا تھا تو مشرقِ وسطیٰ اور تمام آزاد دنیا کے درمیان ایک تجارتی اور اقتصادی رابطے کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ قدرت نے تیل کے ذخائر زمین میں دفن کئے اور انسان نے اس کے استعمال کے مختلف طریقے نکالے اور اب تو انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس سیال مادے کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ اور باقی تمام آزاد دنیا کو اقتصادی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اگرچہ تیل کی جدید صنعت کو قائم ہوئے تقریباً سو سال گذر چکے ہیں۔ لیکن ہزاروں سال پہلے لوگ اس مادے کے متعلق جانتے تھے جو زمین سے رِس رِس کر بہتا تھا اور وہ اس کو اپنے کام میں بھی لاتے تھے۔ چنانچہ ایرانی اس کو نہ صرف چراغاں کرنے کے لئے بلکہ زرتشتی عبادت گاہوں میں آتشِ مقدس کو روشن رکھنے کے لئے، مصری لاشوں کو محفوظ کرنے، یونانی اولمپک کھیلوں کی مشعل جلانے اور ریڈ انڈین اپنے مذہبی ناچوں کے موقع پر اس کا استعمال کیا کرتے تھے۔ ایران کی طرح دوسرے ممالک میں بھی وہ خام تیل جو زمین سے رِس رِس کر تارکول کی طرح جم جایا کرتا تھا۔ لوگ گارے کی جگہ، فرش ہموار کرنے اور جلانے کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جہازوں کی درزیں بند کرنے، پانی کی نالیاں بنانے، باندھ تیار کرنے اور فضا میں روشنی کرنے کے لئے بھی اس کو کام میں لایا جاتا تھا۔ قدرتی گیس جو زمین سے نکلتی تھی وہ بھی بے کار نہیں جاتی تھی چنانچہ خوزستان کے علاقے میں زرتشتی اپنے معابد اُن جگہوں پر بناتے تھے جہاں گیس کا سرچشمہ ہوتا تھا اور اس گیس کو شعلے کے ذریعے روشن کر دیا کرتے تھے۔

پچھلی صدی میں رفتہ رفتہ تیل ایک صنعت کی شکل اختیار کر گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں تیل کی ایک تجارتی کمپنی برما میں قائم ہوئی اُس وقت تک تیل کے کنویں ہاتھوں سے کھود کر ان میں سے تیل نکالا جاتا تھا۔ سب سے پہلی بار امریکہ میں تیل نکالنے کے لئے جدید قسم کی مشینوں اور ٹکنالوجی کا استعمال شروع ہوا جس وقت کرنل[1] اڈوین ایل ڈریک نے پنسلوانیا میں سب سے پہلا تیل کا کنواں کھودنا شروع کیا تو اس وقت اس کی کمپنی تقریباً دیوالیہ ہو چکی تھی اور بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نیم دیوانہ ہے لیکن جیسے ہی کام مکمل ہونے کے بعد نفع کا روپیہ تجوریوں میں آنا شروع ہوا تو لوگوں نے اپنی رائے بدل دی اور اس کو بیدار مغز اور عالی دماغ کہنے لگے۔ ڈریک نے جو کنواں کھودا تھا اس کی گہرائی ستر فٹ سے زیادہ نہ تھی درحالیکہ آج کل جو کنویں ایران میں اور دوسرے تیل کے علاقوں میں کھودے جاتے ہیں ان کی گہرائی عام طور پر دس ہزار فٹ اور کہیں کہیں تو اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اُس کے کنویں سے ہر روز تقریباً پینتیس پیپے تیل برمے کے ذریعے کھینچا جاتا تھا جب کہ آج کل ہمارے ایک اچھے کنویں سے ہر روز تیس ہزار سے زیادہ پیپے سالوں تک نکالے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈریک میں انتھک لگن اور جستجو کا جذبہ تھا اور اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ تیل کی صنعت کا بانی دراصل وہی شخص تھا۔

اس بلند ہمت انسان نے نہ صرف تیل نکالنے کا ذریعہ معلوم کیا بلکہ لوگوں کو اس کے استعمال کے مختلف طریقے بھی بتائے۔ وہ خود گٹھیا کا مریض تھا اس کی کمپنی نے پٹرول سے ایک قسم کا تیل مالش کے لئے تیار کیا جس کو ڈریک اپنے پیر پر ملتا تھا۔ ڈریک نے خام تیل کو صاف کر کے کروسن آئل تیار کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔ اس سے قبل لوگ وہیل مچھلی کا تیل استعمال کرتے تھے جو ایک بڑی کمیاب اور مہنگی شے تھی لیکن جب خام تیل صاف ہو کر بازاروں میں آنے لگا تو لوگ لیمپوں اور لالٹینوں میں وہیل مچھلی کے تیل کی جگہ اس کا استعمال کرنے لگے۔ جب کروسن آئل کا استعمال تیزی سے بڑھنے لگا تو

1. COLONEL EDWIN L. DRAKE

ہنری فورڈ نے ایک گاڑی ایجاد کی جس میں گھوڑا نہیں جوتا جاتا تھا چونکہ اس گاڑی کو چلانے کے لئے انجن میں بہت زیادہ تیل کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے تیل کی سالانہ کھپت بہت بڑی مقدار میں بڑھ گئی۔ کچھ عرصے بعد رائٹ برادرز اور دوسرے لوگوں نے ہوائی جہاز تیار کر لئے جس کی وجہ سے تیل کی مانگ میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی اثنا میں پانی کے جہاز، بوائلر، بہتر ساخت کے ڈیزیل انجن اور پٹرو کیمیکل کی بڑھتی ہوئی صنعت نے تیل کی مانگ کو اور بڑھا دیا۔ قدرتی گیس بھی تیل کے ساتھ ہی پائی جاتی ہے۔ حرارت اور طاقت پیدا کرنے کے علاوہ اس کو فیکٹریوں میں بطور خام مال کام میں لایا جانے لگا اسی کے ساتھ تارکول کے استعمال کے بھی بہت سے طریقے نکل آئے۔ سب سے زیادہ اس کو سڑکیں اور شاہراہیں بنانے کے کام میں لایا جاتا ہے تاکہ پٹرول سے چلنے والی گاڑیاں ان پر آسانی سے دوڑ سکیں۔

جیسے ہی لوگوں پر تیل کے خواص اور فوائد کے سربستہ راز آشکار ہونے لگے۔ اس کی جستجو و تلاش کے لئے یورپ کے سرمایہ دار اور صنعتی طبقہ نے مشرقِ وسطیٰ کی طرف رخ کرنا شروع کیا۔ اس کتاب کی دوسری فصل میں میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ کس طرح ۱۸۷۲ء میں رویٹر نامی شخص کو تیل نکالنے کے اختیارات دیئے گئے اور بعد میں اُن کو ختم کر کے ۱۸۸۹ء میں دوبارہ یہی اختیارات دیئے گئے لیکن پہلے کے مقابلے میں یہ کافی محدود تھے۔ ۱۸۸۹ء کے معاہدے کے مطابق رویٹر نے ایران میں ۱۸۹۰ء میں پرشین بنک مائننگ رائٹس کارپوریشن[1] کے نام سے معدنیات نکالنے کی کمپنی قائم کی جس میں تیل نکالنے کا اختیار بھی شامل تھا۔ اس کمپنی نے جنوبی ایران میں تیل کی تلاش شروع کی لیکن اس کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ کچھ سال بعد ایرانی حکومت نے اعلان کیا کہ رویٹر سے جو معاہدہ ہوا ہے اس میں معدنیات نکالنے کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے اس کا معاہدہ منسوخ سمجھا جائے چنانچہ ۱۹۰۱ء میں یہ کمپنی دیوالیہ ہو کر ختم ہو گئی۔

اس سے قبل کہ رویٹر اپنی تلاش و جستجو کو ختم کرے۔ ہمارے مغربی صوبے کرمانشاہ کے گورنر کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اس علاقے میں تیل ہے۔ ژاک مورگان[2] نامی ایک فرانسیسی جو فرانس کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ٹیم کا سرپرست تھا اپنی ٹیم کے ہمراہ کرمانشاہ کے علاقے میں جگہ جگہ کھدائی کے کام کر رہا تھا، ۱۸۹۱ء میں اس سے کہا گیا کہ وہ بھی تیل کے ذخیروں کی تلاش و جستجو کرے۔ ڈو مرگان پہلا شخص تھا جس نے ایران میں پہلی مرتبہ علمی و فنی اصول و ضوابط کے مطابق تیل کی تلاش شروع کی۔ ڈو مرگان کو تلاش کے بعد جو معلومات حاصل ہوئیں وہ پہلے تو فرانس کے ایک تکنیکی رسالے میں چھپیں بعد میں ان کو ایک کتاب کی شکل دے دی گئی۔ ڈو مرگان کے بعد تیل کے ذخیروں کی تلاش میں بہت سے لوگ یورپ سے ایران آئے۔ اور جن خطوں سے تیل نکل سکتا تھا ان کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔

ڈو مرگان کی کتاب اور دوسرے تیل کی تلاش کرنے والوں کی تحریروں نے ولیم ناکس ڈارسی[3] نامی ایک انگریز کی توجہات کو اپنی طرف مبذول کیا۔ یہ شخص اس سے قبل آسٹریلیا میں سونے کی کانوں کی تلاش میں اپنی قسمت آزمائی کر کے کامیاب ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ڈارسی نے ایک ٹیم بنا کر تہران روانہ کی تاکہ تیل کے ذخیرے تلاش کرنے کی اجازت حاصل

1. PERSIAN BANK MINING RIGHTS CORPORATION   2. JACQUES de MORGAN
3. WILLIAM KNOX D'ARCY

کر سکے۔ بعض روسیوں کی مخالفت کے باوجود ۱۹۰۱ء میں ڈارسی کو ساٹھ سال تک کے لئے تیل کے ذخیرے تلاش کرنے اور تیل کے علاوہ قدرتی گیس، تارکول اور دوسرا خام مواد نکالنے کے اختیارات مل گئے۔ معاہدے میں شرط رکھی گئی تھی کہ ڈارسی دو سال کی مدت میں اپنی کمپنی ایران میں قائم کرے گا۔ اس کمپنی سے ایک ایک پونڈ کے بیس ہزار حصص ایرانی حکومت خریدے گی اور بیس ہزار پونڈ نقد وصول کرے گی اور تیل کی آمدنی سے جو نفع ہوگا اس کا سولہ فی صدی حصہ ایرانی حکومت کا ہوگا۔ ڈارسی کو شمالی سرحد کے پانچ صوبوں کو چھوڑ کر پورے ملک میں تیل تلاش کرنے اور نکالنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ پانچ صوبے دفاعی تحفظ کے تحت اور روسیوں کی رخنہ اندازی کے خوف سے چھوڑ دیئے گئے تھے۔

ڈارسی کی ٹیم کا چیف انجینیر جی۔ بی رینالڈز نامی شخص تھا۔ یہ شخص بڑا باہمت اور جفاکش انسان تھا۔ اس نے تمام سختیاں برداشت کر کے جنوبی ایران کے دُور افتادہ گرمی سے جھلستے ہوئے علاقے میں زمین میں سوراخ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کا پہلا کنواں ۱۹۰۲ء میں تیار ہوا جو بالکل خشک نکلا۔ دوسرا کنواں ۱۹۰۳ء میں تیار ہوا اس میں کچھ تیل تھا چنانچہ ہر روز ایک سو بیس پیپے تیل نکالا جانے لگا۔ دوسرے کنوئیں کے تیار ہونے سے پہلے ڈارسی مالی پریشانیوں میں گھر چکا تھا لیکن جب دوسرے کنویں سے تیل نکل آیا تو اُس کو امید کی کرن دکھائی دی لیکن تھوڑے عرصے کے بعد یہ کنواں بھی خشک ہو گیا۔

اِن حالات کو دیکھتے ہوئے برطانوی سمندری بیڑے کے افسروں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ جہازوں میں تیل کی بجائے پتھر کا کوئلہ بطور ایندھن استعمال ہوا کرے گا۔ سرجان فیشر[1] جو بعد میں لارڈ فیشر کے لقب سے مشہور ہوا۔ انہی دنوں برطانوی بحری بیڑے کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس کی یہ زبردست خواہش تھی کہ بحری جہازوں میں تیل ہی کام میں لایا جائے اُس کے اِس جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے بعض کوتاہ نظر اس کو تیل کا دیوانہ کہہ کر پکارنے لگے۔ اس نے ایک آئل کمیٹی مقرر کی تاکہ شاہی بیڑے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تیل حاصل کرنے کے مسائل پر غور و فکر کر سکے۔ اس کمیٹی کو ایرانی تیل کے ذخائر اور ان سے تیل حاصل ہونے کے امکانات کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ اُس نے ڈارسی کا تعارف برما آئل کمپنی سے کرا دیا۔ اگلے سال ڈارسی اور برما آئل کمپنی نے مل کر ایک سنڈیکیٹ قائم کیا جس کا مقصد تھا کہ ایران میں تیل کی تلاش کے لئے جو رقم خرچ ہو اس کا انتظام یہ سنڈیکیٹ کرے گا۔

نئے سنڈیکیٹ کے تحت ایران میں پھر تیل کی تلاش شروع کر دی گئی۔ پانچ سال تک انتھک کوششوں سے پانچ کنویں کھودنے کے بعد ۱۹۰۷ء میں تیل نکلا جو مقدار میں نہ نکلنے کے برابر تھا۔ اتنی سختیاں اُٹھانے اور جان توڑ محنت کے بعد بھی کوئی امید افزا صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ رینالڈز اس وقت بھی چیف انجینیر تھا اس نے فیصلہ کیا کہ قطعی نااُمید ہونے سے قبل ایک بار پھر قسمت آزمائی کر لی جائے۔ چنانچہ اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے آبادان سے ایک سو پچاس میل کے فاصلے پر مسجد سلیمان نامی مقام پر (یہاں ایک شہید و شکستہ مسجد کے آثار پائے جاتے ہیں)

1. SIR JOHN FISHER

ایک بار پھر ہمت سے کام لے کر کھدائی شروع کردی۔

آخر کار ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کی صبح کو رینالڈز کی محنت بارآور ہوئی اور کنویں میں سے تیل فوارے کی شکل میں اس طرح پھوٹا کہ کنویں کی مینڈ پر جو منجنیق لگی ہوئی تھی اس کے اوپری حصے سے بھی ڈیڑھ سو فٹ اُوپر نکل گیا۔ اور یہ پہلا دن تھا جب کہ نہ صرف ایران میں بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں باقاعدہ تیل کی صنعت کا آغاز ہوا۔ مشرقِ وسطیٰ کی تیل کی تاریخ میں ہمیں اس دن کو ایک یادگار دن سمجھنا چاہیئے۔

میں اکثر اس بات پر غور کیا کرتا ہوں کہ جن لوگوں نے تیل حاصل کرنے میں پیشقدمی کی اور آخر کار سختیاں جھیل کر اور طرح طرح کی پریشانیاں اُٹھا کر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ان کے پیچھے کون سا جذبہ اور کیا محرکات کارفرما تھے۔ کچھ حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ تلاش وجستجو، مادی منفعت، شہرت اور اقتدار کی خاطر کر رہے تھے لیکن یہ ماننے کے لئے میں تیار نہیں کہ محض مادی مفاد کی خاطر اتنا بڑا کام ہو رہا تھا۔ میری رائے میں جن لوگوں نے اس صنعت کا آغاز کیا اور خاص طور پر وہ اشخاص جو مدتوں تک منجنیقوں کے پاس کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی مشینوں کے نزدیک سکونت اختیار کئے رہے اور ہر طرح کی رکاوٹ اور پریشانی کا مقابلہ کرتے رہے وہ لوگ تھے جن کے دلوں کو مہم جوئی کا جذبہ اُبھارتا تھا۔ خطرات اور مایوسیاں ان کو نئی راہیں دکھاتی تھیں۔ میرے ملک میں مہم جوئی کے بہت اچھے مواقع ہیں اور جن ایرانی نوجوانوں میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ اُن کے لئے اُن کی محنت جنہوں نے پورے عزم وارادے سے مسلسل کام کر کے پہلا تیل کا کنواں تیار کیا اور تیل کی صنعت کی بُنیاد رکھی۔ ترقی کرنے اور نئی راہیں تلاش کرنے کے لئے ایک عمدہ اور کارآمد مثال ہوگی۔

تھوڑے عرصے بعد دو اور تیل کے کنویں مسجد سلیمان کے پاس دریافت کر لئے گئے اور رینالڈز نے سالوں کی مایوسی اور ناامیدی کے بعد آخر کار تیل سے مالامال ذخیرہ ڈھونڈ ہی نکالا اور جس سے آج بھی کثیر مقدار میں تیل نکالا جاتا ہے۔

جب تیل دریافت کرنے کی مہم میں کامیابی ہوئی تو یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ تیل سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک نئی اور زیادہ بڑی کمپنی قائم کی جائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ بختیاری قبیلے کے لوگوں سے کس طرح معاہدہ کیا جائے کیونکہ یہ قبیلہ بڑا ہی طاقتور تھا اور مرکزی حکومت کی علانیہ نافرمانی کرتا تھا اور مسجد سلیمان کے اطراف میں انہی لوگوں کا قبضہ تھا۔ میرے والد کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ نہ صرف جنوبی علاقوں میں بلکہ پورے ملک میں ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ تیل کی صنعت اُسی وقت ترقی کر سکتی تھی جب کہ ملک میں امن وامان ہو اور جن لوگوں نے تیل دریافت کرنے کا کام اپنے ذمے لیا تھا ان کو تلخ تجربات سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ مرکزی حکومت کے ذمے دار لوگ امن قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جن دنوں تیل کی دریافت کے لئے کنویں کھودے جا رہے تھے، کنویں کھودنے والی ٹیم کو اپنی جان ومال کی حفاظت کے لئے بختیاری سرداروں کو نقد روپیہ دینا پڑتا تھا اور اب جب کہ تیل نکل آیا تھا تو ان کے مطالبے اور زیادہ بڑھ گئے تھے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ رقم کے طلبگار تھے۔

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپریل ۱۹۰۹ء میں بختیاری آئل کمپنی اِن شرائط پر قائم ہوئی کہ جو علاقے بختیاری قبیلوں کے تحت ہیں اگر اُن میں سے تیل نکالا جائے گا تو تیل کے منافع کا کچھ حصّہ بختیاری سرداروں کو بھی ملے گا۔ اسی کے ساتھ یہ کمپنی انگریزوں کے پُرانے اصول پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے تحت بھی بختیاری سرداروں کے ہاتھ مضبوط کر رہی تھی تاکہ یہ لوگ ایران کی مرکزی حکومت سے سرکشی کرتے رہیں۔ اس کے مقابلے میں بختیاری سرداروں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو قابو میں رکھیں تاکہ پورے طور پر امن و امان برقرار رہے۔ جب تیل کے علاقوں میں امن کا مسئلہ حل ہو گیا تو بختیاری آئل کمپنی کے منتظمین نے اگلے ہی دن انگلو پرشین آئل کمپنی قائم کر دی۔ (یہی کمپنی آئندہ انگلو ایرانین آئل کمپنی کے نام سے اور بعد میں برٹش پٹرولیم کمپنی کے نام سے مشہور ہوئی)

نئی تیل کی کمپنی نے تیل نکالنے اور اس کو دُنیا کی منڈیوں میں بھیجنے کے تمام منصوبے فوری طور پر تیار کر لئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ تیل صاف کرنے کا کارخانہ لگایا جائے اور صاف شدہ تیل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جائے پُرامن راستوں کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا۔ اُن دنوں شیخ محمرہ (محمرہ موجودہ خرم شہر اور اس کے آس پاس کے علاقے کا بھی نام ہے) کہنے کو تو مرکزی حکومت کے تابع تھا لیکن عملاً اپنے علاقے میں اُس نے آزاد حکومت قائم کر رکھی تھی جس پر وہ خود حکمران تھا اور مرکزی حکومت اُس کے خلاف کسی قسم کی چارہ جوئی نہیں کر سکتی تھی۔ ہماری تجارتی بندرگاہ کے نزدیک شط العرب کے کنارے آج بھی شیخ کے محل کے کھنڈرات دیکھے جا سکتے ہیں جہاں وہ پورے مشرقی جاہ و جلال سے اپنی حرم کی عورتوں کے ساتھ عیش کی زندگی گذارتا تھا۔ انگریزی حکومت نے شیخ کو ایک آزاد حکمران تسلیم کر کے اس سے ایک معاہدہ کیا۔

معاہدے کے تحت جب شیخ کو یہ معلوم ہوا کہ اس کو ایک مناسب رقم ملتی رہا کرے گی تو اس نے بھی کمپنی کے ساتھ پدرانہ شفقت اور سخاوت کا سلوک کیا اور ایک مربع میل غیر آباد اور دلدلی علاقہ جو جزیرۂ آبادان کے نام سے مشہور تھا کمپنی کو دے دیا تاکہ یہاں وہ تیل صاف کرنے کا کارخانہ قائم کر سکے۔ اس کے بدلے انگریزی حکومت نے اس کو یقین دلایا اور اس بات کی ضمانت دی کہ اسکی آزاد اور خود مختار حیثیت برقرار رہے گی۔

باوجود تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کے ۱۹۱۲ء میں ایک پائپ لائن مسجد سلیمان سے آبادان تک ڈال دی گئی ۱۹۱۲ء کے آخر تک آبادان کا کارخانہ بڑی مقدار میں تیل صاف کرنے لگا اور اس کی مزید توسیع کے لئے ضروری اقدامات بھی کئے جانے لگے۔ اب تیل کی صنعت نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنی شروع کی چنانچہ ۱۹۱۲ء میں تینتالیس ہزار ۱۹۱۳ء میں اسّی ہزار اور ۱۹۱۴ء میں دو لاکھ تہتر ہزار ٹن تیل یہاں سے نکالا گیا۔ اس تیل کی وجہ سے میرا ملک خواہ مخواہ دُنیا کی سیاسی اور اقتصادی کشمکش کا اکھاڑہ بن گیا۔

یورپ کے آسمان پر جنگ کے بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ حکومتِ برطانیہ کو ۱۹۱۲ء سے ہی یہ فکر دامن گیر تھی کہ تیل کے ذخیروں کی کس طرح حفاظت کی جائے۔ ونسٹن چرچل نے جو اس وقت برطانوی بحری بیڑے کا افسرِ اعلیٰ تھا یہ تجویز پیش کی کہ

بحری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی کا اکیاون فی صدی حصّہ خود حاصل کرے۔ اس تجویز کو برطانوی پارلیمنٹ نے جنگ شروع ہونے سے چھ روز قبل ایک قانون کے ذریعے منظور کرلیا۔ یہ یاد رہے کہ پہلی جنگ عظیم اگست ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی۔

اس قانون پر خاطر خواہ عمل درآمد کیا گیا اور باوجود تمام جنگی دشواریوں کے تیل کی پیداوار بڑھا دی گئی۔ ترک جرمنوں کے طرفدار تھے۔ انہوں نے بغداد اور بصرہ میں اینگلو پرشین آئل کمپنی کا تمام اثاثہ اور تیل کی رسد پر اپنا قبضہ کرلیا۔ ترکوں نے آبادان کے کارخانے کے لئے بھی خطرہ پیدا کردیا تھا لیکن برطانوی بحری فوج نے ان کو بروقت پیچھے دھکیل دیا۔ جرمنوں نے شط العرب میں چند کشتیاں ڈبونے کا منصوبہ تیار کیا تاکہ اس طرح تیل بردار جہازوں کی آمد و رفت بند ہو جائے۔ لیکن انگریزوں نے اُن کے اس منصوبے کو بھی ناکام بنا دیا۔ ۱۹۱۵ء میں بعض ایرانی قبائلیوں نے جرمن اور ترک جاسوسوں کے اکسانے پر مسجد سلیمان سے آبادان تک کی پائپ لائن کئی جگہ سے کاٹ دی جس کی وجہ سے آبادان کے کارخانے میں تیل پہنچنا بند ہو گیا۔ لائن کی مرمّت میں تقریباً چار ماہ صرف ہوئے اور کام دوبارہ شروع ہوا۔

جرمنوں نے سمندری جہازوں پر حملہ کر کے تیل کے کارخانے کے لئے ضروری سامان کی درآمد اور تیل کی برآمد میں کافی رکاوٹیں پیدا کیں لیکن تیل کی پیداوار اور برآمد میں برابر اضافہ ہوتا رہا چنانچہ ۱۹۱۵ء میں تین لاکھ چھیتر ہزار ۱۹۱۶ء میں چار لاکھ انچاس ہزار ۱۹۱۷ء میں چھ لاکھ پچاس ہزار اور ۱۹۱۸ء میں آٹھ لاکھ ستانوے ہزار ٹن تیل نکالا گیا۔

میری رائے میں تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم میں اتّحادیوں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کے قبضے میں ایرانی تیل کے ذخیرے تھے۔ چنانچہ برطانوی باشندہ لارڈ کرزن لکھتا ہے کہ "آیندہ آنے والی نسلیں جب ہماری فتح کی بات کریں گی تو کہیں گی کہ اتّحادی تیل کی لہروں کے سہارے ساحل مراد تک پہنچے اور اس تیل کے سمندر میں سب سے زیادہ تیل ایران کا تھا۔" لیکن اس کے باوجود چونکہ اینگلو پرشین آئل کمپنی میں سب سے بڑی حصّے دار برطانوی حکومت تھی اس لئے جب تک ہم نے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار نہیں دے لیا ہمارے سیاسی تعلقات اُن سے بڑے ہی پیچیدہ رہے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد بھی تیل کی پیداوار برابر بڑھتی رہی۔ اور کمپنی نے آبادان اور تیل کے میدانوں میں کام کرنے والوں کے لئے بہت سی کام کی اور رہن سہن کی سہولتیں مہیا کیں۔ ۱۹۲۰ء میں ایرانی حکومت اور کمپنی کے درمیان نہایت ہی پیچیدہ نئے معاہدے کا مسودہ تیار ہوا۔ اس معاہدے کی رُو سے مجموعی طور پر ایرانی حکومت کو تھوڑا سا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ لیکن ایرانی حکومت کا حصّہ نفع کی رقم میں سے وہی سولہ فی صدی رکھا گیا تھا جو کبھی ڈارسی کے زمانے میں طے پایا تھا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اینگلو پرشین کمپنی کے تحت جو دوسری کمپنیاں تھیں (جیسے تیل بردار جہاز کمپنیاں وغیرہ) اُن سے بھی جو کچھ نفع ہوتا تھا وہ بھی اسی سولہ فی صدی میں شامل تھا۔

میرے والد برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بھی کمپنی کے برتاؤ سے مطمئن نہیں تھے بلکہ ۱۹۲۱ء کے فوجی انقلاب کے فوراً بعد انہوں نے سر ولیم مکلن ٹاک[1] کی خدمات حاصل کیں۔ یہ شخص لندن کا مشہور و معروف پرائیویٹ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا۔ (اُس زمانے میں ہمارے ملک میں اعلیٰ اور ماہر اکاؤنٹنٹ نہیں تھے) ایرانی حکومت اور کمپنی کے درمیان جو مالی رابطہ تھا اس کی جانچ پڑتال کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ مکلن ٹاک نے تمام اعداد و شمار اکٹھا کر کے میرے والد کو دیئے جن کا استعمال انہوں نے کمپنی سے احتجاج کے موقع پر کیا۔

۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں میرے والد نے باغی قبائلیوں کی سرکوبی اور ان کو مرکزی حکومت کے تحت لانے کے لئے باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ مغرب میں کُردوں کو، مرکزی ایران میں مولُروں کو اور جنوب میں قشقائی قبیلے کے لوگوں کو مطیع کرنے کے بعد وہ بختیاری قبیلے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس موقعے پر برطانوی حکومت کے وزیرِ مختار مقیم تہران نے ایرانی حکومت کو بڑے سخت الفاظ میں یہ یادداشت بھیجی کہ بختیاری قبیلے کے لوگ حکومت برطانیہ کے دوست ہیں۔ اگر رضا شاہ کی فوجوں نے برطانیہ کے دوستوں پر حملہ کیا تو اُس کی حکومت خاموش نہیں بیٹھے گی۔ میرے والد نے اس دھمکی کی بالکل پروا نہ کی اور برابر آگے بڑھتے رہے۔ بختیاری سرداروں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ مرکزی حکومت میں ان کو زیر کرنے کی طاقت ہے چنانچہ وہ خود ہی اس کے تحت فرمان آ گئے۔

کچھ عرصے بعد میرے والد نے شیخ محمرہ سے نبرد آزمائی کا فیصلہ کیا۔ شیخ کو ایک طرف تو میرے والد کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اقتدار کا خوف لگا ہوا تھا لیکن دوسری طرف اس کو یہ بھی یقین تھا کہ مصیبت کے وقت برطانوی حکومت اس کی مدد کرے گی اور اسی اُمید پر وہ ایران کی مرکزی حکومت سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اِس دفعہ بھی برطانوی حکومت نے سخت احتجاج کیا لیکن ۱۹۲۴ء کے موسمِ خزاں میں میرے والد بائیس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخ نے ایک ماہ میں ہی بغیر کسی کُشت و خون کے ہتھیار ڈال دیئے۔ میرے والد شیخ کو اپنے ساتھ لے کر تہران واپس آ گئے جہاں اُنہوں نے شیخ کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا لیکن اس کو واپس اپنی جاگیر میں نہیں جانے دیا۔ شیخ کا کچھ عرصے بعد تہران میں انتقال ہو گیا۔

میری رائے میں شیخ محمرہ کی کُھلم کُھلا بغاوت کو بغیر کُشت و خون کے دبانے کا سبب میرے والد کی اپنی ہمت اور بہادری تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر ایک شہر کے قریب پہنچے جس پر شیخ محمرہ کا قبضہ تھا۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ شہر کے باہر ہی رہیں اور خود اکیلے شہر میں داخل ہو گئے۔ شیخ نے اپنے مسلّح سپاہی سڑک پر اور مکانوں کی چھتوں پر تعینات کر رکھے تھے اور سب کے سب ان کو گذرتا ہوا دیکھ بھی رہے تھے چنانچہ وہ ٹہلتے ہوئے سڑک پر سے گذر کر نہانے کے لئے کرائے کے حمام تک پہنچ گئے۔ اگرچہ ان کو بڑی آسانی سے گولی کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا لیکن کسی میں ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ بڑے سے بڑا سردار اور معمولی سے معمولی آدمی اُن کی ہمت کے سامنے ٹھہر نہیں

1. SIR WILLIAM McLINNTOCK

سکتا تھا۔

جس وقت میرے والد ایران کے تختِ سلطنت سے دست بردار ہوئے تو اُن دنوں سر ریڈر بلارڈ[1] برطانوی حکومت کی طرف سے تہران میں وزیر مختار تھا۔ اس نے ایک دفعہ دورانِ گفتگو مجھ سے بہت صاف لفظوں میں کہا شیخ محمرہ کے زوال سے اس کی حکومت نے ایک سبق سیکھا ہے کیونکہ شیخ محمرہ کا شمار بہت بڑے سرداروں میں ہوتا تھا اور جب رضا شاہ نے اس کا تختہ اُلٹ دیا تو برطانوی سرکار نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آیندہ کبھی ایرانی حکومت سے قبائلیوں کے معاملات میں نہیں اُلجھے گی۔

میرے والد کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر چیز کی کھوج میں رہتے تھے چنانچہ جن دنوں وہ جنوب کی طرف لشکر کشی کر رہے تھے تو انہوں نے تیل کی صنعت کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لی تھیں ۱۹۲۲ء میں اُنہوں نے آبادان کا سرکاری دورہ کیا۔ اگرچہ کمپنی نے اُن کا شاہانہ استقبال کیا لیکن ان کو کمپنی کے برتاؤ سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ یہاں کے لوگ بہت ہوشیار اور چالاک ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے کمپنی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں جس سے پتہ چلا کہ کمپنی کا بیس فی صدی سے زیادہ عملہ غیر ملکی ہے اور کمپنی کی طرف سے بالکل اس بات کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے کہ اُن کی جگہ ایرانیوں کو رکھا جائے۔ انہوں نے اعلیٰ عہدے داروں اور معمولی کام کرنے والوں کے معیارِ زندگی میں بہت بڑا فرق محسوس کیا۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ کمپنی مقامی حکومت کے کاموں میں مداخلت کرتی ہے اور تیل کی پیداوار میں بین الاقوامی منڈی کے اُتار چڑھاؤ اور ملک کے اندر کام کرنے والی دوسری کمپنیوں کی مرضی کو مدِّنظر رکھا جاتا ہے اور ایران کی اقتصادی حالت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو ان کو بہت تکلیف ہوئی۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ میرے والد نے ۱۹۳۲ء میں کمپنی کے تیل نکالنے کے اختیارات ایک دم بغیر کمپنی کو اطلاع دیئے ختم کر دیئے تھے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ میرے والد تختِ سلطنت پر آنے سے پہلے ہی ۱۹۲۰ء کے کمپنی کے معاہدے سے سخت ناراض تھے۔ اور اُنہوں نے کمپنی سے کئی بار یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ ایرانی حکومت سے بہتر شرائط پر معاملہ کرے۔ ۱۹۲۶ء میں رضا شاہ کی حکومت نے باضابطہ کمپنی کو یہ یاد دہانی کرائی تھی کہ وہ اس کے موجودہ رویّے سے مطمئن نہیں ہے اور ۱۹۲۸ء میں دوبارہ کمپنی کے معاملات پر اعتراضات کیے تھے۔ دو سال تک کمپنی سے بات چیت چلتی رہی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس اثنا میں پوری دُنیا میں اقتصادی بحران آ گیا جس کی وجہ سے تیل کی کھپت کم ہو گئی اور حکومتِ ایران کو تیل کی آمدنی سے معاوضہ کم ملنے لگا۔ ۱۹۳۲ء میں کمپنی نے اعلان کیا کہ ۱۹۳۱ء میں جتنی رقم ایرانی حکومت کو دی گئی تھی آیندہ اس سے ایک چوتھائی کم دی جائے گی۔ اُس وقت میرے والد نے سوچا کہ اب عملاً سخت قدم اُٹھانے کا وقت آ گیا ہے اور اس کے فوراً بعد اُنہوں نے کمپنی کے تیل نکالنے کے اختیارات منسوخ کر دیئے۔ ہماری پارلیمنٹ نے بھی اُن کے اس فعل کو پسند کیا اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس طرح میرے والد نے لوگوں میں قوم پرستی کا جذبہ

1. SIR READER BULLARD

پیدا کرنے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

تیل کے اختیارات منسوخ ہونے کے بعد کمپنی اور برطانوی حکومت کا غل مچانا ایک طبعی امر تھا۔ چند روز بعد پورا معاملہ لیگ آف نیشنز کے حوالے کر دیا گیا۔ دونوں طرف سے دلائل پیش کی گئیں اور آخرکار یہ طے پایا کہ کمپنی اور ایرانی حکومت براہِ راست آپس میں گفتگو کریں۔ اپریل ۱۹۳۳ء میں تیل نکالنے کے لئے نئے معاہدے پر دستخط ہوئے۔

اس دفعہ معاہدے کی شرائط زیادہ پیچیدہ تھیں لیکن میری رائے میں نئے معاہدے کی رُو سے ہماری حیثیت پہلے سے یقیناً بہتر ہو گئی تھی۔ تیل نکالنے کے اختیارات ۱۹۹۳ء تک کے لئے دے دئے گئے تھے جس کا ہمیں سخت افسوس تھا لیکن اس وقت ہماری حالت اس قابل نہ تھی کہ ہم کم عرصے کے لئے معاہدہ کرتے، اس کے علاوہ کمپنی کے لئے تیل نکالنے کا علاقہ ایک لاکھ مربع میل تک محدود کر دیا گیا تھا۔ ملک کے شمالی صوبوں کو چھوڑ کر کسی ایک کمپنی کو پورے ملک سے تیل نکالنے کا اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ اب سے قبل ملک کی اندرونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کمپنیاں ہی تیل ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا کرتی تھیں نئے معاہدے کے تحت ان کو اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کے معاملے میں بھی اب ہم پورے طور پر کمپنی اور منڈیوں کے اُتار چڑھاؤ کے رحم و کرم پر نہ تھے۔ جس قدر ہمارا مطالبہ تھا ہم کو اگرچہ اتنی رقم تو کمپنی سے نہ مل سکی لیکن یہ طے پا گیا تھا کہ سالانہ کم از کم ایک مخصوص رقم بغیر کسی رُکاوٹ کے ملتی رہے گی۔ ان شرائط کی خاص طور پر ان دنوں زیادہ اہمیت تھی جبکہ دُنیا کی منڈیوں میں تیل کا بھاؤ گر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری شرائط یہ بھی تھیں کہ غیر ملکی عملے کی جگہ زیادہ سے زیادہ ایرانی رکھے جائیں۔ تیل کے کنوؤں کی حالت جلد از جلد بہتر بنائی جائے اور مغربی ایران میں کرمانشاہ کے علاقے میں ایک اور تیل صاف کرنے کا کارخانہ قائم کیا جائے۔

۱۹۳۳ء کے معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد ایرانی حکومت اور کمپنی کے تعلقات بہت حد تک بہتر ہو گئے۔ کمپنی نے ہمارا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اپنا بہت سا سرمایہ ہمارے ملک میں لگانا شروع کر دیا۔ معاہدے پر دستخط ہونے سے پہلے صرف تین میدانوں میں تیل کے ذخیرے دریافت کر کے ان میں کنوئیں بنائے گئے تھے لیکن معاہدے کے بعد مزید ایک گیس کا ذخیرہ اور تین تیل کے کنوئیں الگ الگ میدانوں میں دریافت کئے گئے اس کے علاوہ جو تیل کنوؤں میں سے ضرورت سے زیادہ نکل آتا تھا اس کو صاف کر کے دوبارہ ذخیروں میں محفوظ رکھنے کے طریقوں کو کافی ترقی دی گئی تاکہ یہ فالتو تیل کسی بھی ضرورت کے وقت کام میں لایا جا سکے۔ آبادان کے کارخانے کو بھی پہلے سے زیادہ وسیع کیا گیا اور اس کی حالت بھی سدھاری گئی۔ ۱۹۳۳ء کے معاہدے پر عمل کرتے ہوئے کمپنی نے ایک شاخ کرمانشاہ آئل کمپنی کے نام سے کرمانشاہ میں کھولی اور نفت شاہ نامی تیل کے میدانوں سے تیل نکالنے کا کام شروع کیا۔ تیل نکالنے کا پلانٹ تیل کے ذخیروں کے میدان میں نصب کیا گیا۔ ایک ڈیڑھ سو میل لمبی پائپ لائن تیل کے میدان سے کرمانشاہ تک ڈالی گئی اور وہیں پر ایک چھوٹا سا تیل صاف کرنے کا کارخانہ بھی ملک کی اندرونی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا۔

کرمانشاہ کے تیل کے کارخانے کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے تعلقات کمپنی کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے۔ میرے والد نے کمپنی سے کہا تھا کہ وہ تیل صاف کرنے کا نیا کارخانہ اس طرح بنائے کہ ابتدائی سالوں میں دس لاکھ ٹن سالانہ تیل نکالا جاسکے۔ لیکن کمپنی نے اتنا بڑا کارخانہ لگانے سے انکار کردیا اور کہا کہ چونکہ ایران کی اندرونی کھپت اتنی زیادہ نہیں ہے اس لئے اتنا بڑا کارخانہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرے والد کا یہی اصرار تھا کہ کارخانہ اتنا بڑا ہی بنایا جائے جتنا کہ وہ چاہتے ہیں اور انہوں نے وعدہ کیا کہ جتنا بھی تیل اس کارخانے سے نکلے گا اس کو کھپانے کے لئے وہ ملک میں ہی منڈی بنائیں گے لیکن میرے والد کا اندازہ صحیح تھا کیونکہ آج ایران میں ہی تیل کی کھپت تیس لاکھ ٹن سالانہ سے زیادہ ہے اور ہر سال اوسطاً پندرہ فی صدی بڑھ رہی ہے۔ تیل کی کھپت میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اقتصادی میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

۱۹۳۰ء تک کمپنی ہر سال تقریباً ایک کروڑ ٹن سے زیادہ تیل نکالتی رہی۔ گویا پچھلے دس سال کے مقابلے میں یہ مقدار دوگنی سے زیادہ تھی۔ اسی طرح کمپنی نے غیر ملکی عملے کی جگہ ایرانیوں کو ترجیح دینے کے لئے عملی اقدامات کئے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اس نے آبادان ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور دوسرے تربیتی مراکز قائم کئے۔ شہر کو جدید طرز پر آباد کیا۔ رہائشی اور طبّی سہولتیں زیادہ بہتر فراہم کیں۔ بجلی، پانی اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران تیل بردار جہازوں کی کمی اور دوسری دشواریوں کی وجہ سے تیل کا نکالنا بہت کم کردیا گیا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں صرف چھیاسٹھ لاکھ ٹن تیل نکالا گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں جن دنوں سب سے زیادہ تیل نکالا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ مقدار سات گنا زیادہ تھی اس کے علاوہ کمپنی سے جو کم سے کم رقم کی ادائیگی کی شرط میرے والد نے رکھی تھی وہ بھی ہم کو ملنے لگی۔ کمپنی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر سال چالیس لاکھ پونڈ ایرانی حکومت کو ادا کیا کرے گی۔ یہ رقم ۱۹۳۸ء کی آمدنی کے برابر تھی (جنگ سے قبل کے تمام سالوں میں ۱۹۳۸ء کمپنی کے لئے نفع کے اعتبار سے بہترین سال تھا) دوسری جنگ کے دوران ۱۹۴۴ء کے بعد سے تیل کی پیداوار پھر بڑھنے لگی چنانچہ ۱۹۴۴ء میں ایک کروڑ بتیس لاکھ ٹن تیل نکالا گیا۔ یہ مقدار اُس سے کہیں زیادہ تھی جو امن کے دنوں میں سب سے زیادہ حاصل ہوئی تھی اور ۱۹۴۵ء میں یہ مقدار بڑھ کر ایک کروڑ اڑسٹھ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کمپنی نے آبادان کے تیل کے کارخانے کو جدید طرز کا بنانے اور توسیع دینے کا فیصلہ کیا۔ آبادان کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ دُنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اگرچہ دوسرے ممالک نے اپنے اپنے کارخانوں کو بہت ترقی دی لیکن اوّلیت کا سہرا اسی کے سر رہا۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی پیداوار دو کروڑ انچاس لاکھ ۱۹۴۸ء میں دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ اور ۱۹۴۹ء و ۱۹۵۰ء میں تین کروڑ اٹھارہ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔ لیکن آیندہ سالوں میں بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر تیل کی پیداوار کو ۱۹۴۹ء و ۱۹۵۰ء کی پیداوار کے برابر نہیں لایا جاسکا۔

۱۹۵۱ء میں پیداوار گر کر صرف ایک کروڑ ستر سٹھ لاکھ ٹن رہ گئی۔ پچھلے سالوں کے مقابلے میں یہ مقدار آدھی سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ۱۹۵۲ء میں صرف دس لاکھ ٹن تیل نکالا گیا گویا ۱۹۵۰ء کی نسبت سے صرف تیسواں حصّہ۔ اس کتاب کی پانچویں فصل میں میں بیان کر چکا ہوں کہ مصدّق نے نہ صرف تیل کی صنعت کو نقصان پہنچایا بلکہ اُس نے پورے ملک کے ڈھانچے کو جس کا وہ خود کو خدمتگار بتاتا تھا مفلوج کر کے رکھ دیا۔

تیل کی پیداوار گھٹنے اور ہماری اقتصادی زندگی میں جمود آنے سے پہلے حکومت کی آمدنی تیل کی پیداوار بڑھنے کی وجہ سے ہر سال زیادہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی نے یہ فرض کر لیا تھا کہ جیسے جیسے تیل کی پیداوار سے ہماری آمدنی بڑھے گی میں اور میرے ملک کے لوگ نکمّے ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن جنگ کے دوران اتحادیوں کے ہمارے ملک پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے اور جنگ کے بعد روسیوں کی بدسلوکی کے باعث ہمارے ملک کے لوگوں میں قومی اتحاد کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا یا دوسرے الفاظ میں اتحادیوں کی زیادتی اور روسیوں کی بدسلوکی ہماری بیداری کے دو بڑے سبب تھے۔ ہم غیر ملکیوں کے حاکمانہ رویّے سے بیحد تنگ آ چکے تھے۔ جب کمپنی کا غیر ملکی عملہ ہم کو اس نظر سے دیکھتا گویا ہم اس کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں تو ہمارا خون کھولنے لگتا۔ کمپنی کے اعلیٰ افسر اپنے ایرانی ماتحتوں سے اور ایرانی حکومت کے افسروں سے نہایت بدتمیزی سے پیش آتے گویا ہماری مہمان نوازی کا بدلہ ہتک اور توہین آمیز جملوں میں دیا جاتا۔ کمپنی کے بعض افراد کے برتاؤ سے ایسا لگتا تھا کہ گویا سارا ملک انہی کا ہے اور ہم تو محض بیگانے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے ملک کے ساتھ ہی جن دُوسرے ممالک میں تیل نکالنا شروع کیا گیا تھا ان کو پُرانے حساب سے معاوضے کی صورت میں معمولی رقم دینا ان کے ساتھ کھُلی بے انصافی اور زیادتی تھی۔ کیونکہ یہ بڑی بڑی کمپنیاں اپنے نفع میں سے چھوٹی سی رقم دے کر ہماری خداداد دولت کو بُری طرح کھینچ رہی تھیں۔ میری رائے میں ایران میں اِن تمام جھگڑوں کے ختم ہو جانے کا سبب یہ تھا کہ سعودی عرب کی حکومت سے انہی دنوں عربین امریکن آئل کمپنی (آرامکو) نے تیل نکالنے کا معاہدہ کیا۔ اب تک جتنے بھی معاہدے مشرقِ وسطیٰ کی حکومتوں سے کئے گئے تھے ان میں یہ معاہدہ سب سے بہتر اور معقول تھا۔ چنانچہ ایرانی صنعت کو قومی ملکیت قرار دینے سے ایک سال قبل یعنی ۱۹۵۰ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کی رُو سے یہ طے پایا کہ تیل کے نفع کی رقم میں کمپنی اور حکومتِ ایران برابر کے شریک ہوں گے۔

اس کتاب کی پانچویں فصل میں تفصیل سے یہ ذکر آ چکا ہے کہ کس سفاکی اور بزدلی سے رزم آرا کو جو اس وقت ایران کا وزیر اعظم تھا مسجد شاہ (تہران) میں ایک عالم دین کی فاتحہ خوانی کے موقع پر قتل کر دیا گیا تھا اس کی موت سے چند روز قبل کمپنی کے انگریز افسران کی طرف سے تیل کے نفع کی رقم کو نصف نصف تقسیم کرنے کی پیشکش کی گئی تھی۔ رزم آرا کے ایک صلاح کار نے یہ صلاح دی تھی کہ عوام میں کشیدگی کو کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پیشکش کو پارلیمنٹ کے سامنے رکھا جائے۔ اس پر رزم آرا نے جواب دیا کہ لوگوں کا جوش و خروش ذرا ٹھنڈا ہو جائے اس کے بعد وہ یہ پیشکش پارلیمنٹ کے

سامنے لائے گا۔ ممکن ہے کہ اس کے قتل کا سبب یہی واقعہ ہو۔

واقعات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن برطانوی افسروں کی پیش کش بہت دیر میں ملی۔ کیونکہ اس وقت تک ایرانیوں کا جذبۂ قوم پرستی پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور اکثریت اس حق میں تھی کہ تیل کی صنعت کو جلد از جلد قومی ملکیت قرار دے دیا جائے۔

اگر تیل کی صنعت، قومی ملکیت قرار دینے کے بعد صحیح سیاستدانوں کے ہاتھ میں آجاتی تو یقیناً ہماری سالانہ آمدنی تیل کی مال گذاری سے بڑھتی۔ جو ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہوتی کیونکہ ہمیں اس وقت اندرونی ترقی و توسیع کے لئے روپے کی فوری ضرورت تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حالات نے ہماری توقعات کے خلاف رُخ بدلا اور یہ بات بالکل ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ میرے والد کئی مرتبہ آبادان کے کارخانوں کا معائنہ کر چکے تھے اور میں خود بھی کئی بار وہاں جا چکا ہوں لیکن مصدق، جس تیل کی صنعت کے متعلق چیختا پھرتا تھا اس کو دیکھنے کے لئے ایک بار بھی وہاں نہیں گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مصدق کے زمانے میں تیل کے منابع کس طرح استعمال کئے جاتے تھے؟ مصدق کے برسرِ اقتدار آنے سے بہت پہلے ۱۹۴۹ء میں ایک قانون بنایا گیا تھا جس کی رُو سے منصوبہ بندی کا محکمہ قائم ہوا اور اسی محکمے کے تحت حکومت کے سرمائے سے ایران آئل کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا مقصد تیل کے ذخیرے دریافت کرنا اور تیل کی صنعت کو فروغ دینا تھا۔ جب ہم نے ۱۹۵۱ء میں تیل کو قومی صنعت قرار دیا تو نیشنل ایرانین آئل کمپنی بھی قائم کی اور ایران آئل کمپنی ۱۹۵۴ء میں اس نئی کمپنی (نیشنل ایرانین آئل کمپنی) میں مدغم کر دی گئی۔

۱۹۵۱ء میں جس وقت مصدق نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت نیشنل ایرانین آئل کمپنی اور ایران آئل کمپنی دونوں ہی چل رہی تھیں۔ اس وقت آٹھ تیل کے ذخیرے، دو تیل صاف کرنے کے کارخانے، دو پائپ لائنیں ملک سے باہر تیل بھیجنے کے لئے دو گودام اور ملک میں جگہ جگہ تیل پہنچانے کے عمدہ انتظامات، تیل دریافت کرنے کا سامان اور پچاس ہزار ملازمین مصروفِ کار تھے۔ جتنے دنوں تک تیل کا بحران رہا نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے باوجود تمام رکاوٹوں اور پریشانیوں کے تیل کے ذخیروں، کارخانوں اور اس کی مختلف شاخوں میں کام کو بڑی خوش اسلوبی سے جاری رکھا اور کسی بھی ایرانی کاریگر یا عملے کے فرد کو کام سے الگ نہیں کیا۔ ملک کی اندرونی ضرورت کے لئے جس قدر تیل کی مانگ تھی اس کمپنی نے پوری کی اور خاص طور پر ان دنوں جبکہ مصدق کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ملک میں غیر ملکی زرِ مبادلہ بہت کم مقدار میں رہ گیا تھا۔ ہماری اقتصادی پریشانی کمپنی کو اس بات کے لئے مجبور کر رہی تھی کہ جس قدر ممکن ہو سکے اپنے اخراجات کو کم کرے لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود کمپنی پورے ملک میں تیل پہنچانے کے ذرائع کو ترقی دے رہی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، حالات بڑے مایوس کُن تھے۔ تصور کیجئے کہ ایک بہت بڑا کارخانہ جو ساری دُنیا کو تیل تقسیم کرتا ہو گر کر اس حالت پر آجائے کہ صرف ایران جیسے کم ترقی یافتہ ملک کی اندرونی ضروریات

کو مہیا کر سکے۔ دُنیا کے تیل صاف کرنے کے سب سے بڑے کارخانے کو اپنے ذہن میں لائیے جواب بالکل بیکار پڑا تھا۔ یہ سوچ کر ہماری پریشانی کا اندازہ لگائیے کہ تنگدستی کے باعث ہم کو تیل کے ذخیرے تلاش کرنے کے اخراجات کو جن پر ہماری آیندہ کی خوشحالی کا دارومدار تھا، کم کرنا پڑا۔

میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ مصدق کے زوال کے بعد ہم نے اپنے نقصانات کی تلافی کرنا شروع کی ۱۹۵۲ء میں تیل کی پیداوار دس لاکھ ٹن سے بھی کم رہ گئی تھی (یہ سارا تیل ملک کی اندرونی ضروریات کو پورا کرنے کے کام میں لایا جایا تھا) ۱۹۵۳ء میں یہ پیداوار چودہ لاکھ ٹن ہو گئی۔ ۱۹۵۴ء میں تیس لاکھ ٹن، ۱۹۵۵ء میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ٹن، ۱۹۵۶ء میں دو کروڑ ستر لاکھ ٹن تیل نکالا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں تو یہ پیداوار تین کروڑ ساٹھ لاکھ ٹن تک بڑھا دی گئی گویا تیل کو قومی ملکیت قرار دینے سے پہلے یعنی ۱۹۵۰ء کے ریکارڈ کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد پیداوار مزید بڑھی اور ۱۹۵۸ء میں چار کروڑ دس لاکھ ٹن ۱۹۵۹ء میں ساڑھے چار کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔

دوسرے الفاظ میں ۱۹۵۹ء کی پیداوار ۱۹۵۲ء کے مقابلے میں پینتالیس گنا زیادہ تھی۔ اور امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۶۰ء میں یہ پیداوار لگ بھگ پانچ کروڑ ٹن تک پہنچ جائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل کی آمدنی سے ہمیں جو معاوضہ ملتا ہے اس کی شرح ٹیکس اور مال گذاری وغیرہ ادا کرنے کے بعد پچاس فی صدی ہے۔ جو پچھلے سالوں کی آمدنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

اسی کے ساتھ ایک لاکھ مربع میل کے اس علاقے کو چھوڑ کر جس میں سے برٹش کمپنی کو تیل نکالنے کے اختیارات دیئے گئے تھے ہم نے باقی حصے میں سے خود ہی تیل نکالنے کے اقدامات کئے ہیں۔ اگرچہ یہ حصہ رقبے کے اعتبار سے چھوٹا ہے لیکن تیل کے ذخیروں سے مالا مال ہے۔ ۱۹۵۶ء کے وسط میں سرکاری ایران آئل کمپنی نے تیل کی تلاش شروع کرنے کی غرض سے شہر مقدس یعنی قم کے نزدیک ایک کنواں کھودنا شروع کیا۔ مصدق کے بحرانی دور کے خاتمے کے بعد اس کنویں کی کھدائی پہلے سے زیادہ تیز کر دی گئی۔ آخر کار ۱۹۵۶ء کے آخر میں کنواں نمبر ۵ سے زمین کی سطح سے تین سو فٹ کی بلندی تک تیل فوارے کی شکل میں پھوٹ نکلا اور بیاسی دن تک تیل اسی رفتار سے نکلتا رہا کہ تقریباً ایک لاکھ پیپے روزانہ بھرے گئے۔ اس سے پہلے کبھی کسی ایک کنویں سے اتنا تیل نہیں نکلا تھا۔

یہ دن ہمارے لئے واقعی بڑے جوش و خروش سے کام کرنے کے تھے کیونکہ صحرا کے سینے میں تیل کا دریا بہہ نکلا تھا جو دیکھتے دیکھتے ایک اچھی خاصی بڑی جھیل کی شکل اختیار کر گیا۔ جھیل کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت ہوا چلتی تھی تو اس میں لہریں اٹھتی تھیں اور سورج کی روشنی میں اس کی چمکتی ہوئی سطح سے دیکھنے والے کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔

فوارے کی طرح اُبلتے ہوئے تیل کے اس سوتے کو قابو میں لانے کے لئے میزن کنسلے نامی شخص کو فوراً ایران بلایا

گیا۔ یہ شخص تیل کے کنوئیں کی آگ بجھانے کے لئے ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ چنانچہ وہ فوراً ہوائی جہاز کے ذریعے ٹکساس سے ایران آیا اور اپنے باہمت ساتھیوں کی مدد سے تیل کے کنوئیں کو قابو میں لانے کے اقدامات شروع کر دیئے۔ جس وقت یہ پوری ٹیم تیل کو قابو میں لانے کے انتظامات کر رہی تھی تو ہر ایک کو یہ خدشہ لگا ہوا تھا کہ گیس زمین کو پھاڑ کر کسی وقت بھی باہر نکل سکتی ہے اور ایسی صورت میں تمام کام کرنے والوں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد زمین کے دھنس جانے کی وجہ سے اس کنوئیں کا اُبال بالکل اُس کنوئیں کی طرح جو ڈارسی نے تیار کیا تھا آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا گویا ایک غراتا ہوا شیر دبک کر بھیڑ کے بچے کی طرح بے زبان ہو کر رہ گیا۔ ہم نے اس تیل کو جو ایک بڑی جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا ہر شخص کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کر دیا اور یہ جھیل آہستہ آہستہ بالکل خالی ہو گئی۔

تمام تیل کے ماہرین اس بات پر متفق تھے کہ قم کے میدان تیل کی دولت سے مالا مال ہیں چنانچہ کنوئں کی کھدائی کا کام برابر جاری رہا۔ ۱۹۵۸ء کے آخر تک کئی کنوئیں کھودے گئے جنکی مجموعی گہرائی اٹھارہ میل سے زیادہ تھی۔ قم سے سینتیس میل کے فاصلے پر جنوب مشرق کی جانب سراجہ نامی ایک مقام ہے جہاں زمین کے نیچے گیس کے بہت سے ذخیرے ہیں گیس کی تلاش کے لئے یہاں بڑے وسیع پیمانے پر کنوئیں کھودنے کا کام شروع کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء کے شروع میں یہاں عمدہ قسم کا تیل دریافت ہوا۔ اسی سال ایران آئل کمپنی نے پورے ملک کا جیوفزکس نقشہ تیار کیا جس سے ہماری تیل کی صنعت میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

میری ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ پبلک اور پرائیویٹ کمپنیوں کو ایک ساتھ ہی آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں ہم نے ایک بل پاس کیا جس کی رُو سے ہم نے دوسری اور سہولتوں کے ساتھ اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی غیر ملکی کمپنیوں کے تعاون سے ہمارے تیل کے ذرائع کو بہتر بنانے میں ہماری مدد کرے۔ ۱۹۵۴ء میں تیل کی مرکزی کمپنی [1] سے جو ہمارا عہد و پیمان ہوا تھا اس کی حیثیت معاہدے کی سی تھی لیکن نئے قانون کے مطابق نیشنل ایرانین آئل کمپنی کو براہِ راست یہ حق حاصل تھا کہ غیر ملکی کمپنیوں سے براہ راست تجارتی معاملات کرے بشرطیکہ پارلیمنٹ بھی اس کی اجازت دیدے۔

اس قانون کے پاس ہونے کے فوراً بعد نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے بین الاقوامی سطح پر تیل کی کمپنیوں کو عام دعوت دی کہ ہمارے ملک کی حدود میں تیل تلاش کریں اور جہاں کہیں اتنا تیل نکلے جس سے تجارتی نقطۂ نظر سے فائدہ ہو، اونچی سے اونچی بولی پر ٹھیکہ کر تیل نکالنے کا کام شروع کریں۔ ہمیں امید تھی کہ دُنیا کی تیل نکالنے والی کمپنیوں میں ہماری کمپنی کی شرائط پڑھ کر ضرور ہلچل مچ جائے گی اور ہوا بھی ایسا ہی۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تیل نکالنے اور تیل کے ذخیروں کی ترقی و توسیع کے کاموں میں آیندہ ہم نئے طریقے استعمال کریں گے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس رویئے کو بدلنا تھا جس کے تحت اب سے پہلے تیل نکالنے کے اختیارات دیئے جاتے

1. CONSORTIUM

تھے۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم نے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دیا تھا اس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ آیندہ جو بھی غیر ملکی جماعت ہمارے ملک میں اس سیاہ سونے کی تلاش میں آئے گی اس کو یا تو ہماری حکومت کا ایجنٹ بن کر تیل نکالنا ہوگا اور یا دوسری صورت میں وہ ہماری حصّہ دار بن کر کام کرے گی۔ ایجنٹ ہونے کی شرائط ۱۹۵۴ء کے اس راضی نامے میں بیان کر دی گئی تھیں جو انگلو ایرانین آئل کمپنی کو ختم کرنے کے بعد اس کی جگہ ایک نئی مرکزی کمپنی قائم کرتے وقت تیار کی گئی تھیں اس کے کچھ عرصے بعد شرکت کے اصول وضوابط بھی اُس راضی نامے میں داخل کر دیئے گئے تھے۔

دوسری شرط یہ تھی وہ تمام غیر ملکی کمپنیاں جو ایران کے ذخیروں سے تیل نکالنا چاہیں ان کو میرے ملک اور میرے ملک کے تیل کے ذخیروں کے بارے میں پورا پورا اعتماد ہونا چاہیئے اور تیل کی تلاش و نکاس کا کام وہ اپنی ذمّہ داری پر اپنے ہی خرچ سے کریں۔ کیونکہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے ملک کے بہت سے حصّوں کے جیولوجیکل اور دوسرے زمینی انکشافات کئے ہیں اس بنا پر وہ غیر ملکیوں کو اس معاملے میں مدد اور مشورہ تو دے سکتی ہے لیکن تلاش و جستجو میں اُنہیں کچھ ملتا ہے یا نہیں اس کے لئے ان کو خود ہی سرمایہ لگانا ہوگا۔

تیسرے یہ کہ اگر تیل اتنی مقدار میں نکل آئے جو تجارتی ضرورتوں کو پورا کر سکے تو ایرانی حکومت مالی اور انتظامی معاملات میں بیرونی کمپنیوں کے ساتھ شریک رہے گی۔ ایرانی قوم پرستی کے تحت میں نے اس شرط کو خاص اہمیت دی تھی اور اب بھی اسی اصول پر کاربند ہوں کہ کسی بھی غیر ملکی جماعت یا ادارے کو اتنی زیادہ آزادی نہ دی جائے کہ وہ ہماری اس صنعت کو جس پر ہماری اقتصادی زندگی کا دارومدار ہے جس طرح اور جیسے چاہے استعمال کرے۔ میری حکومت تمام انتظامی معاملات میں اپنا عمل و دخل رکھے گی اور غیر ملکی جماعتوں اور کمپنیوں کو بھی پہلے ہی سے ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ ہمارا اور ان کا مفاد اسی میں ہے کہ دونوں طرف سے نیک نیتی اور ایمانداری سے تمام کام کئے جائیں اور اگر انہوں نے ہمارے ساتھ حسنِ نیت کا برتاؤ کیا تو ہم بھی ان کے ساتھ باہمی تعاون اور مدد کا رویّہ اختیار کریں گے۔

چہارم یہ کہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ تیل کا معاوضہ ہم موجودہ نرخوں سے زیادہ لیں گے کیونکہ تیل کی آمدنی کو نصف نصف تقسیم کر لینے میں ہمیں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا تھا اور اس سے ہمارے قوم پرستی کے جذبے کو بھی ٹھیس پہنچتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں تیل کے نرخ بڑھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اس اعلان کے فوراً بعد جب کہ ہم اونچے نرخ کے لئے تیل فروخت کرنے کے لئے منڈیاں تلاش کر رہے تھے تو کچھ با اثر لوگوں نے جن کو ہمارے تیل سے دلچسپی تھی ان شرائط کی مخالفت شروع کر دی۔ بین الاقوامی منڈی نے جو تیل کا بھاؤ مقرر کرتی ہے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم ان سوتوں کو ہی سکھا دیں گے جو تمام جھگڑوں کی جڑ ہیں اور واشنگٹن میں ہمارے خلاف باقاعدہ احتجاج شروع کر دیا گیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس وقت جو شخص ایران میں امریکہ کا سفیر تھا اس نے بھی کوشش کی اور چاہا کہ ہم نئے معاہدے کرنے سے باز رہیں۔

کچھ تیل کی کمپنیوں نے جن کو ہمارے تیل سے زیادہ دلچسپی تھی ہمارے قوم پرستی کے جذبے کے ساتھ وہی غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جو اس سے قبل اینگلو ایرانین آئل کمپنی کارہ چکا تھا۔ کچھ وقت کے لئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امریکی افسران بالا بھی ایران میں وہی غلطی کریں گے جو ہمارے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دینے سے پہلے برطانوی حکومت سے سرزد ہو چکی تھی۔ لیکن ہمارے مطالبات اصولی اور منطقی تھے اور ان کے مقابلے میں کچھ کمپنیوں نے جو متحدہ محاذ بنایا تھا اس کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکیں اور ہم کو ایسا نظر آنے لگا کہ امریکی حکومت کی وزارتِ خارجہ نے بھی اپنے رویّے میں تبدیلی کی ہے۔

اگست ۱۹۵۷ء میں نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے پہلی مرتبہ نئی شرائط کے تحت اجیپ منراریا نامی ایک اطالوی کمپنی سے معاہدہ کیا۔ دوسرا معاہدہ اپریل ۱۹۵۸ء میں پان امریکن پٹرولیم کارپوریشن سے ہوا جو اسٹنڈرڈ آئل کمپنی (انڈیانا) کی ایک بہت بڑی شاخ ہے۔ تیسرا معاہدہ سفائر پٹرولیم لمیٹڈ نامی ایک کینیڈا کی کمپنی سے ہوا۔ اطالوی اور امریکی کمپنیوں نے معاہدے کے بموجب فوراً کام شروع کر دیا لیکن کینیڈا کی کمپنی کا کام ہماری توقعات کے مطابق زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔

یہ تینوں معاہدے اصولی طور پر ایک سے ہیں اور تیل کے تلاش کے لئے جو علاقے ان کو دیئے گئے ہیں وہ زیادہ تر جنوبی ایران میں ہی ہیں ان میں خلیج فارس کا ساحلی علاقہ اور اس سے ملا ہوا سمندری حصہ بھی شامل ہے۔ ان تینوں کمپنیوں میں سے امریکی کمپنی نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ اور اس کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

جن علاقوں میں پان امریکن کمپنی نے نیشنل ایرانین آئل کمپنی کے تعاون سے کام شروع کیا ہے وہ تقریباً سب کے سب پانی میں ہیں۔ عام آدمیوں کو حیرت ہوگی کہ آخر ایک کمپنی نے تیل نکالنے کے لئے کیوں ایسے علاقے کا انتخاب کیا جس کی پوری سطح زیرِ آب ہے۔ دراصل امریکہ، وِنزولا، انڈونیشیا اور دوسرے ممالک میں کئی جگہ تیل کے ذخیرے پانی کے نیچے ہیں اور پچھلے چند سالوں میں سمندر میں تیل تلاش کرنے کی صنعت نے کافی ترقی کی ہے۔

معاہدے میں یہ شرط بھی درج ہے کہ دستخط ہونے کے بعد سے بارہ سال تک اگر اتنا تیل دریافت نہ ہو جو تجارتی ضروریات کو پورا کر سکے تو وہ علاقہ جو تیل کی تلاشی کے لئے دیا گیا ہے واپس حکومت لے لے گی۔ اور اگر اتنا تیل دریافت بھی ہو جائے جو تجارتی تقاضوں کو پورا کر سکے تو پہلے پانچ سال بعد تیل نکالنے کے رقبہ میں پچیس فیصدی کمی کر دی جائے گی اور بارہ سال گذر جانے کے بعد صرف اتنی ہی زمین کمپنی کے اختیار میں رہ جائے گی جس سے اتنا تیل نکل سکے جو تجارت کے کام آ سکے۔ اب ذرا سوچئے کہ جو شرائط اور مراعات رویٹر اور ڈارسی کو تیل نکالنے کے لئے دی گئی تھیں ان میں اور آج ٹھیکے پر دینے کی شرائط میں کتنا بڑا فرق ہے۔

معاہدے کی رُو سے تہران میں ایک مشترکہ کمپنی، ایران پان امریکن کمپنی کے نام قائم ہوگی جس میں نیشنل ایرانین آئل کمپنی اور پان امریکن برابر کی حصہ دار ہوں گی۔ یہ کمپنی جو ڈائرکٹرز کا بورڈ بنائے گی اس کے آدھے ممبر ایرانی ہوں گے اور آدھے امریکی۔ پان امریکن کمپنی کے ذمّے دو کام ہیں۔ پہلا تو یہ کہ وہ اپنے خرچ پر تیل دریافت کرے اور دوسرا یہ کہ نیشنل

ایرانین آئل کمپنی کی مدد اور تعاون سے اتنی مقدار میں تیل نکالے جس سے تجارتی مقاصد پورے ہو سکیں۔

معاہدے میں یہ بھی شرط ہے کہ دستخط ہونے کے بعد تیس دن کے اندر پان امریکن کمپنی پچیس ملین ڈالر نقد بونس کی صورت میں داخل کرے گی اور تیل دریافت کرنے کا کام شروع کر دے گی۔ بارہ سال کی مدت میں اس کو کم از کم بیاسی ملین ڈالر اپنے پاس سے تیل کی دریافت پر خرچ کرنے ہوں گے۔ اگر اس سے کم خرچ پر اتنا تیل نکل آئے جو تجارتی ضرورتوں کو پورا کر سکے تو باقی رقم وہ ایرانی حکومت کو دے گی۔

اگر بارہ سال کی مدت میں پان امریکن کمپنی اتنا تیل دریافت نہیں کر سکی جس کو تجارت کے کام میں لیا جا سکے تو اس کی بیاسی ملین ڈالر کی رقم ایرانی حکومت لے لے گی اور تیل دریافت کرنے کی شرائط میں مزید توسیع نہ کرے گی۔ اگر پان امریکن اتنا تیل دریافت کرلے جس سے تجارت کی جا سکے تو یہ باقاعدہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی کو مطلع کرے گی (یہ بات واضح طور پر معاہدے میں بیان کی گئی ہے) اور یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ اب وقت آگیا ہے کہ ایران پان امریکن کمپنی ایک مشترکہ کمپنی کی حیثیت سے اپنا کام شروع کر دے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت تیل نکالنے کا کام جاری ہو تو نفع کی رقم کس طرح تقسیم ہو گی، اس بات کی اور ایسی ہی اور بھی بہت سی اہم باتوں کی معاہدے میں صراحت کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جن لوگوں کو تیل کی صنعت سے دلچسپی ہے وہ اگر چاہیں تو ہمارے معاہدے کی نقل حاصل کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ معاہدے کی رُو سے کمپنی کے کُل نفع کی رقم کا پچھتّر فی صدی حصّہ ہم لے لیتے ہیں اور باقی پچیس فی صدی کمپنی کے پاس ہی رہتا ہے۔ اس تقسیم کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ معاہدے میں یہ درج ہے کہ پان امریکن اور نیشنل ایرانین آئل کمپنی نفع میں برابر کی شریک ہوں گی۔ یہ آدھی رقم اس شکل میں ہے جس میں سے ابھی تک ٹیکس یا مال گذاری کا روپیہ وصول نہیں کیا گیا ہے۔ چونکہ معاہدے میں یہ ذکر ہے کہ پان امریکن کمپنی کے منافع کی رقم میں سے پچاس فی صدی رقم ٹیکس کی نکل جاتی ہے اور اس طرح ہماری آمدنی پچھتّر فی صدی ہوتی ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے یہ اور اس کے علاوہ وہ معاہدہ جو ہم نے اطالوی کمپنی سے کیا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے دُنیا میں پہلی بار تیل پیدا کرنے والے اور تیل نکالنے والے ملکوں کے درمیان ۷۵ : ۲۵ کے تناسب سے کیا گیا ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض لوگ جنہیں تیل کی صنعت سے دلچسپی ہے اب تک ہمارے نئے معاہدوں اور پُرانے پچاس فی صدی نفع کے معاہدوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں وہ ہر ایک سے یہی کہتے ہیں کہ جن معاہدوں میں نفع کا تناسب پچاس فی صدی رکھا گیا ہے وہ درحقیقت پچاس فی صدی ہے نہیں اور جن سمجھوتوں میں ۷۵ اور ۲۵ فی صدی کا تناسب دکھایا گیا ہے ان میں بھی دراصل یہ تناسب نہیں ہے اور بطور مجموعی دونوں معاہدوں میں فرق بہت ہی معمولی ہے۔ اپنے دلوں میں یہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اگر تمام اعداد و شمار کی غور سے جانچ پڑتال کریں گے تو

وہ اس کی تاب نہ لا سکیں گے۔

تیل کے سودے میں دلچسپی رکھنے والے لوگ جب فرصت کے لمحات میں غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو نرخ تیل کے ہم نے ایران میں مقرر کئے ہیں ان کا اطلاق ساری دنیا میں بھی ہو گا اور بعض جگہ تو شروع ہو بھی چکا ہے۔ جو لوگ ابھی تک اُسی پچاس فی صدی نفع کے اصول کے پابند ہیں وہ ڈرتے ہیں۔ اگر متحد ہو کر اپنی شرائط نہیں منوائیں گے تو ان کو علیحدہ علیحدہ اسی مشکل اور پریشانی سے دو چار ہونا پڑے گا۔ پُرانا اصول خواہ کتنا ہی دلفریب کیوں نہ ہو لیکن اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا اور میرے ساتھ ہی اس کتاب کے پڑھنے والے بھی جلدی ہی وہ دن دیکھیں گے کہ جبکہ اس پُرانے اور فرسودہ اصول کا تیل کی دُنیا سے خاتمہ ہو چکا ہو گا۔

ابھی یہ معاہدے چونکہ نئے ہیں اس لئے بعض تیل کے بیوپاری ان کو قبول کرتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن جہاں تک ان کا تعلق میرے ملک سے ہے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ نفع کے ان سوتوں کو جن سے ہمارے ملک کو فائدہ ہوتا ہے خشک کر دیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ فائدے کے اس سرچشمے کو اس ڈھنگ پر لے آئیں جس سے ہم کو ہمیشہ ہمیشہ فیض پہنچتا رہے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ تیل کی پیداوار کے لئے ہم نے یہ شرط رکھی ہے کہ غیر ملکی کمپنیاں ہمارے تعاون سے ہی تیل نکالیں گی اور اس کا ذکر معاہدے میں بھی آیا ہے اور یہی ایک ایسا نکتہ ہے جس سے تیل کے بیوپاریوں کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔

جو لوگ ایرانین پان امریکن کارپوریشن کی طرح ہمارے ساتھ شریک ہو کر تیل کا کاروبار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ دو باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ پہلی تو یہ کہ نفع کمانے کے معاملے میں ہماری دلچسپی غیر ملکی شریک کار لوگوں سے کم نہیں اس میں شک نہیں کہ نفع کی رقم ہم کو زیادہ ملے گی لیکن اس کے لئے ہم کو کام بھی زیادہ کرنا پڑے گا تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ باہمی تعاون سے کام کرنے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ جب ہم تیل کی پیداوار میں خود شریک ہوں گے تو اس سے ہمارے حصّہ داروں کو یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ انتظامی معاملات میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو گی۔ کیونکہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی ملک میں اگر کمپنیوں کا انتظام غیر ملکیوں کے ہاتھ میں رہتا ہے تو اُس ملک کے لوگ اور حکومت کے افسر کمپنیوں سے مخالفت اور دشمنی پر اُتر آتے ہیں۔ لیکن جس ملک میں کسی بھی چیز کے ذخیرے ہوں اُسی ملک کی حکومت کے ذمّہ دار لوگ انتظامی اور دیگر معاملات میں شریک ہوں تو غیر ممالک کی کمپنیوں کو اُس حکومت کی زیادہ مدد اور حمایت حاصل رہتی ہے جو کسی بھی کام کی ترقی اور آگے بڑھنے کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کے نمائندے بھی انسان ہیں اور ان سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن امکان قوی یہی ہے کہ وہ کمپنی کے کاموں میں رُکاوٹیں پیدا کرنے کی بجائے کمپنی کے کاموں کو آگے بڑھانے اور آسانیاں پیدا کرنے میں زیادہ حصّہ لیں گے۔ اور یہ بات میں اُن تجربات اور مشاہدات کی بِنا پر کہہ رہا ہوں جو مجھے

ایران میں حاصل ہوئے ہیں۔

پان امریکن کارپوریشن سے معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد ہم نے پچیس ملین ڈالر بونس کی رقم اُس سے وصول کی۔
ایرانین پان امریکن کمپنی کے نام سے ایک ایرانی کمپنی قائم کی اور تیل نکالنے کا بھاری سامان جس کا میں آگے ذکر کروں گا امریکہ سے منگانے کا بندوبست کیا۔ پچیس لاکھ ڈالر کی رقم خرچ کر کے زلزلے کی لہریں درج کرنے والے آلات کے ذریعے اُس علاقے کی جانچ کی گئی جس کا معاہدہ پان امریکن کارپوریشن سے ہوا تھا (یہ معلوم کرنے کے لئے کہ تیل کے ذخیرے کس جگہ ہیں۔ زمین کے نیچے پانی میں ڈائنامیٹ کے دھماکوں سے لہریں پیدا کی گئیں اور ان لہروں کو بڑے حساس مائیکروفون اور دوسرے لہروں کی کیفیت درج کرنے والے آلات کے ذریعہ آواز کی لہروں اور ان کے مختلف اُتار چڑھاؤ کا اندراج کیا گیا تھا) اس علاقے کا ثقلِ زمین اور کششِ زمین کا دباؤ معلوم کرنے کے لئے سات لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی رقم خرچ کی گئی تھی (اس کام کے لئے جہازوں پر بڑے ہی نازک اور حساس آلے رکھے گئے تھے۔ یہ آلے ثقلِ زمین کی طاقت کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہلکی سے ہلکی لہر کو بھی پکڑ سکتے ہیں اور ان کو اس لئے استعمال کیا گیا تھا کہ اس علاقے کی طبقات الارضی کیفیات کا مزید مطالعہ کیا جا سکے) زمین کا جائزہ لینے کے بعد جو اعداد و شمار حاصل ہوئے تھے ان کے ذریعے تیل تلاش کرنے کیلئے جگہ کا انتخاب کیا گیا، ادھر امریکہ سے بھاری سامان آنا بھی شروع ہو گیا چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں تیل کی تلاش کیلئے زمین میں سوراخ کرنے کا کام شروع کیا گیا۔

پانی کے نیچے سے تیل نکالنے کا سامان اور آلات واقعی دیکھنے کے قابل ہیں۔ اسی سامان میں ایک چلتا پھرتا بیڑے جیسا لوہے کا چبوترہ ہے جس کی لمبائی ۲۰۰ فٹ چوڑائی ۱۰۴ فٹ اور اونچائی ۱۵ فٹ ہے۔ اس کا وزن چھ ہزار ٹن ہے۔ یہ چبوترہ آٹھ پایوں پر استوار ہے۔ ہر پائے کی لمبائی ۲۲۵ فٹ ہے جن کا توازن پانی کے دباؤ سے قائم کیا جاتا ہے۔ اس چبوترے کو خلیج فارس میں نیچے بھی لے جایا جا سکتا ہے اور اتنا بلند اُٹھایا جا سکتا ہے کہ جس وقت طوفان آئے تو بپھری ہوئی لہریں اس تک نہ پہنچ سکیں اس چبوترے پر چالیس فٹ اونچی منجنیق تیل کا کنواں بنانے کے لئے نصب کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہیلی کوپٹر اُتارنے کے لئے چھتری، جر ثقیل، پمپ اور دوسرا سامان رکھنے کی بھی اس پر جگہ ہے۔ ہیلی کوپٹر کی چھتری کے نیچے ۶۰ آدمیوں کی رہائش کے لئے ایرکنڈیشنڈ کمرے بنائے گئے ہیں۔ لوکوموٹیو ٹائپ کے تین ڈیزل انجن بجلی کی طاقت پیدا کرنے کے لئے ہیں انہی کے ساتھ بجلی کی چھوٹی موٹریں بھی ہیں۔ پانی صاف کرنے کا بھی ایک کارخانہ ہے جہاں سمندر کے پانی کو ایک ہزار گیلن فی گھنٹے کے حساب سے صاف کیا جاتا ہے۔ یہیں پر مشینوں کی مرمت کا کارخانہ اور سامان رکھنے کا گودام بھی ہے۔ اس چبوترے کو سمندر کی سطح پر چلنے والا دُنیا کا سب سے بڑا خلیج میکسیکو سے جہاں اس کو تیار کیا گیا تھا ۔۔۔۔۔۔ میل کھینچ کر خلیج فارس میں لے کر آیا۔ یہاں دن رات کنویں بنانے میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔

اس چبوترے کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا جہاز بھی رہتا ہے جس کو ہم برمے کا جہاز کہہ سکتے ہیں۔ اس پر بہت سا ضروری سامان لدا رہتا ہے جس میں بجلی پیدا کرنے کی موٹریں، برمے، برموں کے خول، کیچڑ اور مٹی جمع کرنے کے حوض، کھانے

پینے کی چیزیں اور عملے کے رہائشی کمرے شامل ہیں۔ اِس جہاز اور چبوترے پر (جن کو مصنوعی جزیرے بھی ہم کہہ سکتے ہیں) کنویں کھودنے کی منجنیقیں اور دوسرا ضروری ساز و سامان لدا رہتا ہے۔ بڑے کا جہاز صرف تیل دریافت کرنے کے لئے مخصوص ہے کیونکہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لے جایا جاسکتا ہے۔ کنویں بنانے کے لئے الگ چبوترے بنائے گئے ہیں جن کی مدد سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ان چبوتروں سے رابطہ صرف بڑے کے جہاز سے ہی نہیں بلکہ ہیلی کوپٹر اور دوسرے چھوٹے جہازوں کی مدد سے بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان چبوتروں کی مدد سے کنوئیں کھودے جائیں اور حسنِ اتفاق سے تیل بھی نکل آئے تو اس پائپ لائن کے ذریعے جو پانی میں پڑی رہتی ہے تیل خلیج فارس کے ساحل پر بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

ایک تیل کے کنویں کی تلاش کے لئے سمندر کی تہ میں سوراخ کرنے کا روزانہ خرچ تقریباً پندرہ ہزار ڈالر آتا ہے اور ایک کنواں تیار کرنے میں اگر دن رات لگاتار کام کیا جائے تو دس ماہ کا عرصہ لگتا ہے۔ اور اس طرح سے ہر کنویں پر کل قم چالیس لاکھ پچاس ہزار ڈالر خرچ ہوتی ہے۔ ہماری طرح امریکی کمپنی بھی بخوبی اس بات کو سمجھتی ہے کہ زمین میں تیل کی تلاش کے لئے سوراخ کرنے کا کام ہوسکتا ہے کہ کئی سالوں تک جاری رہے اور کوئی فائدہ نظر نہ آئے۔ لیکن ساری دُنیا میں تیل کے بیوپاری اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ تیل کا کاروبار بالکل جوئے کی طرح ہے جس میں روپیہ ڈوب بھی سکتا ہے اور آدمی مالامال بھی ہوسکتا ہے جس کسی کو تیل کی تلاش ہو وہ ان لوگوں کی مثال اپنے سامنے رکھے جو شروع میں تیل کی تلاش میں نکلے تھے اور سالوں کی محنت اور مایوسیوں کے بعد آخر کار ۱۹۰۸ء میں پہلی بار ان کو کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ ہم بھی ان کی طرح ہمیشہ جستجو اور تلاش جاری رکھتے ہیں۔

اگر ایک طرف ان علاقوں میں جہاں سے اب تک تیل نہیں نکالا گیا ہے تیل کی صنعت قائم کر رہے ہیں تو دوسری طرف ہم آبادان کے تیل کے کارخانے کو بھی جو تیل کی صنعت کے اعتبار سے ساری دُنیا میں اپنی نظیر آپ ہے بڑی تیزی سے توسیع دے رہے ہیں۔ شہر آبادان کی اپنی خصوصیات ہیں۔ یہ نہ صرف ایران کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے بلکہ دُنیا میں تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں اس سے بڑا کوئی دوسرا کارخانہ نہیں ہے۔ یہاں کی پوری فضا سب سے الگ ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے دوسری جگہ کہیں بھی نہ ملے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ غیر ملکوں سے سیاح ہماری شاندار تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ کرنے کے لئے ایران آئیں اور آبادان کا چکر نہ لگائیں کیونکہ یہاں آئے بغیر ان کا مطالعہ ادھورا ہی رہے گا۔ جو لوگ تہران سے آبادان جانا چاہیں وہ آرام دہ ایرکنڈیشنڈ ریل یا ہوائی جہاز سے جاسکتے ہیں۔ آبادان میں ایسے تیز رفتار ذرائع کا انتظام بھی ہے جن کے ذریعے کوئی بھی سیاح خوزستان کے اُن ترقیاتی منصوبوں کو دیکھ سکتا ہے جو وہاں چل رہے ہیں اور جن کا ذکر اس کتاب کی ساتویں فصل میں آچکا ہے۔ وہ وطن دوست ایرانی اور غیر ملکی جن کو ہمارے ملک کی ترقی سے دلچسپی ہے اگر خوزستان کا سفر کریں تو ان کو بہت ہی دلچسپ اور مفید معلومات حاصل ہوں گی۔

آبادان صنعتی پیداوار کا بہت بڑا مرکز ہے۔ پورے ماحول کو دیکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ گویا مفید اور سود بخش کام

یہاں آبلے پڑ رہے ہیں۔ یہ جگہ شہر سازی کی عمدہ مثال ہے۔ تیل صاف کرنے کا کارخانہ شہر کے مرکز میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف کارون دریا ہے جہاں ہر وقت کاروبار کی وجہ سے بھیڑ لگی رہتی ہے دوسری طرف رہائشی مکانات کی قطاریں ہیں جو دُور سے دیکھنے میں بڑی بھلی لگتی ہیں۔ ہم اس شہر کو ایک بین الاقوامی شہر کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے تعلقات ساری دُنیا سے ہی ہیں۔ یہاں پر ساری دُنیا کے جہاز لنگر انداز نظر آتے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں جس وقت دُور دراز کے علاقوں میں لے جانے کے لئے ان میں تیل بھرا جاتا ہے تو ملاح اور جہاز کا تمام عملہ اس شہر میں آرام کرتا ہے۔ اس شہر کی خوبصورت سڑکوں پر دفتروں کے منتظمین، تکنیکی ماہرین اور دوسرے کام کرنے والے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھومتے نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ یہیں پر ایرانی، انگریز، امریکی، فرانسیسی، ڈچ اور دوسری تمام اقوام کی لڑکیاں جو دفاتر میں کام کرتی ہیں جگہ جگہ دکھائی دیں گی۔ ہمیں اپنے اس فیصلے میں کہ ہر شعبے میں غیر ملکیوں کی بجائے ایرانیوں کو ہی ترجیح دی جائے بڑی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس وقت تیل صاف کرنے کے کارخانے میں ملازمین کی کُل تعداد پچیس ہزار ہے جن میں صرف تین سو غیر ملکی رہ گئے ہیں لیکن اِن کی موجودگی اور ان کے رشتے داروں کی وجہ سے اس شہر میں بین الاقوامی رنگا رنگی پیدا ہو گئی ہے۔

سردی کے دنوں میں یہاں کا موسم بڑا خوشگوار رہتا ہے، جو فٹ بال، رگبی، والی بال، گولف، ٹینس، گھوڑ سواری، کشتی رانی اور ہوائی پرواز جیسے کھیلوں کے لئے نہایت ہی مناسب ہے۔ گرمیوں میں جب موسم بہت زیادہ گرم ہو جاتا ہے تو لوگ ایرکنڈیشنڈ کلبوں اور تھیئٹروں میں وقت گذارتے ہیں۔ کبھی کبھی میں اس موضوع پر سوچنے لگتا ہوں کہ کس طرح آبادان کی سخت گرمی جُداگانہ اقوام میں وحدت اور یکجہتی کے جذبے کو بیدار کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سال سے سال تک دن رات یہاں پوری رفتار سے کام جاری رہتا ہے۔ دفاتر کے منتظمین اور تکنیکی ماہرین بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ آبادان کا ماحول لوگوں کو کام کرنے کے لئے اُبھارتا ہے چنانچہ ایک دانش مند کا کہنا ہے کہ جو شخص یہاں کی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوگا وہ دُنیا کے کسی بھی گوشے میں کام کر سکتا ہے۔

آبادان میں جتنے بھی کام سرانجام پاتے ہیں وہ سب ہی بڑے اور اہم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں دس ایسے بڑے بڑے پلانٹ ہیں جن میں خام تیل تقطیر کے عمل سے صاف کیا جاتا ہے۔ دس پلانٹ سفید تیل تیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چالیس سے زیادہ اور بھی پلانٹ ہیں جو عمدہ قسم کا طاقتور پٹرول فراہم کرتے ہیں۔ کارخانے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اس کے چلانے کے لئے ساٹھ ملین مکعب فٹ گیس روزانہ ایندھن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں کا بجلی کی طاقت پیدا کرنے والا اسٹیشن مشرقِ وسطیٰ کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے۔ اور اس کے دو برمے جو تمام کاموں کے لئے پانی مہیا کرتے ہیں، اس قدر بڑے ہیں کہ آج تک ان جیسے اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔

یہاں سے تیل اتنی بڑی مقدار میں نکلتا ہے گویا پٹرول کی نہر جاری ہو۔ یہ تیل مختلف قسم کا ہوتا ہے جن میں سے اہم اقسام یہ ہیں۔ ہوائی جہاز میں کام آنے والا تیل، موٹر پٹرول، گیس آئل، روڈ ڈیزل آئل، پیرافین، فیول آئل، لبریکیشن آئل اور تارکول۔ آبادان کے کارخانوں میں وہ سبھی کیمیاوی سامان تیار ہوتا ہے جو تیل کی پیداوار میں کام آتا ہے۔ اس کارخانے کے پاس سامان اور لوگوں کو لانے اور لے جانے کے لئے دو ہزار تین سو کاریں، لاریاں اور بسیں، تیس ڈیزل انجن، ایک ہزار ٹرک، اٹھائیس سامان کھینچنے والی کشتیاں، چھپن بڑی کشتیاں اور بیالیس موٹر لانچ ہیں اس کے علاوہ ہوائی جہازوں اور سمندروں میں پانی کے جہازوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے یہاں دس آٹومیٹک اور پندرہ معمولی ٹیلیفون ایکسچینج بھی ہیں۔

ایک سو ساٹھ میل لمبی بڑی پائپ لائن تیل کے ذخیروں سے کارخانے تک پڑی ہوئی ہے اس پائپ لائن کو نہ صرف مسجد سلیمان کے اس کنویں سے جوڑا گیا ہے جو سب سے پہلے بنایا گیا تھا اور جس میں سے اب بھی تیل نکلتا ہے بلکہ دوسرے کنوؤں سے بھی ملا دیا گیا ہے۔ ہمارا آغا جاری نامی تیل کا ذخیرہ دُنیا میں سب سے زیادہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ تیل کے سب ہی میدانوں میں ہر رنگ اور نسل کے لوگ نظر آئیں گے۔ ان کے رہائشی مکان، دکانیں، کھیل کے میدان اور کلب سب ہی آبادان کے مخصوص نمونے پر بنائے گئے ہیں۔

آبادان کے تیل کی کچھ مقدار تو ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے روک لی جاتی ہے باقی غیر ممالک میں بھیج دیا جاتا ہے جس سے ہمیں غیر ملکی زرِ مبادلہ کثیر مقدار میں ملتا ہے اور اس کو ہم اپنے ترقیاتی منصوبوں میں لگاتے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں سات سو باسٹھ سے زائد تیل بردار جہازوں میں تیل آبادان کی بندرگاہ سے لادا گیا تھا اور بارہ سو پچاس سے زیادہ جہازوں میں تیل معشور بندرگاہ سے بھرا گیا تھا۔ (یہ بندرگاہ آبادان سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے اور بڑی تیزی سے یہاں ترقیاتی کام ہو رہے ہیں) آبادان کی بندرگاہ سے زیادہ تر صاف کیا ہوا تیل اور بندرگاہ معشور سے خام تیل باہر بھیجا جاتا ہے۔ آبادان سے ایک سو پچاس میل کے فاصلے پر خلیج فارس میں جزیرہ خارک ہے۔ یہاں بھی بڑی چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔ یہاں پر تعمیری کام جلدی ہی ختم ہونے والا ہے۔ جب یہاں کی بندرگاہ بن کر تیار ہو جائے گی تو بڑے سے بڑا تیل بردار جہاز جس میں ایک لاکھ ٹن تیل آسانی سے آسکتا ہے لنگر انداز ہو کر تیل لے جاسکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ایرانی تیل کی اس لمبی چوڑی اور شاندار صنعت کے مالک کون لوگ ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے مالک خود ایرانی ہی ہیں۔ جب میں اور میرے ملک کے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس صنعت کے وہ بغیر شرکتِ غیرے مالک ہیں تو بڑا اطمینان ہوتا ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں کی طرح اب اس پر جمود طاری نہیں ہے بلکہ اِس تیزی سے ترقی ہو رہی ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی تو ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آبادان کے تیل صاف کرنے کے کارخانے میں، اُن گودیوں میں جہاں تیل بھرنے کے لئے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں، تیل کے ذخیروں کے میدانوں میں اور ان تمام جگہوں پر جہاں سے تیل پورے ملک میں تقسیم کیا جاتا

ہے یہ عبارت دو زبانوں میں لکھوا دوں "تیل ایرانیوں کا ہے" تاکہ یہ عبارت میرے ملک کے ان ہزاروں جوانوں، بوڑھوں اور غیر ملکیوں کے دل میں بیٹھ جائے جو اس صنعت کی ترقی کے لئے دن رات یہاں کام کرتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر بھی یہ بات بہت ہی ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت سے باخبر رہیں کہ ہم اس بڑی صنعت کے خود مالک ہیں اور اس میں کسی غیر کی شرکت نہیں ہے۔

ہمارے لئے یہ سوچنا ہی کافی نہیں کہ ہم بہت بڑی تیل کی صنعت کے مالک ہیں بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ہمیں چاہیئے کہ نہایت خوش اسلوبی اور موثر طریقے پر اس کی نگرانی کریں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تیل کی پیداوار اور اس سے بننے والی دوسری اشیاء تیار کرنے کا کام بہت ہی پیچیدہ اور دشوار ہے جس کے لئے بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قابلیت کے ماہرین اور منتظمین کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب چونکہ ہم نے تیل کو قومی ملکیت قرار دے دیا ہے اس لئے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس کی دیکھ بھال اور تیل نکالنے کے کام بھی آہستہ آہستہ ایرانیوں کے ہی ہاتھوں میں سونپ دیں۔ اس مقصد کی برآری کے لئے ہم نے دو طریقوں پر غور کیا ہے۔

پہلا تو یہ کہ ایرانی عملے کو ہر جگہ ترجیح دی جائے۔ اور اسی لئے ہم نے تیل کی مرکزی کمپنی کے اعلیٰ افسران پر یہ دباؤ ڈالا ہے کہ وہ اپنے غیر ملکی عملے کی تعداد کم کرے۔ اگرچہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے کچھ غیر ملکی مشیر اور تکنیکی ماہرین کو ملازم رکھا ہے اور تیل دریافت کرنے اور نکالنے کی جو نئی شرائط مقرر کی گئی ہیں ان کے تحت بھی کچھ غیر ملکی ایران آئے ہیں لیکن بطور مجموعی ہمارے تمام کارخانوں میں باہر سے آنے والوں کی تعداد چند سو تک ہی محدود رہ گئی ہے جو اب تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ تیل کی صنعت کا سارا انتظام اور دیکھ بھال کا کام ایرانیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن اس معاملے میں ہمیں چاہیئے ذرا محتاط رہیں اور ایسا کوئی کام جو ہم سے نہ ہو سکے اس کو ہاتھ لگانے سے گریز کریں۔ سب سے پہلے ہم سیدھے سادے اور آسان کام شروع کریں۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ پیچیدہ اور مشکل مسائل کو ہم وطنوں کے ہاتھوں میں سونپیں۔ آبادان کے کارخانے کو چلانے کے لئے جن مختلف شعبوں میں بہت سے کاموں کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہے اس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ ہماری نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے سب ہی اجتماعی کاموں کو آہستہ آہستہ مرکزی کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اب تیل کے کارخانے کے عملے کی صحت اور تندرستی کی دیکھ بھال یہی کرتی ہے۔ اسی طرح عملے کے لئے نئے مکان بنانے اور پہلے جو کئی ہزار مکان بن چکے ہیں ان کی دیکھ بھال اور مرمت کے کام بھی یہی کمپنی کرتی ہے۔ سڑکوں کی مرمت اور ان کو چوڑا کرنا یا دوسری عوام کے استعمال کی چیزوں کی نگرانی بھی اسی کمپنی کا کام ہے۔ آبادان کے پورے کارخانے پر کمپنی کے لوگوں کا ہی پہرہ رہتا ہے۔ آبادان ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور دوسرے تربیتی ادارے چلانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے وسط تک آبادان کی مرکزی کمپنی کا ایک تہائی عملہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی کے تحت آ چکا تھا۔ یہ اہم کام دونوں کمپنیوں کے باہمی تعاون اور حسن نیت سے طے ہوا۔ آئل تیل کے میدانوں میں بھی جہاں سے آبادان کے کارخانے کے لئے تیل بھیجا جاتا ہے یہی اصول اپنایا گیا ہے اور یہاں بھی نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے تمام اجتماعی خدمات کے کاموں

کو اپنے اختیار میں لے لیا ہے۔

لیکن ہمارے سامنے ابھی جو منصوبے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ اس سے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ بحرِ روم تک پائپ لائن ڈالنے کے لئے ابتدائی مراحل پورے ہو چکے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ تیل بردار جہاز ہمارے اپنے ہوں اور ان پر ہمارا ہی جھنڈا لہرائے۔ آیندہ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ غیر ممالک میں اپنی ہی ایجنسیاں قائم کریں تاکہ ان کے ذریعے نہ صرف زیادہ نفع حاصل کریں بلکہ اپنے ملک کی قدیم رسوم و روایات سے بھی لوگوں کو آشنا کریں۔ اس وقت پوری دُنیا میں ایسے ممالک کی تعداد کوڑیوں تک پہنچتی ہے جہاں ایران کا تیل عام زندگی کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ دُنیا میں ہمارا تیل کسی کمپنی کے نام سے مشہور نہ ہو بلکہ ہمارے ملک کے نام سے پہچانا جائے۔

موجودہ دور کی تیل کی صنعت کی بنیاد سائنسی تحقیقات و ترقیات پر استوار ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی نے اپنا تحقیقی ادارہ قائم کر لیا ہے۔ جلدی ہی ہمارے ملک میں پٹرولیم انجینیئرنگ اور تیل کے کنویں بنانے کی تجربہ گاہ بھی قائم ہو جائے گی۔ ان شعبوں کی عمارتوں کا سنگِ بنیاد ملکہ فرح نے ۱۹۶۸ء کے اوائل میں رکھا تھا۔ امید ہے کہ جیولوجی، جیو فزکس، جیو کیمیکل، پٹرو فزیکس اور پروڈکشن انجینیئرنگ کی تجربہ گاہوں کا اضافہ جلدی ہی ہو جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے تیل کی پیداوار کا مرکز کسی طرح بھی دوسرے تمام ترقی یافتہ ممالک کے تیل کے کارخانوں سے پیچھے نہ رہے۔ یہاں میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ یہ تمام تحقیقی مراکز تہران کے نزدیک شہر رے میں میرے والد کے مقبرے کے بہت ہی قریب قائم کئے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو وہ پہلے شخص ہوتے جو ان تمام ترقیات کو دیکھ کر خوش ہوتے اور اُنکی تعریف کئے بغیر نہ رہتے۔

جو باتیں اوپر بتائی گئی ہیں وہ میرے اس یقین اور اعتماد کی شاہد ہیں کہ ہم ایرانی تیل نکالنے کے نئے طریقوں کو استعمال میں لاکر کثیر مقدار میں تیل کی پیداوار بڑھا بھی سکتے ہیں اور دُنیا کی منڈیوں میں اس کو فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ مستقبل بعید میں دُنیا کو تیل کی کس قدر ضرورت رہے گی؟

آج پوری انسانی برادری میں مشینوں کو چلانے کے کئے دوسرے طاقت کے ذرائع دریافت کرنے کا بڑا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ کو لے لیجئے۔ آج یہ ملک ایٹمی طاقت کے میدان میں دوسرے تمام ممالک سے آگے بڑھ گیا ہے۔ برطانیہ کی طرح دوسرے ممالک نے بھی ایٹمی طاقت کے مراکز کھولنے شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ آج امریکہ کی ایٹمی طاقت سے چلنے والی آبدوز کشتیاں سات سمندروں میں گھومتی نظر آتی ہیں۔ رُوسیوں نے ایٹمی طاقت کی مدد سے برف شکن جہاز بنائے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں امریکہ نے ایٹمی طاقت سے چلنے والا پہلا تجارتی جہاز بھی تیار کیا ہے جو ساڑھے تین سال تک پانی میں چلتا رہے گا اور اس عرصے میں اس کو کسی قسم کے ایندھن کی ضرورت نہ ہوگی۔ تیل کی قدر و قیمت کو گرانے کے لئے جرمنی، انگلستان اور دوسرے ممالک اس فکر میں ہیں کہ ایٹمی طاقت سے چلنے والے تیل بردار جہاز کام میں لائے جائیں۔ مستقبل بعید میں وہ دن بھی آئے گا جب کہ سورج کی طاقت اور تیل کے درمیان تجارتی رسّہ کشی شروع ہو جائے گی۔ تیل کی تقسیم

کے سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہئیے کہ فرانسیسیوں نے افریقہ کی صحراؤں میں تیل کے ذخیرے دریافت کرکے بڑے بڑے کارخانے قائم کرلئے ہیں لیبیا میں بھی تیل کے کنوئیں دریافت ہوئے ہیں۔

اس وقتی طور پر تیل کی زیادتی سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہئیے کیونکہ میری رائے میں تیل اور قدرتی گیس کے لئے کھپت کے پہلے سے کہیں زیادہ اچھے مواقع ہیں کیونکہ ایک طرف تو ایندھن یا مشینوں کو حرکت میں لانے والی طاقت کی مانگ اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اگر قوت و حرکت پیدا کرنے کے نئے ذرائع دریافت بھی ہو گئے تو وہ دنیا کی دن بدن بڑھتی ہوئی مانگ کو مشکل سے ہی پورا کر سکے گی۔ دوسری طرف کیمیاوی مواد کے لئے بھی تیل اور قدرتی گیس کا استعمال پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔

نامیاتی کیمیاگری کے نقطۂ نظر سے خام تیل اور قدرتی گیس اس قدر اہم اور قیمتی شئے ہے کہ اس کو ایندھن کی جگہ استعمال کرنا قابل افسوس بات ہے۔ علم کیمیا کے ماہر اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جبکہ لامحدود انسانی ضرورت کی چیزیں تیل اور گیس سے تیار ہوا کریں گی۔ چند سال پہلے تیل کے ایک بہت بڑے بیوپاری نے کہا تھا کہ پٹروکیمیکل صنعت میں تیل اتنی کم مقدار میں استعمال ہوگا کہ گویا سمندر میں سے ایک قطرہ لیا گیا ہو لیکن اس کا یہ نظریہ غلط ثابت ہوا کیونکہ اس وقت یہ صنعت اس تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ اندازہ ہے ۱۹۶۵ء تک اس سے صرف امریکہ میں ہی دس ہزار ملین ڈالر سالانہ آمدنی ہوا کرے گی۔

پٹروکیمیکل صنعت سے بہت سا خام مواد اور دیگر کام میں آنے والی اشیاء تیار کی جاتی ہیں مصنوعی ربڑ، پلاسٹک، نائلون اور ڈیکرون کے تار، کیمیاوی کھاد، کیڑے مارنے کی دوائیاں، منجمد نہ کرنے والا محلول، عمارتی سامان، نہ ٹوٹنے والے شیشے، کھانے کے برتن، رنگ و روغن اور دیگر سیکڑوں قسم کا سامان جو بازاروں میں نظر آتا ہے اسی صنعت کی دین ہے۔ ۱۹۵۹ء میں ایک سو پچاس سے زیادہ پٹروکیمیکل کارخانے ساری دنیا میں قائم کئے گئے ہیں۔ چونکہ ایران اس قسم کے خام مال کا سرچشمہ ہے اس لئے ملک کے باہر جو بھی اس صنعت میں توسیع ہوگی اس پر ہمارے ملک کے اثرات ضرور پڑیں گے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ساتویں فصل میں کہا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی جلدی ہی اس صنعت پر کام شروع ہو جائے گا چنانچہ فرانسیسی ماہرین کی مدد سے ایک پٹروکیمیکل تحقیقی ادارہ ۱۹۵۹ء میں قائم کر دیا گیا ہے۔ یہ ادارہ ایران کی پٹروکیمیکل کی صنعت کی ترقی میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوگا۔

تیل کے ماہرین نے تخمینہ لگایا ہے کہ آیندہ دس سال میں تیل کا استعمال موجودہ دور کی کھپت سے کم از کم دس گُنا زیادہ ہو جائے گا اور قدرتی گیس کا مصرف تو اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ تیل اور قدرتی گیس کی بڑھتی ہوئی مانگ ہم ایرانیوں کے لئے ایک بہت ہی اہم اور غنیمت موقع ہے اس کی مدد سے ہم نہ صرف اپنا بلکہ ساری دنیا کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اسی کے ساتھ تیل کی پیداوار اور تقسیم کے ذرائع کی دیکھ بھال اور حُسنِ انتظام کے ذریعے ہم یہ ثابت کر دیں گے کہ اس صنعت کے صحیح حقدار ہم ہیں۔

۱۳۔۔۔ایران اور امنِ عالم

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مشرقِ وسطیٰ پر کبھی کوئی ایسا دور نہیں گذرا جبکہ یہ علاقہ پُرآشوب واقعات اور حادثات سے دوچار نہ رہا ہو۔ جب کبھی یہاں امن و سکون نظر آئے تو یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ یہی سکون کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ مثال کے طور پر میں نے مئی ۱۹۶۰ء میں یورپ کا ایک مختصر سا سرکاری دورہ کیا تھا۔ دورے کے خاتمے پر جب میں نے ترکی میں قیام کیا تو میری پذیرائی کے لئے جو لوگ آئے وہ قطعی وہ نہ تھے جو میری یورپ کی جانب روانگی کے وقت میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے یورپ کے دورے کے دوران وہاں ایک فوجی انقلاب آیا تھا جس نے ترکی کو داخلی جنگ سے بچا لیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں آئے دن ایسے غیر متوقع اور خلافِ امّید واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ بہت سے لوگ جو بین الاقوامی سطح پر اس علاقے سے روابط قائم کرنا چاہتے ہیں کوئی ایک معیّن قانون اور اصول وضع نہیں کر سکتے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے تعلقات ساری دنیا سے دن بہ دن بہتر اور زیادہ مضبوط ہوتے جا رہے ہیں اور جب لوگ ان روابط کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی حیرانی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا مسئلہ اپنی جگہ بڑا ہی عجیب ہے۔ اگر اس کو ساری دنیا سے الگ کر کے دیکھا جائے تو بہت پیچیدہ ہے اور اگر پوری دنیا سے ملا کر اس کے مسائل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ وہ معمّا ہے کہ جس کا کوئی حل نہیں۔

لیکن میری رائے میں باوجود ان تمام سیاسی مسائل اور دشواریوں کے جن کا یہاں ذکر آچکا ہے مشرقِ وسطیٰ میں امن کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور صلح و آشتی کی راہیں نکل سکتی ہیں۔ لیکن سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کا امن لوگ یہاں چاہتے ہیں۔ اس سوال سے میرا مقصد محض لفظی بحث نہیں ہے کیونکہ جو لوگ آزادی پر جان دیتے ہیں وہ کبھی کسی قیمت پر امن و صلح کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ قید و بند بھی ایک قسم کا گوشۂ امن و عافیت ہی ہے۔

اور کچھ قیدی ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جن کو اگر ایک بار قید میں ڈال دیا جائے تو پھر وہ باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ اسی طرح کسی بھی مجرم کو ذہن شوئی کے ذریعے نفسیاتی علاج کر کے سکوت و سکون بخشا جا سکتا ہے۔ افراد کی طرح وہ ممالک جو کمیونسٹ طاقتوں کے تحت ہیں نہایت ہی پُرامن دکھائی دے سکتے ہیں بشرطیکہ ان کو سخت دباؤ کے ذریعے ذہنی طور پر غلام بنا دیا جائے اور بعض لوگ جو بین الاقوامی کشیدگی کم کرنے کی بات کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن قائم ہو جائے وہ اسی قسم کے امن کا تصور اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں۔

میری رائے میں انسانی برادری کا روشن فکر طبقہ صرف امن و صلح نہیں چاہتا بلکہ وہ تخلیقی اور سودمند امن و صلح کا خواہشمند ہے دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسے امن کا آرزومند ہے جس کی روشنی میں مختلف افراد اور اقوام اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کر سکیں اور ان کو حدِ کمال تک پہنچا دیں۔ میرے خیال میں اگر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور لوگ اس قسم کا امن چاہتے ہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ دو بنیادی شرائط کو پورا کریں۔ پہلی شرط ہے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی جمہوریت، جس کا ذکر اس کتاب کی آٹھویں فصل میں آ چکا ہے۔ میں یہاں محض کسی کٹر اصولی جمہوریت کا پرچار نہیں کر رہا ہوں جس میں کسی طرح کی لچک نہ ہو بلکہ میرا اصرار اس پُراثر جمہوریت پر ہے جس کا مقابلہ اُن حکمرانی کے طریقوں سے کیا جا سکے جو عوامی جمہوریت جیسے اور کبھی کئی مختلف ناموں سے مشہور ہیں اور عملی طور پر جو نتائج اس کے ظاہری ناموں سے اخذ ہوئے ہیں وہ اصلیت سے بالکل ہی متضاد ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تخریبی عناصر، جارحیت اور ظلم و تشدد کے خلاف حفاظتی اقدامات کئے جائیں۔ اگر لوگ اپنی صلاحیتوں اور استعداد کو بروئے کار لائیں اور ان کو جِلا دیں تو یہ دو شرطیں اور اسی کے ساتھ اندرونی جمہوریت بہت اہم ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے انسان کی تخلیق بھی اسی لئے کی ہو گی۔

مشرقِ وسطیٰ اور پوری دنیا میں جہاں پر یہ انسانِ فانی آباد ہے وہاں یہ تمام شرائط ہر اعتبار سے پوری نہیں ہو سکتیں لیکن جہاں تک ممکن ہو ہم کو اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیئے اور جس قدر ہم ان شرائط کے نزدیک ہوتے جائیں گے انسان کو زیادہ خوشیاں اور مسرتیں ملتی جائیں گی۔

آیئے اور میرے ساتھ گذشتہ چند سالوں کے واقعات پر نظر ڈالئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کئی یورپین اقوام اقتصادی بحران سے دوچار تھیں۔ اور وہاں کمیونزم کے پھلنے پھولنے کے لئے حالات پورے طور پر سازگار ہو چکے تھے۔ ان ہی دنوں مارشل پلان کا اجراء کیا گیا اور اس کے تحت اتنی کثیر مقدار میں غیر ملکی مدد دی گئی جو پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اس مالی امداد نے مغربی یورپ کی اقوام کو اس قابل کر دیا کہ وہ اقتصادی طور پر اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ ان میں سے بعض نے تو خود کو اس قدر اونچا اٹھا لیا اور اس قدر مال کی پیداوار کی کہ اس سے پہلے ان کے ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اگرچہ انگریزی حکومت کے ہاتھوں سے ان کی بنائی ہوئی کالونیاں بڑی تیزی سے نکلتی چلی جارہی تھیں لیکن ان
[ک]ی آمدنی اب اُن دِنوں سے کہیں زیادہ تھی جبکہ ان کی ساری دنیا میں سب سے بڑی حکومت تھی۔ باوجود اس کے کہ
[شرو]ت شروع میں فرانس میں سیاسی استحکام نہیں تھا لیکن اس نے صنعتی میدان میں حیرت انگیز ترقی کی۔ جرمنی نے اپنی
[اقت]صادی خرابی کو بڑی تیزی سے درست کیا اور ہٹلر کے جابرانہ عہد کو ختم کر کے اس جگہ ایسی مضبوط بنیادوں پر جمہوری
[حک]ومت قائم کی کہ جس کی مثال اُن کی قوم میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ غرض یہ کہ تمام مغربی یورپ کے ممالک نے اس
[حکو]مت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

یورپ کے آزاد ممالک کی ترقی کی بنیاد دراصل ان عملی اقدامات پر استوار ہوئی جو دفاعی اصلاح اور مؤثر طور
کے لئے اٹھائے گئے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں اقوامِ متحدہ کی تشکیل ہوئی اور اس کے فوراً بعد ہی سرد جنگ کی قابلِ لعنت
علامتیں سامنے آنے لگیں۔ اقوامِ متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵۱ اور ۵۲ کی رُو سے قوموں کو یہ مجاز ہے کہ کسی بھی علاقے میں
[ا]من وامان برقرار رکھنے کے لئے مجموعی دفاع کے انتظامات کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں یورپ کی بہت سی آزاد قومیں
[ا]یک دوسرے سے اور امریکہ اور کناڈا سے متحد ہو گئیں اور نارتھ[1] اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن یا ناٹو کے نام سے ایک
انجمن کی تشکیل ہوئی۔ بعد میں یونان، ترکی اور مغربی جرمنی بھی اس انجمن میں شامل ہو گئے۔ اِس وقت شمالی امریکہ سے
ایشیا تک اس انجمن کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، آئس لینڈ، ناروے، ڈنمارک (اور گرین
لینڈ) دولتِ متحدہ برطانیہ، فرانس، جرمن فیڈرل ریپبلک، نیدرلینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، پرتگال، اٹلی، یونان اور ترکی
اس انجمن کے ممبر ہیں۔

ابتدا میں ناٹو سے مراد فوجی معاہدہ لی جاتی تھی لیکن اب اس کا مطلب یہیں تک محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ
وہ اقوام جو اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے ہم خیال اور آزادی پر اپنی جان دیتی ہیں ان کے اتحاد اور میل جول کی یہ
ایک نمایاں علامت ہے۔ اس معاہدے نے یورپ کے آزاد ممالک کے شہریوں کی اخلاقی اقدار کو بڑی قوت بخشی ہے
بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی حیثیت ان کے لئے اُس ڈھال کی سی ہے جس کی پناہ میں یہ اقوام جنگ کے بعد حیرت انگیز
ترقی میں مصروف ہیں۔ اس انجمن نے باہمی مدد اور مل کر کام کرنے کی بہترین مثال دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ اور
یورپ کے اوریٹم[2] جیسے منطقے میں ترقیاتی پروگرام شروع کر کے لوگوں میں ذوق و جستجو کی لہر پیدا کر دی ہے۔

یہ کسی سے بھی پنہاں نہیں کہ کس طرح مارشل پلان نے دل کھول کر بین الاقوامی سطح پر بیمثال مدد دی ہے۔
آنے والے مورّخ اس واقعے کو ضرور اپنی تاریخ میں جگہ دیں گے۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ بالکل اسی طرح یہ مورّخ
ناٹو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ کس طرح یہ مختلف اقوام کی کامیابی کے ساتھ مدد
کرتی رہی ہے اور اسی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اس کو بین الاقوامی باہمی تعاون و تحفظ کی انجمن کا نام دوں۔ کچھ بد بین

1. NORTH ATLANTIC ORGANIZATION (NATO) 2. EURATOM

لوگ جو کمیونسٹ رویّے کو اپنائے ہوئے ہیں وہ شروع سے یہی کہتے چلے آ رہے ہیں کہ امریکی سامراجیت مارشل پلان کی باریک سی نقاب چہرے پر ڈال کر دنیا کے سامنے آئی ہے۔ ان لوگوں نے تو اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ امریکہ کا اس معاہدے میں شریک ہونا خالی از مصلحت نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اقتصادی اعتبار سے تباہ حال ممالک کو مدد دے کر ان کو اپنے دام میں لے آئے اور اس طرح یورپ پر اپنا اقتدار قائم کرے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ اس قسم کی بے سروپا باتیں کرتے ہیں وہ امریکہ کی تاریخ اور تمدّن کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں نے امریکہ کی دور اندیشی اور دلچسپی کو غلط سمجھا ہے۔ امریکیوں میں کافی حد تک یہ سمجھ بوجھ موجود ہے کہ وہ اپنا بھلا اور بُرا اچھی طرح سمجھ سکیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے ملک کی فلاح و بقا اسی میں ہے کہ وہ طاقتور اور قابلِ اعتماد دوستوں پر بھروسہ کریں۔

اگرچہ بظاہر یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے حالات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن اصولی اور بنیادی طور پر ایک دوسرے سے جُدا نہیں کہے جا سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ مغربی یورپ میں جو ممالک شامل ہیں وہ اقتصادی میدان میں کافی ترقّی یافتہ ہیں اور ان کے مقابلے میں مشرقِ وسطیٰ نے ابھی پورے طور پر اقتصادی ترقّی نہیں کی ہے اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ میں جنگ کے بعد جو از سرِ نو تعمیری کام شروع ہوئے ہیں ان کی بنیاد اُن علوم و فنون پر رکھی گئی ہے جو وہاں پہلے سے رائج تھے۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ میں تو اس کے مقابلے میں بنیاد ڈالنے کا کام بھی ابھی شروع نہیں ہوا۔ لیکن ان دونوں منطقوں کے لوگ سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی ترقّی کے بڑی شدّت سے آرزومند ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ یہاں امن برقرار رہے تاکہ اس کے سائے میں ان کے ترقیاتی منصوبے پورے ہو سکیں۔

۱۹۴۹ء میں جس وقت پریذیڈنٹ ٹرومین نے پہلی مرتبہ ایک ترقیاتی پروگرام دنیا کے سامنے پیش کیا (جو بعد میں ہر جگہ نکتۂ چہار کے نام سے مشہور ہوا) تو اس کے ذہن میں کم ترقّی یافتہ اور زیادہ ترقّی یافتہ ممالک کا فرق موجود تھا چنانچہ اس پروگرام کو بڑی خوشی اور دلگرمی سے قبول کیا گیا اور میرے جوش و خروش کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ اُس نے اور اُس کے مشیروں نے اپنے پہلے ترقیاتی منصوبے کو شروع کرنے کے لئے ایران کو ہی منتخب کیا۔ اس سے قبل ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ نے بھی ان ممالک کو جنہوں نے ترقّیاتی کام شروع ہی کئے تھے چھوٹی چھوٹی ابتدائی ٹیکنیکی مدد دینا شروع کی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں اس نے یہ امدادی پروگرام وسیع پیمانے پر شروع کر دیا جس سے میرے ملک نے بھی کافی فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۵۰ء میں انگلستان اور دوسرے دولتِ مشترکہ میں شامل ممالک نے تکنیکی مدد کے لئے بڑی کامیابی سے کولمبو پلان شروع کیا کچھ عرصے بعد اس منصوبے میں ان ممالک کو بھی شریک کر لیا گیا جو دولتِ مشترکہ کے ممبر نہیں تھے۔ اور دنیا کی تاریخ میں پہلی بار تکنیکی مدد کو بین الاقوامی سطح پر خوشگوار تعلقات کے لئے بنیادی اور اہم ذریعہ سمجھ کر استعمال کیا گیا۔

ی اہمیت کو نہیں سمجھا تھا اور چونکہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ کیمیاوی کھاد یا مٹی کا تیل خرید سکیں اس لئے گوبر کو ہی جلانے کے کام میں لاتے تھے، اگر کیمیاوی کھاد کے استعمال کے ساتھ صحیح طریقے سے فصلوں کو لوٹ پھیر کر کے بویا جائے تو زمین کو بیکار چھوڑ دینے کی ضرورت نہ رہے گی، اور اس طرح ہر ایکڑ زمین پر پانی اور اناج کی اوسطاً سالانہ پیداوار پہلے سے کہیں زیادہ ہو جائے گی، ایرانی آب و ہوا اور دوسری کیفیات کے پیش نظر جو ابتدائی تجربات کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ اگر کیمیاوی کھاد کا ٹھیک استعمال کیا جائے تو فی ایکڑ زمین پر چاول کی کاشت ہی پچاس فی صدی سے زیادہ بڑھ سکتی ہے اب ہمارے ملک میں کیمیاوی کھاد تیار ہونے لگی ہے اور قیمت اس قدر کم رکھی گئی ہے کہ چھوٹے کاشتکار بھی نقد دام دے کر خرید سکتے ہیں، اور اگر نقد روپیہ نہ ہو تو مناسب شرائط پر اپنے گاؤں کی تعاونی انجمن سے روپیہ قرض لے کر یہ کھاد حاصل کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے کسان کیمیاوی کھاد کا استعمال جلد ہی سیکھ جائیں گے اور اس کو پسند کریں گے۔

اس کے علاوہ اگر زمین کو اچھی طرح تیار کیا جائے اور اس میں عمدہ بیج ڈالا جائے تب بھی پیداوار کہیں زیادہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر پرانے قسم کے ہل کی بجائے جدید ساخت کا زمین کو ہموار کرنے والا ہل جس کو چوپائے ہی کھینچتے ہیں استعمال کیا جائے تو خام فصلیں جیسے روئی یا قندسازی کا چقندر پچیس فی صدی زیادہ حاصل ہو سکتی ہیں اگر کھیت کو ہل چلانے کے بعد بیج ڈالنے کے لئے اچھی طرح تیار کر لیا جائے تب بھی پیداوار میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ اگر کسی کھیت کو اچھی طرح تیار کر کے مشین سے بیج ڈالا جائے تو اس طریقے سے اس کھیت کی نسبت جس کو لاپروائی سے جوت کر ہاتھ سے بیج ڈالا جائے ایک تہائی بیج خرچ ہوگا، زراعت کے نئے اصولوں کے مطابق اگر بیج بویا جائے تو ہر سال تقریباً پچھتر ہزار ٹن جو اور دو لاکھ ٹن گیہوں جو صرف بیج کے طور پر استعمال ہوتا ہے بچایا جا سکتا ہے۔ جاپانی ماہرین کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر دھان کے کھیت اچھی طرح تیار کر کے جدید طریقوں سے بیج بویا جائے اور مناسب مقدار میں کھاد دی جائے تو دھان کی پیداوار دوگنی ہو سکتی ہے۔

اگر سینچائی کے لئے کھیتوں کو اچھی طرح تیار کیا جائے تو آبپاشی کے لئے اس وقت جتنا بھی پانی ہے اس کو دو طریقوں سے بچایا جا سکتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ اگر کھیت اچھی طرح تیار کیا گیا ہو تو اس میں سے پانی بخارات بن کر کم اڑتا ہے اور فصل بھی بہت عمدہ ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کم پانی سے زیادہ فصل اگائی جا سکتی ہے اور بچا ہوا پانی ان کھیتوں میں استعمال ہو سکتا ہے جو پانی کی قلت کی وجہ سے بیکار پڑے ہیں، دوسرے یہ کہ مشینوں کے ذریعے کھیت تیار کرنے میں پانی کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس طریقے سے بھی پانی بچایا جا سکتا ہے، ہمارے کسان کئی ہزار سال سے خشک زراعت کے طریقوں سے واقف ہیں۔ لیکن مشینوں کے ذریعے خشک زراعت کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ ایران کے بہت سے حصوں میں بڑی بڑی زمینوں پر مشینوں کے ذریعے خشک زراعت ان ہی اصولوں

پر ہوسکتی ہے جو عام طور پر امریکہ، آسٹریلیا اور دنیا کے دوسرے خشک علاقوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ہزاروں ایکڑ زمین ایسی ہے جس کے متعلق تھوڑے عرصے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ یہاں بغیر پانی کے کاشت ممکن ہی نہیں لیکن اب مشینوں کے ذریعے یہاں خشک زراعت ہوسکتی ہے۔

درحقیقت ہمارے کسان اب زیادہ سے زیادہ خشک اور تر کاشتکاری کے لئے مشینوں کا استعمال کر رہے ہیں، اس وقت ہمارے کھیتوں میں تقریباً پانچ ہزار ٹریکٹر چل رہے ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے ملک کے بڑے بڑے صوبوں میں جیسے آذر بائیجان، بحر خزر کے ساحلی علاقے۔ خوزستان اور تہران کے سرسبز میدانوں میں جگہ جگہ ٹریکٹر، اناج صاف کرنے کی مشینیں اور دوسرے میکانیکی اوزار نظر آئیں گے، مشرقی ممالک میں لکڑی کے ہلوں کا جو تصوّر تھا وہ اب بدلتا جا رہا ہے، اب اگر کہیں کسانوں کے ہاتھوں میں لکڑی کے ہل نظر آتے ہیں تو آنکھوں کو بڑے عجیب معلوم ہوتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ہاتھ کے بنے ہوئے اوزار اب بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن ہم بڑی تیزی سے ان کو ترک کر کے مشینوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

خودرو پودوں کے اگنے، کیڑا لگنے اور دیگر آفات کی وجہ سے ہر سال ہماری فصلیں بڑی بھاری مقدار میں تباہ ہوجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر آذر بائیجان کے صوبے کو ہی لے لیجئے یہاں کے کچھ حصّوں میں خودرو پودے اور گھانس سال بھر تک اگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے تقریباً اسّی فی صدی فصل تباہ ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ ٹڈی دل، زہریلے کیڑے مکوڑے اور درختوں کی مختلف بیماریاں بھی ہمارے اناجوں، روئی، سبزیوں، پھلوں اور خشک میووں کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان سب دشواریوں کو روکنے کے انتظامات کئے تو گئے ہیں لیکن ابھی اور بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ایران میں فصلیں کم اگنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں بیج پر خاص توجہ نہیں دی جاتی، پچھلی فصل کے جو گھٹیا اور معمولی دانے کسانوں کے پاس ہوتے ہیں ان ہی کو وہ بو دیتے ہیں جس سے پیداوار نہیں بڑھ پاتی۔ بیج کو بہتر بنانے کے لئے تھوڑا سا کام کیا گیا ہے جس کے نتائج بہت ہی عمدہ برآمد ہوئے ہیں۔ ہمارے کسان اچھے اور مختلف قسم کے بیج حاصل کرنے میں اچھی خاصی دلچسپی لے رہے ہیں، کیونکہ جب ان کو پرانے اور گھٹیا بیج سے اُگے ہوئے کھیت اور نئے عمدہ قسم کے بیجوں کی فصلیں ایک ساتھ دکھائی جاتی ہیں تو پیداوار کا فرق وہ خود ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں نئے اور اچھے قسم کے بیجوں کی طرف ان کا مائل ہونا ایک قدرتی امر ہے، میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کھیتوں اور فصلوں کی نمائش اور زیادہ کی جائے۔

زراعت کی ترّقی کے لئے جو چند اصول میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کو پھلوں اور خشک میووں کی کاشت کے لئے بھی اپنایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک کو میووں اور پھلوں کی وجہ سے کئی صدیوں سے شہرت حاصل رہی ہے لیکن ہم نے ابھی تک باغبانی کے نئے اصولوں سے کچھ نہیں سیکھا ہے۔ مثال کے طور پر پھلوں کی بہتر قسموں

کی طرف ہماری توجہ بہت کم ہے۔ میوہ دار درختوں کو ہم شاید ہی کبھی کھاد دیتے ہوں۔ کیڑے مکوڑوں کو مارنے والی دوائیاں نہ چھڑک کر ہم ہر سال ہزاروں ٹن پھل اور میوے تباہ کر دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں پھل اور میوے بہت زیادہ مقدار میں پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بازار میں غیر ملکی سیب اور دوسرے پھل بکتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے زعفران کشمیر میں لے جانا۔

ہمارے ملک کے مویشی اور چوپائے بھی عمدہ اور نسل کے اعتبار سے اصیل ہیں، مثلاً ہمارے دُنبوں کا گوشت اور اون دونوں ہی ہر اعتبار سے اچھے مانے جاتے ہیں اور خاص طور پر قیمتی اور نفیس قالینوں میں جو اون استعمال ہوتا ہے وہ ان ہی دُنبوں کا ہوتا ہے۔ ان جانوروں کو ایسی سختیاں برداشت کرنے کی عادت ہے کہ اگر دوسرے ممالک کے مویشیوں کو اس حالت میں رکھا جائے تو یقیناً مر جائیں، لیکن اتنا ہی کافی نہیں ہے ہم چاہیں تو دوسرے ممالک کے اچھی نسل کے مویشیوں اور پرندوں کی اپنے ملک میں پرورش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے ملک میں سوئٹزرلینڈ کی مشہور کتھئی رنگ کی گایوں کے گلّے پالنے شروع کر دیئے ہیں، اسی طرح ہم امریکہ کی لال رنگ کی مرغیوں کی نسل بڑھا رہے ہیں کیونکہ اس کے انڈے ایران کی مرغیوں کے انڈے کے مقابلے میں کافی بڑے ہوتے ہیں اور لوگ خوش ہو کر ان کو کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے کسانوں کے لئے مرغیوں کی یہ نسل کافی نفع بخش بھی ہے، لیکن ابھی اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے مویشیوں اور پرندوں کو سائنس کے اصولوں کے مطابق غذا دی جائے، غیر ملکی کسانوں کی طرح ایرانی کسان بھی یہ جان گئے ہیں کہ جو رائی اور تیپتیا گھاس کی فصلوں کے کیا فائدے ہیں ان سے نہ صرف جانوروں کو عمدہ چارہ اور چوگا ملتا ہے بلکہ بارش کے تیز پانی سے مٹی بھی نہیں بہتی جس کی وجہ سے زمین کا بنجر پن رُک جاتا ہے ہم نے ایک جانوروں کا ہسپتال بھی قائم کیا ہے جو سارے ملک میں گشت کرتا ہے، لیکن ہم کو اس پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ جانوروں کی بیماریوں کی روک تھام کے لئے مزید اقدامات بھی کرنے چاہئیں۔

وزارتِ زراعت، وزارتِ تعلیم، ایگریکلچر کالج، تہران یونیورسٹی کا جانوروں کے علاج کا شعبہ، بنیادِ پہلوی، آبادکاری کا بنک، زراعتی بنک، وزارتِ داخلہ، وزارتِ تجارت کا ناپ اور تول کے اوزان کا محکمہ وغیرہ سب ہی کاشتکاری کو بہتر بنانے کے لئے تحقیقی کاموں میں یا اس کو ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں، ہمارے ان مختلف اداروں کے ساتھ کچھ غیر ملکی شعبے بھی ہماری ترقی و فلاح کے کاموں میں مشغول ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ایران کی زراعت کی بہتری اور ترقی کے لئے جو بھی کام ہم نے کیا ہے اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کے کاشت کے طریقوں کو ایکدم نہیں بدلا جا سکتا، اگر ظلم و زیادتی سے کام نہ لیا جائے تو زراعت کے اس پرانے نظام کو بدلنے کے لئے کافی وقت لگے گا، اسی کام کے لئے ہم کو کافی تحقیقات کرنی پڑیں گی تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ ایران کے موجودہ حالات کے تحت کس طرح جدید ترین زراعت کے طریقوں کو اپنایا جا سکتا ہے، ہمارے ملک میں

ایک دو نہیں ہزاروں گاؤں ہیں ان سب میں بیک وقت جدید ترین تحقیقات کے نتائج کا استعمال کوئی آسان کام نہیں لیکن ان سب مشکلات کے باوجود جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے ہمارے زراعتی میدانوں میں ترقی و توسیع ہو رہی ہے۔

زراعتی پیداوار کو بڑھانے کے ساتھ ہم کو یہ بھی سوچنا ہے کہ کس طرح اناج کو بہتر طریقوں سے خاص طور پر دیہاتوں میں حفاظت سے رکھا جائے۔ اناج کی حفاظت ہماری زراعت کی چھٹی بڑی ضرورت ہے۔ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں اس کام کے لئے نئی طرز کے اناج کو ذخیرہ کرنے کے برج اور کھانے کی چیزوں کو ٹین کے ڈبوں میں بند کرنے کے لئے کارخانے قائم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کا ناپ تول کے پیمانوں کا محکمہ ہمارے ملک کی برآمد ہونے والی چیزوں کا معیار بڑھا رہا ہے لیکن اس میدان میں ہمیں ابھی اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ہماری زراعت کی ساتویں بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پچاس ہزار دیہاتوں اور باہر کی دنیا سے تعلقات برقرار رکھنے کے لئے بہتر نقل و حمل کے وسائل کو ترقی دی جائے۔ فرض کیجئے کہ کسی گاؤں کی پیداوار اس کی ضرورت سے تھوڑی ہی زیادہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جدید ترین زراعتی طریقوں سے پیداوار دوگنی کر دی جائے لیکن اس طرح پیداوار کے بڑھانے سے کیا فائدہ جبکہ اناج منڈیوں میں نہ پہنچ سکے۔ کیا ہمارے کسان دن رات محنت کرکے جدید قسم کے زراعتی سامان کی مدد سے پیداوار اس لئے بڑھائیں کہ جب یہ پک کر تیار ہو جائے تو اچھے وسائل نقل و حمل نہ ہونے کی وجہ سے یہ گاؤں میں ہی سڑگل کر رہ جائے؟ پچھلی فصل میں میں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ملک کے اندر اور باہر نقل و حمل کے وسائل کو بہتر بنانے کے لئے ہم نے کیا اقدامات کئے ہیں۔ اس فصل میں بھی مناسب مقامات پر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ لوگ راستوں اور آمد و رفت کے ذرائع کی اہمیت سے غافل نہ رہیں۔

اب میں زراعت کی آٹھویں بڑی ضرورت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ہمیں چاہیئے کہ دیہات کے بسنے والے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنائیں۔ ہمیں اس بات کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیئے کہ ہمارے دیہاتوں میں بہت سی حسین اور دلکش چیزیں ہیں، جب میں کسی ایرانی گاؤں کا تصور کرتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ تصویر ابھرتی ہے کہ ایک بڑی حسین اور پرسکون جگہ ہے جس کی گلیوں میں دونوں طرف دور تک درختوں کی قطاریں چلی گئی ہیں بیچ میں نہر جاری ہے۔ درختوں کے پتوں میں سے دھوپ چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی ہے، کسانوں کے گھروں میں رنگ برنگے قالین بچھے ہوئے ہیں، تانبے پیتل کے چمکدار برتن دیواروں پر ٹنگے ہوئے ہیں۔ باغوں میں انگور کی بیلیں میوے سے لدی ہوئی ہیں۔ دوسرے پھلوں کی ڈالیاں بھی بوجھ سے جھول رہی ہیں، بوڑھے نہر کے کنارے آرام کر رہے ہیں عورتیں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں اور بچے پاس ہی کھیل رہے ہیں۔

اگرچہ میں اپنے دیہاتیوں کی غربت، بیماری اور ان کے اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے فکر مند رہتا ہوں لیکن اس حقیقت کا بھی مجھے اعتراف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص کبھی بھوکا نہیں رہتا، ان کی سادگی ان کی زندگی کی سب سے

بڑی نعمت ہے۔ دیہاتی زندگی کی اپنی خصوصیات ہیں۔ جہاں اجتماعی زندگی کا مرکز کسان کا کنبہ ہی ہوتا ہے، شہر کے بسنے والوں کی نسبت یہ دیہاتی ایک دوسرے کے ساتھ بڑی سادگی اور خلوص سے ملتے ہیں، ہمارے دیہاتی تمام زندگی ایک ہی کام کرتے ہیں اور وہ ہے پیداوار، یہ پیداوار خواہ اناج کی ہو، خواہ مویشیوں کی یا اپنے ہی بچوں کی۔

بہت سے لوگوں کو ایران کے دیہاتوں کی زندگی بڑی دھیمی اور پرسکون نظر آئے گی جہاں کبھی کوئی بڑا حادثہ یا معرکہ نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے کسان سارے سال اپنے کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ سورج چھپنے کے بعد گھر لوٹتے ہیں کبھی اپنے گاؤں کے معمولی چائے خانے میں چائے پی لی تو پی لی ورنہ کھانا کھا کر سو رہتے ہیں۔ اور صبح کو مرغ کی بانگ کے ساتھ اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے، اس دن یا تو مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں یا دھوپ میں بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہیں، اور اگر دھوپ میں تیزی ہو تو درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام کرتے ہیں ان کی بات چیت زیادہ تر موسم، کاشت اور ذاتی پریشانیوں کے بارے میں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اُس دوست کی بات بھی چھڑ جاتی ہے جو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے گیا ہوا ہے۔ عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور اگر گھر پر رہتی ہیں تو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں کھانا پکاتی ہیں اور اگر وقت بچتا ہے تو قالین بننے بیٹھ جاتی ہیں، جاڑوں میں جبکہ کھیتوں پر کام نہیں رہتا تو زندگی کی رفتار کافی سُست ہو جاتی ہے، ان دنوں مرد تو باہر کسی قہوے یا چائے خانے میں دن گذارتے ہیں اور عورتیں گھر پر اپنے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔

ہمارے کسان جس طرح کی زندگی گذار رہے ہیں وہ ان کے اعلیٰ اور مضبوط کردار کی دلیل ہے۔ میری آرزو ہے کہ ان کی زندگی کو نہ صرف جسمانی سہولتیں ملیں بلکہ ذہنی تقویت و ترقی کے بھی سب اسباب میسّر ہوں کیونکہ ان سہولتوں اور آسائشوں کے بعد ہی وہ دورِ حاضر کے عمدہ کاشتکار ثابت ہو سکتے ہیں اور ایرانی جمہوریت کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں بجلی پہنچانے، سڑکیں بنانے، اسکول کھولنے اور کسانوں کی صحت و صفائی کے کاموں کے علاوہ دوسری عوامی ضرورتوں کے متعلق میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں، یہ اقدامات نہ صرف اناج کی پیداوار بڑھانے کے لئے اقتصادی اعتبار سے مفید ہوں گے بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی دیہاتیوں کی زندگی پر اچھا اثر ڈالیں گے، اگر ہم غیر ممالک کی مثالیں اور اپنے محدود تجربات کو سامنے رکھیں تو پتہ چلے گا کہ بجلی کی طاقت ہماری دیہی زندگی میں انقلاب لا سکتی ہے، سڑکوں کے بن جانے سے نہ صرف کسانوں کی فصلیں منڈیوں میں پہنچ سکیں گی بلکہ ان کی وجہ سے ہمارے اجتماعی تعلقات بھی بہتر ہوں گے اسکولوں کے کھلنے سے اناج کی پیداوار ہی زیادہ نہ ہوگی بلکہ ہمارے کسانوں کے ذہنوں کو علم کی روشنی ملے گی، صحت و صفائی کی سہولتیں نہ صرف دیہاتیوں کی جسمانی طاقت کو بڑھائیں گی بلکہ اس سے انہیں اپنی حفاظت کے جذبے کو تقویت ملے گی اور ذہنی اعتبار سے وہ اپنے کو زیادہ بہتر محسوس کریں گے۔

ہمارے ملک میں زیادہ گاؤں ایسے ہیں جن میں کم از کم ایک پنچایتی ریڈیو سیٹ ہے بلکہ کہیں کہیں زیادہ بھی نظر

آتے ہیں، چونکہ میں خود ایک پائلٹ ہوں اس لئے میں نے اپنی آنکھوں سے ہوائی جہاز چلاتے وقت بہت سے ایریل اُن گاؤں کی چھتوں پر دیکھے ہیں جہاں جہاں سے میں گذرا ہوں، دیہاتوں میں جیسے جیسے بجلی پہنچے گی لوگ زیادہ سے زیادہ ریڈیو سیٹ خریدیں گے، اس کے علاوہ بجلی کسانوں اور ان کی عورتوں کی جفاکشی اور سخت مشقت کو کافی حد تک کم کر دے گی۔ بجلی کی موٹروں سے آٹا پیسنے کی چکیاں، کولہو، روئی اور اُون کاتنے اور بننے کی مشینیں اور لکڑی کے کام کی خرادیں آسانی سے چل سکیں گی اور تھوڑے وقت میں زیادہ سامان تیار ہو سکے گا۔ بجلی چھوٹی صنعتوں میں بھی کسانوں کی مددگار ثابت ہوگی اور اس سے نہ صرف دیہاتیوں کے مال کی پیداوار بڑھے گی بلکہ اس سے ان کا معیار زندگی بھی اونچا ہوگا۔

میں چاہتا ہوں کہ جیسے جیسے دیہاتیوں میں تعلیم پھیلے اگر سب دیہاتوں میں ممکن نہ ہو تو کم از کم ان میں جہاں نسبتاً آبادی زیادہ ہے لوگوں کے لئے ریڈنگ روم کھولے جائیں تاکہ وہاں جا کر ہمارے دیہات کے رہنے والے علمی، ادبی رسائل اور کتابیں پڑھ سکیں۔ اسی کے ساتھ گشتی کتابخانے بھی قائم کئے جائیں جو پورے ملک میں جگہ جگہ جا کر لوگوں کو پڑھنے کے لئے کتابیں دیں، بڑے بڑے دیہاتوں میں مستقل طور پر سینما کھولے جائیں، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے لئے گشتی سینما گھر جیسے اب بھی کہیں کہیں جاتے ہیں ہر گاؤں میں اور قصبے میں باری باری مقررہ وقت پر پہنچیں زیادہ آبادی والے دیہاتوں میں بوائے اسکاؤٹ اور گرلز گائڈ کے علاوہ اور بھی دوسری طرح کے کلب قائم کئے جائیں مجھے اُس دن کا انتظار ہے جبکہ ہمارے دیہات کے لوگ، گاؤں کی پنچایتیں اور دوسرے آبادکاری کے کام کرنے والے مزدوران پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

ہمارے دیہات کے رہنے والوں میں لاکھوں لوگوں کی تعداد ایسی ہے جن میں بڑی خوبیاں اور صفات ہیں اور سب سے بڑا ان کا وصف جذبۂ وطن پرستی ہے، جن لوگوں نے ہمارے کسانوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کی عادات و اطوار کا مطالعہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ فطرتاً ذہین، ذی ہوش ہوتے ہیں اور تکنیکی باریکیوں کو سمجھنے اور نئی معلومات سے واقفیت پیدا کرنے کی ان میں لگن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میری رائے میں اس سے بڑی قربانی اور وطن پرستی کی کوئی اور دلیل نہیں ہو سکتی کہ ہمارے شہروں میں بسنے والے لوگ جو بڑے مہذب سمجھے جاتے ہیں ہمت کریں اور دیہات کے رہنے والوں کو اپنی مدد آپ کرنے کا اصول سکھائیں۔

اس فصل میں میں نے ایران کی زراعت کی آٹھ بڑی ضرورتوں کا ذکر کیا ہے، یعنی حق مالکیت کی اصلاح، زراعت کے کاموں کی تعلیم و تربیت، مناسب سود پر کاشتکاری کے لئے قرض دینا، کاشت کی زمینوں کے لئے میٹھے پانی کی فراہمی، کاشت کے بہتر طریقے اور بہتر کاشت سے فائدہ اٹھانا، فصلوں کو اچھی طرح ذخیرہ کرنا، کسانوں کی آمدورفت کے طریقوں میں سہولت پیدا کرنا، اور ذہنی اور جسمانی تربیت کے لئے مراکز قائم کرنا۔ مجھے امید ہے کہ ان صفحات میں میں نے

یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ ایرانی زراعت کا مسئلہ کوئی مبہم اور پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے مجھے بے انتہا مسرت ہے کہ میرے ملک کے لوگوں میں کاشتکاری کو بہتر بنانے کے لئے بہت زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے، لیکن صرف یہ جوش و خروش ہی کافی نہیں بلکہ ہم کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے اور اس عمل کی بنیاد گہرے مطالعات، اور اچھی طرح سوچے سمجھے اصول و پروگرام کے تحت ہو۔

میری نظریں ایرانی کسانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور جب کبھی میں ان کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک نہایت ہی حسین اور دلفریب منظر آجاتا ہے۔

۱۰ — ایرانی اجتماع میں عورت کا مقام

کچھ عرصے لنکا کے شہر کولمبو میں ایشیا افریقائی خواتین کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی ہم نے اپنے ملک سے ایک نہایت ہی حسین و جمیل اور بڑی دلفریب عورت کو اپنے ملک کا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا جب وہ عورت کانفرنس میں شرکت کر کے واپس آئی تو اس نے بتایا کہ کولمبو کے ایک اخبار نے اس کانفرنس کی تائید کرتے ہوئے اپنے اخبار کی پڑھنے والی عورتوں کو یہ نصیحت کی تھی۔

"اے عورتوں تم سب ایک ہو جاؤ اس ایکتا میں تمہارا کچھ نہیں جائے گا سوائے اس کے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے شوہر سے محروم ہو جائے گی۔" دوسرے اخبار کے ایڈیٹر نے یہ مقالہ اپنے اخبار میں سپرد قلم کیا تھا۔

"عورتیں ہر جگہ موجود ہیں، حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں، سرکاری دفاتر میں، ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیوز میں، اسکوٹروں پر، کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں یہ مخلوق نہ ہو سوائے اپنے گھر کے اور کوئی کام ایسا نہیں جو یہ نہ کر سکیں بجز شوہر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش کے۔"

عورت خدا کی وہ مخلوق ہے جس کو مختلف اضداد کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں یہ مسئلہ بحث کا موضوع اور لوگوں کی پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے کہ عورتوں کے لئے کیا کام مناسب ہو سکتے ہیں، یہی مسئلہ اب ہمارے ملک میں بھی ابھر رہا ہے جہاں عورتیں تیزی سے ہر میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں، اس فصل میں سب سے پہلے میں ان عورتوں کا ذکر کروں گا جو میری زندگی میں آئیں اس کے بعد ایرانی عورتوں اور ان کے فرائض کے متعلق لکھوں گا۔

اگر میں کہوں کہ ایک کسان کی طرح بادشاہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اپنی نجی زندگی میں پوری آزادی سے رہے تو شاید کسی کو میری اس بات پر اعتراض نہ ہوگا، اس کتاب کے پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ حکومتیں

ایسی بھی ہیں جو شوہر اور بیوی کی نجی زندگی کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتیں لیکن خوش قسمتی سے مہذب ممالک میں ازدواجی زندگی کے رشتوں کو احترام سے دیکھا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کی جاتی میں بھی اپنی ازدواجی زندگی میں اسی اصول کا قائل ہوں۔

جس وقت میں سوئٹزرلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا اس وقت کچھ لڑکیوں کے نزدیک آنے کا مجھے موقع ملا تھا، لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے سرپرست کو یہ گوارا نہ تھا کہ میں صنفِ نازک کے زیادہ قریب رہوں، یورپ سے واپس آنے کے بعد جب میں نے اپنی تعلیم ملٹری کالج میں ختم کر لی تو میرے والد نے یہ فیصلہ کیا کہ میرے واسطے کوئی مناسب دلہن تلاش کریں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے پیچھے دو مقصد تھے اوّل تو یہ کہ اُن کی خواہش تھی کہ میری شریکِ حیات کسی اعلیٰ اور شریف شاہی خاندان سے ہو اور دوسرے یہ کہ اس شادی کے ذریعے کسی ہمسایہ ملک کے شاہی خاندان سے قریبی اور مضبوط تعلقات استوار ہو جائیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد نے مصری شہزادی فوزیہ کی کہیں تصویریں دیکھ لی تھیں۔ اور شاید دِلوں کی قربت سے زیادہ کسی انجینئرِی منصوبے کی تکمیل کے تحت انہوں نے اس حسین و جمیل شہزادی کے متعلق چھان بین شروع کر دی، سب سے پہلے تو لڑکی کے شجرۂ حسب و نسب کی تحقیق کی، اس کے بعد قاہرہ میں مقیم ایرانی سفیر کو حکم دیا کہ وہ اس سلسلے میں مصری حکومت سے رابطہ قائم کرے۔ چنانچہ ایرانی سفیر نے افسرانِ بالا سے اس سلسلے میں بات چیت کی اور انہوں نے اس کا تذکرہ شاہی خاندان سے کیا، میرے والد نے سرکاری سطح پر اس بات کی تصدیق کرائی کہ کیا مصر کی شہزادی کی شادی ان کے لڑکے سے طے پانا عین ممکن ہے، جواب "ہاں" میں دیا گیا۔ لیکن ان تمام واقعات کا علم مجھے ۱۹۳۸ء میں اس وقت ہوا جب کہ میری منگنی کا اعلان کیا گیا۔

اس سے قبل میں نے اپنی ہونے والی شریکِ حیات کی صورت تک نہیں دیکھی تھی، چنانچہ یہ طے پایا کہ اس کو دیکھنے کے لئے میں خود قاہرہ جاؤں، وہاں مجھے دو ہفتے ٹھہرنا تھا تاکہ میں شہزادی فوزیہ کی عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف ہو جاؤں، اس سلسلے میں کچھ آئینی اور قانونی رکاوٹیں بھی راستے میں آئیں اور بالآخر ہماری شادی کی باقاعدہ رجسٹری تہران اور قاہرہ میں ہو گئی۔ چونکہ ایرانی آئین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ولی عہد کے والدین ایرانی النسل ہونے چاہئیں اس لئے میرے والد نے اس آئینی شرط کی طرف توجہ دی اور ایرانی پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کرایا جس کی رو سے شہزادی فوزیہ کو ایرانی قومیت حاصل ہو گئی۔

ہماری شادی کی رسم قاہرہ میں ادا ہوئی۔ اور وہاں کے بہت بڑے جیّد عالم نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ اس تقریب میں میرے خاندان کا کوئی فرد شریک نہ تھا البتہ دلہن کے خاندان کے سب رشتے دار اور ایرانی حکومت کے افسرانِ بالا جو تہران سے آئے تھے اس شادی میں شریک تھے، ان مراسم کے بعد میں دلہن کو اپنے ساتھ تہران لے آیا۔

یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اسلامی ممالک میں بنیادی طور پر شادی کے ابتدائی مراحل تقریباً وہی ہیں جو مغربی ممالک میں رائج ہیں، صرف وقت کا تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، چنانچہ ایران میں یہ رسم ہے کہ منگنی اور نکاح کے دوران وقت کا کافی فاصلہ رکھا جاتا ہے۔ منگنی کے بعد لڑکا اور لڑکی بہت کم ایک ساتھ رہتے ہیں۔ منگنی کئی ماہ تک قائم رہتی ہے اور کبھی کبھی جیسا کہ مغربی ممالک میں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ منگنی دو تین سال تک رہتی ہے اس کے بعد اسلامی اصولوں کے مطابق نکاح ہو جاتا ہے اور نکاح کے رجسٹر میں باقاعدہ اس کا اندراج ہوتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ یہ تمام کاروائی ایک ہی دن میں ہو لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ نکاح کے وقت ہی سب خانہ پری کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد شادی کا جشن منایا جاتا ہے جس کی مراسم ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی مغربی ممالک میں رائج ہیں۔ عام طور پر نکاح اور شادی کی تقریبات کے درمیان تھوڑے دن کا فاصلہ رکھا جاتا ہے جو کچھ ہفتے بلکہ چند ماہ کا بھی ہو سکتا ہے۔ اس عرصے میں دولہا اور دلہن کا ایک ساتھ رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آخر کار خدا خدا کر کے وہ دن آتا ہے جب شادی کی خوشیاں پوری دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں، خاص طور پر دیہاتوں میں تو اب تک یہ رواج ہے کہ شادی کی دعوتیں دس دس روز تک چلتی رہتی ہیں، اس موقع پر گوئیے خوب دل کھول کر گاتے بجاتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان کثرت سے ہوتا ہے (ان میں کسی طرح کی شراب شامل نہیں ہوتی) دولہا اور دلہن کو تحفے تحائف دئے جاتے ہیں جن میں مرغیاں، بھیڑ کے بچے، چاول اور دوسری اشیا رسب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دلہن اپنے سسر کے گھر آجاتی ہے اور اگر شوہر کی مالی حالت اچھی ہو تو میاں بیوی الگ رہنے لگتے ہیں

درحقیقت ہماری شادی کا جشن تہران میں منایا گیا اگرچہ بظاہر تو اس جشن میں بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت تھی لیکن اصلی معنوں میں یہ جشن ان تقاریب سے زیادہ مختلف نہ تھا جو ان موقعوں پر ایران کے دیہاتوں میں منایا جاتا ہے بس فرق اتنا تھا کہ چونکہ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایران میں بھی زندگی بہت مصروف ہے اس لئے اس میں بہت عجلت سے کام لیا گیا۔ شادی کی دھوم دھام اور دیگر مراسم کے بعد میں کچھ عرصے تک مرمر محل میں رہا، یہ محل میرے والد نے اپنے لئے تعمیر کرایا تھا چونکہ اس میں یزد کا سبزی مائل سفید پتھر استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہ مرمر محل یا کاخ مرمر کہلاتا ہے۔ اس کے بعد میں تھوڑے عرصے کے لئے اس محل میں مقیم رہا جہاں میرے والد گرمی کے دنوں میں قیام کرتے تھے یہ محل تہران سے باہر سعد آباد نامی مقام پر ہے، اس عرصے میں وہ محل بھی مکمل ہو گیا جو خاص طور پر میرے لئے بنوایا گیا تھا۔

ابھی شادی کو کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے، اور شہر تہران اتحادی فوجوں کی چھاؤنی میں تبدیل ہو کر رہ گیا، میرے والد کو سلطنت سے دست بردار ہونے کے لئے مجبور کیا گیا اور حکومت کی پوری پوری ذمہ داری میرے کندھوں پر آگئی۔ یہاں مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ

باقاعدہ اور عیش سے ازدواجی زندگی بسر کرتا۔ اس وقت تہران کی ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی یہ حالت تھی کہ کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند دن کے لئے سیر و تفریح کے لئے گھر سے باہر چلا جائے۔ باوجود اس کے کہ ان دنوں عوامی خدمت کا دائرہ انتہائی محدود تھا لیکن میری شریکِ حیات نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے کچھ کام اپنے ذمّے لے لئے۔

اس شادی کے بعد سب سے زیادہ مسرت بخش لمحہ میرے لئے وہ تھا جب ۱۹۴۰ء میں میری پیاری بیٹی شہزادی شہناز کی ولادت باسعادت ہوئی، اور یہ بات بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ ۱۹۵۹ء میں شہناز کے بطن سے شہزادی مہناز پیدا ہوئی گویا میں اپنی اکلوتی نواسی کا نانا بھی ہوں۔

کچھ ایسی وجوہات کی بنا پر جس کا جواب ابھی تک طب کے پاس نہیں ہے ملکہ فوزیہ اس قابل نہ رہیں کہ دوسرے بچّے کو جنم دے سکیں اور یہ ہماری بدبختی تھی کہ اولادِ نرینہ کی سعادت سے ہم محروم رہے۔ ایرانی آئین کے مطابق ایک بادشاہ کا جانشین اس کا لڑکا ہی ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میری لڑکی بلکہ میری تینوں بہنیں بھی حقِ سلطنت سے محروم قرار دی گئیں۔ ہمارے آئین میں اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ شاہی خاندان کی وہ اولادِ نرینہ جو قاجاری خاندان کی بیگمات کے بطن سے ہو ایران کے تاج و تخت کی وارث نہیں بن سکتی چونکہ میرے والد کی دو بیویاں قاجاری خاندان سے تھیں اس لئے میرے دو سوتیلے بھائی بھی اس حق سے محروم ہیں۔ میرا ایک حقیقی بھائی بھی تھا جس کا قاجاری خون سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن افسوس ۱۹۵۴ء میں ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو کر وہ مجھے داغِ مفارقت دے گیا۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان آئینی اور قوانینی مجبوریوں کی وجہ سے میرے مشیر اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے ہوں کہ میری بیوی کے بطن سے اولادِ نرینہ پیدا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بنیادی آئین میں تبدیلی کی جا سکتی تھی لیکن رائے عامہ اس وقت بھی اس کے حق میں نہ تھی اور اب بھی نہیں ہے کہ ولی عہد کے تقرر کے بارے میں کوئی تبدیلی کی جائے۔

آئینی مسائل کے علاوہ اس وقت میں بالکل جوان تھا اور چاہتا تھا کہ میرے سامنے بھی کئی کئی بچّے کھیلتے نظر آئیں چنانچہ جب ملکہ فوزیہ طویل عرصے کے لئے مصر گئیں تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں۔

ملکہ فوزیہ کو طلاق دینے کے بعد میں دو سال تک تنہا رہا۔ ہر ملک و قوم میں کچھ لوگ اور خاص طور پر ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو شادی بیاہ کرانے کے معاملات میں بیحد دلچسپی لیتی ہیں چنانچہ میرے سامنے بھی بہت سی کنواری لڑکیوں کے نام لئے گئے لیکن میں برابر ٹالتا رہا، آخر کار ۱۹۵۰ء میں میں نے ثریّا اسفندیاری کا نام سنا اس کی شخصیت نے مجھے بیحد متأثر کیا اور میں اس میں دلچسپی لینے لگا۔ ان دنوں ثریّا اسفندیاری انگلستان میں تھی چنانچہ میں نے اپنی بہن شہزادی شمس کو اس سے ملنے کے لئے انگلستان بھیجا۔ کچھ عرصے بعد میری بہن نے اس کے اوصاف اور کردار

کی خوبیوں کی تعریف تفصیل سے لکھ کر بھیجی اور آخر کار اسی سال کے آخری دنوں میں میری اور آیندہ کی ایران کی ملکہ کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔

میری منگیتر کے والد بختیاری قبیلے کے سردار تھے اور والدہ نسل کے اعتبار سے جرمن تھیں۔ بختیاری قبیلہ ایران کا سب سے بڑا قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ کچھ قبائلی بہت زیادہ سرکش تھے اور لوگوں پر ہر طرح کے ظلم و ستم کو روا سمجھتے تھے اس لئے میرے والد نے ان کے ہتھیار چھین لئے تھے اور ان کو زیر کر کے مرکزی حکومت کے تحت لے آئے تھے۔ ان قبائلی سرداروں کو اختیار اور اقتدار کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہت افسوس تھا جن میں سے بعض بغاوت پر آمادہ ہو گئے جس کی وجہ سے ان کو کچھ عرصے تک تہران جیل میں بھی رہنا پڑا۔ اس کے باوجود ان سرداروں کو اپنے قبیلے کے اندرونی معاملات میں پوری آزادی تھی۔ یہ کئی گاؤں کے مالک تھے اور بڑے بڑے مویشیوں کے گلّے رکھتے تھے۔ بعض قبائلی سردار اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے (یہاں تک کہ بعض عورتیں بھی کافی پڑھی لکھی تھیں) اور اپنے بچّوں کو ملک سے باہر پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے۔

ثریّا کے والد جناب اسفندیاری صاحب آغازِ جوانی میں ہی اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی چلے گئے تھے، جہاں ان کی ملاقات ثریّا کی والدہ سے ہوئی اور ان کے دامِ عشق میں گرفتار ہو کر شادی کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے سُسر (ثریّا کے نانا) زارِ روس کے عہد میں کسی کارخانے کے منیجر تھے لیکن پہلی جنگِ عظیم سے قبل اپنے وطن واپس آ گئے تھے۔ اسفندیاری صاحب اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ایران آئے اور چونکہ شہر اصفہان صوبے کا پایۂ تخت بھی ہے اور بختیاری قبیلے کے لوگ اس کو اپنا وطنِ عزیز بھی سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس شہر میں مقیم ہو گئے۔

اسی شہر میں ۱۹۳۱ء میں ان کے ہاں سب سے پہلی لڑکی یعنی میری آیندہ ہونے والی شریکِ حیات کی ولادت ہوئی کچھ سال بعد ایک لڑکے کا ... لود مسعود بھی ہوا۔ اگرچہ ثریّا کو اصفہان کے ایک جرمن مدرسے میں داخل کیا گیا تھا لیکن چونکہ اس کے گھر پر جرمن اور فارسی دونوں ہی زبانیں بولی جاتی تھیں اس وجہ سے اس کی تربیت ایرانی ماحول میں ہوئی۔ ایران کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اصفہان ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں ایران کی قدیم تاریخ و تمدن کے آثار کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یہ لڑکی تہذیب و تمدّن کے اس گہوارے اور صدیوں پرانے تاریخی شہر میں پروان چڑھ رہی تھی، کچھ عرصے کے بعد اس کے والدین نے اس کو ایک ایرانی مدرسے میں منتقل کر دیا جہاں اس نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے والدین اس کو کئی بار یورپ لے کر گئے لیکن اصفہان کی زندگی، ان دیہاتوں کے ماحول نے جو اس کے والد کی ملکیت تھے اور اس کے اپنے قبیلے کے خانہ بدوش لوگوں کے سفر نے اس کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔

بالکل اسی طرح جیسے میرے والد نے مجھے پڑھنے کے لئے سوئٹزر لینڈ بھیجا تھا اس کے والدین نے بھی اس کو

اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے اسی ملک کا انتخاب کیا، دو سال تک وہ بڑی ہنسی خوشی کے ساتھ ایک اسکول میں زیرِ تعلیم رہی ثریا فارسی اور جرمن زبانوں کے علاوہ فرانسیسی بڑی روانی سے بول سکتی تھی، انگریزی میں بھی تھوڑی بہت استعداد پیدا کرلی تھی لیکن اس زبان کو وہ بہت اچھی طرح سیکھنا چاہتی تھی، چنانچہ طے یہ پایا کہ ۱۹۵۰ء کا گرمی کا موسم وہ انگلستان میں گذارے، انگلستان میں میری بہن سے ملاقات کے بعد ثریا واپس ایران آگئی جہاں ہماری منگنی کا اعلان کیا گیا۔

ہم شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن ایک افسوسناک واقعہ پیش آگیا اور میری حسین وجمیل نازنین منگیتر ٹائیفائیڈ کے بخار کا شکار ہوگئی، اور اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ اس دوران میں نے کئی ہفتے تک راتیں جاگ کر گذاریں۔ کچھ دن بعد ثریا کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی، لیکن بیماری نے اس کو بری طرح کمزور و نڈھال کر کے رکھ دیا تھا، اور اسی وجہ سے ہماری شادی میں اس قدر تاخیر ہوئی، چنانچہ اس کی اس کمزوری اور نقاہت کے دوران ہم نے ایک دن یہ فیصلہ کیا کہ دفتری کارروائی اور نکاح کی رسم بڑی سادگی سے ادا کرلی جائے۔ نکاح کے وقت تک اس قدر لاغر ہو چکی تھی کہ اس کے لئے شادی کا جوڑا بھی سنبھالنا مشکل تھا اور جس وقت ہمارے اعزاز میں دعوت دی جارہی تھی اس وقت وہ بیہوش ہوتے ہوتے بچی۔

موسم سرما کا میرا رہائشی محل تہران میں ہے جنوری ۱۹۵۱ء میں میں اپنی نئی دلہن کو اس محل میں لے آیا۔ مغربی دنیا میں جو ماہ عسل (ہنی مون) کا تصور ہے اس کا رواج ایران میں نہیں ہے، بلکہ ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ دلہن کے رشتے دار اس کو دولہا کے گھر چھوڑ کر خود واپس آجاتے ہیں۔ جہاں وہ آپس میں ہنسی خوشی سے رہتے ہیں لیکن میں اور ثریا چونکہ مغربی آداب و رسوم سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کے لئے ہم شہر سے باہر جاکر ہنی مون منائیں گے، لیکن ہماری یہ تدبیر تقدیر کو سازگار نہ آئی اور ملک میں سیاسی کشیدگی کی بنا پر ہنی مون کے پروگرام کو ختم کرنا پڑا۔ اس کتاب کی پانچویں فصل میں میں اشارہ بھی کرچکا ہوں کہ ہماری شادی کے کچھ عرصے بعد وزیرِاعظم رزم آرا کو قتل کردیا گیا، مصدق برسرِاقتدار آیا جس کی وجہ سے غیر ملکی طاقتوں نے ایران کے مستقبل کے لئے خطرہ پیدا کردیا، حالات نے اس وقت اس طرح رخ بدلا کہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہنی مون کے سفر کی بجائے میں اپنی شریکِ حیات کو ساتھ لے کر ملک کے باہر چلا جاؤں چنانچہ بغداد سے ہوتا ہوا میں روم پہنچا، یہ مانا کہ یہ سفر میں نے ہنی مون منانے کی غرض سے نہیں کیا تھا بلکہ حالات کا تقاضا تھا۔ البتہ اس سفر کی وجہ سے مصدق اور اس کے ساتھی جو ملک ایران کی دلہن سے سیاسی ہنی مون منانا چاہتے تھے اس آرزو کو پورا ہوتا نہ دیکھ سکے کیونکہ ہمارے ملک کے وطن پرست لوگ جلدی ہی سمجھ گئے کہ مصدق اور اس کے ساتھی ملک کو تباہی کی طرف کھینچ رہے ہیں چنانچہ انہوں نے نہ صرف مصدق بلکہ اس کے ساتھ جتنے بھی اس سازش میں ہم بستر تھے سب کو ابدی نیند سلادیا۔

یہ تمام واقعات میری دوسری شادی کے چھ ماہ بعد پیش آئے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیاسی

بحران کا یہ زمانہ نہ صرف میرے اور میری شریک حیات کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے سخت آزمائش اور اضطراب کا زمانہ تھا، شروع شروع میں تو ہمیں یہ امید تھی کہ مصدق سیاسی امور میں مثبت راہ اختیار کرے گا لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور مجھے مصدق کی منفی پسندانہ روش کے نتائج کی خبریں ملنا شروع ہوئیں تو میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا، ملک کے اقتصادی اور اجتماعی ترقیاتی کام بالکل بند ہو گئے۔ لوگ پریشان اور خوفزدہ تھے۔ ملک دشمن عناصر ہمارے قومی کاموں میں رخنہ اندازی کر رہے تھے اور تقریباً ہمارے ملک پر پوری طرح چھا گئے تھے۔

میرے نقطۂ نظر سے میرے لئے سب سے زیادہ سخت اور صبر آزما وہ زمانہ تھا جبکہ میں اس وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ جوابی کاروائی کے لئے قدم اٹھایا جائے، جن مخدوش اور پریشان کن حالات سے اس وقت ہم گذر رہے تھے اس کی تفصیل سے خبریں برابر میرے پاس آرہی تھیں، جو خوفناک اور خطرناک منصوبے ہم کو بحیثیت ایک قوم کے مٹانے کے لئے بنائے جارہے تھے اس کی ایک ایک اطلاع مجھے مل رہی تھی۔ وقت کی رفتار پہچاننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی جو عمدہ حس قدرت نے میرے والد کو ودیعت کی تھی اس کا کچھ حصہ مجھے بھی ورثے میں ملا ہے میں یہ بخوبی جانتا تھا کہ اگر قبل از وقت کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کے نتائج بہت ہی زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔ اور وہ ملک جو تیزی سے تباہی کی طرف جارہا ہے میری عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے کہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پسپا ہو کر نہ رہ جائے۔

میں بخوبی جانتا تھا کہ خود اکیلا یا چند ساتھیوں کی مدد سے کچھ نہیں کر سکتا۔ جو فتنہ و فساد میرے سامنے تھا اس پر قابو پانے کے لئے ضروری تھا کہ مجھے عوام کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔ لیکن عوام کو خطرے سے آگاہ کرنے اور یہ جاننے کے لئے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور اس کے سدّباب کے لئے وہ کیا چاہتے ہیں وقت درکار تھا لیکن جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا میں دیکھتا تھا کہ جو افکار اور خیالات ملک میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں یا ہماری یکجہتی میں رخنہ اندازی کرنا چاہتے ہیں ان کے خلاف لوگوں کے جذبات اور خیالات زیادہ قوی اور مضبوط ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ قدرت ایزدی کو ایران کی فلاح و بقا منظور ہے اگر ایک طرف ملک بڑی تیزی سے فنا و بربادی کی طرف چلا جارہا تھا تو دوسری طرف لوگ پہلے سے کہیں زیادہ میرے ساتھ وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے اور تخریب کار عناصر سے مقابلہ کرنے کے لئے آپس میں متحد ہو گئے تھے لوگوں میں یہ جوش و خروش دیکھ کر میرا حوصلہ پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوتا تھا، میں جانتا تھا کہ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ مجھے بہتری کی راہ بھی نظر آرہی تھی، اگرچہ ہم ابھی تباہی و بربادی کی انتہا کو نہیں پہنچے تھے لیکن فلاح و بہبود کی راہ نکل آئی تھی جب کبھی مجھے پریشان کن خیالات گھیرتے تو مجھے اپنی شریک حیات کا خیال آجاتا کہ کس طرح اس نے بلند ہمتی سے کام لیا اور ٹائیفائڈ کے بخار کی وجہ سے جو بحرانی کیفیت اس پر طاری ہوئی تھی اس سے وہ نکل آئی تھی، اس واقعے کو سوچ کر خدا پر میرا ایمان پہلے سے کہیں زیادہ قوی ہو جاتا اور مجھے فوراً خیال آتا کہ انسانی طاقت سے کہیں اوپر ایک اور بھی طاقت

ہے جو ہماری اور ہمارے ملک کی تقدیر کو بنا رہی ہے۔ میں سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچا کہ میری تقدیر بھی خالقِ دوجہاں کے دستِ قدرت میں ہے اور جو کچھ ہونا ہے وہ کاتب تقدیر لکھ چکا ہے، اور جو کچھ اس نے لکھ دیا اس کے حکم کو مجھے بجالانا ہے۔ لیکن کسی کام کو کرگذرنے کے لئے ضروری ہے کہ خیالات اور توہمات سے نکل کر عملی طور پر قدم اٹھایا جائے، کامیابی کے لئے فیصلہ کن قدم بڑھانا نہایت ضروری ہے کیونکہ عمل ہی سب کچھ ہے۔

اس دنیا میں بعض بادشاہ اور کچھ ملکوں کے سربراہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے تمام کاموں کو تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔ اور خود بڑے عیش و نوش کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن میرا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے، اور مجھے عیش و عشرت کی زندگی قطعی ناپسند ہے، کیونکہ مجھے خالی بیٹھے رہنے سے بدہضمی کی شکایت ہونے لگتی ہے اس کے علاوہ یہ میرا ایمان ہے کہ جب تک انسان پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کوشش نہ کرے اور پورے طور پر عملی قوّتوں کو بروئے کار نہ لائے تو رحمت ایزدی کا سزاوار نہیں ہو سکتا، اور وہ شخص بھی خدا کی عنایات سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ دیکھتا رہے کہ دیکھئے آسمان سے کیا اترتا ہے۔ ایک آدمی کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ مشیّتِ الٰہی اور تقدیر یزدانی پر ایمان کامل رکھتا ہو بلکہ اس کو چاہیئے کہ مسلسل کوشش کرتا رہے اور خدا نے روزِ ازل جو اس کی قسمت میں لکھ دیا اس کو اپنے افعال و اعمال سے پورا کرے۔ چنانچہ میرا بھی یہ فرض ہے کہ سیاسی اقدامات، اقتصادی بحالی اور اجتماعی تبدیلی کے لئے جد وجہد کرتا رہوں۔

میری شریکِ حیات کو سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی وہ تو بس یہی چاہتی تھی کہ میرے دُکھ سُکھ میں شریک رہے، جس وقت ملک کے حالات سازگار ہو گئے تو میرے اور ثریّا کے لئے سفر کے کئی موقعے نکل آئے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے ۱۹۵۶ء میں ہم کو روس جانے کی دعوت دی گئی، خروشچیف اور دوسرے روسی رہنماؤں نے ہمارا بڑا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہمارے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے، اس کے علاوہ ہم نے امریکہ، ہندوستان، ترکی، اسپین، لبنان اور دیگر ممالک کا بھی دورہ کیا۔ اگرچہ ان دوروں اور دعوتوں کا مقصد دوسرے ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا لیکن اس طرح سے ہم کو ذرا دیر سے ہنی مون منانے کا موقع بھی مِل گیا۔

ہر ملک اور ہر جگہ کی عورتوں کی طرح ثریّا کو بھی اپنے گھر کو سجانے اور سنوارنے کا خاص سلیقہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارا موسم سرما کا رہائشی محل آرائش و زیبائش کے اعتبار سے بڑی اچھی حالت میں ہے لیکن ثریّا چاہتی تھی کہ اس کے بعض حصّوں کو اپنے مذاق کے مطابق نئے ڈھنگ سے آراستہ کرے اس کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ آرائش کے قیمتی سامان پر روپیہ فضول خرچ کرے بلکہ وہ چاہتی تھی کہ ہر چیز اپنی جگہ پر صاف اور ستھری ہو اور دیکھنے میں اچھی و خوبصورت معلوم ہو اس نے اسی طرح ہمارے موسمِ گرما کے رہائشی محل میں بھی بعض تبدیلیاں کیں۔

ثریّا میرے ساتھ ازدواجی زندگی میں سات سال شریک رہی اس عرصے میں اس کی دلچسپیاں اجتماعی

خدمات کے کاموں میں روز بروز بڑھتی رہیں ہمارے ہاں کافی عرصے سے ایک یتیم خانہ چلا آرہا ہے، ایک روز ثریا اس کے معائنے کے لئے گئی۔ اس یتیم خانے کی بدانتظامی اور یتیموں کی زبوں و افسوسناک حالت نے اس کو بے حد متاثر کیا، میں یہ منظر فراموش نہیں کر سکتا کہ اس نے جس وقت یہ واقعہ مجھے سنایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور اس نے رو رو کر مجھ سے درخواست کی کہ ان یتیموں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے میں فوری اقدامات کروں۔ چنانچہ میں نے فوراً بنیاد پہلوی کے ذمہ دار افسران کو حکم دیا کہ اس یتیم خانے کو اپنی تحویل میں لے لیں اور اس کی عمارت از سرِ نو تعمیر کرائی جائے۔ ثریا خیراتی انجمن، بنیاد پہلوی کی ہی ایک شاخ ہے چنانچہ کچھ عرصے بعد یہ یتیم خانہ ثریا انجمن کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اس تبدیلی کے بعد جو خوشی و خرمی کی لہر ان یتیم بچوں میں پائی گئی وہ میں نے شاید پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اب آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حکومت کی ذمہ داریوں اور آئینی مجبوریوں کے تحت جب میں نے ثریا کو طلاق دی ہوگی تو اس وقت مجھ پر کیا بیتی ہوگی اور اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی، شادی کو کئی سال گذر گئے اور ہمارے ہاں اولاد نرینہ کی شکل نظر نہ آئی، جیسے جیسے وقت گذرتا تھا مجھ میں یہ احساس زیادہ قوی ہوتا جاتا تھا کہ ایرانی قوم کے اعلیٰ مفاد کے لئے ایک ولی عہد کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ میرے بعض نزدیکی لوگوں نے بطور ہمدردی اور از روئے محبت یہاں تک کہا کہ ایک آدمی کے لئے ازدواجی زندگی ہر چیز پر فوقیت و برتری رکھتی ہے لیکن میرے لئے حکومت کی ذمہ داریاں زیادہ مقدم تھیں چنانچہ میرے مشیروں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور مارچ ۱۹۵۸ء میں مجھے ثریا سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

اس واقعے کے بعد میں تہران میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا رہا، کچھ دن کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر نئی ملکہ کا انتخاب عمل میں نہ لایا جائے تو ثریا کو طلاق دینے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن اس وقت میری ذہنی کیفیت اس طرح کی تھی کہ میں اس معاملے میں عجلت نہیں کرنا چاہتا تھا، ایک بار پھر میرے سامنے بہت سی لڑکیوں کے نام پیش کئے گئے اور دنیا کے اخبارات نے میری شادی کے متعلق بہت ہی بے سروپا خبریں شائع کرنا شروع کیں شادی کے لئے اب مجھے ایسی لڑکی کی جستجو تھی جو نہ صرف میرے بچوں کی ماں ہی ہو بلکہ اجتماعی بیداری کے کاموں میں بھی میری شریک اور مددگار ثابت ہو، وہ میرے ملک کے غریب اور بدحال لوگوں کے گہرے احساسات و جذبات اور دلی تمناؤں کو محسوس کر سکے اور ایک عورت ہونے کی حیثیت سے وہ غریب و بے نوا لوگوں کے مستقبل کو سدھارنے میں اَن تھک کوشش ہی نہیں بلکہ خود کو ان کے لئے وقف کر دے۔

ایک روز میری پیاری بیٹی شہزادی شہناز میرے پاس آئی اس وقت اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اور اس کے شوہر نے ایک ایسی لڑکی دیکھی ہے جس میں وہ تمام اوصاف ہیں جو ایک ملکہ میں

رائے میں جو لوگ صاحبِ عقل و فہم ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ مخابراتی نظام جو ۱۹۶۱ء کے آخر تک مکمل ہو جائے گا فوجی حملے کو برداشت نہ کر سکے گا لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ تعمیری کام ہم آیندہ کی خوشحالی اور امن و سلامتی کے لئے کر رہے ہیں اور ہمارا اس سے مقصد جنگ اور تباہی نہیں ہے۔ جو ممالک سنٹو کے ممبر ہیں وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک عالمگیر جنگ کے شروع ہونے کے امکانات ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ہرگز یہ نہ چاہیں گے کہ اس قسم کے مایوس کن خیالات ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔

میری رائے میں سنٹو انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلر سائنس[1] کے قیام نے ہمارے افکار اور نظریات کو پورے طور پر واضح کر دیا ہے کیونکہ اس ادارے نے اپنی تمام خدمات اس کام کے لئے وقف کر دی ہیں کہ نیوکلر طاقت[2] کو کس طرح امن اور صلح کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ ادارہ جس کا افتتاح میں نے ۱۹۵۹ء کے وسط میں کیا تھا تہران یونیورسٹی کی فیکلٹی آف سائنس کا ایک شعبہ ہے۔ اس ادارے کا ساز و سامان دولتِ متحدہ[3] برطانیہ نے فراہم کیا ہے۔ پڑھانے والا عملہ برطانوی، ترکی، پاکستانی اور ایرانی اساتذہ پر مشتمل ہے اور یہاں پڑھنے والے طلباء انہی ممالک سے آتے ہیں جو سنٹو کے ممبر ہیں۔ پہلے سال میں ریڈیو آیزوٹوپ[4] کی تکنیک اور اس کا استعمال بتایا جاتا ہے۔ (ریڈیو آیزوٹوپ ایک سائنس کی اصطلاح ہے جس کے تحت یہ بتایا جاتا ہے کس طرح مختلف غیر مستقیم اجزا کی شعاعوں کو کام میں لایا جا سکتا ہے) کورس کی تکمیل کے بعد طلباء کو یہ موقع دیا جاتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ ایک سال میں سیکھا ہے اس کی روشنی میں سنٹو ممالک کے مسائل پر غور و فکر کریں۔ تعلیمی معیار کے سلسلے میں اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ کسی طرح امریکہ یا برطانیہ کے معیارِ تعلیم سے کم نہ ہو۔

ریڈیو آئزوٹوپ متعدد طریقوں سے دنیا کے اس حصے کے لئے ترقی کا سبب بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی غدودوں کا مریض تھوڑی سی ریڈیو ایکٹیو آیوڈائن[5] پی لے جو بے ضرر مادّہ ہے تو یہ مریض کے درقی غدودوں میں جمع ہو جائیں گی اور ڈاکٹر تجربات و آزمائش کے بعد بڑی آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ مریض کے غدودوں میں کس قسم کا عارضہ ہے۔ اور اس سے علاج میں بہت زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر ریڈیو آرسنک[6] کسی مریض کے جسم میں داخل کر دیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ورم کہاں ہے۔ خواہ یہ ورم مریض کے دماغ میں ہو یا جسم کے کسی اور حصے میں اور آپریشن کے وقت اگر ذرا سا بھی سرطان کی قسم کا کوئی بھی ذرہ پٹھوں یا گوشت کے ریشوں میں اٹکا رہ جائے گا تو سرجن فوراً ہی اینٹی مشینوں اور آلوں کے ذریعے اس کو معلوم کر لے گا۔ اس کے علاوہ ریڈیو فسفورس[7] کو خون میں سرخ خلیوں کی زیادتی کو روکنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

زراعت کے میدان میں ریڈیو آئزوٹوپ کے ذریعے بالکل ٹھیک بتایا جا سکتا ہے کہ پودوں کو کتنی مقدار میں کھاد دینی چاہیئے اور اس میں سے وہ کتنا شورہ اپنے میں جذب کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی معلومات نہ صرف ایران

1. SENTO INSTITUTE OF NUCLEAR SCIENCE 2. NUCLEAR ENERGY
3. UNITED KINGDOM 4. RADIO ISOTOPES 5. RADIO ACTIVE IODINE
6. RADIO ARSENIC 7. RADIO PHOSPHORUS

کو بلکہ دوسرے سنٹو کے ممبر ملکوں کو بھی کیمیاوی کھاد کے استعمال کے طریقے بتانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اسی طرح ریڈیو آئزوٹوپ کے ذریعے یہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ کیڑوں کو مارنے والی اور گھاس پھوس کو ختم کرنے والی دوائیاں کس طرح پودوں پر عمل کرتی ہیں۔ اور اب تو ریڈیو ایکٹیو[1] کے ذریعے فصلوں کو تباہ کرنے والے کیڑوں کا بھی پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے اور ان کے رہن سہن اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے طریقوں کا بھی دقیق مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مادہ کیڑوں کو ریڈیو ایکٹیو کے ذریعے بانجھ کر دیا جائے تاکہ جب یہ اپنے نر سے جفتی کریں تو آگے نسل نہ بڑھ سکے اور اس طرح کیڑوں کی تعداد کو کم کیا جا سکتا ہے۔ امریکی سائنسدانوں نے کچھ علاقوں میں اپنے اس عمل سے کیڑوں مکوڑوں کی نسلیں ختم کر دی ہیں۔

سنٹو منطقے میں جتنے ممالک شامل ہیں انہوں نے حال ہی میں تجارتی اور صنعتی امور میں ریڈیو آئزوٹوپ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے ذریعے باریک سے باریک دھات کی چادر کی تہہ، کسی استرکاری کی ضخامت یا گھسے ہوئے بیرنگ کا قطر معلوم کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ دھات کے بنے ہوئے تسمے کتنے بڑے ہیں۔ ڈھلائی یا جھلائی میں جو نقص رہ جاتے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی اسی سے ہو سکتا ہے۔ ریڈیو آئزوٹوپ سے پانی اور دوسرے مائعات کا بہاؤ بھی ناپا جا سکتا ہے۔ باندھوں اور پائپ لائنوں کے سوراخ اور دراڑیں دریاؤں اور بندرگاہوں میں کیچڑ کے گاڑھے پن اور بہاؤ کی رفتار کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے آلوں سے یہ بھی پتہ چل سکتا ہے کہ پائپ لائنوں میں تیل کی روانی اور نکاس کی کیا کیفیت ہے۔

امن پسندانہ مقاصد کے لئے ایٹمی طاقت کے اتنے وسیع اور امید افزا امکانات ہیں کہ کوئی تعجب نہیں کہ سنٹو منطقے کا ہر ملک اپنے ہاں ریڈیو آئزوٹوپ کے مراکز قائم کرلے اور تہران کے مرکز سے بنیادی تحقیق کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھائے۔

سنٹو منطقے کے ممالک میں تکنیکی تعاون صرف نیوکلر طاقت کے استعمال تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے تحت اور بھی بہت سے تکنیکی امداد کے منصوبے چل رہے ہیں جن میں زراعت، تعلیم اور عوام کی صحت پر خاص توجہ دی جا رہی ہے اس کے علاوہ تجارت اور سیر و سیاحت کے محکمے کو بھی ترقی دی جا رہی ہے۔ ان میں سے کچھ منصوبے سنٹو کے مغربی ممبران کی مدد سے شروع کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ نے پورے سنٹو منطقے کے جانوروں کی دیکھ بھال اور ان میں بیماریوں کو روکنے کے لئے ایک مشیر بھیجا ہے اور برطانیہ نے تینتیس وظیفے اس منطقے کے لئے وقف کئے ہیں۔ یہ وظائف صرف ان طلباء کو دیئے جائیں گے جو جانوروں کے معالجے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

میری رائے میں ان سارے منصوبوں میں سے وہ منصوبے ہماری خاص توجہ کے مستحق ہیں جن کے ذریعے مشرقِ وسطیٰ کے سنٹو ممبران کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہوں۔ مثال کے طور پر ترکی کی

1. RADIO ACTIVE

حکومت نے ہم سے درخواست کی کہ ہم پستے اگانے اور ان کو مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی تکنیک اُس کے آدمیوں کو سکھائیں۔ ہم نے ترکی کی درخواست کو فوراً منظور کر لیا اور اِس وقت ترکی کے دو باشندے ہمارے ملک میں پستوں کی کاشت کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے منصوبے کے تحت ہمارے آدمی ترکی گئے ہیں اور وہ وہاں یہ سیکھ رہے ہیں کہ خشک میووں کی مختلف قسموں کو کس طرح الگ الگ رکھا جائے۔ پاکستان کو جوٹ کی صنعت کا کافی طویل تجربہ ہے اور وہ ہم کو جوٹ کا سامان تیار کرنے کی تازہ ترین تکنیک سکھا رہا ہے اور ہم اپنے شریک کار ممالک کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ پٹ سن کو کس طرح کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے۔ مجھے امید ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے وہ ممالک جو سنٹو کے ممبر ہیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں جیسے جیسے ترقی پذیر ہوں گے باہمی تعاون اور زیادہ بڑھے گا اور یہ تعاون ہم کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے راستے پر تیزی سے تکمیل کی طرف لے جائے گا۔

اِن امن پسندانہ و صلح جویانہ کاموں سے زیادہ سنٹو کا براہِ راست تعلق ملک کے دفاعی امور سے ہے۔ یہ کہتے ہوئے ہم کو ندامت نہیں بلکہ اس کے برعکس فخر ہوتا ہے کہ ہم اس تنظیم میں اپنی آزادی کے تحفظ کی خاطر شریک ہوئے ہیں۔ ہماری اس تنظیم کو اقوامِ متحدہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ امن و صلح کی راہ میں ہم جو بھی قدم اٹھاتے ہیں اس کی اطلاع اقوامِ متحدہ کو بھی دی جاتی ہے اور دنیا کے تمام ممالک کو بھی۔ اب تو ہمارے کمیونسٹ دوستوں کے لئے بھی ایسے دلائل پیش کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے جس سے وہ یہ ثابت کر سکیں کہ سنٹو کوئی جارحانہ یا فوجی طرز کی سازشی تنظیم ہے اور اس کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ میں امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

سنٹرل[1] ٹریٹی آرگنائزیشن کی اپنی شورائے عالی ہے جس کے تحت تین بڑی تنظیمیں چل رہی ہیں جو سنٹو کے دفاعی اور تحفظی امور کی نگرانی کرتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے درجے پر 'مستقل[2] فوجی نمایندوں کی جماعت' ہے جو ۱۹۶۰ء کے شروع سے ہی انقرہ میں مقیم ہے اور اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔ (اس جماعت میں سنٹو ممبران کے اعلیٰ فوجی افسر جن میں امریکہ کا نمایندہ بھی شامل ہے) اپنے اپنے ملک کے نمایندوں کی حیثیت سے شریک ہیں۔ یہ جماعت سنٹو منطقے کی حدود میں فوجی منصوبوں کی تیاری پر مفصل غور و فکر کرتی ہے اور مشترکہ[3] ملٹری پلاننگ اسٹاف، جو منصوبے اور نقشے تیار کرتا ہے یہ جماعت ان کا مطالعہ کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے سنٹو کے ممبر ممالک کی تاریخ میں مستقل فوجی نمایندوں کی یہ جماعت اپنی نوعیت کی پہلی جماعت ہے جو اتنے قریب سے متواتر اس منطقے کے مشترکہ دفاعی مسائل کے متعلق غور و فکر کرتی ہے۔

سنٹو کی دفاع و امن سے متعلق دوسری تنظیم تخریب کار عناصر کی سرکوبی کی جماعت[4] ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں جو ریڈیو کے ذریعے جھوٹا پروپیگنڈا کر کے عجیب اور غیر دانشمندانہ کارروائیاں کی جا چکی ہیں ان کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہ جماعت تخریبی کارروائیوں اور دیگر پست افعال و اعمال کو روکنے کے لئے اقدامات کرتی ہے تیسری تنظیم رابطہ

1. CENTRAL TREATY ORGANIZATION 2. PERMANENT MILITARY DEPUTIES GROUP
3. COMBINED MILITARY PLANNING STAFF 4. COUNTER-SUBVERSION COMMITTEE

قائم رکھنے والی جماعت[1] ہے۔ یہ جماعت سنٹو کے ممبران کے درمیان اس منطقے کی سلامتی و تحفظ سے متعلقہ جو اہم خبریں ہوتی ہیں جلد از جلد فراہم کرتی ہے۔

اگرچہ سنٹو نے اس قدر ترقی کی منزلیں طے نہیں کی ہیں جتنی ناٹو[2] نے لیکن پچھلے دو سالوں میں اس کی آگے بڑھنے کی رفتار بہت نمایاں رہی ہے اور بعض امور میں اس کی سرگرمیاں ناٹو کے مقابلے میں کہیں وسیع اور کشادہ ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے منطقے کے ممالک کی اقتصادی ترقی میں بہت حد تک ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ سائنٹفک اور تکنیکی تعاون کے پروگراموں کے ذریعے اس نے بہت سی اِس منطقے کی عملی مشکلات کو دور کر دیا ہے۔ اور پورے منطقے کے لوگوں میں تکنیکی ذوق و استعداد کے جذبے کو بیدار کرنے کے علاوہ مستقبل کی ترقیات کی بنیادوں کو بھی استوار کیا ہے۔ امن و صلح کے میدان میں سنٹو نے بہت سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد اُن تخریبی عناصر کو جو رات دن فتنہ و فساد بپا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں (اور جس کو کمیونسٹ ذہن پُرامن بقا کا ضروری جُز سمجھتے ہیں) روکنے کے منصوبے تیار کئے ہیں۔ جو تجاوزات اور دراز دستیاں دنیا کے اس حصّے میں ہو سکتی ہیں ان کو روکنے کے لئے سنٹو نے ایک مفصّل پروگرام تیار کر رکھا ہے۔ اور ان منصوبوں کے کچھ حصّوں پر جنگی مشق کے ذریعے بحری، برّی اور ہوائی تجربے اور آزمائشیں بھی کی جا چکی ہیں۔ خواہ نقشے اور منصوبے ہیڈ کوارٹرز میں تیار کئے گئے ہوں یا میدانوں میں ان کی مشقیں کی گئی ہوں سنٹو کے ممبر ممالک نے بھائیوں کی طرح شانہ بشانہ ہو کر کام کئے ہیں اور سب نے مل کر انسان کی آزادی پر مُنتج اور امن کے لئے خطرہ پیدا کرنے والے عناصر کو کچل دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں ہماری فوج نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ اس کی آتشی اسلحہ کی طاقت پہلے کے مقابلے میں کئی گُنا بڑھ چکی ہے اور اسی مناسبت سے اس کی استعداد اور سُرعتِ عمل میں بھی افزایش ہوئی ہے۔ ہم فوجیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ بہت سے دیہاتی جب فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آتے ہیں تو بالکل اَن پڑھ ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں کوئی ہُنر بھی نہیں ہوتا لیکن جب وہ فوجی تربیت حاصل کر کے واپس جاتے ہیں تو اپنی معلومات اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے آج کی جمہوریت کے اچھے شہری بن چکے ہوتے ہیں حال ہی میں ہم نے پورے ملک میں نمائش کی غرض سے فوجی مراکز قائم کئے ہیں تاکہ لوگ وہاں جا کر یہ دیکھ سکیں کہ فوجی کس طرح رہتے ہیں اور فوجیں کیا کام کرتی ہیں۔ چنانچہ ہزاروں ایرانی کنبوں کے افراد اپنے بچّوں سے تربیت کے دوران اِن مراکز میں جا کر ملے ہیں یہ مراکز قائم کر کے جو نتائج اخذ ہوئے ہیں وہ بہت ہی حوصلہ افزا ہیں۔

فوج کے بعد دیہی پولیس کا شمار ہوتا ہے جس کا فوج سے بہت گہرا تعلق ہے اس کا قیام میرے والد کے عہد میں دیہاتوں سے لُوٹ کھسوٹ اور بد امنی کو روکنے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ آج اس کے عملے کی تعداد ایک ہزار افسروں اور تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہے جو پورے ملک کی دو ہزار چوکیوں پر متعیّن ہیں۔ دور دراز پہاڑی درّوں، دولہو

1. LIAISON COMMITTEE 2. NATO

اور دیگر دشوار گذار مقامات پر جگہ جگہ پولیس چوکیاں نظر آئیں گی جہاں پر چھ سے اٹھارہ تک آدمی پہرے پر رہتے ہیں۔

پورے ملک میں پولیس ہی ایک ایسا محکمہ ہے جس نے ہر جگہ امن قائم کر رکھا ہے درحقیقت قانون کا محافظ یہی عملہ ہے۔ ہماری پولیس ڈاکوؤں، اسمگلروں، قاتلوں، فوج سے بھاگے ہوئے سپاہیوں اور چور اچکوں و بدمعاشوں پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ گرفتاری کے وارنٹ پیش کرنا اور دیگر عدالتی کارروائیوں پر عمل درآمد کرانا پولیس کا ہی کام ہے۔ اس کے علاوہ ہماری پولیس پوست کی کاشت کی روک تھام بھی کرتی ہے اور جب قبیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں تو پولیس ان کی نگرانی بھی کرتی ہے اور حفاظت بھی۔

پورے ملک کا اسّی فی صدی علاقہ جس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے (پورے ملک کی آبادی دو کروڑ ہے) پولیس کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ ہماری پولیس کا ریڈیو کے ذریعے خبر رسانی کا انتظام قابلِ ستائش ہے۔ اس کی تحویل میں گشتی اور قائم دونوں قسم کے ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ ان ریڈیو اسٹیشنوں نے ملک کے دور دراز گوشوں کا تہران سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے پولیس کے سپاہیوں کو ہلکے جدید قسم کے ہتھیار اور دوسرا ضروری ساز و سامان جس میں ہیلی کوپٹر بھی شامل ہے مہیا کریں۔

مرکزی حکومت اور عام دیہاتیوں کے درمیان پولیس نے ہی رابطہ قائم کر رکھا ہے اور شاید اسی لئے یہ بات عام لوگوں میں مشہور ہے کہ اچھا سپاہی اچھی حکومت کا اور برا سپاہی نکمّی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہماری پولیس کے تقریباً سب ہی افسر اور سپاہی ایماندار اور بہادر ہیں۔ وہ لوگ جو گھروں میں پڑے ہماری پولیس پر اعتراضات کرتے ہیں ان سے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ چند ماہ کے لئے گھر سے باہر نکلیں اور ہماری پولیس کے ساتھ تعاون کر کے دیکھیں تاکہ ان کو ہماری پولیس کی فرض شناسی کا اندازہ ہو سکے۔ اس بات سے میں انکار نہیں کرتا کہ اب سے پہلے پولیس کے افسر اور سپاہی اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا کرتے تھے اور میرے والد باوجود اپنی تمام سختیوں کے پورے طور پر پولیس کی بدعنوانیوں کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

رضا شاہ کو فریب دینا کوئی آسان کام نہ تھا اور اسی لئے وہ پولیس کے کرتوتوں سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ رضا شاہ اور ان کی کابینہ کے وزیر پولیس چوکیوں اور تھانوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ ایک تھانے میں پہنچے میرے والد نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے اپنی جیبوں پر مارا اور اپنے ساتھیوں سے بلند آواز میں کہا "اپنی جیبوں سے ہوشیار رہنا۔"

اس وقت سے اب تک اور خاص طور پر پچھلے دو سالوں میں ہماری پولیس نے اپنے حسنِ عمل اور طرزِ رفتار میں نمایاں ترقی کی ہے۔ جو لوگ پولیس کی خدمات کو جانتے ہیں وہ اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم بدعنوانیوں کا خاتمہ دو طریقوں سے کیا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو پولیس کے محکمے میں اندرونی طور پر تفتیش کرائی جاتی ہے اور دوسری

طرف جو عوام کی شکایات حکومت اور شاہی تفتیش کے محکمے کو پہنچتی ہیں ان کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کے لئے تقسیم اراضی کے کام میں پولیس نے ہماری کافی مدد کی ہے کیونکہ اب سے پہلے بدعنوانیاں اس لئے ہوا کرتی تھیں کہ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار پولیس پر اپنا دباؤ ڈالا کرتے تھے۔

آج ہر تھانے کا عملہ اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے حسن انتظام، عوامی خدمت اور صحت و صفائی کے کاموں کی وجہ سے ایسی مثال بن گیا ہے جس کی پیروی کی جاسکتی ہے۔ ایران کے شہروں کے بسنے والے اور غیر ملکی سیاح اگر ہماری دیہی پولیس کا مشاہدہ و معائنہ کریں تو وہ یہ دیکھیں گے کہ اس محکمے نے پچھلے چند سالوں میں نمایاں ترقی کی ہے اور اس کے اخلاق و کردار میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔

بری طاقت کے علاوہ ہمارے پاس اپنی مختصر سی بحری فوج بھی ہے۔ جو بحر خزر اور خلیج فارس کی نگرانی کرتی ہے بڑی طاقتوں کا تو ذکر ہی کیا جن ممالک کی بحری طاقت درمیانے درجے کی ہے ہماری بحری طاقت کا اس سے بھی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا لیکن یہی ہماری مختصر سی بحری طاقت ایران کے ساحلوں کی حفاظت، دریائی لٹیروں اور اسمگلروں کا قلع قمع کرنے اور پریشانی کی حالت میں بحری بیڑے کو مدد دینے میں بحسن و خوبی اپنی خدمات انجام دیتی ہے اور اگر کسی وقت نہ چاہتے ہوئے بھی کسی چھوٹی موٹی بحری جنگ میں ہم گھر جائیں تو ہماری یہی فوج اپنے دوست ممالک کی بحری فوج کے تعاون سے دشمنوں کا مقابلہ بھی کر سکتی ہے۔ خلیج فارس میں چونکہ ہمارا تسلط ہے اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی بحری طاقت کو جلد از جلد مضبوط بنائیں۔

ہماری اپنی چھوٹی سی ہوائی طاقت بھی ہے۔ جو اس مقصد کے تحت بنائی گئی ہے کہ اگر کوئی چھوٹے پیمانے پر لڑائی ہو جائے تو ہماری بری فوج کی مدد کر سکے۔ تربیت کے اعتبار سے پچھلے چند سالوں میں ہماری بحری اور ہوائی فوج کا معیار کافی بلند ہوا ہے۔ ہمارے جنگی جیٹ جہازوں کے پائلٹوں نے فضا میں کرتب اور پرواز کی مشقیں دکھا کر فضانوردی کے ماہرین کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اسی کے ساتھ کوئی بھی صحیح الدماغ شخص، بجز کسی ریاکار کے، اپنے ذہن میں یہ تصور بھی نہیں لا سکتا کہ ہماری ہوائی فوج تو کیا بلکہ پوری فوج باوجود اتنے سازوسامان کے اس قابل ہو کہ اپنے اتنے بڑے اور طاقتور پڑوسی ملک کے لئے خطرے کا باعث بن سکے۔ ہماری ہوائی طاقت ابھی بہت کم ہے اور ہمیں چاہئے کہ اس کو مزید توسیع دیں۔

ایران کی مسلح فوج میں جو بہت سی اصلاحات ہوئی ہیں اس کے لئے ہم امریکہ کے مرہون منت ہیں ۱۹۴۳ء میں ایک چھوٹا سا مشن ہماری پولیس کی اصلاح کے لئے امریکہ سے ایران آیا تھا اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں دوسرا لیکن بڑا اور مفصل فوجی امداد اور مشورے کا مشن ہمارے ملک میں قائم ہوا۔ اس مشن نے فوج کی تنظیم اور تربیت کے سلسلے میں ہمیں بڑے قیمتی مشورے دیئے ہیں اور اسی کی بدولت ہمیں بہت سا اسلحہ اور رسد کا سامان بغیر قیمت ادا کئے امریکہ سے ملا ہے۔

چونکہ ہم ابھی اپنے قومی تعمیری کاموں میں لگے ہوئے ہیں اس لئے پیسے کی کمی ہے۔ لیکن جنگی سامان مُفت مِل جانے کی وجہ سے ہم بہت سی مالی مشکلات سے بچ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا شروع سے ہی امریکی حکومت سے یہ معاہدہ ہے کہ ایران میں اس کے فوجی افسروں کی حیثیت محض مشیروں کی ہوگی اور وہ لوگ کسی فوجی کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ امریکی امداد نے ہماری محدود فوج کی استعداد اور طاقت کو بہت زیادہ سہارا دیا ہے اور ہمارے ملک و قوم کے تحفظ کے لئے بہت بڑا کام کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اُن بالواسطہ اتفاقیہ مواقع کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیئے جو اس فوجی امداد کی وجہ سے حاصل ہوئے ہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ خواہ امریکی امداد ملتی یا نہ ملتی ہم اپنے تحفّظ کے لئے فوجی طاقت کو مضبوط بناتے جس کے لئے ہمیں روپیہ بھی خرچ کرنا پڑتا۔ لیکن امریکی فوجی پروگرام کے تحت امداد مِل جانے سے ہماری آمدنی کی وہ رقم جو فوج پر خرچ ہوتی دوسرے تعمیری اور حفاظتی کاموں کے لئے بچ گئی (ان تعمیری کاموں کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں) مثال کے طور پر اگر ہمیں امریکی فوجی امداد نہ ملی ہوتی تو ہم اپنی سالانہ آمدنی کا پانچواں حصّہ تعلیم پر نہ خرچ کر پاتے۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ امریکہ کی فوجی اور غیر فوجی امداد نے ہمیں براہِ راست اور بالواسطہ فائدہ پہنچایا ہے لیکن اگر میں یہ کہوں تو لوگ اس کو میری احسان فراموشی نہ سمجھیں گے کہ جو کچھ ہمیں امریکہ سے مدد ملی ہے وہ اس کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہیں جو اس نے دوسرے ممالک کو دی ہے قبل اس کے کہ میں اس موضوع کو زیادہ وضاحت سے بیان کروں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فوجی نقطۂ نظر سے ہمارے ملک کی کیا اہمیت ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں ہمارے طاقتور دشمن بخوبی واقف ہیں اس لئے یہاں میرا کچھ کہنا راز فاش کرنے کے مصداق نہ ہوگا۔

ایک ظریف کا کہنا ہے کہ دنیا میں آج ایسا کوئی ملک نہیں ہے جس کی فوجی اعتبار سے کوئی اہمیت نہ ہو۔ اگرچہ کہنے کو یہ ایک لطیفہ ہے لیکن اس میں بہت حد تک صداقت پنہاں ہے۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا کو لے لیجئے بظاہر یہ برّاعظم الگ تھلگ ہے اور بہت دور بھی واقع ہے لیکن روسی راکٹوں کی زد سے باہر نہیں اور یہی بات اُن میزائلوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے جن کا رُخ اُس طرف سے اِدھر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اِس ایٹمی دور میں میزائل، لمبی پرواز لینے والے ہوائی جہاز، پانی کی سطح پر چلنے والے جہاز، آب دوز کشتیاں، مصنوعی اقمار[1] سب ہی فوجی اعتبار سے اپنی حیثیت اور اپنا مقام منوالیں گے اور ان کی حالت ان گداگروں اور فقیروں کی سی ہوگی جن کو شہر میں ڈھونڈا جائے تو کسی کو ان کا پتہ معلوم نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ مصنوعی اقمار ایک معیّن مدار میں ہی حرکت کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی کیفیت اور حالت ان ممالک جیسی نہیں ہے جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے زمین کی سطح پر کسی کونے میں پورے سکون و آرام سے آباد ہیں۔

جغرافیائی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ایران ہمیشہ سے اس چار راہے پر

1. SATELLITES

واقع ہے جس کی تجارتی اور فوجی اعتبار سے خاص اہمیت ہے اور آج یہ بات اس پر پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ صادق آتی ہے کیونکہ یہ کوئی محض اتفاقی امر نہ تھا کہ پچھلی چند صدیوں میں جبکہ مغرب سے مشرقِ بعید تک سفر کاروانوں کے ذریعے کیا جاتا تھا اور وہ شاہراہ جو "ابریشم کی راہ" کے نام سے مشہور تھی اور مغرب و مشرق کے براعظموں کو ملاتی تھی ایران سے ہی ہو کر گذرتی تھی۔ ایران کی حیثیت آج بھی ویسی ہی ہے اور جو ہوائی راستے آج تمام براعظموں کو ایک دوسرے سے متصل کئے ہوئے ہیں تہران سے ہی ہو کر گذرتے ہیں۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں جتنی بھی اہم فوجی چڑھائیاں مشرقِ وسطیٰ میں ہوئی ہیں ان کی ابتدا یا تو ایران سے ہوئی یا ان کا براہِ راست اثر اس ملک پر پڑا۔ آج بھی جغرافیائی اور فوجی نقطۂ نظر سے ایران کو سنٹو کا مرکز کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ سنٹو چونکہ ناٹو اور سیٹو کے بالکل درمیان واقع ہے اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ میرا ملک تمام معاہدوں اور پیمانوں کا مرکز ہے۔

اگر ایران کو بالکل بے دست و پا کر دیا جائے تو دائیں اور بائیں بازو کی ناٹو و سیٹو طاقتوں کے علاوہ مرکزی طاقت سنٹو اور اس سے متعلقہ تمام ممالک کے لئے زبردست خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ مجھے یہ بات واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اگر شمال کی طرف سے یا شمالی طاقت کی شہ پر کسی اور طرف سے ایران پر حملہ کیا گیا اور اس کو نہ روکا گیا تو یہاں سے بہت بھاری مقدار میں مالِ غنیمت حملہ آوروں کو ملے گا۔ ہماری گرم پانی کی بندرگاہوں اور تیل کے میدانوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بھرپور قدرتی ذرائع بین الاقوامی امن کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ہاتھ لگیں گے اور اِن امن دشمنوں کے لئے دو طرفہ حملے کی راہیں ہموار ہوں گی ایک طرف یہ جزیرہ نماعرب تک گھستے چلے جائیں گے اور دوسری طرف نہر سوئز کے راستے سے براعظم افریقہ پہنچ کر دم لیں گے اب اس سے زیادہ اور کیا باتیں اُن لوگوں کے لئے پُرفریب اور فریفتہ کرنے والی ہو سکتی ہیں جو زبان سے تو مسلسل امن و صلح کی باتیں کرتے ہیں لیکن یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ دل سے اس کے قائل نہیں۔

اگر پورے حالات کو دوسرے رُخ سے دیکھیں تو آپ بھی یہی کہیں گے کہ اگرچہ ایران ناٹو، سنٹو اور سیٹو کے سلسلے کی اہم کڑی ہے لیکن پورے سلسلے میں کمزور ترین کڑی بھی یہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف ہمارے ملک کی تاریخ درخشاں ماضی اور قومی افتخار کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے جس میں ملّی وحدت و ثبات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ ہم ترقی کی شاہراہ پر تیز گام بھی ہیں اور ذاتی تجربات کی بنا پر کمیونسٹوں کی متجاوزانہ سرگرمیوں سے بھی باخبر ہیں لیکن دوسری طرف ہماری مسلح فوجوں کی اور خاص طور پر ہوائی فوج کی حالت بہت کمزور ہے اور اس کے پاس جدید ترین قسم کا وہ ساز و سامان نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔

اب ہمارا مقابلہ عراق سے ہی کر لیجئے (ہماری آرزو ہے کہ ہمارے تعلقات اس ملک سے اوروں کے مقابلے میں

زیادہ خوشگوار رہیں) اس ملک کی کُل آبادی ہمارے ملک کی آبادی سے ایک چوتھائی ہے اور ملک کا رقبہ ہمارے ملک کے رقبے کا پانچواں حصّہ لیکن اس کی ہوائی طاقت ہماری ہوائی طاقت سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اس کے پاس جدید ترین قسم کے جیٹ لڑاکا ہوائی جہاز ہیں جو ہمارے پُرانی ساخت کے امریکی جہازوں کو آسانی سے پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔ اسی طرح اس کے پاس جدید قسم کے بم مارنے والے جیٹ جہاز بھی ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ عراق کی مسلح فوج کے پاس بطور مجموعی ہماری مسلح فوج سے زیادہ جنگی سامان ہے کیونکہ اس کو یہ سامان برطانوی اور روسی حکومتیں مہیّا کرتی ہیں جبکہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے ہمیں تقریباً کل امداد صرف امریکہ سے ہی ملتی رہی ہے۔ جو کچھ ہمیں اب تک امداد ملی ہے اسکے لئے ہم بہت شکرگذار ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جو کچھ ہمیں دیا گیا ہے وہ ہماری اور آزاد دنیا کے اس اہم حصّے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

یہاں مزید میں یہ کہوں گا کہ اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک نے امریکہ سے تکنیکی، اقتصادی اور فوجی امداد لی ہے لیکن جب اس کا تقابل اُس امداد سے کیا جائے گا جو امریکہ نے دوسرے ممالک کو دی ہے تو بہت نمایاں اور عجیب فرق نظر آئے گا۔

امریکہ کے قرضوں اور امدادی رقموں کے سرکاری اعداد و شمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے جتنی رقم امریکی حکومت کی طرف سے روس کو براہِ راست غیر فوجی امداد کے طور پر دی جا چکی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو اب تک ایران کو ملی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دنیا کی مت ہی اُلٹی ہے۔ امریکہ نے جو روس کو امداد دے کر سہارا دیا یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ دوسری جنگِ عظیم ختم ہی ہوئی تھی اور روس کی حالت بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ اس وقت تک روس و امریکہ کے سیاسی تعلقات کی کشیدگی کی نوبت "طلاق" کے مرحلے تک نہیں پہنچی تھی لیکن اس وقت سے اب تک کافی عرصہ گذر چکا ہے اور یہ بات بالکل عجیب لگتی ہے کہ ایران جو امریکہ اور پوری آزاد دنیا کا یارِ باوفا رہا اس پورے عرصے میں روس کے برابر بھی امریکہ کی امداد نہ پا سکا۔

اس کے علاوہ اس تمام مدّت میں امریکہ نے جو ایران کی فوجی اور غیر فوجی مدد کی ہے اس سے دوگنی سے زیادہ امداد تو وہ اب تک کمیونسٹ یوگوسلاویہ کو دے چکا ہے۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ میں یہ اعتراض کروں کہ امریکہ کیوں یوگوسلاویہ کو اتنی امداد دے رہا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بڑی عجیب لگتی ہے کہ ایک کمیونسٹ ملک اتنی بڑی مقدار میں امریکی امداد حاصل کرے اور ایران اس سے محروم رہے جبکہ اس نے ہمیشہ مغرب کا ساتھ دیا ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے جو اسپین کو امریکی امداد ملی ہے اس کی ایک تہائی رقم سے کچھ زیادہ ہی ہے جو اب تک ایران کو مل چکی ہے۔ ترک جو ہمارے بہت اچھے دوست ہیں ہمارے مقابلے میں تین گنا امریکی امداد حاصل کر چکے ہیں۔

میں یہاں تقابل کی ایک مثال اور دوں گا۔ جتنے عرصے تک امریکہ نے ہمیں فوجی اور غیر فوجی امداد دی ہے اتنے عرصے میں اس نے تائیوان کو ہم سے چار گنا زیادہ امداد پہنچائی ہے۔ اس بات کا میں اعتراف کرتا ہوں کہ مشرقِ بعید میں تائیوان کی فوجی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے لیکن پورے مشرقِ وسطیٰ میں ہماری حیثیت بھی تو فوجی اعتبار سے تائیوان سے کسی طرح کم نہیں۔

یہاں یہ سب کہنے سے میری ہرگز یہ مراد نہیں کہ یوگوسلاویہ، اسپین، ترکی، تائیوان یا روس ہی امریکہ کی امداد لازماً اس سے کم پاتے جو ان کو اب تک ملی ہے۔ میں تو امریکی رہنماؤں کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایران نے جو آزاد دنیا کے دفاع کے لئے کام کیا ہے اس کا مزید غور سے مطالعہ کریں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس طرف دھیان دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکی حکومت یقیناً ایران کو امداد دینے کے معاملے میں اور سب پر فوقیت و ترجیح دے گی۔

دنیا کے اس منطقے میں امن و تحفظ برقرار رکھنے کے مختلف ذرائع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امریکہ، ایران اور سنٹو ممبر ممالک کی امداد میں مزید اضافہ کرے (یہاں سنٹو ممبران کی آپس کی مدد کا ذکر نہیں ہے)۔ عرصے سے سنتے چلے آرہے ہیں اور اب تو سننے کے عادی ہو چکے ہیں کہ کمیونسٹوں کی رخنہ اندازیوں کو مغربی طاقتیں ہی ایٹمی اور دوسری طرح کے ہتھیاروں کے ذریعے روک سکتی ہیں لیکن میری رائے میں یہ بات بھی واضح طور پر ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہئیے کہ مشرقِ وسطیٰ میں کمیونسٹ حملوں کو روکنے کے لئے ہم کو چاہئیے کہ خود ہی کوئی مخصوص راہ اختیار کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہمارے ہاتھوں میں پوری طاقت ہو اس کے لئے ہم کو صحیح طریقوں پر خود ہی تعمیری کام کرنے ہوں گے۔

اس مقصد کی برآری کے لئے میں مختصر لفظوں میں یہاں تین اہم باتوں کا ذکر کروں گا جس پر فوری عمل ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو سنٹو کی پورے طور پر ممبری قبول کرلینی چاہئیے۔ میں کافی عرصے سے اس کو ممبر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیا وجہ ہے جو امریکہ اس معاملے میں پس و پیش کر رہا ہے جبکہ وہ پہلے سے ہی کئی بنیادی کمیٹیوں کا ممبر ہے۔ دوسرے یہ کہ سنٹو کا ترقیاتی پروگرام خواہ فوجی ہو، یا غیر فوجی نوعیت کا اس میں مزید توسیع ہونی چاہئیے۔ میری رائے میں دوسرے تمام معاہدوں سے علیحدہ اگر سنٹو کے مغربی ممبران سنٹو کی مالی امداد میں اضافہ کریں تو اس سے نہ صرف ان کو بلکہ آزاد دنیا کو بھی اس سے فائدہ حاصل ہوگا۔ تیسرے یہ کہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے سنٹو کو چاہئیے کہ مستقل فوجی نمائندوں کی جماعت میں سے ایک کمانڈ تیار کرے جس میں سنٹو کے تمام ممبر ممالک کے نمائندے شامل ہوں۔

اس بات کا قطعی امکان ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ کا آغاز ایران سے ہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس بات کے خواہشمند ہوں کہ ایران کے اہم فوجی ناکوں پر جنگ کے شعلے بھڑکیں لیکن اس بات کی پوری کوشش کی جانی چاہئیے کہ ایسی جنگ جو ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے نہ صرف ایران بلکہ دنیا کے کسی بھی گوشے سے شروع نہ ہو آج

لاکھوں کمیونسٹ مارکس[1]، انگلس[2] اور لینن[3] کی کتابیں اس یقین کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ غیر کمیونسٹ ممالک سے جنگ ناگزیر ہے لیکن تمام کمیونسٹ پارٹی کے ممبران نے کم وبیش یہ اندازہ تو لگا ہی لیا ہوگا کہ موجودہ سائنس ٹکنالوجی اور جدید ایٹمی ہتھیاروں نے کمیونسٹ فلسفے کے بانیوں کے افکار و نظریات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

جہاں تک مسٹر خروشچف کے متعلق مجھے علم ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے کمیونسٹوں کے مقابلے میں وہ مارکس کے نظریات کی سخت بندشوں میں کم جکڑے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بھی دوسروں کی طرح فنا پذیر ہی ہیں۔ (کیونکہ مارکس نظریات کے پیشوا بھی تمام افرادِ بشر کی طرح فنا پذیر ہی تھے) لیکن اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت سوویت یونین میں امن کے لئے جو طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ بڑی گہرائی سے ابھر رہی ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ اب کمیونسٹ جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے اعتدال پسندی کی طرف مائل ہو رہے ہیں اس ملک میں بسنے والے حکومت کے اعلیٰ افسروں، جراثیم شناسوں، بس ڈرائیوروں اور راج مزدوروں کی بھی وہی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جو غیر کمیونسٹ ملکوں میں رہنے والے ان کے ہم پیشہ لوگوں کے ذہنوں میں پرورش پا رہی ہیں۔ روس کا ذہین، اعلیٰ دماغ اور با اصول پسند طبقہ اب پہلے کے مقابلے میں اپنی گرفت کو نرم کرتا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ اس حقیقت کو محسوس کر رہا ہے ممکن ہے کہ ان کے حقیقی دشمن وہ سرمایہ دار نہ ہوں جن کو وہ موردِ الزام قرار دیتا ہے۔ بلکہ اصلی دشمن وہ بھیانک بھوت ہو سکتا ہے جو مشرقِ بعید میں بیٹھا ہوا اپنی آبادی اور رقبے کو برابر بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔

جب روس کے داخلی امور میں بغیر محسوس کئے ارتقاء ہوگا تو اس کا اثر دنیا کے آزاد ممالک پر بھی پڑے گا لیکن اس ارتقاء کی مدت کے دوران ایٹمی دھماکوں اور حملوں کا ڈر، تخریب کار عناصر ملک کے اندر اور باہر سے تباہ کن سازشیں، حملوں کی تیاریاں اور ان کا خوف جاری رہے گا اور ان تمام کمیونسٹ سامراجیت کی کارروائیوں کو روکنے کے لئے ہمیں سینہ سپر ہو کر ان سب حالات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

یہاں میں یہ بھی پیشین گوئی کئے دیتا ہوں کہ ایک دن وہ آئے گا جب روسیوں کو تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت چین کی آبادی ہر نسبت سے روس سے زیادہ ہے اور آگے چل کر اس کے تناسب کا فرق برابر بڑھتا چلا جائے گا چینی بظاہر اور خفیہ دونوں طریقوں سے خود کو روسیوں کے خلاف ایٹمی ہتھیاروں اور میزائل سے مسلح کریں گے اور وہ کوشش کریں گے کہ اپنے خیالات و نظریات کو پھیلا کر اور فوجی دباؤ کے ذریعے تمام کمیونسٹ ممالک کی قیادت حاصل کر لیں۔ یہ ممکن ہے کہ اختلافات سطح پر نہ آئیں لیکن اندر ہی اندر دونوں طاقتوں کے نظریاتی اختلاف شدید طور پر بڑھتے چلے جائیں گے۔ اس عرصے میں مغربی اقوام خواہ کتنی ہی کوشش کریں کہ اپنے افکار و نظریات کو آگے بڑھتی ہوئی سوسائٹی سے ہم آہنگ کریں لیکن پھر بھی وہ نظریاتی اختلاف کے دھارے کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔

روسی خواہ کتنا ہی اپنے نظریات کے حامی چینیوں کی دوستی کا دم بھریں لیکن ایک دن وہ مجبور ہوں گے کہ غیر کمیونسٹ

1. MARX 2. ENGELS 3. LENIN

ممالک کی طرف دوستی و مفاہمت کا ہاتھ بڑھائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ روس سے دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں لیکن دنیا کی بڑی طاقتیں اس کام پر اپنی پوری کوشش اور قوت صرف کر دیں گی کہ چین کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکا جائے اور اسی کے ساتھ وہ اُن اقوام سے جنہوں نے تعصب اور کٹر پن کو چھوڑ کر اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کر لیا ہے پورا پورا تعاون کریں گی۔

یہ تمام تبدیلیاں لانے کے لئے ایک طویل مدت چاہیئے۔ اس وقت کے آنے تک آزادی پسند اقوام کو چاہیئے کہ اپنے خیالات اور نظریات میں ثابت قدم و محکم رہیں اور اس نکتے کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مبہم اور غیر معیّن امن و صلح ایک بے معنی سی بات ہے کیونکہ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ کسی نفسیاتی مریض کو ہسپتال میں لے جایا جائے اور وہاں اس کے ذہن کو بالکل صاف کر دیا جائے اور وہ یہ محسوس کرے کہ اب اس پر پورے طور پر امن و سکون کی کیفیت ہے۔

۱۴۔ شاہ اور امورِ سلطنت

ایک بادشاہ کی روزانہ کی زندگی کا کیا معمول ہوتا ہے؟۔ کیا اس کا کام عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے؟۔ کیا وہ اپنے کام میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہے؟ شاید اس کتاب کے پڑھنے والوں کی یہ خواہش ہو گی کہ وہ مجھ سے ان سب سوالوں کے جواب دریافت کریں اور یہ بھی چاہیں کہ میں ان کے سامنے یہ وضاحت کروں کہ میرے نقطۂ نظر سے ایران جیسے ملک میں، جس کی شہنشاہیت اتنی قدیم ہوتے ہوئے بھی بالکل جدید طرز کی ہے، ایک بادشاہ کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور اس کے کیا فرائض ہیں۔

میری روزانہ کی زندگی میں ایک خاص ترتیب و تنظیم ہے۔ کبھی کبھی حالات اور مزاجی کیفیات کی تبدیلی کی وجہ سے اس میں تھوڑا بہت تغیر بھی آجاتا ہے۔ میں ہر روز صبح ساڑھے سات بجے بیدار ہوتا ہوں، نہانے اور چہرے کی اصلاح کے دوران ملکی معاملات پر غور و فکر کرتا ہوں یا پھر ان کاموں کے متعلق سوچنے لگتا ہوں جو اس دن مجھے کرنے ہوتے ہیں۔ یہ میرا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ ناشتے کی میز پر مرتب لباس پہن کر بیٹھتا ہوں۔ ناشتہ اکیلا ہی کرتا ہوں جو بہت ہلکا ہوتا ہے۔ عام طور پر ناشتے میں کسی پھل کا رس، ایک پیالی سیاہ قہوہ اور ایک توس لیتا ہوں اگرچہ ناشتہ کرنے میں مجھے دو یا تین منٹ سے زیادہ نہیں لگتے لیکن عام طور پر ناشتے کی میز پر تقریباً پون گھنٹے تک بیٹھتا ہوں۔ اور اخبارات پڑھتا رہتا ہوں۔ ہر صبح ایران کے اہم اخبار اور وہ جو امریکہ، انگلستان اور فرانس سے میرے لئے آتے ہیں ان کو غور سے پڑھنا میرے معمول میں شامل ہے۔ ان کے ساتھ ہی میں جرمن اور اطالوی خبروں کے ترجمے بھی پڑھتا ہوں۔

نو بجے کے قریب میں اپنا دفتر کا کام شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے وزیرِ دربار کو بلاتا ہوں جس سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے جیسے عام لوگوں کو شرفیابی کی اجازت، غیر ملکی اہم شخصیتوں سے ملاقات اور ضرورتمندوں کی درخواستوں پر مدد کے لئے غور و فکر وغیرہ۔ وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ جب بھی چاہیں ملاقات کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے

وزرا اور افسرانِ بالا اکثر و بیشتر مجھ سے ملاقات کرنے آتے رہتے ہیں۔ مسلح فوجوں کا کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے ہفتے میں دو روز صبح کا وقت میں نے فوج کے افسرانِ بالا اور دیگر اہم اشخاص سے ملاقات کے لئے وقف کر رکھا ہے جو پورے ملک کی براہِ راست خبریں میرے پاس لے کر آتے ہیں۔ ان لوگوں سے میں فرداً فرداً علیحدہ ملاقات کرتا ہوں تاکہ بات چیت آزادانہ ماحول میں ہو سکے۔

اس کے علاوہ ایران کے عام شہری جن میں تہران اور دوسرے تمام صوبوں کے لوگ شامل ہوتے ہیں مجھ سے شرفِ ملاقات کے لئے آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ملاقاتوں کا نتیجہ سوائے وقت تلفی کے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ لوگ کسی خاص سبب سے ملاقات کے لئے نہیں آتے لیکن اس خیال سے کہ ایران میں افواہیں بلا روک ٹوک بہت جلدی پھیلتی ہیں اس لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے مختلف نظریات کے لوگوں سے مل کر کئی ذرائع سے اپنی اطلاع کے لئے خبریں حاصل کروں۔ خوش قسمتی سے مجھے لوگوں سے مل کر مسرت ہوتی ہے اور ان ملاقاتوں سے اکتاہٹ کی بجائے خوشی محسوس کرتا ہوں اور طبعاً میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ کاغذی کارروائی کی بجائے لوگوں سے مل لیا جائے۔

لیکن اس کے باوجود مجھے بہت زیادہ کاغذی کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر روز دن چڑھے میں اپنے خصوصی سکریٹریٹ[1] کے افسرِ اعلیٰ کو بلاتا ہوں اور یہ ہدایت دیتا ہوں کہ جو خطوں کے پلندے، یادداشتوں کے ڈھیر اور رپورٹوں کے انبار دفتر میں پہنچے ہیں ان کے لئے فوری مناسب اقدامات کرے۔ زیادہ تر خطوط اور یادداشتیں ایسی ہوتی ہیں جس کے جوابات کا خلاصہ لکھوا دیتا ہوں لیکن کچھ خطوط ایسے بھی آتے ہیں جن کی پوری پوری عبارت مجھے خود ہی لکھوانی پڑتی ہے۔

فارسی تحریر خود ہی ایک طرح کی مختصر نویسی[2] ہے۔ اس لئے میں مغربی ممالک کے لوگوں کی طرح اسٹینوگرافر یا صدا بند کرنے والی مشین سے کام نہیں لیتا۔ کبھی کبھی بعض بہت اہم خطوط کا جواب خود ہی لکھ کر بھیجتا ہوں۔ مثلاً اگر مجھے انگلینڈ کی ملکہ الزابتھ سے مراسلت کرنی ہو تو خط خود ہی لکھوں گا۔ لیکن ملکی امور اتنے زیادہ ہوتے ہیں اور سرکاری خطوط اور رپورٹیں اتنی کثیر تعداد میں پڑھنی پڑتی ہیں کہ اس بات کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ نجی خط و کتابت کے سلسلے کو برقرار رکھا جائے۔

ڈیڑھ بجے کے قریب میں اپنے دفتر سے اٹھتا ہوں اور اپنی ملکہ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ کبھی کبھی کھانے پر رشتے دار، ایرانی یا غیر ملکی اہم شخصیت کے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ کھانا زیادہ تر ایرانی ہوتا ہے یا پھر یورپین اور کبھی کبھی دونوں قسم کی خوراک بھی میرے سامنے چُنی جاتی ہے۔ لیکن اپنے ہم وطنوں کی عادت کے برخلاف میں دوپہر کا کھانا ہلکا ہی پسند کرتا ہوں کھاتے وقت اور دوسرے مواقع پر بھی شراب کے استعمال سے پرہیز کرتا ہوں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بھی تقریباً پون گھنٹے تک دوسرے اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں اور اگر وقت ملے تو تقریباً اتنی ہی دیر ایک ہلکی سی نیند بھی لے لیتا ہوں۔ دوپہر بعد میں اپنے دفتر میں آ بیٹھتا ہوں اور تقریباً دو یا تین گھنٹے تک رپورٹیں پڑھتا رہتا ہوں۔ لیکن ہر دوشنبہ کو دوپہر کے بعد میری موجودگی میں شورائے عالی اقتصادیات اور وزراء کی کونسل کی

1. SECRETARIAT 2. SHORT HAND

نشست ہوتی ہے جو کئی گھنٹے تک چلتی رہتی ہے۔

مہینے میں ایک بار پریس کانفرنس بلاتا ہوں جس میں بہت سے ایرانی مدیر اور خبر نگار شرکت کرتے ہیں۔ مہینے میں کئی بار تہران کے آس پاس کبھی ہسپتالوں کے کبھی یتیم خانوں اور فوجی دستوں کے معاینے کے لئے جاتا ہوں یا پھر کسی نئی قائم شدہ فیکٹری یا کارخانے کے افتتاح کے لئے جانا ہوتا ہے۔ میں اکثر مختلف صوبوں کا دورہ بھی کرتا رہتا ہوں تاکہ حالات سے باخبر رہوں اور ترقیاتی کاموں کی دیکھ بھال کرتا رہوں۔ کبھی کبھی مجھے ملک کے باہر کا بھی دورہ کرنا پڑتا ہے جو اکثر و بیشتر سرکاری ہوتا ہے۔

اگر کوئی خاص کام نہ ہو تو شام کے وقت ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ جسمانی ورزش اور کسی کھیل میں صرف کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں ملکہ کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔ شام کے وقت ہم موسیقی کی دھنوں کے ریکارڈ بھی سنتے ہیں کبھی کبھی فلمیں بھی اپنے رہائشی محل میں دیکھ لیتے ہیں۔ اور رات کو جلدی ہی سو جاتا ہوں۔

ایران میں ہفتہ وار چھٹی چونکہ جمعہ کی ہوتی ہے اس لئے جمعہ کے دن یا دوسری چھٹیوں کے موقع پر اگر دوست احباب آجائیں تو ان کے ساتھ میں مختلف قسم کے کھیلوں میں جیسے والی بال یا کسی دوسرے کھیل میں لگ جاتا ہوں وگرنہ عام طور پر ان دنوں میں بھی رپورٹیں ہی پڑھتا رہتا ہوں یا اور کسی کام میں لگا رہتا ہوں یا کبھی کبھی کانفرنس بلا لیتا ہوں جو آدھے دن تک چلتی رہتی ہے۔

کچھ لوگ سوچتے ہوں گے کہ میں نے جس روزانہ کے معمول کا ذکر کیا ہے وہ یقیناً اکتاہٹ پیدا کرنے والا ہوگا لیکن اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنا کام بیحد پسند ہے۔ اس کتاب کی ساتویں فصل میں اشارہ بھی کر چکا ہوں کہ اقتصادی اور دیگر پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں میں بہت دلچسپی لیتا ہوں اس کے علاوہ مجھے مختلف قسم کے لوگوں سے باتیں کرنے میں بھی لطف آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر روز جب میں لوگوں کو ملاقات کے لئے بلاتا ہوں تو ان سے مل کر مجھے یک گونہ مسرت ہوتی ہے۔ جس وقت میں آبادکاری اور ترقیاتی کاموں کے معاینے کے لئے نکلتا ہوں تو کام کی رفتار دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی کا احساس ہوتا ہے اس کے علاوہ کسی ایسے کارخانے یا ادارے کے افتتاح سے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو یا عوام کو اس سے فائدہ پہنچے تو میں اپنے دل میں یک گونہ مسرت اور اطمینان محسوس کرتا ہوں۔

جب بھی میں نئے کسان مالکان کو زمینوں کے قبالے تقسیم کرتا ہوں یا کسی نئی فیکٹری کا سنگ بنیاد رکھتا ہوں یا کسی نئے بجلی گھر کو چلانے کے لئے اس کا برقی بٹن دباتا ہوں یا کسی نئی کلینک کا ربن کاٹ کر اس کا افتتاح کرتا ہوں تو میرا دل مسرت اور شادمانی کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ سوچتے ہوں کہ یہ کام میرے لئے ضابطے کی کارروائی کی حیثیت رکھتے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نئے ایران کی تعمیر میں یہ تخلیقی کام میرے دل میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں [illegible]

اس معاملے میں میں اپنے والد کا پیرو ہوں کیونکہ وہ بھی ہمیشہ ایران کی بہتری کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اور میرے ذہن میں بھی اسی قسم کے خیالات وافکار موجزن رہتے ہیں جن میں ایران کی ترقی اور یہاں کے رہنے والوں کی فلاح وبہبود مضمر ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ میرے دل میں ذوق وشوق انہی افکار وخیالات سے ابھرتا ہے اور جب یہ افکار عملی جامہ پہن کر جلوہ گر ہوتے ہیں تو پھر میری مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ باوجود ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے جو کبھی کبھی راہ میں آجاتے ہیں میں اپنے کام میں کبھی اکتاہٹ یا تھکن محسوس نہیں کرتا۔ اسی کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر میں نے زندگی میں صبر واستقلال سے کام لینا اور مشکلات کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کرنا نہ سیکھا ہوتا تو مجھ میں لگاتار کام کرنے کی لگن اور طاقت پیدا نہ ہوتی۔ اپنی سلطنت کے ابتدائی دنوں میں اور خاص طور پر مصدّق کے عہد میں میرا بیشتر وقت سخت اضطراب وپریشانی میں گزرتا تھا اور اسی لئے مجھے اس بات پر کوئی حیرانی نہیں کہ میرے بال کیوں قبل از وقت سفید ہوگئے اگر مجھ میں مشکلات کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کرنے کی خصوصیت نہ ہوتی تو شاید میری جسمانی اور ذہنی قوتیں جواب دے چکی ہوتیں اور یہ آتش شوق کبھی کی سرد ہو چکی ہوتی۔

کھیلوں سے جو مجھے دلچسپی ہے وہ سب کو ہی معلوم ہے۔ تیراکی، ٹینس، والیبال، گھوڑسواری، شکار، چہل قدمی، پانی اور برف کی اسکی، گلف، ہوائی جہاز کی پرواز اور کاریں دوڑانا میرے پسندیدہ مشغلے ہیں۔ لیکن صرف ورزشی کھیل ہی میری تفریح طبع کا ذریعہ نہیں ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مشاغل ہیں، مثال کے طور پر عام موضوعات پر بات کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ شطرنج سے بھی میں حظ اٹھاتا ہوں۔ مجھے ناول پڑھنے کا بھی شوق ہے اور خاص طور پر فرانسیسی ناول تو بہت پسند آتے ہیں۔ اگرچہ اب ان کے پڑھنے کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ وقت گذاری کے لئے میں وہ فلمیں بھی دیکھ لیتا ہوں جو ایران میں تجارتی مقاصد کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔ فلموں میں مجھے تاریخی اور جاسوسی فلمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ موسیقی اور ہنسی مذاق سے بھرپور فلمیں پسند نہ آتی ہوں۔ میری رائے میں امریکی فلمیں تکنیکی اعتبار سے بہت ہی اچھی ہوتی ہیں لیکن بعض انگریزی، فرانسیسی اور اٹلی کی فلمیں اداکاری اور ہدایت کاری کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھتا ہوں۔ اگرچہ ایران میں فلم انڈسٹری کی ابتدا، حال ہی میں ہوئی ہے لیکن اب یہاں بھی بہت سی اچھی فلمیں بننے لگی ہیں۔

میں اپنے آپ کو کسی طرح بھی موسیقی کا ماہر نہیں سمجھتا لیکن اس کا بیحد شائق اور دلدادہ ہوں۔ اگرچہ مجھے فارسی دھنیں بھی پسند ہیں لیکن مغربی موسیقی میں چونکہ تنوع زیادہ ہوتا ہے اس لئے طبیعت بیشتر اسی طرف مائل ہے۔ والز[1] کے علاوہ مجھے دوسری ہلکی کلاسیکی گتیں بھی اچھی لگتی ہیں تفنن طبع کے لئے جاز بھی خوب ہے لیکن جن استادوں کے راگوں سے مجھے واقعی عشق وعلاقہ ہے وہ شوپن[2]، بیتھووِن[3]، شوبرٹ[4]، لِسٹ[5]، چیکووسکی[6]، رِمسکی کورسا کو[7] اور بورڈن[8] وغیرہ کے لافانی نغمے ہیں کبھی کبھی میں ان استادوں کے فن کے متعلق سوچتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ آج کے دور میں اس طرح کی

1. WALTZES 2. CHOPIN 3. BEETHOVEN 4. SCHUBERT
5. LISZT 6. TCHAIKOVSKY 7. RIMSKY - KORSAKOV 8. BORODIN

دُھنیں بنانا امرِ محال ہے لیکن یہ محض ایک احتمال ہے، ہوسکتا ہے کہ ثقافت اور موسیقی کے میدان میں دنیا ایک بار پھر لوٹ کر سنہری دور میں آجائے۔

میری تفریح کے اور بھی بہت سے سامان ہیں۔ مثلاً میں نے اپنے موسمِ گرما کے رہائشی محل میں گائیں اور مرغیاں پال رکھّی ہیں جب میرا وہاں قیام ہوتا ہے تو اکثر ان کی دیکھ بھال کے لئے جاتا رہتا ہوں۔ اور ان سے دل بہلاتا ہوں۔ بجلی کی ٹرین اب سے دو سال قبل میں نے سوئٹزرلینڈ سے خریدی تھی۔ اس کو چلا کر تو میں بالکل اسی طرح خوش ہوتا ہوں کہ گویا ایک چھوٹا سا بچّہ ہوں جس وقت میں ثانوی مدرسے میں پڑھتا تھا تو میں نے بڑے شوق سے ایک سال تک لکڑی کا کام بھی سیکھا تھا۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس شوق کو پھر تازہ کروں۔ اس کے علاوہ جب کبھی میں عام لوگوں سے بات کرتا ہوں تو ان کی سادہ لوحی اور بھولپن کی باتیں سُن کر واقعی دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔

سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی اعتبار سے ہم پچھلے چند سالوں میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب گذشتہ دنوں کی پریشانی اور زبوں حالی کو یاد کر کے افسوس کم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اب میرے سامنے محرومیاں اور دشواریاں نہیں ہیں۔ آج جن باتوں سے میں دل برداشتہ ہوتا ہوں وہ لوگوں کی نا اہلی، سُستی، بے توجہی، ناتجربے کاری اور غیر ذمہ داری ہے۔ آج کا ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے اور اگر اس کا حل نکل آئے تو دوسری دشواریاں آپ ہی راہ سے ہٹتی چلی جائیں گی۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جن اہم نکات کا ذکر میں نے اس کتاب کی گیارہویں فصل میں کیا ہے ان پر اس قدر زور دینے سے میری کیا مراد ہے اور کس وجہ سے ایرانی نوجوانوں کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ مستقبل کی ترقی اور خوشحالی ان کے ہاتھوں میں ہے۔

میں بار بار تاکید سے یہ بات کہہ چکا ہوں کہ دفاتر سے رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کو ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سِول ملازمین کو اس قدر تنخواہ دی جائے کہ ان کے اخراجات آسانی سے پورے ہو جائیں تاکہ وہ اپنی اقتصادی ضروریات کو پورے کرنے کے لئے غلط قدم نہ اٹھائیں۔ میں یہ بھی بخوبی جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں رشوت خور اور بدعنوانیاں پھیلانے والے کچھ دولتمند لوگ ہیں۔ جن کو مال و دولت کی چنداں ضرورت نہیں لیکن اپنی پس فطرتی کے باعث لوگوں سے تحفے تحائف وغیرہ قبول کرنے میں ذرا بھی نہیں چوکتے۔ میری افسردگی اور حوصلہ شکنی کا سب سے بڑا سبب ایسے لوگوں کا وجود ہے۔ لیکن ان لوگوں کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے میں اپنا خون کھولانے اور ہمّت ہارنے کی بجائے ان سے قانونی چارہ جوئی کر کے اصولی لڑائی لڑتا ہوں۔

اسی طرح جس وقت ہمارے ہمسایہ ملک کی طرف سے ہمارے خلاف اہانت آمیز اور بیہودہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے تو میں جذبات میں بہہ کر جوابی کارروائی کر سکتا ہوں لیکن اس سے سوائے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو تلف کرنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا اور میں اپنی افسردگی میں کئی گُنا اضافہ کرلوں گا۔ چنانچہ جب کبھی ہمارے خلاف کچھ کہا جاتا ہے

میں اس کو سُنتا ہوں یا اخباروں میں اس کے متعلق پڑھتا ہوں تو اس سے بھی تفریح لیتا ہوں۔

اس فصل میں میں نے مختصراً اپنا روزانہ کا معمول بھی بیان کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ جب سخت مشکلات اور حوصلہ شکن حالات کا سامنا ہوتا ہے تو میں کس طریقے سے ان پر غلبہ پاتا ہوں۔ اگر میں نے اب تک دور اندیشی اور ہمت سے کام نہ لیا ہوتا تو بالکل بے دست و پا ہی نہیں بلکہ نیست و نابود ہو کر رہ جاتا۔ یہاں میں یہ بھی بتاؤں گا کہ انتظامی امور و مسائل کو حل کرنے کے لئے میں نے کیا روش اختیار کی ہے تاکہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ لگانے میں مدد مل سکے کہ کن اصولوں کی بنا پر میں نے اب تک کامیابی سے حکمرانی کی ہے۔

کسی ظریف نے کیا خوب کہا ہے کہ علم ریاضی کی ضریب کی طرح افسردگی اور حوصلہ شکنی کی بھی ضریب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں میں اپنے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ جیسے جیسے ہم ترقی کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں اُسی نسبت سے میری حوصلہ شکنی اور افسردگی کی ضریب کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی بات میرے ہموطنوں پر صادق آتی ہے۔

میں نے اپنے ملک کے انتظامی امور و مسائل کے لئے جو روّیہ اختیار کیا ہے وہ اس ملک کے مخصوص تہذیب و تمدّن کے ماحول کے عین مطابق ہے اور ممکن ہے کہ قارئین کو یہ روّیہ عجیب و غریب اور غیر روایتی نظر آئے لیکن تجربات نے اس روئیے کو بہت ہی سود مند ثابت کیا ہے اور ترقی کی وہ عمدہ راہ دکھائی ہے جہاں دن بہ دن حوصلہ شکنی اور افسردگی کی ضریب گھٹتی چلی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر میں اس بات کا زبردست حامی ہوں کہ انتظامی امور کی راہیں ہمیشہ متعدد و متبادل ہوں۔ چنانچہ اگر کوئی افسر اپنی جہالت، سستی، کاہلی یا ذاتی غرض کی بنا پر اپنے فرائض کو معمول کے مطابق انجام نہیں دیتا تو میں وہی کام کسی دوسرے افسر کو سونپ دیتا ہوں۔ اس طرح کام بھی میری مرضی کے موافق ہو جاتا ہے اور وہ اشخاص جو قوم کی خدمت میں دلچسپی لینا نہیں چاہتے۔ ان کو ان کے وقار اور اہمیت و منزلت سے محروم کر دیتا ہوں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں چھوٹے درجے کے افسران کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنے سے اعلیٰ مرتبے کے افسران کو میرا یہ پیغام دیں کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کس وقت چاہتا ہوں۔ کبھی کبھی یہ کام انتظامی امور میں سہولت پیدا کرنے کے لئے بھی کرتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ میں کسی نئے ہوائی اڈّے کے معاینے کے لئے جا رہا ہوں اور وہاں مجھے یہ خیال آجاتا ہے کہ جہاز کے میدان کے کنارے کنارے اگر ہری گھاس اُگا دی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا' اس وقت جو بھی افسر میرے نزدیک ترین ہوگا میں اس سے کہوں گا کہ اپنے افسرِ اعلیٰ کو میرا یہ حکم پہنچا دے۔ کبھی کبھی یہ روّیہ میں دیدہ و دانستہ بھی اختیار کرتا ہوں تاکہ اُن سُست اور کاہل افسران کو جنہیں اپنی اہمیت اور کارکردگی پر غرور و ناز ہے ان کے اس طلسم کو توڑ دوں۔

یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مختلف لوگوں کے نظریات اور خیالات دریافت کرنا تو میری عادت میں شامل

ہے اور اس رجحان کو میں نے اور بھی اس طرح جِلا دی ہے کہ انتظامی امور کے لئے متعدد راہیں کھول دی ہیں تاکہ مجھے اس امر کی اطلاع ملتی رہے کہ دفاتر یا اداروں میں کام کسی طرح ہو رہا ہے۔ اگر میں کبھی کسی کارخانے کو دیکھنے جاتا ہوں تو اس شخص سے جو خراد پر یا برے کی مشین کے پاس کھڑا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے اس کے کام کی بابت یا اس کی لڑکی کی پڑھائی کے بارے میں ضرور سوال کرتا ہوں۔ جب کسی نئے مدرسے کا افتتاح کرتا ہوں تو اس کے معلّموں سے ان کے رہن سہن کے بارے میں بھی دریافت کرتا ہوں، اسی طرح میں کسانوں سے بھی پوچھتا ہوں کہ ان کی امداد کے لئے جو دفتر قائم کیا گیا ہے وہاں سے مدد ٹھیک طور پر مل رہی ہے یا نہیں اور تھانے کا عملہ کس طرح کا سلوک کرتا ہے۔ دفاتر کے چھوٹے ملازمین سے میں کھانے پینے کی چیزوں کی بابت دریافت کرتا ہوں اور یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مہنگائی کا ان کی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے اور دفاتر میں لوگوں کا اخلاقی معیار کیسا ہے۔

مشیر کا جو مفہوم ہے، اُن معنوں میں مَیں کسی کو اپنا اصلاح کار نہیں بناتا۔ کیونکہ میری رائے میں ایسا کرنا کسی بھی حکومت کے سربراہ کے لئے خطرناک ہے۔ میرے والد نے جو غلطیاں کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنے مشیروں کے محدود حلقے پر اعتماد کیا۔ چونکہ وہ رضا شاہ سے ڈرتے تھے اس لئے ان کے سامنے حقیقت کو آشکارا کرنے کی بجائے خوشامد میں لگے رہتے تھے اور مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو بے ایمانی اور بدعنوانی سے پاک رہا ہو۔ میرا طریقۂ کار اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ مشیر فنی اعتبار سے خواہ کتنے ہی قابل اور سمجھدار کیوں نہ ہوں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ذاتی اغراض کے لئے قومی مفاد کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مجھ تک ساری اطلاعات انہی کے ذریعے پہنچیں اور اطلاع پہنچانے کے جو مستقل ذرائع اور راہیں ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں مشیروں کی بجائے سب ہی ذرائع سے اطلاعات حاصل کرتا ہوں اور اس کے بعد ہی عوام کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خلوص نیت سے بڑا متوازن قدم اٹھاتا ہوں۔ میں یہ بات یہاں واضح کر دوں کہ میں کسی طرح اپنے آپ کو گنجینۂ حقائق اور افکارِ منوّر کا مخزن نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برعکس متعدد ذرائع سے جو اطلاعات ملتی ہیں ان کی روشنی میں صاحبِ عقل و فہم لوگوں کے مشوروں سے کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اگر میں یہ دیکھتا ہوں کہ معاملہ غیر معمولی مشکل اور پیچیدہ ہے تو میں اپنے اطلاعاتی ذرائع کو پہلے سے بھی زیادہ وسیع کر دیتا ہوں اور جب تمام ذرائع سے اطلاعات مل جاتی ہیں اور تمام نظریات سے مجھے آگاہی ہو جاتی ہے تو میں اس مشکل کا حل بھی فوراً نکال لیتا ہوں۔ جب مسائل کا حل نکل آتا ہے تو ان کو متعلقہ ذمہ دار افسران کے گروہ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ میں ان لوگوں کا شکرگزار ہوں جو میرے طریقۂ کار میں معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں کیونکہ انہی کی وجہ سے کوئی ایسا حل نکل آتا ہے جو ایران کے لئے اور خاص طور پر یہاں کے عوام کے لئے پورے طور پر مناسب ہو کیونکہ ان کی فلاح و بہبود ہی میرا اوّلین فرض ہے۔

جس وقت میں کوئی پالیسی تیار کر لیتا ہوں تو وزیر اعظم یا کسی وزیر یا کسی متعلقہ ادارے کے افسرانِ اعلیٰ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اب اس پر عمل درآمد کرائیں۔ معمولاً جس ادارے کو حکم دیا جاتا ہے وہ بڑی سرعت اور اطمینان سے کام کو انجام دیتا ہے کبھی کبھی اس کی طرف سے غفلت بھی برتی جاتی ہے ایسی صورت میں میں جواب طلب کر لیتا ہوں۔ میں یہ جملہ ہرگز سننا نہیں چاہتا "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے"۔ مجھے غصہ کم ہی آتا ہے۔ لیکن جس شخص سے جواب طلب کیا جاتا ہے وہ میری نگاہوں اور آواز سے سمجھ جاتا ہے کہ میں اس کے رویّے سے کس قدر مطمئن یا غیر مطمئن ہوں۔ اس کو اصول وضابطے کی راہ سے معطل بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد حکومت سے کہا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے اس سے بہتر کسی اور آدمی کو مقرر کرے۔ اگر کسی کام کی اصلاح کے لئے کسی ادارے یا شخص کی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو میں حکومت کو حکم دیتا ہوں کہ جلد از جلد اس طرف متوجہ ہو۔

صحیح طور پر اطلاعات حاصل کرنے اور کسی کام کو جاری رکھنے کے لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ غیر رسمی تعلقات پر اعتماد کیا جائے یا اس سلسلے میں ایک یا چند آدمیوں کو شرف باریابی بخشا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اہم کاموں کے لئے میں دو رسمی انجمنوں سے جن کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں (یعنی وزرا کی کابینہ اور شورائے عالی اقتصاد) سے بھی مشورہ کرتا ہوں۔ وزرا کی کابینہ، وزیر اعظم اور دیگر وزرا پر مشتمل ہوتی ہے میری رائے میں یہاں اس بات کا مختصر ذکر بہت ہی مناسب ہوگا کہ وزرا کی کابینہ کس طرح میرے ساتھ کاموں میں تعاون کرتی ہے تاکہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو میرے طریقۂ کار کا کچھ حد تک اندازہ ہو سکے۔

کابینہ کی نشست مرمر محل میں ہوتی ہے۔ وزیر اعظم اور دیگر وزرا میری آمد سے قبل ہی اپنی اپنی جگہوں پر آبیٹھتے ہیں چونکہ یہ لوگ میرے منتظر ہوتے ہیں اس لئے جلسے کی کارروائی شروع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ میرے پہنچنے کے فوراً بعد ہی مذاکرات شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ مذاکرات کے دوران میں کبھی گھنٹی بجانے یا میز پر ہاتھ مارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا بلکہ حاضرین میری نگاہوں، چہرے کے اُتار چڑھاؤ یا آواز کی کرختگی سے ہی سنبھل جاتے ہیں اور جلسے کا نظم ونسق برقرار رہتا ہے۔

میرے ذہن میں اگر کوئی خاص خیال یا اہم موضوع آجاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ میں پوری کابینہ سے خطاب کروں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وزیر اعظم یا کسی دوسرے وزیر سے کہوں کہ پچھلی نشست میں جو رپورٹ طلب کی گئی تھی اس کو اس نشست میں پڑھ کر سُنائے یا اس وقت جو موضوع زیر بحث ہے اُس پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ میں صرف اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ کابینہ کے ممبران کو اس بات کی طرف رغبت بھی دلاتا ہوں کہ وہ آزادانہ اپنی رائے پیش کریں لیکن اس کے ساتھ ہی میری توجہ اس بات پر بھی رہتی ہے کہ پورے بحث ومباحثے کا نتیجہ قطعی اور مثبت نکلے۔ میں کبھی کبھی پوری کارروائی کے لئے ایک کلی اصول مقرر کر دیتا ہوں اور بعض معاملات کے لئے مخصوص حکم بھی صادر

کرتا ہوں۔

مثال کے طور پر ایک نشست میں مَیں نے تفصیل سے بتایا کہ لوگوں کو ایران کے ترقیاتی پروگراموں کی رفتار کے متعلق سمجھانے کے لئے ڈاکومنٹری فلموں کی کیا اہمیت ہے لیکن دوسری طرف جب کہ میں بچّوں کی ذہنی نشو ونما میں کھلونوں کی اہمیت بتا رہا تھا تو کسی نے یہ پیش کش کی کہ ایران میں کھلونوں کی درآمد بند کر دی جائے تو میں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔ ایک دفعہ کسی سرکاری ڈپارٹمنٹل اسٹور کے انتظامیہ کے متعلق تفتیش کی جا رہی تھی اس موقع پر میں نے اتنا ہی کہا کہ اس اسٹور سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے کہ اس میں فروخت ہونے والے سامان کی قیمتیں کم ہو جائیں۔ اس کے بعد میں نے اس بات پر بھی پورا زور دیا کہ شہری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ چیزوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا آسانی سے مقابلہ کر سکیں۔ ایک دفعہ ایک وزیر سے پوچھ لیا کہ وہ مجھے فیصلہ کر کے بتائے کہ وہ ریلوے لائن جو زیرِ تکمیل ہے کس تاریخ تک مکمل ہو گی۔ اسی طرح میں نے حکم دیا کہ فولاد سازی کے کارخانے کی تکمیل میں جلدی کی جائے۔

دوسری نشست میں سال آیندہ کا بجٹ زیرِ بحث تھا میں نے اصولی طور پر یہ ہدایت دے دی کہ تیل کی آمدنی کو ترقیاتی پروگراموں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ میں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شہری اور پولیس ملازمین کی تنخواہوں میں فوراً اضافہ کیا جائے اور اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ صحت، تعلیم اور حفاظتی انتظامات پر روپیہ پہلے کی نسبت زیادہ خرچ کیا جائے۔ ان اضافی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے میں نے مشورہ دیا کہ کسٹم اور مالگذاری کی رقم کی وصولیابی کے طریقوں میں اصلاحات کی جائیں اور عام اخراجات میں کمی کی جائے۔ پرائمری سطح تک تعلیم کو ترقی دینے کے لئے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ میونسپلٹیوں کو مزید اختیارات دیئے جائیں اور وزیرِ تعلیم کو حکم دیا کہ وہ پوری طرح غور کر کے یہ بتائے کہ تعلیم کے اخراجات کے لئے مزید فنڈ کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ عوام کی ضروریات کے پیشِ نظر میں نے یہ ہدایت دی کہ چائے اور چینی کی پیداوار پہلے سے زیادہ کی جائے۔ کابینہ کے کئی وزیروں کو حکم دیا کہ ان کی وزارتوں سے متعلقہ جو زمین ہے وہ اس کی فروخت کے امکانات پر غور کریں تاکہ اس سے جو روپیہ جمع ہو وہ شہری ملازمین کے مکانات بنانے کے کام میں لایا جا سکے۔

مجھے اطلاع ملی تھی کہ ہمارے ایک شمالی صوبے میں ناجائز طور پر افیون کی درآمد ہو رہی ہے میں نے تیسری نشست میں کابینہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور یہ مطالبہ کیا کہ اس خلافِ قانون کارروائی کی روک تھام کے لئے فوراً ہی سخت اقدامات کئے جائیں۔ اس کے بعد میں نے وزیرِ صحت سے شکایت کی کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ جن مراکز سے بچّوں کو مُفت دودھ تقسیم کیا جاتا ہے ان میں سے ایک کی حالت بہت زیادہ خستہ و خراب ہے اور حکم دیا کہ فوراً ہی وہاں کی حالت سدھاری جائے۔ حکومت کے شہری ملازمین کی تنخواہ کے اضافے کے لئے میں نے وزراء کی کابینہ کو دوبارہ تاکید کی اور مشورہ دیا کہ سال آیندہ کا بجٹ تیار کرتے وقت اضافی تنخواہوں کی فراہمی کے لئے جو بھی بجٹ میں ترمیم ضروری

سمجھیں، کریں۔ میں نے ٹیکس پالیسی پر جلد از جلد غور کرنے کی تجویز بھی پیش کی تاکہ حکومت کی آمدنی مالگذاری کے ذریعے بڑھ سکے اور اجتماعی عدل و انصاف کی احتیاجات پوری ہوسکیں۔

میں ایسی بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ جس وقت کابینہ کسی پالیسی کے مرتب کرنے کے لئے فیصلہ کُن قدم اٹھاتی ہے تو اس میں اجتماعی عدل و انصاف کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً میں نے بارہا کابینہ کی توجہ اجتماعی عدل و انصاف کے ان پانچ اصولوں کی طرف دلائی ہے جن کا ذکر اس کتاب کی آٹھویں فصل میں کیا جا چکا ہے۔ کابینہ کی نشستوں میں جو بھی احکامات یا بیانات میں نے دیئے ہیں ان میں ان اصولوں اور ان پر عمل کرنے کے مختلف طریقوں کی جھلک بھی ضرور نظر آئے گی۔

میں نے مطالبہ کیا ہے کہ جن کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد سَو سے زیادہ ہے وہاں اس قانون کا پُرزور طریقے پر اطلاق کیا جائے کہ کارخانوں کے مالکان اپنے مزدوروں کو معیاری نقشوں کے مطابق تیار کردہ مکانات رہائش کے لئے فراہم کریں۔ صنعتی ترقی کے پروگرام کے متعلق میرا یہ نظریہ ہے کہ ایسے کارخانوں کے قیام کو فوقیت دی جائے جن کی پیداوار سے ہمارے کم آمدنی والے لوگوں کی ضروریات پوری ہوں اور چیزوں کی قیمتیں گرنے میں ان سے مدد مل سکے چنانچہ پہلے بھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس مقصد کے تحت ہم نے سرکاری خرچ پر روٹیاں اور دوائیاں تیار کرنے کی مشینیں نصب کی ہیں۔

ایک جلسے میں میں نے وزراء کی کابینہ کو یہ حکم دیا کہ پورے ملک میں مزید دستکاری مدرسوں کے کھولنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے ان کی تکمیل میں سُرعت سے کام لیا جائے اور یہ بات بھی ذہن نشین کرائی کہ اس قسم کے مدرسے ہمارے ملک کے نوجوانوں کے لئے جو مالی اور خاندانی اعتبار سے کسی بھی طبقے کے ہوں اچھّے مواقع فراہم کریں گے اور اسی کے ساتھ ہمارے ملک میں جو دستکاروں کی کمی ہے وہ بھی ان اسکولوں کے ذریعے پوری ہوجائے گی۔ میں نے کابینہ سے یہ بھی کہا کہ اگر ٹکنیکل تعلیم کے لئے ہمیں باہر سے امداد ملتی ہے تو اس کو خوشی سے قبول کرلینا چاہیئے اور اسی کے ساتھ میں نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ جو غریب طلباء دوسرے ممالک میں تکنیکی یا دیگر مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے شاہی اور سرکاری وظائف کی تعداد بڑھائی جائے۔

میں نے کابینہ سے یہ بھی درخواست کی کہ ایسے مؤثر قدم اٹھائے جائیں جن سے ڈاکٹروں میں ملک کے دور دراز گوشوں میں جاکر لوگوں کی خدمت کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔ کیونکہ اعلیٰ ترقی یافتہ ممالک کی طرح ایران میں بھی ڈاکٹروں کا یہ عام رجحان پایا جاتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں رہ کر ہی لوگوں کا علاج کریں۔ میں نے حکومت کو تاکید کی ہے کہ جو ڈاکٹر تہران سے باہر دور دراز جگہوں پر رضاکارانہ طور پر جانا چاہیں ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسائشیں فراہم کی جائیں۔

خوراک سے متعلقہ وزیر کو میں نے حکم دیا کہ کسانوں کی مدد اور کافی مقدار میں غلّے کو ذخیرہ کرنے کی غرض سے وہ سرکاری خرچ پر مزید گیہوں خریدے۔ زراعتی بنک کو یہ احکام جاری کئے کہ وہ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں اپنی شاخوں کی تعداد بڑھائے تاکہ کسان ان سے روپیہ لے کر زمین کی پیداوار اور اپنی آمدنی میں اضافہ کریں۔ اسی طرح میں نے وزیرِ زراعت کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ تہران کے اطراف میں سنچائی کی زمین کے رقبے کو توسیع دے تاکہ اس شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کم داموں پر زیادہ سے زیادہ کھانے کا سامان مل سکے۔

میں نے یہ اعلان جاری کرایا کہ سال میں ایک مرتبہ پورے ملک میں درختکاری کا دن منایا جائے اور جنگلوں کی توسیع و ترقّی کے لئے دیگر اقدامات بھی کئے جائیں تاکہ دیہاتیوں کو ایندھن اور عمارتی لکڑی مل سکے اس کے علاوہ جب جنگل کے درخت زمین کی رطوبت جذب کریں گے تو موسم بھی معتدل رہے گا۔ میں نے اس بات پر بھی ماہرین کی توجہ دلائی ہے کہ جس طرح آسٹریلیا، امریکہ اور دیگر ممالک میں مصنوعی بارش کرائی جاتی ہے۔ ایران میں بھی اس کے امکانات پر غور کیا جائے۔

جس قسم کی ہدایتیں اور احکام میں مسلسل متعلقہ افسران و حکّام کو دیتا رہتا ہوں ان میں سے چند کا ہی ذکر یہاں کیا گیا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی کام کے لئے حکم دینا اور اس کو عملاً جاری رکھنا دو مختلف امور ہیں۔ بہتر تعلیمی نظام اور کارخانوں میں نظم و ضبط کے اصولوں کی وجہ سے وہ دن جلد ہی آئے گا جبکہ ہمارے ملک سے سستی اور دفع الوقتی کی لعنت دور ہو چکی ہوگی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ دن آئے ہم سب کو چاہیئے کہ مل کر مسلسل اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں اور یہ کوشش کریں کہ ہمارے کارخانے کے مزدوروں میں بھی یہ لگن اور عادت پیدا ہو۔

کسی کام کو عمدہ طریقے پر انجام دینے کے لئے انتھک لگن اور کوشش ضروری امر ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ شخصی طور پر تعلقات بھی ہوں۔ یورپ کے وہ لوگ جو کارخانوں میں نظم و ضبط کے ماہر سمجھے جاتے ہیں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ کارخانوں میں حسنِ انتظام کے لئے ضروری ہے کہ مزدوروں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا جائے اور ایک مدیر یا سرپرست کے تحت آٹھ سے بارہ تک مزدور رکھے جائیں۔ لیکن ہمارے ملک کے تہذیبی ماحول میں یہ اصول کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ مجھ تک اطلاعات پہنچنے کے جو ذرائع ہیں اور جن پر میں ہمیشہ انحصار کرتا ہوں اگر ان کو محدود کر دیا جائے تو یہ پورے ملک کے لئے خطرناک ہوگا۔ یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ میرے تعلقات کا دائرہ بہت ہی زیادہ وسیع ہو جس کے ذریعے میں اس ملک کے عام لوگوں کی دشواریوں اور ضروریات سے پوری طرح باخبر رہوں۔ میرا ملک چونکہ مسلسل ترقی و توسیع کی طرف بڑھ رہا ہے اس لئے میرا دوسرا فرض یہ بھی ہے کہ میں متواتر لوگوں سے اپنا رابطہ قائم رکھوں۔

یہ بات بھی یہاں قابلِ ذکر ہے کہ جن لوگوں نے ہمارے ملک کا آئین تیار کیا ہے انہوں نے نہایت ہی دوراندیشی

سے کام نے کر یہ بات واضح کر دی ہے کہ "بادشاہ ملک کی ہر ذمہ داری سے مبرا ہے" اس جملے سے ان کی یہ مراد تھی کہ جس طرح پارلیمنٹ کے سامنے ایک وزیر کو کسی امر کا ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس مفہوم میں شاہ پر نہیں بلکہ اس کے وزرا پر ذمہ داری آتی ہے۔

اگر آئین شاہ پر کسی طرح کی ذمہ داری نہیں ڈالتا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ شاہ کوئی غیر ذمہ دار شخص ہے بلکہ اس کے برعکس شاہ کا یہ فرض ہے کہ وہ دانشمندی سے اپنے ان اختیارات کا استعمال کرے۔ (اس کتاب کی آٹھویں فصل میں شاہ کے اختیارات کا مجملاً ذکر کر دیا گیا ہے) اس کے علاوہ اگر شاہ کو واقعی لوگوں سے اور ان کے فلاحی کاموں سے دلچسپی ہے تو اس کا فرض ہے کہ قومی سطح پر پالیسیاں مرتب کرنے اور ان پر عمل درآمد کرانے کے لئے خود کو ایک اچھا راہنما ثابت کرے۔ ملک کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لئے بادشاہ جس قدر قیادت کر سکتا ہے اس کی بھی دراصل کچھ حدود معین ہیں۔ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں چونکہ ہم نے ترقی کی راہ پر قدم حال ہی میں رکھا ہے اس لئے ہم کو بہت سی کوتاہیوں اور خامیوں کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور خاص طور پر ایسے ہنرمند آدمیوں کی تو بہت ہی کمی ہے جو ہمارے ترقی کے کاموں میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ اسی طرح جن منصوبوں کو پورا کرنے کی ہمارے دل میں آرزو ہے اس کے لئے ہمارے پاس نہ کافی روپیہ ہے نہ ضروری سامان اور نہ دیگر وسائل لیکن اس کے باوجود میں اور میرے ملک کے وطن پرست لوگ سب ہی اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ جس قدر ہو سکے ترقی کے منصوبوں کو پورا کر لیں۔ میری رائے میں ایسے بہت سے شواہد منظرِ عام پر آگئے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم اپنی انتھک کوشش اور لگن کی وجہ سے کامیابی کے کس قدر نزدیک آ چکے ہیں۔

ابراہم لنکن کی طرح دوسرے بڑے بڑے رہنماؤں اور ملک کے سربراہوں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ اعلیٰ مقامات پر پہنچنے کے بعد آدمی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ ایران میں بھی عہدِ قدیم میں اسی طرح کی روایات تھیں اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تنہائی شاہ کو ہر طرف سے گھیرے رہتی تھی۔ اگرچہ مجھ تک لوگوں کی رسائی بہت آسان ہے اور میرے چہرے پر وہ رعب و دبدبہ بھی نہیں جو رضا شاہ کے رُخ پر تھا لیکن چونکہ سلطنت کا سربراہ ہوں اس لئے لوگ مجھ سے دور ہی دور رہتے ہیں۔ کابینہ کی نشست کے وقت یا عام لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے میں اکثر لوگوں سے ہنسی مذاق بھی کرتا ہوں لیکن سب ہی یہ سمجھتے ہیں کہ میرا یہ تقرب اور نزدیکی سطحی اور وقتی ہے۔ اپنی عادت کی وجہ سے اور چونکہ مشیروں کو ملازم رکھنے میں ذرا احتیاط برتتا ہوں اور دوسرے ممالک کے سربراہوں کی طرح اہم معاملات کے فیصلے خود ہی کرتا ہوں اس لئے بھی میری تنہائی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے لیکن میری افتادِ طبع اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ جزئی اور معمولی باتوں کو چھوڑ کر ملکی امور میں اپنے رشتے داروں تک سے کوئی صلح و مشورہ نہیں کرتا۔

کیا میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں؟ کبھی نہیں۔ مجھے جو اُلفت اپنے بیوی بچوں سے ہے اور جو محبت اور لگاؤ اپنی قوم اور مناظرِ فطرت سے ہے اس کی وجہ سے مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے کام سے

گہری دلچسپی ہے۔ایک طرف یہ مجھے مقابلے کے لئے ابھارتی ہے تو دوسری طرف اطمینان بھی بخشتی ہے۔ملک میں جہاں کہیں جاتا ہوں اور ترقی کے نمایاں آثار دیکھتا ہوں تو مجھے بے انتہا مسرت ہوتی ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں۔

میں یہاں جذباتی ہونا نہیں چاہتا لیکن جب کبھی اپنے ملک کی حسین و جمیل اسکول جانے والی لڑکیوں کو دیکھتا ہوں جو ٹولیاں بنا کر گلیوں اور بازاروں سے ہنستی اور باتیں کرتی گذرتی ہیں تو مجھے بالکل تنہائی کا احساس نہیں رہتا بلکہ اس کائنات سے اور بھی زیادہ عشق بڑھ جاتا ہے اور کوئی تعجّب نہیں کہ وہ دن جلد ہی آئے جبکہ میں ان کے لئے ایک سرکاری ادارہ قائم کروں تاکہ ہر ایرانی لڑکی جب سن بلوغ کو پہنچے تو یہاں سے اس کو جہیز مل سکے۔ہمارے ملک میں بہت سی لڑکیوں کی شادی محض اس وجہ سے دیر میں ہوتی ہے کہ اقتصادی حالات اجازت نہیں دیتے اور میری رائے میں یہ انتہائی ناانصافی ہے۔اسی طرح آج کل یہ منصوبہ بھی میرے پیش نظر ہے کہ اپنے ملک کے معمّر لوگوں کے لئے بہت کشادہ اور خوبصورت مکانات بنواؤں تاکہ وہ اگر رہنا چاہیں تو ان میں آرام سے رہ سکیں اور زندگی کے آخری ایّام بڑے اطمینان اور خوشی سے گذار سکیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم ان کے لئے یہ آسائشیں فراہم کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ایک اور سبب ہے جس کے باعث میں اپنے آپ کو بحیثیت اس ملک کا سربراہ ہونے کے تنہا محسوس نہیں کرتا۔میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ یہ میرا ایمان ہے کہ خدا میرا محافظ و مددگار ہے اور مجھے اس کی مدد اور نگہبانی پر پورا بھروسہ ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مدد اور نگہبانی مجھ میں تکبّر و تعصّب پیدا نہیں ہونے دیتی بلکہ اس کے برعکس اس اعتماد کو اور بھی پختہ بنا دیتی ہے کہ اس کی ہدایت کی بنا پر ہی میں بھی اس کائنات کے ساز پر ہمنوا ہوں۔روزانہ نماز کے بعد دعا کرنے کے علاوہ بھی کبھی کبھی میں خدا سے بصد عجز و نیاز یہ التجا کرتا ہوں کہ وہ میری دستگیری اور رہنمائی فرمائے۔میرا یہ دعویٰ نہیں کہ عالمِ ربّانی سے میرا کوئی اشراقی رابطہ ہے لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میری یہ دعائیں رائیگاں نہیں جاتیں اور میں خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔

اس فصل میں میں اپنے متعلق اس ملک کا فرمانروا ہونے کے اعتبار سے یا ان عظیم روایات کا جن کے تحت میں اس ملک کی خدمت کر رہا ہوں اور زیادہ ذکر نہ کروں گا کیونکہ پچھلی فصلوں میں کئی جگہ اپنے نظریات کا اظہار کر چکا ہوں اور یہ بتا چکا ہوں کہ اب تک میں نے کیا اقدامات کئے ہیں اور آیندہ کن پروگراموں پر عمل کروں گا۔یہاں میں ایرانی شہنشاہیت کا ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے مختصر سا حال بیان کر کے کتاب کو ختم کروں گا۔

میں نے خود کو اس ملک کا فرمانروا ہونے کی حیثیت سے علیحدہ کر کے اس بات پر خوب غور و فکر کیا ہے کہ ایرانی شہنشاہیت کا عہدِ قدیم سے کیا کردار رہا ہے۔اگر مجھے کبھی بھی یہ احساس ہوا کہ اب ایرانی شہنشاہیت ایک بے جان سی چیز ہو کر رہ گئی ہے تو میں بڑی خوشی سے اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں گا اور یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ شریک

ہو جاؤں گا جو اس کو ادارے کی حیثیت سے ختم کر دینا چاہتے ہیں لیکن میں نے حالات کے دھندلکوں میں سے جھانک کر دیکھا ہے کہ شہنشاہیت کا ہماری زندگی پر بڑا گہرا اثر رہا ہے یہ ایٹمی دور میں بھی اتنی ہی سود مند اور کار آمد ثابت ہوئی ہے جتنی یہ اپنے ابتدائی دور میں سب سے پہلی اور بڑی شہنشاہیت کی حیثیت سے ثابت ہوئی تھی۔

میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ہماری شہنشاہیت تقریباً ڈھائی ہزار سال قدیم ہو چکی ہے۔ یہ تو میں نے محض اندازے سے بتایا ہے کیونکہ صحیح دن اور تاریخ تو حسابداں ہی بتا سکتے ہیں۔ کوروش اعظم اب سے تقریباً دو ہزار پانچ سو چھ سال قبل ایران کے تخت سلطنت پر متمکن ہوا تھا لیکن پورے ملک کو متحد کرنے اور ایک محکم حکومت قائم کرنے میں اس کو کئی سال لگے تھے۔ کوروش اعظم کے عہد سے آج تک کتنی ہی صدیاں بیت چکی ہیں۔ اس طویل عرصے میں کبھی ہم پر حملے کئے گئے اور کبھی ہم نے دوسروں پر حملے کئے اور دنیا کے وسیع و عریض ملکوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں رکھا لیکن اس کے باوجود ہماری شہنشاہیت کبھی منقطع نہیں ہوئی بلکہ ہر دور میں مسلسل جاری رہی۔

وقت کے اس طویل دور میں ہماری شہنشاہیت ہمیشہ کثرت میں وحدت پیدا کرتی رہی۔ ہمارے ہاں رنگ، نسل اور دینی عقائد کا اختلاف بھی رہا۔ اقتصادی اعتبار سے اونچ نیچ بھی باقی رہی اور سیاسی نظریات میں بھی بڑا بُعد رہا لیکن یہ سب اختلافات ایک جگہ آ کر متحد ہو جاتے تھے ان تمام اختلافات میں وحدت کی علمبردار شاہ کی اپنی شخصیت ہوتی تھی۔

یہاں میں اس بات کا بھی اعتراف کروں گا کہ اپنے ملک کی تاریخ میں مَیں پہلا شاہنشاہ ہوں جس نے آئینی اختیارات کو پورے طور پر استعمال کیا۔ یہ بات شروع میں تو بڑی ہی عجیب اور حیرت انگیز نظر آئے گی لیکن میں اس کو بھی واضح کئے دیتا ہوں سنہ ۱۹۰۶ء سے پہلے تک ہمارا آئین تحریری شکل میں نہ تھا اور اب سے قبل جو بادشاہ گذرے ہیں ان کو مشکل سے ہی مبہم طور پر آئینی حکمران کہا جا سکتا ہے سنہ ۱۹۰۶ء سے میرے والد کے برسر اقتدار آنے تک جتنے بھی قاجاری بادشاہوں نے مختصر مدت تک حکومت کی سب نے ہی ہمارے آئین کا مذاق اُڑایا اور جو بھی آئینی اختیارات ان کو حاصل تھے ان کا انہوں نے بیجا استعمال کیا۔ باوجود اس کے کہ رضا شاہ نے ایران کی قابلِ قدر اور عظیم الشان خدمت کی لیکن انہوں نے خود کو پارلیمنٹ کا مطیع رکھا۔ اگرچہ لیجسلیچر کی رو سے انہیں بعض آئینی اختیارات سے محروم بھی ہونا پڑا۔ آئین نے قانون ساز اسمبلی کی بھی گنجائش رکھی تھی لیکن اس کا وجود میرے ہی عہد میں منصہ شہود میں آیا۔

حقائق و شواہد میرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ میں پہلا ایرانی حکمراں ہوں جس نے ان حقوق و اختیارات کو پورا پورا استعمال کیا ہے جو آئین بنانے والوں نے اس ملک کے بادشاہ کو دیئے تھے۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے ملک کے لوگوں نے میری خدمات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھ کر مناسب یہی سمجھا کہ سنہ ۱۹۰۶ء کے آئین میں ترمیم کر کے میرے اختیارات کو مزید بڑھا دیا جائے۔

کچھ چلتے پھرتے غیر ملکی نامہ نگاروں نے میرے متعلق اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ آئینی حکمراں ہوتے

ہوئے بھی میرا رجحان استبداد کی طرف ہے اس کے مقابلے میں میرے ملک کے لوگوں اور کچھ غیر ملکیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مجھے اپنے والد سے زیادہ خود مختار اور سخت گیر ہونا چاہیئے تھا۔ اور میرا یہ نظریہ ہے کہ میں نے اپنے کردار میں ایک قسم کا توازن برقرار رکھا ہے جس کا اندازہ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو ہو گیا ہوگا۔ اب چونکہ ملک میں سیاسی جماعتیں رونما ہونے لگی ہیں اس لئے اب مجھے یہ موقع بھی ملے گا کہ اپنی ملک کی روایتی شہنشاہیت کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کروں۔

اس میں شک نہیں کہ عہدِ قدیم میں ہمارے ملک میں بڑے جلیل القدر بادشاہ گذرے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے اختیارات کا غلط فائدہ اٹھایا یا عوام کی خدمت کرنے میں سخت ناکام رہے لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اب کوئی بادشاہ نہ اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر سکتا ہے اور نہ خدمت میں کوتاہی۔ تعلیم کے عام ہو جانے اور سیاسی جماعتوں کے اُبھر آنے کی وجہ سے ایک اچھا بادشاہ پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ مؤثر طریقے پر ملک کی خدمت تو کر سکتا ہے لیکن ایک متوسط یا بُرا حکمران اس ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اب روشن خیال طبقہ اس کے بُرے سلوک کو برداشت نہ کرے گا۔ بلکہ اس کو مجبور کرے گا کہ یا تو ملک میں اصلاحی کام کرے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو آئینی جانشین کے حق میں وہ تخت و تاج سے دست بردار ہو جائے۔ ایرانی عوام اب بیدار ہو چکے ہیں اور وہ ملک کی ضروریات کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ایران میں جب پارٹیاں حکومت بنایا کریں گی تو شاہ کی حیثیت اتحاد و یکجہتی برقرار رکھنے کے لئے مرکزی نکتے کی سی ہوگی اور اس کی شخصیت تمام ذاتی اور نجی اغراض و فوائد سے بالاتر ہوگی۔ ہم ایرانی دنیا کی بہت سی انفرادیت پسند قوموں میں سے ایک ہیں جیسا کہ ہم پچھلی کئی صدیوں سے ثابت کرتے چلے آئے ہیں آگے بھی یہ دکھا دیں گے کہ ہماری وفاداری محض پارٹی تک محدود نہ رہے گی بلکہ اس سے بلند و بالا ہوگی اور اس سلسلے میں ہم آیندہ سالوں میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں گے۔

اپنا رنگ روپ بدلنا تو دنیا کی پُرانی عادت ہے۔ اس روز روز کی کایا پلٹ میں اگر کوئی سوسائٹی اپنی اقدار کو کھو بیٹھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پچھلے چند سالوں میں جو ایران میں زبردست تبدیلیاں تیزی سے آئی ہیں وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ ہم تعمیری تبدیلیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ ہم اپنی اعلیٰ اقدار کو بھی فراموش کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی ہیں اور ہم کو کوئی ان سے جدا نہیں کر سکتا۔ ایک طرف ہم اپنے باغوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ شعر و ادب کو سنوارتے ہیں۔ گھریلو زندگی پر جان دیتے ہیں اور اگر مہمان آ جائے تو دل کھول کر اس کی خاطر مدارات کرتے ہیں تو دوسری طرف ہم کو اپنے صحراؤں۔ برف پوش پہاڑوں۔ صنوبر و چنار کے درختوں، آبشاروں اور پانی سے بھرے ندّی نالوں، گلاب کے پھولوں نارنجی کے خوشبودار درختوں اور گل کے شیدائی بُلبُلوں پر بھی ناز ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو اپنے سیاسی اور سماجی اداروں پر فخر ہے۔